ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

لکھنؤ

ADBEE NASHEMAN

رباعی نمبر



ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت: ۲۰۰/روپئے



ذاکر حسین ذاکر کی

اہم تصانیف امیر خسرو

شخصیت فکر و فن اور تصوف

قیمت:599 روپئے۔صفحات:404

تنقیدی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ خندہائے گل

قیمت:300 روپئے

ہندی زبان میں امیر خسرو

بھاشا ساہتیہ اور ادھیا مک چیتنا

سجلد 499 غیر مجلد 300

کتابوں کو 20 فیصد کمیشن کے ساتھ

دی جائے گی۔ڈاک خرچ مفت

جن حضرات کو کتابیں چاہئے

نیچے درج واٹس ایپ نمبر پر رابطہ کریں۔

9670160786

جون تا نومبر ۲۰۲۳ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۶ شمارہ: ۳،۴

سہ ماہی

ادبی نشیمن

سرپرست
ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)
ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی (آسٹریلیا)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
محمد حنظلہ ندوی (لکھنؤ)

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جارہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

ADBEE NASHEMAN

قیمت

اس خصوصی شمارے کی قیمت:	۲۰۰/روپے	
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	25 $ (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ (رباعی نمبر) جون تا نومبر ۲۰۲۳

آغاز

۱	حمدیہ رباعیاں	ڈاکٹر اختر ریاض	۵
۲	نعتیہ رباعیاں	محمد عارف حسن خاں	۶

اداریہ

۳	نظریہ	ڈاکٹر سلیم احمد	۷
۴	پیغام	پروفیسر خواجہ اکرام الدین	۸
۵	پیغام	پروفیسر شمس الہدیٰ	۹
۶	پیغام	ڈاکٹر اطہر فاروقی	۱۰

حصہ اول (رباعی: فن و تاریخ)

۷	رباعی اور اس کے اوزان	ڈاکٹر اختر ریاض	۱۲
۸	رباعی: فن اور امکانات	حافظ کرناٹکی	۱۷
۹	رباعی: آہنگ و ارکان اور ہیئت و قوافی کے تجربے	اسلم حنیف	۳۰
۱۰	صنف رباعی اور اس کا فن	انس مسرور انصاری	۳۹
۱۱	مزید امکانات رباعی کے وزن میں	محمد انور ضیاء	۴۲
۱۲	رباعی فن اور روایت	راشدہ خاتون	۴۵
۱۳	رباعی کا فن اور اس کا ارتقاء	سفیان احمد انصاری	۴۸
۱۴	رباعی مشکل ترین فن	احتشام افسر	۵۳

حصہ دوم (رباعی: تنقید و تحقیق)

۱۵	رباعی پس منظر سے پیش منظر تک	پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۵۶
۱۶	کرناٹک میں رباعی: ماضی تا حال	پروفیسر مقبول احمد مقبول	۶۳
۱۷	رواںؔ: منفرد رباعی گو	پروفیسر صغیر افراہیم	۷۲
۱۸	نقد رباعیات جمیل مظہری	پروفیسر عراق رضا زیدی	۷۷
۱۹	ظفر کمالی کی رباعیاں	صفدر امام قادری	۸۱
۲۰	شاہین رضا زیدی کی رباعیاں	پروفیسر احمد محفوظ	۹۱
۲۱	رباعیات خیام کا اجمالی جائزہ	محمد ظفر جلالپوری	۹۵
۲۲	خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی رباعی گوئی	ڈاکٹر رضوان انصاری	۹۹
۲۳	عبدالغفور خاں نساخؔ: بہ حیثیت رباعی گو	ڈاکٹر تسلیم عارف	۱۰۲

۲۴	علامہ اقبالؔ: بحیثیت فارسی رباعی گو شاعر	ڈاکٹر زین العباء/ ڈاکٹر عابد ابراہیم	۱۰۷
۲۵	زیب النساء زیبیؔ کی رباعیات کا انتقادی مطالعہ	محسن اعظم محسنؔ ملیح آبادی	۱۱۰
۲۶	'نیرنگ رباعی': ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۱۱۳
۲۷	نشتر یاسِ یگانہ چنگیزی	ڈاکٹر امیر حمزہ	۱۱۷
۲۸	طرفہ قریشی کی رباعیات	ڈاکٹر خواجہ غلام السّیدین ربّانی	۱۲۲
۲۹	ظہیر غازی پوری کی رباعی گوئی	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۱۲۶
۳۰	ناوکؔ حمزہ پوری کی رباعیات	ڈاکٹر عرفانہ بیگم	۱۲۹
۳۱	رباعیات سیّد عابد علی وجدی الحسینی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر اعظم	۱۳۲
۳۲	دکن میں رباعی کی شمع - شاہ حسین نہری	ڈاکٹر ابو اسامہ (ابن آدم)	۱۳۴
۳۳	رباعیات روشن: ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر غلام حسین	۱۳۶
۳۴	رباعیات فراق: ایک مطالعہ	ڈاکٹر معراج الدین خاں	۱۳۹
۳۵	اجتبیٰ رضوی: مفکر رباعی گو	پروفیسر رئیس انور	۱۴۳
۳۶	محبوب رباعیات: ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر یاسر عباس	۱۴۶
۳۷	رباب رشیدی کی رباعی گوئی	محمد عشرت صغیر	۱۴۹
۳۸	ترقی پسند رباعی گو: پرویز شاہدی	محمد منظر حسین	۱۵۵
۳۹	رباعیاتی نظم: مامون ایمن کا ایک منفرد تجربہ	نذرانہ بی بی	۱۵۹
۴۰	صادقین: نام ایک، کام انیک	ڈاکٹر سنجے مصر اشوقؔ	۱۶۴
۴۱	فصنّا ابن فیضی کی رباعی گوئی	ڈاکٹر صوفیہ محمود	۱۶۶
۴۲	رباعیاتِ شوقؔ نیموی: ایک جائزہ	طفیل احمد مصباحی	۱۶۹
۴۳	کوثر صدیقی کی رباعیات پر ایک نظر	ڈاکٹر یاسمین اختر (بھاگلپور)	۱۷۳
۴۴	اشراق حمزہ پوری کی رباعی گوئی	تنویر اختر رومانی	۱۷۷
۴۵	رباعیات فریدؔ کی فکری و معنوی جہت	ارشاد آفاقی	۱۷۹
۴۶	رباعی کے گلابوں کے روشن چراغ: طہور منصوری نگاہ	رئیس الدین رئیس	۱۸۴
۴۷	نور محمد یاسؔ: بہ حیثیت رباعی گو	سیفی سرونجی	۱۸۶
۴۸	عاصم شہنواز شبلی اور باغ صنوبر	انجم عظیم آبادی	۱۸۸
۴۹	عابدہ شیخ: گلشن رباعی کا نیا پھول	شاہینہ پروین	۱۹۰
۵۰	رباعیات انیس: ایک مطالعہ	عذرا انجم	۱۹۳
۵۱	کلیات رباعیات جوش: جوش شناسی کا نیا باب	حقانی القاسمی	۱۹۸

۵۲	دبستانِ لکھنؤ میں صنفِ رباعی کا آغاز وارتقاء: ایک اجمالی تعارف	مجتبیٰ حسن صدیقی	۲۰۱
۵۳	اردو کے غیر مسلم رباعی گو شعراء	خوشبو پروین	۲۱۳
۵۴	میرٹھ کے اہم رباعی گو شعراء: ایک جائزہ	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	۲۱۹
۵۵	صنفِ رباعی میں فلسفۂ لاادریت کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر عبدالحق امام	۲۲۸

تخلیق رباعیات

۵۶	رباعیات	مخمور کاکوروی	۳۸
۵۷	رباعیات	شاہ حسین نہری	۴۴
۵۸	رباعیات	پروفیسر عراق رضا زیدی	۵۲
۵۹	رباعیات	پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۶۲
۶۰	رباعیات	طہور منصوری نگاہ	۹۰
۶۱	رباعیات	ذکی طارق (غازی آباد)	۹۴
۶۲	رباعیات	اسلم حنیف	۱۰۱
۶۳	رباعیات	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۱۰۶
۶۴	رباعیات	سلیم سرفراز	۱۰۹
۶۵	رباعیات	محمد انور ضیاء	۱۲۵
۶۶	رباعیات	ڈاکٹر فرحت نادر رضوی	۱۲۸
۶۷	رباعیات	اعجاز مانپوری	۱۳۱
۶۸	رباعیات	فیضی سمبلپوری	۱۴۲
۶۹	رباعیات	فہیم بسمل،	۱۵۸
۷۰	رباعیات	ساجد عارفی خیرآبادی	۱۶۳
۷۱	رباعیات	ڈاکٹر ہارون رشید، لکھنؤ	۲۱۸
۷۲	رباعیات	معید رہبر	۲۲۷
۷۳	رباعیات	محسن عظیم انصاری، لکھنؤ	۲۴۷
۷۴	رباعیات	زیب النساء زیبی/مصباح انصاری	۲۴۸

حصہ سوم (رباعی: تبصرے)

۷۵	رباعیات قمر	از: قمر سیوانی	مبصر: صفدر امام قادری ۲۳۳
۷۶	آئینِ رباعیات	از: پروفیسر عراق رضا زیدی	مبصر: پروفیسر علیم اشرف خان ۲۳۵
۷۷	انسان (ایک موضوع پر مبنی، مستزاد رباعیات میں نظم)	از: مامون ایمن	مبصر: سومی پروین ۲۳۶
۷۸	سوغات	از: ظفر کمالی	مبصر: شاہد حبیب ۲۳۹
۷۹	رباعی تحقیق	از: ڈاکٹر امیر حمزہ	مبصر: شاہد حبیب ۲۴۰
۸۰	اشاریہ مجموعۂ رباعیات (اردو)		تحقیق وترتیب: تنویر اختر رومانی ۲۴۲
۸۱	مراسلہ		قارئین (ابوالفیض اعظمی) ۲۴۷

حمدیہ رباعیاں

پروفیسر مقبول احمد مقبول
اُودگیر-413517 ضلع لاتور (مہاراشٹر)

کس طرح ثنا کروں میں تیری مولا!
میں کیا ہوں؟ بساط کیا ہے میری مولا!
عاجز ہے زباں اور ہے کم زور قلم
ہے شان بڑی عظیم تیری مولا!

تو مالک ومعبود ہے، رب ہے رازق
دنیا کی ہر شے کا، ہے تو ہی خالق
جتنے بھی اطبّا ہیں، ذریعہ ہیں فقط
ہے تو ہی یا خدا! طبیب ِحاذق

دنیا میں کوئی شے نہیں ایسی مولا!
پڑھتی نہ ہو تسبیح جو تیری مولا!
اشجار، ہوا، ارض وسما، شمس وقمر
کرتے ہیں بیاں تیری بڑائی مولا!

تو خالق و رازق ہے، تو آقا، مالک!
رکھتا ہوں تجھی پر میں بھروسا مالک!
جو کچھ ہے جہاں میں وہ ہے تیرا بے شک
ہر چیز کا یارب! تو ہے تنہا مالک!

ہر سمت، میں نے تیرا کرشمہ دیکھا
سب میں، تری صنعت کا جلوہ دیکھا
شہکارِ عظیم ہے، تری ہر تخلیق
ذرے میں بھی قوت کا ذخیرہ دیکھا

پھولوں کو عطا کی ہے کیا خوب مہک
بخشی ہے ستاروں کو بھی اک طرفہ چمک
اے نورِ ازل! تجھی سے روشن ہے جہاں
ہے تیرے ہی پرتو سے ہر شے پہ دمک

دریا، صحرا، پہاڑ، سبزہ دیکھا
ہر سُو، تری قدرت کا جلوہ دیکھا
بے شک ہے تو ہی خالق وحاکم یا رب!
ہر شے پہ میں نے تیرا ہی غلبہ دیکھا

یہ نورِ آگہی، ہے بخشش تیری
یہ ذوقِ بندگی، ہے بخشش تیری
ہے راہِ زیست جس سے روشن یارب!
یہ ساری روشنی، ہے بخشش تیری

نعتیہ رباعیاں

عارف حسن خاں
(نیو فرینڈس کالونی، سول لائنس، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲)

دنیا میں ثانی انؐ کا کوئی نہیں
نبیوں میں بھی انؐ جیسا کوئی نہیں
ہے عالم میں سب سے بزرگ انؐ کی ذات
اللہ کے بعد انؐ سے بڑا کوئی نہیں

دل میں یہ تڑپ ہے کہ مدینے کو چل
طاقت نہیں پیروں میں تو چل سر کے بل
جب پیشِ نظر ہوگا ترے گنبدِ سبز
مل جائے گا ہر مشکل کا تجھ کو حل

محبوب مرا انؐ کے سوا کوئی نہیں
دنیا میں اور انؐ جیسا کوئی نہیں
اللہ بھی کرتا ہو محبت جس سے
دنیا میں بشر اور ایسا کوئی نہیں

ہر شے سے فزوں تر ہے مدینے کی خاک
ہاں مشک ہے، عنبر ہے مدینے کی خاک
پیوند اسی خاک کا ہو جا عارفؔ
گر تجھ کو میسّر ہے مدینے کی خاک

اعزاز ہمارا ہے غلامی انؐ کی
نصرت کا اشارہ ہے غلامی انؐ کی
آلام و مصائب میں، پریشانی میں
بیکس کا سہارا ہے غلامی انؐ کی

اب چین نہیں ہے مرے دل کو اِک پل
رہتی ہے عجب سی اِک دل میں ہلچل
چین آئے گا اب مجھ کو پہنچ کر کے وہیں
اللہ مجھے پھر سے مدینے لے چل

لگتا ہی نہیں سارے عالم میں من
ہوتی ہے سینے میں میٹھی سی چبھن
آتی ہے جب گنبدِ خضرا کی یاد
تب دل میں جلتی ہے برہا کی اگن

مت پوچھو کہ اُن آنکھوں نے کیا کیا دیکھا
یوں سمجھو کہ فردوس کا جلوہ دیکھا
دیکھا وہاں انوارِ الٰہی کا نزول
جن آنکھوں نے سرکارؐ کا روضہ دیکھا

نظریہ



لمبے انتظار کے بعد سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ کا خصوصی شمارہ "رباعی نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس پر ہم اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہیں۔ اور اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ رباعی دراصل شاعری کی وہ صنف ہے جو متشاعروں کی دسترس سے ہمیشہ دور رہی۔ اس لیے جس وقت رباعیات پر خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا، علم تھا کہ کم ہی لوگ اس موضوع پر مضمون تحریر کریں گے ایسا میرا اپنا خیال تھا اور ہوا بھی وہی، فن رباعیات پر بمشکل مضامین دستیاب ہوئے جبکہ شخصی مضامین اتنی تعداد میں آئے کہ رسالے کی ضخامت بڑھانے کے بعد بھی مضامین کا انتخاب کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ رسالہ کو حتمی شکل دینے کے بعد بھی کئی مضامین موصول ہوئے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ جن قلمکاروں کے مضامین اشاعت سے محروم رہ گئے ہیں، ان کو آنے والے شماروں میں جگہ دی جائے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رباعی اردو شاعری کی مشکل صنف ہے، اسی لیے رباعی گو شعراء کی تعداد کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کی رباعی کو جتنا مشکل فن کہا جاتا ہے اتنا ہے نہیں۔ شاعری کے لیے عروض سے واقف ہونا ضروری ہے اور جو عروض کا جاننے والا ہوگا وہ رباعی بھی کہہ سکتا ہے جس کی شرط اوزان سے واقفیت ہے۔ ظاہری بات ہے جو عروض جانتا ہی نہیں یا تھوڑی بہت شد بد رکھتا ہے اس کے لیے تو یہ مشکل فن ہے ہی۔ حالانکہ یہ دریا کو کوزے میں سمیٹنے والی صنف ہے اور خاصے کی چیز ہے۔

عربی زبان میں لفظ ربع یا رباع کے معنی ہوتا ہے چار۔ اسی سے بنا ہے رباعی اور اس کی جمع ہے رباعیات۔ اسی وجہ سے اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ انھیں چار مصرعوں پر مشتمل نظم کو رباعی کہتے ہیں۔ اس میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور چوتھے مصرعے میں خیالات کی تکمیل اور رباعی کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔ اگرچہ تیسرا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو تو کوئی عیب نہیں۔ روایتی عروض کی روشنی میں رباعی کے ۲۴ اوزان مقرر ہیں جو کہ بحرِ ہزج سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض علماء نے ان اوزان میں مزید اضافے کیے ہیں اور وہ کہاں تک درست ہیں، اس کے بارے میں ماہرین عروض ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مولف غیاث کے مطابق ''رباعی کا وزن خاص لا حول ولا قوت الاّ باللہ (مفعول مفاعیلن مفعولن فاع) ہے اگر اس وزن میں نہ ہو تو قطع کہیں گے لیکن یہ تعریف جامع نہیں کیوں کہ رباعی کے چوبیس اوزان بنیادی ہیں اور انھیں میں ایک وزن لاحول ولا قوت الاّ باللہ ہے''۔ رباعی گو کے لیے افکار کی بلندی، بیان کی دلکشی اور مضمون کی انفرادیت کے ساتھ چوتھے مصرعے میں پرزور تکمیل کی خاص پاسداری رکھنی ہوتی ہے۔ جس رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہو اس رباعی کو خصی کہتے ہیں جو ابتداء سے آج تک رائج ہے جبکہ جس رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں اسے غیر خصی رباعی کہتے ہیں۔

رباعی کو ترانہ، دوبیتی، چہار مصرعی بھی کہا جاتا ہے۔ رباعی کے موجد فارسی شاعر رودکی کو بتایا گیا ہے مگر رباعی کا آغاز کیسے ہوا اس کی الگ کہانی ہے۔ ادبی نشیمن کے اس خاص شمارے میں شامل مضامین کے مطالعہ سے اس کہانی کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں دکنی شاعر میر عبدالقادر کو بعض محققین پہلا رباعی گو قرار دیتے ہیں جبکہ عبدالقادر سے قبل دکنی شعراء قلی قطب شاہ اور ملا وجہی اردو میں رباعی کی ابتدا کر چکے تھے یعنی رباعی کی ابتداء بھی دکن سے ہی ہوئی۔ آگے چل کر تقریباً سبھی کلاسیکی شعراء نے رباعیاں کہیں۔ میر، مصحفی، انشاء، سودا، انیس، جرأت، مومن، غالب، حالی، اکبر، اقبال، جوش، فراق، جگت موہن لال رواں، امجد حیدرآبادی، یگانہ چنگیزی، شفیق جونپوری، فانی بدایونی وغیرہ نے رباعی کو پروان چڑھایا۔ ہمارے عہد میں بھی بعض نئے اور پرانے شعراء رباعی میں طبع آزمائی کر رہے ہیں ان کی تعین قدر کے لیے ادبی نشیمن کا یہ خصوصی شمارہ محققین کے لیے ایک اہم ماخذ ثابت ہوگا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ کوئی بھی قابل ذکر رباعی گو شاعر چھوٹنے نہ پائے۔ سید ظفر ہاشمی اور ناوک حمزہ پوری کی ادارت میں شائع دوماہی گلبن (احمد آباد) کے رباعی نمبر (جنوری تا اپریل ۱۹۹۶) کے بعد اختر بارک پوری اور فراغ روہوی کی ادارت میں دوماہی دستخط (کلکتہ) کا رباعی نمبر جنوری تا دسمبر ۲۰۰۱ میں نکلا تھا جو تخلیقی نگارشات کو اولیت دے رہا تھا۔ مارچ-اپریل ۲۰۱۸ میں ماہنامہ پیش رفت، دہلی نے "امامِ رباعیات: امجد حیدرآبادی" کے عنوان سے ۱۱۲/صفحات پر مشتمل ایک خاص نمبر نکالا تھا اور پھر حافظ کرناٹکی صاحب کی ایماء اور مالی تعاون سے ماہنامہ شاعر ممبئی نے جولائی ۲۰۱۹ میں ۶۶/صفحات پر مشتمل "رباعی نمبر" نکالا تھا۔ یوں ایک وقفے کے بعد کسی معتبر رسالے کا رباعی کے حوالے سے کوئی خصوصی شمارہ نکل رہا ہے تو اس میں ہمیں لازمی طور سے اس فریضے کی ادائیگی کرنی تھی۔ اپنے پیش رو خصوصی رسالوں کے برخلاف ہم نے رباعی گو شعراء کے تجزیاتی مطالعے پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، اس لیے اس میں تخلیقی حصہ کم اور مضامین کا حصہ زیادہ ہے۔ ادبی نشیمن کے گذشتہ خاص شماروں کی طرح اس نمبر کو بھی ہم نے ہر ممکن بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کسی کوشش میں تکرار سے بچنا تقریباً محال ہوتا ہے پھر بھی ہم نے سعی کی ہے کہ حتی الامکان تکرار سے بچا جائے۔ خامی انسانی فطرت ہے تو اس کوشش میں بھی کمیوں کا در آنا کوئی بعید نہیں۔ آپ بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی قیمتی آراء سے مطلع فرمائیں، آپ کی تنقید، مشوروں اور تجاویز کا خیر مقدم ہے کیونکہ ہم اس سے سیکھتے ہیں اور رسالے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

افسوس کہ معروف شاعر، صحافی اور ماہنامہ لاریب لکھنؤ کے مدیر رشید قریشی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر اور معروف وکیل ظفر یاب جیلانی، مشاعروں کے اسٹیج کی کامیاب ترین شاعرہ ڈاکٹر نسیم نکہت اور معروف ادیب ابولیث جاوید اس فانی دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ ان کے انتقال پر ملال پر ادبی نشیمن کنبہ انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے غریق رحمت ہونے کی دعا کرتا ہے۔ اللہ پاک تمام ہی مرحومین کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین۔

اب رسالہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ استفادہ کریں اور اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

Centre of Indian Languages
School of Language, Literature and Culture Studies
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
New Delhi - 110 067 India

سینٹر آف انڈین لینگویجز
اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔انڈیا

Prof. Khwaja Md. Ekramuddin
Tel: +91-11-26704295 (M) + 91-9717977743
E-mail: ekramuddin@mail.jnu.ac.in , khwajaekram@gmail.com

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

اہم ادبی کاوش

رباعی اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ ہیئتی اعتبار سے اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ انہی چار مصرعوں کی مدد سے ایک مکمل مضمون یا خیال مسلسل اور مربوط طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اردو کی دوسری اصناف کی طرح رباعی بھی فارسی کے تتبع میں شروع ہوئی۔ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرا مصرعہ بے قافیہ ہوتا ہے لیکن ایسی بھی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ رباعی کے لیے بحر و وزن مخصوص کیے گئے۔ رباعی کی بحر عام طور پر مشکل سمجھی جاتی ہے اس لیے صنف رباعی پر طبع آزمائی کرنے والے کم ہیں۔ تقریباً تمام قدیم وجدید شعرا کے یہاں رباعی مل تو جائے گی مگر انھوں نے بہت کم رباعیاں لکھی ہیں یا کہیں کہ اس صنف میں بھی محض مشق سخن کا ہنر دکھایا ہے۔ اردو کی شعری روایت یہ رہی ہے کہ مروجہ تمام اصناف پر شعرا نے طبع آزمائی کہ مگر صرف اس لیے کہ وہ اس صنف میں بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو کئی صدیوں پر محیط اردو شاعری کی تاریخ میں قلیل تعداد ہی ایسے شعرا کی ہے جنھوں نے صنف رباعی کو اپنا میدان فکر و فن بنایا ہے۔

یہی وجہ رہی ہے کہ صنف رباعی پر بہت کم تنقیدی و تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ رسائل و جرائد میں بھی اس صنف پر مضامین کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ایسے میں سہ ماہی "ادبی نشیمن" کا یہ رباعی نمبر واقعی ایک اہم ادبی کاوش ہے۔ اس شمارے میں بہت ہی اہم مضامین شامل ہیں۔ عصری منظر نامے میں جن کی تحریروں کو استناد حاصل ہے، وہ کہکشاں یہاں موجود ہے۔ یہ بھی اس شمارے کی بڑی کامیابی ہے۔ میں پوری ادارتی ٹیم اور انتظامیہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(خواجہ محمد اکرام الدین)

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
A Central University under Ministry of Education
Government of India

Prof. Shamshul Hoda
Head
Email: drhodamanuu@gamil.com

شعبۂ اردو
Department of Urdu

پروفیسر شمس الہدیٰ
صدر
Mob- 9032520784

بخدمت گرامی قدر جناب ڈاکٹر سلیم احمد صاحب!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ کے رباعی نمبر کی اشاعت کی اطلاع پا کر بیحد مسرت ہوئی۔ فارسی رباعیات کو حضرتِ عمر خیام کی ریاضت نے چہار دانگ عالم میں معروف ومقبول بنا دیا۔ اردو رباعیات نے بھی جس طرح کی فلسفیانہ اور حکیمانہ موضوعات کے ساتھ ساتھ دیگر مسائلِ حیات اور مباحثاتِ کائنات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہوئی ہے، اس کا تقاضا تھا کہ اردو رباعیات کا تعارف بھی اس کے شایانِ شان چہار دانگ عالم میں ہو۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حافظ محمود شیرانی، سیدہ جعفر، عادل اسیر دہلوی، ناوک حمزہ پوری، محمد ارشاد اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے بشمول ہمارے ناقدین نے اس سلسلے میں کئی معرکے سرانجام دیئے ہیں۔ نوجوان محققین نے بھی اس جانب بطورِ خاص توجہ کی ہے جس کی وجہ سے ہماری جامعات سے بھی رباعیات کے حوالے سے قابلِ قدر تحقیقات سامنے آرہی ہیں۔ پچھلی تین دہائیوں کے دوران کئی قابل ذکر رسائل کے خصوصی شمارے منظر عام پر آئے ہیں، جس میں دو ماہی رسالہ گلبن (احمد آباد)، دو ماہی دستخط (کلکتہ) اور ماہنامہ شاعر (ممبئی) کے نام اہم ہیں۔ ان سب کوششوں کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ اردو رباعیات کے تعارف وتحقیق کو لے کر ہمارے ذکر وفکر میں اور بھی باریک بینی اور شدت آنی چاہیے۔ سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ آپ کی ادارت میں اس ذکر وفکر کی شمع کو تیز تر کرنے میں ایک لَو کا اور اضافہ کر رہا ہے، یہ مستحسن بھی ہے اور حوصلہ افزاء بھی۔ امید ہے ادبی نشیمن کے اس ضخیم خصوصی شمارے کی اشاعت کے بعد ہمارے رباعی گو شعراء کی اپنی ناقدری کے احساس میں کمی آئے گی کہ آپ نے تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر رباعی گو شعراء کے احاطے کی شعوری کوشش کی ہے۔ میں اپنی طرف سے اور شعبہء اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے آپ کی اس کوشش کی ستائش کرتا ہوں اور آپ کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی امید کرتا ہوں کہ آپ ادبی نشیمن کے ذریعے آگے بھی ایسے ہی کارنامے سرانجام دیتے رہیں گے۔

شکریہ

خیر اندیش

8/7/2023

(پروفیسر شمس الہدیٰ)

صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

انجمن ترقی اُردو (ہند)

अन्जुमन तरक्क़ी उर्दू (हिन्द) ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)

General Secretary
Dr Ather Farouqui

جنرل سکریٹری
ڈاکٹر اطہر فاروقی

4 جولائی 2023

محترمی ومکرمی ڈاکٹر سلیم احمد صاحب!

تسلیمات!

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ کا رباعی نمبر منظر عام پر آرہا ہے۔ رسالے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ رباعی کے فن اور اس کی تحقیق وتنقید سے متعلق علمی و تحقیقی مضامین اس میں شامل ہیں۔ صنف رباعی کو مشرقی ادبیات میں ایک اہم مقام حاصل ہے اور ہمارے ادب میں بھی اسے مستقل صنف کی حیثیت حاصل ہے، اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ رباعی گو شعراء کی خدمات کا اعتراف کما حقہ نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ غزل گو، نظم گو، قصیدہ گو اور مرثیہ گو شعراء کو مستقل طور پر قبول کیا گیا ہے۔ امجد حیدر آبادی (1888–1961) اور جگت موہن لال رواں (1889–1934) جیسے رباعی گو شعراء کے حوالے سے مختلف تحریریں لکھ کر مولوی عبد الحق صاحب نے اس سلسلے میں قابل قدر کوششیں کی تھیں۔ اس کے بعد کئی رسائل نے بھی رباعی پر مختص خصوصی شمارے نکالے۔ مگر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے رباعی گو شعراء کی کثیر تعداد کی خدمات کا احاطہ رسائل کے چند نمبرات نکال کر ممکن نہیں۔ اس حوالے سے مزید ٹھوس کوششیں درکار ہیں۔ سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ کا یہ رباعی نمبر ان کوششوں کے احاطے کی سمت میں ایک مستحسن قدم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی نشیمن کا یہ نمبر رباعی گوئی کی تنقید وتحقیق کی تاریخ میں ایک سنگ میل کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ آپ کی مساعی کو سلام پیش کرتا ہوں اور آپ کی خدمات کا استقبال کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادبی نشیمن کا یہ خصوصی شمارہ قارئین میں مقبولیت حاصل کرے گا۔ شکریہ

مخلص

(اطہر فاروقی)

سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

URDU GHAR, Urdu Ghar Marg, 212, Rouse Avenue, New Delhi - 110002 (India), Ph: 0091-011-23237722
E-mail: farouqui@yahoo.com, Website: www.atuh.org

حصہ اول

رباعی: فن و تاریخ

رباعی اور اس کے اوزان

ڈاکٹر اختر ریاض
(شوشانت گولف سٹی، لکھنؤ۔ موبائل:9918226052)

رباعی، عربی لفظ ''رباع'' کے آگے یائے نسبتی بڑھا کر بنایا گیا ہے جس کے لغوی معنی چار۔چار کے ہیں۔ اصطلاحاً رباعی سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جبکہ تیسرا بے قافیہ۔ لیکن اگر تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہو تو اسے افضل سمجھا جاتا ہے۔ رباعی کے قافیے مردف بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مردف بھی۔ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے اصطلاحاً ''مصرّع'' کہلاتے ہیں اور تیسرا بے قافیہ ہونے کے سبب ''خصّی'' کہا جاتا ہے۔ ایسی رباعی جسکے چاروں مصرعے مقفیٰ ہوں اسے ''غیر خصّی'' کہتے ہیں۔ لیکن اس ظاہری ہیئت کی بنا پر ہم اسے رباعی نہیں کہہ سکتے بلکہ رباعی کی صنفی شناخت اس کے مخصوص اوزان سے ہوتی ہے جو کہ بحر ہزج سے مستخرج ہیں۔ رباعی کا ابتدائی نام ترانہ تھا۔ ایک مطلع اور ایک شعر کی وجہ سے اسکا نام دوبیتی بھی رہا ہے۔ چار مصرعوں کے سبب اسے چہار مصراعی بھی کہا گیا ہے۔

جہاں تک رباعی کے اوزان کے استخراج کا سوال ہے اس سلسلے میں کئی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں۔ صاحب معیار البلاغت نے صفحہ ۱۰۸-۱۰۷ پر لکھا ہے کہ رباعی جسکو ترانہ اور دوبیتی اور جفتی اور چار مصراعی بھی کہتے ہیں، متفق الوزن والقوافی ہیں اور اس کا موجد رودکی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ رودکی ایک روز راہ میں چلا جا رہا تھا، دیکھا کہ امیر یعقوب بن لیث صفار کا بیٹا جوز کو گوچی میں ڈالنا چاہتا ہے۔ ایک بار میں اس نے گوچی میں چھے جوز ڈال دئے اور ایک دور جا پڑا لیکن وہ بھی لڑھک کر گوچی میں جا پڑا۔ لڑکا خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا ''غلطاں غلطاں ہمے رود تا بن گو''۔ رودکی کو یہ کلمات بہت فصیح لگے اور غور کیا تو اسے بحر ہزج (مفعولن فاعلن مفاعیلُ فَعَلْ) میں موزوں پایا اور اسی وقت اس نے تین مصرعے اس پر اور کہے۔ جب رودکی کی یہ رباعی مشہور ہوئی تو اور شاعروں نے بھی اس میں طبع آزمائی کی اور رفتہ رفتہ یہ آہنگ اپنی موسیقیت کی بنا پر اس قدر مقبول ہوا کہ اسے ترانہ کہنے لگے۔ پھر اس نے اس وزن سے چوبیس اوزان اختراع کئے۔ تذکرۂ دولت شاہ میں بیان ہے کہ یعقوب بن صفار کا بیٹا عید کے دن لڑکوں کے ساتھ جوز بازی کرتا تھا۔ امیر بھی اس کے پاس کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ امیر زادے نے جوز گوچی کی طرف پھینکے جن میں سے سات گوچی میں چلے گئے لیکن ایک اچھل کر باہر آ گیا۔ امیر زادہ ناامید ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی لڑھک کر گوچی میں چلا گیا۔ فرط خوشی سے اس کے منھ سے یہ الفاظ نکلے ''غلطاں غلطاں ہمے رود تا لبِ گو''۔ یعقوب کو یہ کلام پسند آیا اور حکم دیا کہ اس کو جانچیں کہ یہ کس بحر میں ہے۔ ابودلف اور زینت الکعب نے اس کی تقطیع کی تو اس کو بحر ہزج میں موزوں پایا اور ایک مصرع اس کے ساتھ لگا دیا۔ پھر ایک اور بیت بڑھا کر اسکو دوبیتی بنا دیا اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ بعد میں یہ نام موقوف کر کے اس کا نام رباعی رکھ دیا گیا۔ ابن قیس نے المعجم میں لکھا ہے کہ اس کو ترانہ اس لئے کہتے ہیں کہ ارباب موسیقی نے اس وزن پر اچھے اچھے راگ بنائے ہیں اور صرف اشعار کے لحاظ سے دوبیتی کہتے ہیں کیونکہ اس میں دو بیت سے زیادہ نہیں اور عرب مستعربہ اس کو رباعی کہتے ہیں کیونکہ یہ بحر ہزج میں ہے۔ ابن قیس نے یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ امام حسن قطان نے چوبیس اوزان کے منضبط ہونے کے لئے دو شجرہ، شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم ایجاد کر کے انھیں لکھا۔ غرض کہ اس میں زحاف نو آتے ہیں۔ خرب، خرم، قبض، کفّ، ہتم، جبّ، بتر، شتر اور زلل اور اوزان مزاحف یا مزاحف و سالم باہم مرکب ہو کر بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں اور ان سب کا اجتماع جائز ہے۔ لیکن قطان کا یہ کہنا مناسب نہیں کیونکہ رودکی کے اوزان رباعی میں صرف چھے زحاف خرب، قبض، کفّ، جبّ، ہتم اور تخنیق کے عمل سے مروجہ چوبیس اوزان تشکیل پاتے ہیں۔ مؤلف غیاث کا کہنا ہے کہ رباعی کا وزن خاص لاحولُ ولاقوت الاّ باللہ (مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاعُ) ہے۔ اگر اس وزن میں نہ ہو تو قطع کہیں گے لیکن یہ تعریف جامع نہیں کیونکہ رباعی کے چوبیس اوزان ہیں اور انھیں میں ایک وزن لاحولُ ولا قوت الاّ باللہ ہے۔

ان تمام طول کلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کے ذہن میں رباعی کی تاریخی وفنی حیثیت واضح ہوجائے۔ بہرکیف! زیادہ تر علما کا خیال ہے کہ رباعی کا موجد رودکیؔ ہے جسکی بنیاد اس نے غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو /گور (مفعولن فاعلن مفاعیلُ فَعَلْ/فعولْ) پر رکھی لیکن یہ مصرع بحر رجز مثمن، بحر رمل مثمن، بحر منسرح مثمن، بحر عمیق مثمن اور بحر ہزج مثمن میں بھی ڈبویا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ بحر رجز مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْ	غَلْطَاْ	ہَمِیْ رَوَدْ	تَاْلَبِ گُو
فعْلن	فعْلن	مفاعلن	مفتَعِلن
مرفوع مخبون مسکن	مرفوع مخبون مسکن	مخبون	مطوّی

۲۔ بحر رمل مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْغَلْ	طَاْہَمِیْ رَ	وَدْتَاْلَ	بِ گُوْ
مفعولن	فاعلاتُ	مفعولُ	فَعَلْ
مخبون مسکن	مکفوف	مشکول مسکن	مربوع

۳۔ بحر منسرح مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْغَلْ	طَاْہَمِیْ رَ	وَدْتَاْ	لَبِ گُوْ
مفعولن	فاعلاتُ	فعْلن	فعِلن
مطوّی مسکن	مطوّی	مرفوع مخبون مسکن	مخبول مکشوف

۴۔ بحر عمیق مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْ	غَلْطَاْہَ	مِیْ رَوَدْ	تَاْلَبِ گُوْ
فعْلن	مفعولُ	فاعلن	فاعلاتن
مخبون مسکن	مشکول مسکن	سالم	سالم

۵۔ بحر ہزج مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو/گور

غَلْطَاْغَلْ	طَاْہَمِیْ	رَوَدْتَاْلَ	بِگُوْ/ بِگُوْرْ
مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فَعَلْ/فعولْ
اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب/اہتم

رودکیؔ نے جب بحر ہزج مثمن مزاحف کے آہنگ پر غور کیا تو اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ فاعلن جو مذکورہ وزن کے حشو میں نظر آرہا ہے وہ یہاں اشتر ہوکر نہیں آیا ہے بلکہ تخنیق کے عمل سے وجود میں آیا ہے کیونکہ زحاف شتر صدر وابتدا سے مخصوص ہے۔ اس لئے رودکیؔ نے بحر ہزج مثمن پر غور کرکے دو آہنگ ایجاد کئے جسکا پہلا رکن اخرب، دوسرا رکن مکفوف/مقبوض، تیسرا رکن مکفوف اور چوتھا رکن مجبوب/اہتم ہوتا ہے۔

۱۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فَعَلْ/فعولْ
اخرب مکفوف مکفوف مجبوب/اہتم

۲۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَلْ/فعولْ
اخرب مقبوض مکفوف مجبوب/اہتم

ان دو بنیادی اوزان پر رودکیؔ نے زحاف تخنیق، اصول معاقبہ اور سبب پئے سبب است اور وتد پئے وتد است[1] سے چوبیس اوزان ایجاد کئے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر رودکیؔ نے رباعی کو بحر ہزج سے ہی کیوں منسوب کیا، دوسری بحروں سے کیوں نہیں جبکہ اس کے اوزان دوسری بحروں میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔ اسکی کئی وجہیں نظر آتی ہیں:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ تخنیق کے عمل سے بحر ہزج سے جو آہنگ یا اوزان حاصل ہوتے ہیں وہ کسی دوسری بحور کے مزاحف آہنگ سے حاصل نہیں ہوتے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رودکیؔ نے رباعی کے جو چوبیس اوزان ایجاد کئے وہ سبب پئے سبب است اور وتد پئے وتد است کی ترتیب سے وجود میں آتے ہیں اور معاقبہ کا عمل بھی کارفرما ہے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اوزان رباعی کے اخراج میں صرف چھے زحاف۔ خرب، قبض، کفّ، جبّ، ہتم اور تخنیق کا ہی عمل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ عروضی اپنی لاعلمی کی وجہ سے رباعی کی ایجاد میں مفعولن کو اخرم، فاعلن کو اشتر، فَعْ کو ابتر اور فَاْ کو ازل تصور کرتے ہیں جو کہ صحیح نہیں کیونکہ:

۱۔ یہ حضرات زحاف بتر کو جبّ اور خرم کا اجتماع سمجھتے ہیں جو کہ غلط ہے کیونکہ خرم صدر وابتدا سے مخصوص ہے اور جبّ عروض وضرب سے۔ لہٰذا دونوں کا اجتماع ممکن نہیں۔

۲۔ مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان میں فاعلن کا حشو میں نظر آنا زحاف شتر کے سبب نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل تخنیق کا نتیجہ ہے کیونکہ زحاف

شتر صدر و ابتدا سے مخصوص ہے۔

۳۔ فَأ ع زلل نہیں بلکہ اسکو اہتم مخنق کہنا زیادہ مناسب ہے۔

انھیں وجوہات کی بنا پر رودکی نے رباعی کو بحر ہزج سے منسلک کیا۔

رودکی کے ایجاد کردہ بنیادی اوزان اس طرح ہیں:

بنیادی اوزان

۱	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَلْ/فعولْ
۲	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فَعَلْ/فعولْ

ان دو بنیادی اوزان (فَعَلْ اور فعولْ یعنی عروض وضرب کو الگ الگ شمار کریں تو چار بنیادی اوزان) پر تخنیق کے عمل سے کل چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلے بنیادی وزن پر عمل تخنیق سے برآمد سولہ اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب
۴۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب مخنق
۵۔	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب
۶۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب مخنق
۷۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولن	فَعْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب مخنق
۸۔	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فَعْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب مخنق

اور اسی طرح:

۹۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعولْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مکفوف	اہتم
۱۰۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعولْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	اہتم
۱۱۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولُ	فعولْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	اہتم
۱۲۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فَأ ع
	اخرب	مکفوف	مکفوف	اہتم مخنق
۱۳۔	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فعولْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	اہتم
۱۴۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلن	فَأ ع
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	اہتم مخنق
۱۵۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولن	فَأ ع
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	اہتم مخنق
۱۶۔	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فَأ ع
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	اہتم مخنق

اسی طرح دوسرے بنیادی وزن پر تخنیق کے عمل سے برآمد آٹھ اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب
۲۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب مخنق
۴۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب مخنق

اور اسی طرح:

۵۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعولْ
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم
۶۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعولْ

	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم	
۷۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلن	فَأَ ع	
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم مخنق	
۸۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فَأَ ع	
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم مخنق	

اس طرح ان دو بنیادی اوزان پر تخنیق کے عمل سے کل چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں اور یہی چوبیس اوزان رباعی کے مخصوص روایتی اوزان ہیں اور اگر ہم مذکورہ بالا اوزان پر غور کریں تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بارہ اوزان مفعولُ سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ اوزان مفعولن سے۔ رباعی کی شرط بھی یہی ہے کہ رباعی کے ہر وزن کے صدر و ابتدا میں مفعولُ یا مفعولن کا آنا لازم ہوگا۔ نیز اس میں سبب کے بعد سبب اور وتد کے بعد وتد از روئے معاقبہ ہوگا ورنہ وہ وزن رباعی کا وزن نہیں ہوگا۔

رودکی کے ایجاد کردہ اوزان کو دیکھ کر سب سے پہلے علامہ سحر عشق آبادی کو یہ احساس ہوا کہ حشو میں مقبوض رکن مفاعلن پر تو معاقبہ کا عمل کیا گیا ہے اور اس کے تحت مفاعلن کی جگہ مکفوف رکن مفاعیلُ رکھا گیا ہے لیکن حشو دوم پر معاقبہ کا عمل نہیں کیا گیا ہے اور ایسا نہ کرنے کا کوئی معقول جواز بھی نہیں ہے۔ مفاعلن (مقبوض) اور مفاعیلُ (مکفوف) دونوں عام زحافات کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا علامہ نے دو مزید رباعی کے اوزان اس طرح قائم کئے:

بنیادی اوزان

۱	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فَعَلْ/فعولُ
۲	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فَعَلْ/فعولُ

ان دو بنیادی اوزان (عروض و ضرب کو الگ الگ شمار کریں تو چار بنیادی اوزان) پر عمل تخنیق سے مزید بارہ اوزان حاصل کئے جا سکتے ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلے بنیادی وزن پر عمل تخنیق سے حاصل ہونے والے آٹھ اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض	مجبوب
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعیلن	فاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	مجبوب
۴۔	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	مجبوب

اور اسی طرح:

۵۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فعولُ
	اخرب	مکفوف	مقبوض	اہتم
۶۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	فعولُ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض	اہتم
۷۔	مفعولُ	مفاعیلن	فاعلن	فعولُ
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	اہتم
۸۔	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فعولُ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	اہتم

دوسرے بنیادی وزن پر تخنیق کے عمل سے حاصل ہونے والے چار اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض	مقبوض	مجبوب
۲۔	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعولُ
	اخرب	مقبوض	مقبوض	اہتم
۴۔	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فعولُ
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	اہتم

اس طرح رباعی کے اوزان کی مجموعی تعداد چھتیس (۳۶=۱۲+۲۴) ہو جاتی ہے۔ رباعی میں ان تمام اوزان کا خلط آئین عروض کے عین مطابق ہے۔

علامہ کے بعد زار علامی نے رباعی کے ان چھتیس اوزان میں مزید اٹھارہ اوزان کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے رکن مفعولُ (اخرب) کی جگہ فاعلن (اشتر) رکھنے کی سفارش کر کے مزید اٹھارہ اوزان کا اضافہ کر کے کل

رباعی کے اوزان کی تعداد چوّن بتائی ہے۔لیکن یہ کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ رباعی کا رکن اول (صدر وابتدا) ہمیشہ اخرب ہی ہوتا ہے۔اس کی جگہ رکن اشتر لانا کسی طرح درست نہیں۔زحاف شتر کا استعمال رباعی میں ممکن ہی نہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ ان تمام چھتیس اوزان کا خلط رباعی میں جائز ہے۔یعنی رباعی کے چاروں مصرعے کسی ایک یا زیادہ سے زیادہ چار مختلف اوزان میں ہوسکتے ہیں۔شمس الدین فقیرؔ اور عارفؔ حسن خاں نے اپنی چھے رباعیوں اور شمس الرحمن فاروقی نے اپنی نو رباعیوں میں رودکیؔ کے تمام اوزان یعنی چوبیس اوزان کو سمو دیا ہے۔

ان تمام چھتیس اوزان کو قارئین کے لئے یاد رکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ قارئین اگر چند بنیادی باتیں یاد رکھیں تو اس وزن میں ان سے غلطی ہونے کے امکانات بہت کم ہوں گے:

۱۔رباعی میں کل مصرعوں کی تعداد چار ہوتی ہے۔یعنی رباعی کی بحر ہمیشہ مثمن ہوگی مسدس یا مربع نہیں۔

۲۔رباعی کا ہر ایک مصرع چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر مصرعے میں ماترائیں بیس ہوں گی یا اکیس۔نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

۳۔رباعی کے ہر وزن کے صدر وابتدا میں یا تو مفعولُ آئیگا یا مفعولن۔

۴۔رباعی کے عروض وضرب میں ہمیشہ فَعْ،فَاْعْ،فَعَلْ اور فعولْ میں سے ہی کوئی آئے گا۔

۵۔عروض وضرب میں اگر فَعْ یا فَعَلْ ہے تو ماترائیں بیس ہوں گیں اور اگر فَاْعْ یا فعولْ ہے تو اکیس۔

۶۔رباعی کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر رکن کا آخری جز سبب ہے تو اس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا جز بھی سبب ہوگا اور اگر رکن کا آخری جز وتد ہے تو آنے والے رکن کا پہلا جز بھی وتد ہوگا۔وہ وتد مجموع بھی ہوسکتا ہے اور وتد مفروق بھی۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔صرف وتد ہونا چاہئے۔

رباعی کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ رباعی از سوداؔ (رودکیؔ کے اوزان میں)

ایوانِ عدالت میں تمھارے اللہ	کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤں	پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اِیْوَانِ/عَدَالَتْ مِ/تُمْہَارِیْ اَلْ/لَاہْ	کَاظُلْمْ/کُہِیْ دَخْلْ/عَیَاذَنْ بِلْ/لَاہْ
مفعولُ/مفاعیلُ/مفاعیلن/فَاْعْ	مفعولُ/مفاعیلُ/مفاعیلن/فَاْعْ
شِیْشِیْ کَ/جُوْاَطَاقْ/سِ رَپْٹِیْ ہَے/پَاْوْ	پَتْتَرْ سِ/نِکْلَتِیْ ہَ/صَدَاْ بِسْمِلْ/لَاہْ
مفعولُ/مفاعیلُ/مفاعیلن/فَاْعْ	مفعولُ/مفاعیلُ/مفاعیلن/فَاْعْ

۲۔رباعی از عارف حسن خاں (علامؔ کے اوزان میں)

کچھ کر تو ایسا جس کی نہ ہو مثال	دنیا کہے سب یہی ترا یہ ہے کمال
ہوگی تری فتح رکھ یقیں یہ دل میں تو	لگ جا ہمت تو کر ارے سپر نہ ڈال

کُچْ کَرْ تُوْ/اَیْسَاْ جِسْ/کِیْ نَہُوْ/مِثَالْ	دُنْیَاْ کَ/کِہِ سَبْ یَہِیْ/تِرَاْ یِہَ/کَمَالْ
مفعولن/مفعولن/فاعلن/فعولن	مفعولُ/مفاعلن/مفاعلن/فعولن
ہُوْ گِیْ تِ/رِفْتَحْ رُکْ/یَقِیْنْ دِلِ/مِتُوْ	لَگْ جَاْ ہِمْ/ہَتْ تُکَرْ/اَرِیْ سِپَرْ/نَ ڈَاْلْ
مفعولُ/مفاعلن/مفاعلن/فَعَلْ	مفعولُ/فاعلن/مفاعلن/فعولن

۳۔رباعی از عارف حسن خاں (رودکیؔ اور علامؔ کے خلط اوزان میں)

ہے میرؔ حقیقت میں شاعروں کا میر	ہو شاہ سخن کا، یا پھر کوئی فقیر
جس نے بھی پڑھا میرؔ کو دل سے اک بار	تا زیست رہا عارفؔ وہ اس کا اسیر

ہَے مِیْرْ/حَقِیْقَتْ مِیْ/شَاْعِرْ وْ/کَ مِیْرْ	ہُوْ شَاْہْ/سُخَنْ کَاْ یَاْ/پِرْ کُوْ ءِ/فَقِیْرْ
مفعولُ/مفاعیلن/فاعلن/فعولن	مفعولُ/مفاعیلن/مفعولُ/فعولن
جِسْنِیْ بِ/پَڑَاْمِیْرْ/کَدِلْ سِیْ اِکْ/بَاْرْ	تَاْزِیْسْ/رَہَاْعَاْرِفْ/وَہْ اِسْکَ/اَسِیْرْ
مفعولُ/مفاعیلُ/مفاعیلن/فَاْعْ	مفعولُ/مفاعیلن/مفعولُ/فعولن

اس رباعی کا پہلا مصرع علامؔ کے وزن میں ہے جبکہ باقی مصرعوں کے اوزان رودکیؔ کے اوزان میں ہیں۔

حاشیہ:۱۔سبب پے سبب است اور وتد پے وتد است کا تعلق ماقبل رکن کے آخری جز واولیٰ اور مابعد رکن کے اولین جز واولیٰ سے ہے۔یعنی اگر پہلے رکن کا آخری جز وسبب یا وتد ہے تو اس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا جز وبھی سبب یا وتد ہونا ضروری ہے۔یہاں اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ وہ وتد مجموع ہے یا وتد مفروق۔صرف وتد ہونا چاہئے۔

☆☆☆

رباعی: فن اور امکانات

حافظ کرناٹکی
(شیموگہ، کرناٹک۔ موبائل:9535646077)

رباعی اردو اصناف شاعری میں سے ایک ہے۔ اور کہنا چاہیے کہ آج کی مقبول صنف شاعری ہے۔ رباعی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ چار کے ہے۔ شاعرانہ اصطلاح میں رباعی اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم رباعی کو مختصر نظم بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کی صنفی وضاحت کے لیے اس طرح کہنا مناسب ہوگا کہ رباعی اردو کی وہ مختصر صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان وحدت خیال اور تسلسل بیان کی پابندی ضروری ہے۔

غزل کی طرح رباعی بھی مردف اور غیر مردف دونوں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صرف قافیہ کا خیال رکھا جاتا ہے تو کبھی قافیہ اور ردیف دونوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ چوں کہ عربی شاعری میں ردیف کا رواج نہیں تھا اس لیے جب رباعی عربی سے فارسی میں آئی تو ابتدا میں بہت سارے فارسی شعرا نے بھی غیر مردف رباعیاں کہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ رباعی میں وزن کی تخصیص کے ساتھ ساتھ قوافی کی ترتیب کا بھی مخصوص نظام ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی کے تمام علمائے فن اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر تیسرے مصرعہ میں بھی قافیہ لایا جائے تو عیب نہیں ہے۔ بلکہ بعض قدیم شعرا کے نزدیک یہ مستحسن عمل ہے۔ فرمان فتحپوری کے مطابق ''لباب الالباب'' کے مؤلف محمد عوفی نے شعراء کا جو انتخاب دیا ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عنصری اور فرخی کے عہد تک بیشتر شعرا چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے۔ جیسا کہ اردو نظم کا قاعدہ ہے کہ اس میں تسلسل بیان ہو اور خیال کا بتدریج ارتقا ہو بالکل اسی طرح رباعی کے لیے بھی تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں، الفاظ و تراکیب کا انتخاب موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصوّر نہ کیا جا سکے۔ پہلے مصرعہ میں بطور تمہید کے مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کر دیا جائے۔ اور دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خط و خال کو نمایاں کیا جائے۔ اور چوتھے مصرعہ میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدّت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہو کر رہ جائے۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کی مسرت میں بصیرت بھی شامل ہو۔ فراق گورکھپوری نے اس کی وضاحت نہایت خوب صورتی سے ایک رباعی میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ؛

پہلے مصرعے میں حسن کا خط جبیں
اور دوسرے مصرعے میں لٹوں کی تزئیں
چوتھا ہونکلتا ہوا یوں تیسرے سے
جیسے بھیگی مسیں ہو ابرو سے حسیں

ایک بات اور ذہن میں رہنی چاہیے کہ رباعی دراصل ایک مختصر صنف شاعری ہے اس لیے اس میں یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کیے جائیں۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جب تک موضوع سے مطابقت و مناسبت رکھنے والے موزوں اسلوب بیان ہاتھ نہ آ جائیں رباعی کہنے کی عجلت نہ کی جائے، اس طرح اعلیٰ درجے کی رباعی وجود میں نہیں آئے گی۔ فنی پابندیوں کے ساتھ ساتھ صحت زبان، فصاحت، بلاغت، سلاست، روانی، وغیرہ پر بھی خاص توجہ کرنی ضروری ہے۔

کسی دانشور نے بالکل سچ کہا ہے کہ؛ رباعی کو قوافی کی موزونیت الفاظ کی شیرینی، معانی کی لطافت، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور لفظی محاسن سے مالا مال اور الفاظ کی بے جا تقدیم و تاخیر، تعقید، اور ابتذال و فحش گوئی سے پاک ہونا چاہیے۔ رباعی کے حوالے سے اس مختصر گفتگو سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رباعی کو مشکل صنف شاعری کیوں کہا جاتا ہے۔ رباعی کے موضوعات کے بارے میں اب کوئی قید نہیں ہے۔ پہلے پہل اس صنف میں عام طور پر مذہبی

موضوعات کو پیش کیا جاتا تھا۔ حمد، نعت، منقبت، اور توحید کا ذکر عام تھا۔ پھر اس میں تصوّف کا اثر بڑھا۔ معرفت کی باتیں کی گئیں۔ بعد میں مولانا ابوالخیر نظامی گنجوی اور فریدالدّین عطار نے رباعی میں اس کثرت سے تصوّف کے مسائل بیان کیے کہ لگنے لگا کہ رباعی کی صنف انہیں موضوعات کے لیے مناسب وموزوں ہے۔ مگر عمر خیام اور سرمد نے رندی وسرمستی، حکمت اور عشق وعاشقی کو اس صنف میں برت کر اس کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ اگر توجہ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری کی اصناف میں مرثیہ، قصیدہ، اور مثنوی، اپنے اپنے مخصوص موضوعات کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں جبکہ رباعی موضوعات کے حوالے سے تنوع کی صفت سے متصف ہے اور اس میں روز مرہ زندگی کے مسائل بھی آسانی سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اردو میں حالی، اکبر، انیس، امجد، اور جوش وفراق نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اس کے دائرے کو وسیع کیا۔ رباعی کے اور بھی کئی نام رائج رہے ہیں۔ کسی زمانے میں اسے ''ترانہ''، دوبیتی، چہار مصرعی، چار مصرعی بھی کہا جاتا تھا۔

شروع شروع میں رباعی کے چاروں مصرعے مقفیٰ ہوتے تھے۔ بعد میں تبدیلی یہ آئی کہ تیسرے مصرعے سے قافیہ کو حذف کر دیا گیا۔ ایسی رباعی کو خصی کہا جانے لگا۔ جس رباعی میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے اسے غیر خصّی کہا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ غیر خصّی رباعیوں کا چلن معدوم ہوگیا۔ اور خصّی رباعیوں نے مقبولیت حاصل کر لی۔ اب خصّی رباعیوں کا ہی رواج ہے۔ ویسے اردو میں دونوں قسم کی رباعیوں کی مثالیں مل جاتی ہیں:

رباعی میں رباعی مستزاد کا چلن بھی کبھی کبھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ جس طرح مستزاد غزل دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مستزاد رباعی اسے کہتے ہیں جس میں رباعی کے مصرعوں کے ساتھ ایک ایک فقرہ رباعی کے وزن کا ملحق کر دیا جاتا ہے۔ مثال دیکھیے؛

اے درد شب قدر ہے ہر زلف سیاہ..... گر دل سے ہو راہ
ہر خط میں لکھی ہوئی ہیں آیات الہ..... ٹک کر تو نگاہ
جوں آئینہ حیران ہوں میں سرتاپا..... ہے عشق گواہ
آتا ہے نظر حسن میں جلوہ کیا کیا..... اللہ، اللہ

فن رباعی کے بارے میں کئی قصّے مشہور ہیں۔ بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ فارسی کے شاعر رودکی کی ایجاد ہے۔ بعض لوگ یعقوب بن لیث صفار کے بیٹے کا واقعہ سناتے ہیں کہ ایک بار وہ اخروٹوں سے کھیل رہا تھا کہ ایک اخروٹ لڑھکتا ہوا گڈھے میں گر گیا۔ اور بچے نے خوشی میں کہا؛ ''غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گوئے'' لیث نے یہ مصرعہ شعرا کے سامنے دہرایا اور پوچھا کہ یہ کونسی بحر ہے۔ فاضل شعرا نے کہا کہ یہ بحر ہزج ہے۔ مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا ہے، کیوں کہ اب تک اس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ رباعی پر کام کرنے والے بیشتر حضرات نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ رباعی کے وزن کے بارے میں بھی کافی بحث ماہرین عروض نے کی ہے۔ اس لیے اسے دہرانا بھی تضیع اوقات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ خود میں نے بھی رباعی کے تقریباً سبھی اوزان میں رباعیاں کہی ہیں۔ جنہیں رباعیات حافظؔ چہارم اور رباعیات کلیات حافظؔ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے لیے چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے؛

مفعولن مفعول مفاعیلن فع

ہر اک کے ہاتھوں میں زنجیریں ہیں
کونسے خوابوں کی یہ تعبیریں ہیں
ہم سب کو پڑھنا ہی پڑتا ہے حافظؔ
قسمت کی جو لکھی تحریریں ہیں

مفعولن مفعول مفاعیلن فع

ہر لمحہ اپنی دھن میں رہتا ہوں!
خود ہی سنتا ہوں خود ہی کہتا ہوں!
اوروں کو برداشت نہیں کر پاتا!
اپنے آپ کو سہنا ہے، سہتا ہوں!

مفعول مفاعیل مفاعیل فعول

تا عمر رہے گی نہ جوانی کی بہار
کب تک یہ سجاوٹ یہ بناؤ سنگھار
کام آئے گی محشر میں یہی شئے حافظؔ
بہتر ہے سنوارا کرو اپنا کردار

مفعولن مفعولن مفعولن فع

اردو میں پہلے رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہیں۔ بعض لوگوں نے ملا وجہی کو تو بعض لوگوں نے خواجہ بندہ نواز کو اردو کا پہلا رباعی گو شاعر کہا

ہے۔مگر تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ پہلا رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہی ہیں۔ ڈاکٹر محی الدّین قادری زور نے محمد قلی قطب شاہ کا جو دیوان مکتبہ ابراہیمیہ مشن پریس حیدرآباد سے شائع کیا ہے، جس کا ذکر فرمان فتحپوری نے کیا ہے۔اس میں فرمان فتحپوری کے مطابق ۴۹ رباعیاں شامل ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رباعی کی صنف اردو اصناف شاعری میں ابتدا ہی سے پائی جاتی ہے۔ سترہویں صدی کے شاعر عبدالقادر حیدرآبادی کی یہ رباعی کئی لوگوں نے نقل کی ہے۔

ہر چند ہمن سب سے اٹھایا ہے ہات
اس پر بھی نہ آزاد کہائے ہیہات
عالم منے ہر ایک یہ کہتا ہو گا
دکن میں ہے قادر ابھوں درقید حیات

دکنی میں اکثر و بیشتر شعرا نے رباعیاں کہی ہیں۔اور ان تمام شعراء کے یہاں سے ایک ایک رباعی بھی بطور مثال یہاں پیش کی جائے تو گفتگو طویل ہو جائے گی مگر ایک آدھ مثال دیکھنی بھی ضروری ہے تا کہ اندازہ ہو جائے کہ اردو میں ابتدا ہی سے رباعی کہنے کی مستحکم روایت رہی ہے۔

اس شام جدائی میں مجھے آ دیکھو
الطاف و کرم کو کارفرما دیکھو
خورشید ڈوبا شفق کے لہو میں تمام
ٹک اپنے شہید کا تماشا دیکھو

سراج اورنگ آبادی

ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔شمال میں انہی کے طفیل میں اردو شاعری کا چلن عام ہوا۔یہی وجہ ہے کہ ولی کو شمال وجنوب میں جو مقام حاصل ہے وہ دوسرے کسی شاعر کو حاصل نہیں ہے۔ ولی اصلاً غزل کے شاعر ہیں۔مگر ان کے یہاں بھی دو چار رباعیاں مل جاتی ہیں۔ولی کی شاعری کے دلّی پہونچنے کے بعد بالخصوص دلّی میں اور بالعموم پورے شمال میں اردو شاعری کا رواج عام ہو گیا۔ اور شعرا نے اردو میں شاعری کرنی شروع کر دی۔ دہلی کے شعرا میں سے درد، سودا، میر حسن، اور میر تقی وغیرہ نے غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی کہیں۔

اس عہد کے شعرا میں سب سے زیادہ رباعیاں خواجہ میر درد نے لکھی ہیں، اور اچھی بات یہ ہے کہ خواجہ میر درد نے جتنی بھی رباعیاں کہی ہیں وہ اس پایہ کی ہیں کہ رباعیوں کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی شامل ہونے کا حق رکھتی ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ خواجہ میر درد صوفی منش انسان تھے۔ لیکن وہ عاشق مزاج بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تصوّف جیسے خشک موضوع کو بھی دلکش بنا دیا ہے۔رباعیاں دیکھئے؛

اے درد اگر چہ مے میں ہے جوش و خروش
رہتے ہیں ولے اہل تأمل خاموش
موجوں کو شراب کی وہ پی جاتے ہیں
گرداب کے مانند جو ہیں دریا نوش

میر تقی میر خدائے سخن کہے جاتے ہیں۔اور بیشتر اپنی غزلوں کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ حالاں کہ میر تقی میر نے کم وبیش اردو کی ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنی انفرادیت کا احساس بھی دلایا ہے۔جس طرح میر کی غزلیں اپنی مٹھاس، سوز وگداز، کسک اور نرمی وشیرینی کے لیے یاد کی جاتی ہیں۔اسی طرح ان کی رباعیاں بھی یاد کی جاتی ہیں۔کسی نے خوب کہا ہے کہ ''نکات الشعراء'' کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ میر نے اپنی غزلوں کا انتخاب اچھا نہیں کیا لیکن اپنی رباعیاں فی الواقع منتخب درج کی ہیں۔اور یہ بات بالکل درست ہے۔ یہ رباعیاں دیکھیے؛

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

سودا اور میر حسن نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، فغاں نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ جو بیشتر عشقیہ ہیں۔ یہ سب کے سب ہمارے اہم اور بڑے شعرا ہیں۔ اور عام طور پر اپنی غزلوں اور قصیدوں کے لیے جانے جاتے ہیں۔ سودا تو اپنی ہجو کے لیے بھی پہچانے جاتے ہیں وہ شعرا جنہوں نے غزلوں اور دیگر اصناف شاعری کے علاوہ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ان میں راسخ، وحشت، تاباں، میر سوز، مظہر جان جاناں، غرض سبھوں کے نام شامل ہیں۔

اے زخم جگر تو خون جاری کرنا
اے مردم چشم اشک باری کرنا
سینے میں لگائی شعلہ آہ نے آگ
ہے وقت مدد کا غم گساری کرنا

فغاں

جس طرح دبستان دہلی کے تمام اہم شعرا نے رباعیوں سے کسی نہ کسی حد تک شغف رکھا اور غزل، قصیدہ، ہجو وغیرہ میں مصروف و منہمک رہنے کے باوجود چند رباعیوں کا تحفہ بھی اردو ادب کو دیا اسی طرح دبستان لکھنؤ کے بھی تقریباً سبھی شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اہل لکھنؤ کو دہلی والوں کی طرح تصوّف سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ اور چوں کہ اس وقت تک عام طور پر رباعیوں میں تصوّف کی باتیں کی جاتی تھیں، اس لیے اہل لکھنؤ اس صنف شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیوں کہ اہل لکھنؤ تصوف کی دنیا سے زیادہ لکھنؤ کی رنگینیوں میں کھوئے رہنا پسند کرتے تھے۔ اس زمانے کا لکھنؤ تھا بھی بے حد حسین، ثقافت کی جو نیرنگیاں اس زمانے کے لکھنؤ میں رچ بس گئی تھی وہ دہلی کا مزاج نہیں تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے شعرا کی رباعیوں میں وہ بلندی، فکری پاکیزگی اور کشش نظر نہیں آتی ہے جو دہلی کے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میر انیس جیسے بڑے شاعر کے یہاں بھی رباعیوں کی تعداد ان کے مراثی کے تناظر میں بہت کم ہے۔ دبیرؔ کے یہاں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

لکھنؤ میں سچ پوچھیے تو واسوخت، ریختی، ہزل، اور مبتذل شاعری کا رواج عام تھا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد کی جو شعری فضا ہے اس میں اخلاق باختگی کے نظارے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق، ٹھٹھول اور پھبتی جیسی اصناف ادب بھلے سے لکھنوی تہذیب کا بنیادی لازمہ نہیں تھی۔ مگر اس تہذیب کی بنیادوں میں تصوّف کی اینٹ بھی مضبوطی سے نہیں بیٹھی تھی۔ اس لیے یہاں کی رباعیوں میں زیادہ گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آتی ہے مگر رباعی کے امکانی سفر کے تناظر میں یہاں کی رباعیوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی صنف ادب کو اس کے پاکیزہ دائرے سے باہر لانے کے لیے اس کی پاکیزگی کے حصار کو توڑنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جرأت لکھنوی معاشرے تہذیب، اور مذاق کے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ کسی نے انہیں چوما چاٹی کا شاعر کہا ہے تو کسی نے انہیں مزے دار شاعر بھی کہا ہے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کی طرح اپنی رباعیوں کو بھی آزادہ روی کے ساتھ برت کر رباعی کے موضوعاتی تنوع میں اضافہ کیا ہے۔ بھلے سے رباعی کی صنفی موضوعی خصوصیات اور حکمت و دانش کو انہوں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔

کچھ عشق میں تو مزہ نہ پایا ہم نے
اس دل ہی کو مفت میں گنوایا ہم نے
اور جس کے لیے گنوایا دل کو جرأت
اس کو اپنا کبھی نہ پایا ہم نے

جرأت

ایمانداری سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رباعی کے لیے سب سے اچھا دور انیس و دبیر اور مرزا غالب کا دور تھا۔ جس طرح مرزا غالب کے دور میں اردو غزل نے ایک نئی کروٹ لی۔ اور پرانے خیالات کے لباس کو اتار کر نیا لباس زیب تن کیا اسی طرح رباعی نے بھی اپنی نئی آن بان دکھائی۔ میر انیس اور مرزا دبیر بھلے سے مرثیہ کے شاعر تھے۔ مگر وہ اپنے فن کے ایسے باکمال تھے اور زبان و بیان کے استعمال پر ایسی قدرت رکھتے تھے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ان لوگوں نے بھی رباعی کی صنف کو اپنا کر اس کی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ اور اس صنف میں شاعری کے اظہار کے وسیلوں سے کام لے کر اسے نئے موضوعات کے برتنے کے امکان سے روشناس کرایا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ غالب و انیس کا دور اردو شاعری کا زریں دور تھا۔ یہ دور صنف رباعی کے لیے بھی نہایت بابرکت دور ثابت ہوا۔ دہلی میں غالب، ذوق، مومن، ظفر اور لکھنؤ میں انیس و دبیر جیسے باکمال شعراء نے رباعی کو مقبولیت سے ہمکنار کیا۔

دہلی میں غالب، مومن، ذوق اور شیفتہ جیسے باکمال شاعروں کی ایک بڑی جماعت تھی مگر رباعی کی طرف جو توجہ مومن نے کی وہ دوسرے شاعروں نے نہیں کی۔ غالب کے یہاں چودہ پندرہ رباعیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ وہ بھی بلند پایہ نہیں ہیں۔ ان کی غزلوں کے تناظر میں ان کی رباعیاں پھیکی پھیکی نظر آتی ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر بطور ذکر ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ذوق کے یہاں جو رباعیاں پائی جاتی ہیں ان میں روزمرہ محاوروں کا لطف پایا جاتا ہے۔ ہاں ان کی رباعیوں میں بلند اور ارفع خیالات کی کمی ہے۔ مثال دیکھئے؛

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

دہلوی شعرا میں رباعی کے معاملے میں ذوق کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ مومن صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم اور حکیم بھی تھے۔ ان کو تمام اصناف شاعری پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہر صنف میں ان کی

انفرادی شان نمایاں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالب کے انداز بیان کے سامنے ان کا زور نہیں چل سکا ورنہ معنیٰ آفرینی، نازک خیالی، جدّت طرازی، اور دقت پسندی میں وہ مرزا غالب سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے۔ مومن کو بھی عام طور پر لوگوں نے صرف غزل کے شاعر کے طور پر یاد کیا ہے۔ ان کی بعض دوسری اصناف پر بھی لوگوں نے توجہ کی ہے مگر ان کی رباعیوں کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ ان کی رباعیوں میں رنگینی، چاشنی، اور عشق کی بے تابی کی بھی کمی نہیں ہے۔ کیوں کہ مومن ایک رنگین مزاج انسان تھے۔ اور ان کے عشق کے قصّے زبان زد عام وخاص تھے۔ یہ رباعیاں دیکھئے:

کیسے دیئے پیچ و تاب دل نے مجھ کو
دکھلائے یہ سب عذاب دل نے مجھ کو
وحشت زدہ کو بہ کو پڑا پھرتا ہوں
کیا کیا نہ کیا خراب دل نے مجھ کو

اس دور کے شعرا میں انیس و دبیر کا نام رباعی کے باب میں سب سے ممتاز ہے۔ موضوع کی وسعت، بیان کی صفائی، زبان کی سلاست، اور روانی اور فنی پختگی کے اعتبار سے انیس و دبیر دونوں کی رباعیاں اردو رباعی کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ مرثیہ گوئی کی مشق سے چوں کہ انیس و دبیر کے ذہنوں میں ایک تسلسل پیدا ہو گیا تھا اس لیے ان کی رباعیوں میں اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں نظم وضبط اور برجستگی زیادہ ہے۔ انیس و دبیر کی مذہبی عملی زندگی نے رباعی کے لب ولہجہ کو خاصہ متاثر کیا ہے۔ اور اس میں مذہبی انکسار کے تحت پاکیزگی وطہارت آ گئی ہے۔

اس عہد کے لکھنوی شعرا نے دہلوی شعرا سے بڑھ کر رباعی کی طرف توجہ کی۔ اب رباعی محض ضمنی صنف نہیں رہ گئی تھی۔ انیس و دبیر نے اس صنف کو قابل قدر بنا دیا تھا۔ انیس و دبیر کی رباعیوں نے سچ مچ رباعی کے امکانات کو نئی روشنی سے روشناس کرایا۔ اور یہ احساس دلایا کہ رباعی کا مستقبل واقعی روشن ہے۔ اور یہ کہ رباعی میں اظہار کے امکانات بھی بہت وسیع ہیں۔ رباعیاں دیکھئے:

دل کو آرام بے قراری سے ملا
سینہ کو سرور آہ و زاری سے ملا
گلزار جہاں میں سرفرازی پائی
یہ پھول مجھے نخل خاکساری سے ملا
میر ببر علی انیس

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا
تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر
جو اوڑھنا ہوگا بچھونا ہوگا
مرزا دبیر

انیس و دبیر نے جب رباعی میں طبع آزمائی شروع کی اور ان کی رباعیوں نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا تو دوسرے شاعروں کی دلچسپی بھی اس صنف میں بڑھنے لگی۔ اور ادبی مجلسوں میں بھی کثرت سے رباعیاں پڑھنے کا رواج عام ہوا چنانچہ انیس و دبیر کے بعد حالی، اکبر، اسماعیل میرٹھی، وغیرہ جیسے ممتاز رباعی نگار پیدا ہوئے۔ پیارے صاحب، رشید، اور شاد نے بھی رباعی کی صنف میں ناموری حاصل کی۔

خواجہ الطاف حسین حالی اردو شعرا میں ایک مصلح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی، اخلاقی اور اصلاحی کارناموں کا جائزہ لینا ہو تو ان کی رباعیوں کو بھی دیکھنا ضروری ہوگا۔ ان کی بہت ساری رباعیاں مقبول خاص و عام ہیں۔ اور اکثر رباعیوں میں اصلاح کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی مد ہے جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

مولانا حالی نے زندگی کے جن بے شمار اخلاقی پہلوؤں اور تعمیری تجویزوں کو رباعی کا موضوع بنایا ہے ان پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے اس صنف کو امکانی طور پر ہی نہیں عملی طور پر بھی کس قدر وسیع بنا دیا ہے۔ ان کی رباعیات کے موضوعات کی فہرست میں توحید، حمد، نعت، عشق، ایمان، کفر، اسراف، نفاق، بے مہری، مکر و ریا، عفو، پشیمانی، گدائی، دہریت، قبر پرستی، انسان پرستی، مساعد وقت، ثابت قدمی، صلح کل، امتحان وقت، شراب خوری، قمار بازی، انقلاب، روزگار، آثار زوال، جوہر قابلیت، عزت، حلم، علم، توقع، غیرت، سخاوت، محنت، حسن زن، حقیقت انسان، مخالفت، عیب جوئی، عیب پوشی، تعصب، جہالت، جوانی، بڑھاپا، ترک شعر، جھوٹی نمائش، خاندانی عزت، غم روزگار، یاد رفتگاں، صبر کا پھل، محنت کی برکتیں، علم کے معجزے، مدح و ذم، رفاہ عام، قومی ہمدردی، توکل، اور وقت کی اہمیت

وغیرہ اقسام کے بہت سے عنوانات ملتے ہیں۔خاکسار نے بھی اپنی رباعیوں میں ان عنوانات کے علاوہ سیاست، فرقہ پرستی، غداری، حب الوطنی، رمضان، روزہ، اشخاص، افراد، اردو، استاد، کھلونا، ایثار، غربت، اسکول، نصاب، تاریخ، غرض اور بھی بہت سارے عناوین پر بہ کثرت رباعیاں کہی ہیں۔مگر یہاں پر میں اپنی رباعیوں کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کروں گا۔پھر بھی چند رباعیاں پیش کرنا پسند کروں گا۔

کیوں رام بھگت سنتے نہیں رام کی بات
ڈرتی ہے انہیں دیکھ کے سیتا کی بھی ذات
تن میل یہ کرتے ہیں زبردستی سے
دکھلائے چلے جاتے ہیں اپنی اوقات

■

سب قدر کے قابل ہیں پڑھانے والے
پڑھنے کی لگن دل میں جگانے والے
دیکھو سبھی ٹیچرس کا کہنا مانو
کیوں کہ یہ ہیں قسمت کو بنانے والے

حافظ کرناٹکی

ہاں تو بات ہو رہی تھی حالی کی رباعیوں کے بارے میں حالی کی رباعیوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری اصناف شاعری اور اصناف ادب کی طرح رباعی پر بھی ان کے بڑے احسانات ہیں۔انہیں کی برکت سے رباعیاں نصابی کتابوں میں شامل کی جانے لگیں۔ اگر وہ رباعیوں پر توجہ نہیں کرتے تو رباعی کی سنگلاخ راہ اتنی ہموار نہیں ہوتی۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی طرح اکبرالہ آبادی نے بھی رباعی پر خاص توجہ کی۔ان کی رباعیوں کا مقصد بھی اصلاح ہی ہے۔ان دونوں کے یہاں فرق صرف انداز و اسلوب کا ہے۔حالی نے جن موضوعات کو متانت اور سنجیدگی سے پیش کیا ہے اکبر نے اسے طنز و مزاح، ظرافت اور قہقہہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ اکبرالہ آبادی نے رباعی کے اسلوب میں تبدیلی پیدا کر کے اس کے امکانات کو روشن تر کر دیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔یہاں ملاحظہ فرمائیے:

اے جدّ بزرگوار کے نواسو پوتو
ٹیں ٹیں نہ کرو زمین کو جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت
اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

■

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے
دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نور طبع پایا نہ گیا
پھر کیا جو تم عرش کے تارے بھی ہوئے

اسماعیل میرٹھی بچوں کے سب سے بڑے اور ہر دل عزیز ادیب سمجھے جاتے ہیں لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شاعری میں تجربے کے بھی حق میں تھے۔حالی اور اکبر کے بھی وہ ہمنوا تھے۔ادب کو نئی راہ پر لگانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔سچ پوچھیے تو اسماعیل میرٹھی نے ادب کے نئے قصر کی تعمیر میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔بقول فرمان فتح پوری حالی نے عمارت کھڑی کی۔اور اکبر نے اس عمارت کو نقش و نگار سے دل کش و نظر گیر بنا دیا یا یوں کہہ لیں کہ حالی زیادہ تر نئی نسل کے لیے کام کر رہے تھے۔اکبر بوڑھوں کو سہارا دے رہے تھے۔اور اسماعیل میرٹھی بچوں کے مربی و رہنما بنے ہوئے تھے ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار
بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار ہے مگر نہ اتنا دشوار
بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

اس دور میں شاد عظیم آبادی اور امیر مینائی نے بھی رباعیاں کہیں اور رشید نے بھی۔لیکن ان لوگوں نے رباعی پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

ادب زندگی کا چہرہ ہوتا ہے۔ زندگی کو جن جن مراحل اور کربناک حالات سے گزرنا پڑتا ہے ادب کو اس کے اظہار کے لیے آگے آنا پڑتا ہے۔ملک کے حالات خراب ہوں کہ عالمی سیاست کا رنگ بدلتا منظر نامہ، سماج و معاشرے میں پیدا ہونیوالی تبدیلی ہو کہ انسانیت کو لگنے والے چرکے کا احساس ادب ان تمام چیزوں کو انگیخت کر کے اسے خوب صورت انداز میں پیش کرنے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ادب صرف صورت واقعہ ہی کو پیش نہیں کرتا ہے۔ بلکہ کسی بھی واقعہ، حادثے، واردات، اور المیے سے پیدا ہونیوالے انسانی، اخلاقی، معاشی، ثقافتی، بحران کو نہایت دردمندی کے

ساتھ پیش کرتا ہے۔ اور آنیوالی زندگی میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اس بات سے بھی آگاہی فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا ادب مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی فراہم کرتا ہے۔

اردو میں شاعری کی بہت ساری اصناف رائج ہیں۔ ان میں سب سے مقبول غزل کی صنف ہے۔ مگر دوسری اصناف شاعری کی بھی اہمیت کم نہیں ہے۔ جب پہلی جنگ عظیم نے انسانیت کے جسم پر لہو بھرے خراشوں کی بھرمار کردی۔ اور ایسا لگنے لگا کہ شاید اب انسانیت ہمدردی، اور بھائی چارے کے الفاظ اپنے معنیٰ کھودیں گے۔ تب بھی ادب نے انسانیت کا نعرہ بلند کیا۔ پہلی جنگ عظیم نے سماج اور معاشرے میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اس طرح ادب کے نظریے میں بھی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ سر سید احمد خاں، حالی، شبلی، اکبر اور ان کے دوسرے رفقاء کار نے ضرورت کے تحت اور وقت کے تقاضے کے مطابق ادب میں تبدیلی لانے کی کوشش کی اور انیسویں صدی سے اردو ادب میں نئی تبدیلیوں کی آہٹ واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ چوں کہ مقصد تھا عوام میں بیداری لانا۔ اس لیے ان لوگوں نے غزلوں کی بجائے نظموں اور نثر پر زیادہ توجہ کی۔ اس زمانے میں یہ رجحان عام ہوگیا تھا کہ غزل نئے سماجی و سیاسی رجحانات کی ترجمانی نہیں کرسکتی ہے۔ کسی بھی خیال کو تفصیل سے واضح کرنے کے لیے جس قسم کی وسعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ غزل میں نہیں ہے۔ لہٰذا لوگوں نے نظموں پر زیادہ توجہ کی مگر نظم کو بلندی تک پہونچانے میں بجز علامہ اقبال کے کوئی دوسرا شاعر کامیاب نہیں ہوا۔ اس صورت حال کے پیش نظر لوگوں نے دوسری اصناف شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ کیوں کہ وہ جان گئے تھے کہ نظم میں علامہ اقبال کے سامنے ان کا چراغ نہیں جل پائے گا۔ لہٰذا بہت سارے لوگوں نے رباعی میں طبع آزمائی شروع کردی۔ چنانچہ اس زمانے میں جوش ملیح آبادی، امجد حیدر آبادی، فراق گورکھپوری، اور محروم و یگانہ کے علاوہ بھی کئی شعراء کرام رباعی کے میدان میں سرگرم کار نظر آنے لگے۔ اب شاعروں نے رومانی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سیکھ لیا۔ فانی جیسا غزل کا شاعر بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ کشمیر جو ہندوستان کی جنت کہلاتا ہے۔ اس کی تباہ کن حالت کو فانی نے بہت خوب صورتی سے اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی
مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر
دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

جوش ملیح آبادی نے ابتدا میں کچھ غزلیں بھی کہیں۔ مگر وہ اقبال کے بعد دوسرے اہم اور نظم کے بڑے شاعر بن کر ابھرے۔ جوش کچھ دنوں تک حیدر آباد میں بھی رہے تھے۔ اور اس زمانے میں حیدر آباد میں امجد کی رباعیوں کے چرچے تھے۔ ممکن ہے کہ ان ہی کی وجہ سے جوش رباعیوں کی طرف راغب ہوئے ہوں۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ جوش نے کافی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ ''جنون حکمت'' کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعوں میں بھی رباعیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ بالخصوص ''سموم وصبا'' میں ان کی بہت ساری رباعیاں ہیں۔ جوش کی رباعیاں امکانات کے نئے نئے در وا کرتی ہیں۔ وہ اپنی رباعیوں میں طنز و تمسخر اور سائنسی موضوعات کی سمائی سے بھی کام لیتے ہیں۔ امجد حیدر آبادی نے اپنی رباعیوں میں بیشتر تصوّف کے موضوعات کو برتا ہے۔ جوش نے رباعیات کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ اس میں نت نئے موضوعات کے پیش کرنے کے امکانات کو روشن کیا اسی لیے وہ امجد کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہوئے۔ ایک اور بات وہ یہ کہ جوش ملیح آبادی اپنے باغیانہ تیور کے لیے شروع سے جانے جاتے تھے۔ جوش انقلاب اور شباب کے شاعر بھی کہے جاتے تھے۔ اس لیے جب انہوں نے رباعیاں کہنی شروع کیں تو یہاں بھی اپنے تیور کو برقرار رکھا۔ جس سے رباعی کی فضا کی حد بندی کا احساس ٹوٹ گیا۔ اور لوگوں نے جان لیا کہ رباعی میں بھی سارے موضوعات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے طنزیہ رنگ کی مثال دیکھئے:

وہ رشتۂ تسبیح ہیں ہم پھندے ہیں
ہر عیب سے وہ پاک ہیں ہم گندے ہیں
دیکھو وہ نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا وہ خدا ہیں، ہم بندے ہیں

■

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیر حیات ہے اگر پیش نظر
مڑ کر بھی مٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

اس عہد میں ایک ایسا شاعر بھی پیدا ہوا جس نے اپنی تخلیقی قوّت کے اظہار کے لیے صنف رباعی کا انتخاب کیا۔ اور اسی سے وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ امجد حیدر آبادی اوّل تا آخر رباعی گو تھے۔ وہ جوش کی طرح نظم کے شاعر نہ تھے اور نہ فانی اور فراق کی طرح غزل کے شاعر تھے۔ وہ سرتاپا رباعی کے شاعر تھے اور آج تک اسی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چوں کہ امجد نے رباعی میں ہی مشق سخن کیا تھا۔ اس لیے انہیں رباعی کے فن پر اچھی گرفت حاصل ہوگئی تھی۔ ان کی رباعیوں کے مطالعے کے دوران کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ رباعی کی صنف اور ان کے مزاج میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔ اسی لیے دونوں ایک دوسرے کا دم بھرتے رہے۔ ان کی رباعیاں تنوع کی صفت سے خالی ضرور ہیں۔ مگر انہوں نے جس موضوع کو اپنایا ہے اس میں اپنی انفرادیت کا بھرپور ثبوت پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے؛

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دہن زباں سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

■

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لاحول ولا قوۃ الا با اللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

فراق گورکھپوری بہت پڑھے لکھے انسان اور شاعر تھے۔ ہندی، سنسکرت، انگریزی اور اردو زبانوں سے واقفیت اور ان زبانوں کے ادب سے واقفیت نے ان کی شاعری کے لیے کہ بہت وسیع میدان فراہم کر دیا تھا۔ وہ نئی غزل بلکہ یوں کہیں کے جدید غزل کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت جتنی متنازع تھی ان کی شاعری بھی اتنی ہی متنوع تھی۔ انہیں پامال راستوں پر چلنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اس میں جدت پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے رباعی میں طبع آزمائی کی تو یہاں بھی نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ ''روپ'' کی رباعیاں ان کی انفرادیت کا ثبوت ہیں اگر فراق کی رباعیوں پر نظر کریں تو محسوس ہوگا کہ جوش نے رباعی میں جس روشن امکانات کی بشارت دی فراق کی رباعیاں اس کا اگلا قدم ہے۔ اردو رباعی کے باب میں جس نئے رنگ کا اضافہ فراق گورکھپوری نے کیا اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

مدھو بن کے بسنت سا سجیلا ہے وہ روپ
برکھارت کی طرح رسیلا ہے وہ روپ
رادھا کی جھیک کرشن کی برزوری ہے
گوکل نگری کی رس لیلا ہے وہ روپ

■

مکھڑا دیکھیں تو ماہ پارے چھپ جائیں
خورشید کی آنکھ کے شرارے چھپ جائیں
رہ جان وہ مسکرا کے تیرا کل رات
جیسے کچھ جھلملا کے تارے چھپ جائیں

یاس یگانہ چنگیزی ایک عبقری فنکار تھے۔ انہیں قدرت کی طرف سے بہت زبردست ذہن عطا کیا گیا تھا۔ مگر وہ اپنے ذہن پر قابو نہ رکھ سکے۔ ان کا مزاج بہت تیز تھا۔ ناانصافی، اور علاقائی تعصب انہیں گوارہ نہیں تھی۔ اس لیے وہ کسی سے بھی ڈرے اور گھبرائے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ دنیا میں ایسے ہی لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو سچ کا سامنا دن کے اجالے میں نہیں کرتے ہیں۔ وہ سچ اور حق کو سبوتاز کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اور جب انہیں لگتا ہے کہ منصوبہ کارگر ثابت ہوگا تو وہ بلا تکلف سچ کی آواز دبا دیتے ہیں۔ لکھنؤ والوں نے ان کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی شاعری کی امتیازی خوبیوں کو نمایاں ہونے کا مزید موقع مل گیا۔ یگانہ کو اگر زندگی میں اطمینان حاصل ہو جاتا تو وہ اردو شاعری کو بہت کچھ دینے میں کامیاب ہوتے۔ ان کی رباعی دیکھیے؛

دل کو حد سے زیادہ دھڑکنے نہ دیا
قالب میں روح کو پھڑکنے نہ دیا
کیا آگ تھی سینہ میں جسے فطرت نے
روشن کیا مگر بھڑکنے نہ دیا

اس عہد کے ایک اور اہم رباعی گو شاعر تھے سیماب اکبرآبادی۔ ان میں بڑی شاعرانہ قوتیں پائی جاتی تھیں۔ سیماب اکبرآبادی کی رباعیوں کا

ایک مجموعہ ''عالم آشوب'' شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ سیماب اکبرآبادی نے اپنی رباعیوں میں نازیوں کے ظلم وستم کو پیش کیا ہے۔ تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ایما پر بھی بہت ساری ایسی رباعیاں کہی ہیں جس سے برطانوی رعایا کے دل سے خوف و ہراس دور ہوتی ہے۔ ویسے سیماب اکبرآبادی کی رباعیوں میں تنوع کی کمی نہیں ہے۔ یہ رباعیاں دیکھیے:

صحرا بن کر پہاڑ ڈھل جاتا ہے
لوہا صفت آب پگھل جاتا ہے
آتا ہے جب انقلاب کا تیز قدم
جغرافیہ ملکوں کا بدل جاتا ہے

■

ہیں برق کے سارے داؤں گلشن میں لگے
پھولوں میں لگے داغ کہ خرمن میں لگے
سب اپنی جگہ ہیں چمن میں ہوشیار
کیا جانے کب آگ کس نشیمن میں لگے

اس عہد کے رباعی نگاروں میں ایک اور ممتاز نام نریش کمار شاد کا ہے۔ ان کی رباعیوں پر ملک کے سیاسی اور قومی رجحانات کا اثر صاف صاف نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے نت نئے تقاضوں سے بہت حد تک واقف ہیں اور اپنے آس پاس کے موضوعات کو بھی برتنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ چوں کہ وہ شاعری کی زبان کی نزاکتوں اور اس کی تخلیقی قوت سے بھی آگاہ ہیں اس لیے وہ زبان کو بڑی ہنرمندی سے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

یہ کیف کے اسرار کوئی کیا جانے
راز دل سرشار کوئی کیا جانے
ہم خاک گریباں ہی سہی محفل میں
کس درجہ ہیں ہشیار کوئی کیا جانے

تمام شعرا کا ایک ایک کر کے ذکر کیا جائے تو ایک مخزونہ وجود میں آجائے گا اس کے لیے بس اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اردو کا کوئی بھی ایسا شاعر جو فن شاعری پر گرفت رکھتا ہو، تلاش کرنا مشکل ہوگا جس کے یہاں چند رباعیاں نہ پائی جاتی ہوں۔ اردو زبان وادب میں کئی اقسام کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ کئی طرح کے نظریات و رجحانات آئے۔ اور ان تحریکوں، اور نظریوں اور رجحانوں کے تحت اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے خوب خوب لکھا۔ ہر نظریے کی اپنی کچھ شرطیں بھی پیش کی گئیں۔ ہر تحریک نے وقت کی کسی اہم ضرورت پر توجہ بھی کی۔ ہر رجحان نے کچھ نیا کر دکھانے کا حوصلہ دلایا۔ اور قلمکاروں اور فنکاروں نے اسے قبول بھی کیا اس کے باوجود تقریباً ہر عہد کے قابل ذکر شعرا نے رباعی پر طبع آزمائی کی۔ اچھی بات یہ ہے کہ سن اسّی کے بعد اور اس کے آس پاس کے بھی بہت سارے شعرا نے خوب خوب رباعیاں کہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز تیزی سے جاری ہے۔

آج بہت سارے ایسے شعرا ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ رباعیوں کے مجموعے شائع کروائے ہیں بلکہ کئی شاعروں نے تو رباعی کے دیوان بھی شائع کروائے ہیں۔ نئے رباعی گو شاعروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ذہن پر زور ڈال کر بھی سبھوں کے نام نہیں لکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن جن شعراء کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ان میں مامون ایمن، ظفر کمالی، مقبول احمد مقبول، اصغر ویلوری، اکرم نقاش، جمال اویسی، خالد عبادی، کوثر صدیقی، شمیم انجم وارثی، عادل حیات ناوک حمزہ پوری، افتخار امام صدیقی، طلحہ رضوی برق، فرید پربتی، شمیم انجم وارثی، سراج العارفین، زاہد کونچوی وغیرہ کے علاوہ بھی بہت سارے نام ہیں۔

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی نے جو رباعیات بازی کے لیے کتاب مرتب کی ہے اگر اسے ایک نظر دیکھ لی جائے تو معلوم ہوگا کہ بلا مبالغہ اردو میں رباعی کہنے والے شعرا کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ یہاں پر سبھی رباعی گو شعرا کا تعارف کرانا اور ان کی رباعی گوئی کی خصوصیات سے واقف کرانا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ بات یقین اور پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ ان تمام شعرائے کرام نے صنف رباعی کو نئے امکانات سے روشناس کرایا ہے۔ اور یہ کہنا بھی بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہو نہ ہو ایک دن رباعی غزل کی جگہ لے لے کیوں کہ اس میں اپنی بات کو وضاحت سے کہنے کی غزل کے ایک شعر کی بہ نسبت زیادہ وسعت ہے۔ جبکہ یہ ایسی صنف شاعری ہے جس میں غزل کے رنگ، اور اس کے رس اور جس کو برتنے کے امکانات بھی دوسری صنف شاعری کی بہ نسبت زیادہ روشن ہیں۔ کوثر صدیقی بلاشبہ ایک باکمال شاعر ہیں ان کی چند رباعیاں دیکھئے:

یا رب میری دھرتی کو سہاگن رکھنا
آباد ہمیشہ مرا گلشن رکھنا

سایہ بھی خزاں کا نہ پڑے پیڑوں پر
پھولوں سے مہکتا ہوا آنگن رکھنا

■

اس بار جو درشن کے لیے آؤں گا
میں پیار کے مندر میں ہی بس جاؤں گا
چرنوں میں کروں گا نیر ارپت نت دن
پھولوں سے بدن دیوی کا مہکاؤں گا

کوثر صدیقی کے علاوہ ایک نام شمیم انجم وارثی کا بھی ہے۔ شمیم انجم وارثی کی رباعیوں میں تنوع پایا جاتا ہے اور وہ شعریت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ایک رباعی دیکھئے؛

دل دید کی حسرت میں سجن جلتا ہے
سورج کی تمازت سے گگن جلتا ہے
فرقت کی لگن ایسی لگی ہے دل میں
پانی میں بھی اب میرا بدن جلتا ہے

سراج العارفین بھی ان رباعی دیوان کے خالق شعرا میں شامل ہیں، جو رباعی گوئی کے فن پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں معنیٰ خیزی کی کیفیت اور ایک خاص طرح کے طنز ملیح کا احساس ہر قدم پر ہوتا ہے۔ یہ رباعی دیکھیے؛

موت آئی تو اندیشۂ جاں ختم ہوا
اب سلسلۂ سود و زیاں ختم ہوا
پیدا ہوئے معصوم گنہگار مرے
ہستی ترا احسان گراں ختم ہوا

میں اس وقت جن رباعی گو شعرا کا ذکر فوری طور پر کر رہا ہوں ان کی رباعیوں پر میں بہت پہلے مضامین لکھ چکا ہوں۔ ان شعراء کرام کا ذکر پہلے اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اس عہد کے یہی ممتاز شعرا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان شعراء کرام سے عمر میں بڑے کئی شعراء ہیں جنہوں نے بہت ساری رباعیاں کہی ہیں۔ اور اس پایہ کی رباعیاں کہی ہیں کہ انہیں رباعیوں کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی شامل کیا جائے گا۔ زاہد کونچوی اور مقبول احمد مقبول بھی ایسے ہی رباعی گو شعرا ہیں جن پر میں اپنے تاثرات کا اظہار تحریری شکل میں پیش کر چکا ہوں۔

زاہد کونچوی کے بارے میں بہت پہلے میں نے لکھا تھا کہ ان کو اردو شاعری کی روایت اور زبان و بیان کی خوبیوں کا علم ہے۔ وہ شعر و ادب کے ایسے پرستار ہیں جو فن کو تفریح طبع کے طور پر نہیں بلکہ تخلیق جہان نو کے طور پر اپناتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں تخلیقی کرب کی مٹھاس اور زندگی کے سربستہ رازوں کو سمجھنے اور زندگی کے واقعات کی پرت پرت شدت کو بھانپنے اور بشری تقاضوں کے تحت انسانی فطرت کو اجالنے کی ایک خاص طرح کی کاوش نظر آتی ہے۔ جو ان کی رباعیوں کے باطن میں زندگی اور فن کے آمیزے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ رباعیاں دیکھئے:

جو لوگ محبت میں وفا کرتے ہیں
غم کتنے زمانے میں سہا کرتے ہیں
آنسو یہ تڑپ کراہیں دل کی
عاشق تو مصیبت میں رہا کرتے ہیں

■

سرکار کی ہر بات نرالی زاہدؔ
امت کے لیے فکر ہے عالی زاہدؔ
فرماتے ہیں رب سے جو ہمارے آقا
وہ بات نہیں جاتی ہے خالی زاہدؔ

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کی رباعیوں کا دیوان ''احساس و ادراک'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کی رباعیاں خارجی مظاہر سے زیادہ باطنی احساسات کا آبگینہ محسوس ہوتی ہیں۔ مقبول احمد مقبول رباعی کے مزاج اس کے موضوعات اور اظہار کے منہاج سے پوری طرح واقف ہیں اس لیے ان کا دیوان ہر طرح کی افراط و تفریط اور رطب یابس سے پاک ہے۔ یہ رباعیاں دیکھئے؛

کس طرح میں ثنا کروں تیری مولا !
میں کیا ہوں؟ بساط کیا ہے میری مولا !
عاجز ہے زباں، اور ہے کمزور قلم
ہے شان بڑی عظیم تیری مولا !

■

دریا کی طرح حال ہے بہتا ہوں میں
ہر رنج و الم وقت کا سہتا ہوں میں
آیا نہ کبھی حرف شکایت بھی لب پر
راضی بہ رضا ہر دم رہتا ہوں میں

رباعی کو نئے نئے امکانات سے روشناس کرانے میں امّی کے بعد کے شعرا نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ امّی کے بعد کا ذکر بالخصوص میں اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے دور میں رباعی کی صنف پر اتنی زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ حالاں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بعض سینیر شعراء نے بہت عمدہ رباعیاں کہی ہیں۔ مگر جب اس تحریک نے شدّت اختیار کر لی تو رباعی کا رواج کم ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ جدیدیت نے بہت بڑے بڑے اور اہم شعرا اردو زبان و ادب کو دیے۔ مگر ان شعرا کی غزل گوئی کی گونج میں رباعی گوئی کی آواز دب گئی۔ حالاں کہ یہ بھی درست ہے کہ خود فاروقی صاحب نے بھی بہت ساری رباعیاں کہیں اور کئی دوسرے شعراء نے بھی رباعی گوئی میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ شاہ حسین نہری نے بھی بہت ساری رباعیاں کہی ہیں۔ اور انہوں نے اپنی رباعی گوئی کی انفرادیت کا بھی احساس دلایا ہے۔ یہ رباعیاں دیکھئے؛

ٹیڑھی کیوں مجھ سے رہتی ہے دنیا
میں تو سیدھا سادہ ہوں اک بندہ
تو اس کی چالوں سے اللہ بچا
میں تو دنیا سے رہتا ہوں سیدھا

■

ٹوٹا ہے یہ قہر خود سری کے باعث
دنیا کی ہوس کی دل رسی کی باعث
جینے میں رہا نہیں ہے جینے کا لطف
مر جانے کے خوف و بزدلی کے باعث

شاہ حسین نہری کے ہم عصروں میں علقمہ شبلی، ظفر کمالی، ناوک حمزہ پوری، طہور منصوری نگاہ، قوس حمزہ پوری، طلحہ رضوی برق اور اصغر ویلوری اور اسلم حنیف وغیرہ نے خوب رباعیاں کہی ہیں۔ ایک ایک رباعی بطور مثال ملاحظہ فرمائیے؛

تابندہ قمر، مہر منور، سب ہیچ
یہ مال و منال و گوہر، سب ہیچ
ہو شہر رسول میں سکونت جو نصیب
گلزار بہشت و حوضِ کوثر، سب ہیچ
ناوک حمزہ پوری

تم ڈال کے نفرت کی دلوں میں بنیاد
پھر شان سے کہتے ہو وطن ہے آزاد
لہراتے ہو تم امن کا پرچم باہر
بیٹھے ہوئے اندر سے مچاتے ہو فساد
اصغر ویلوری

تجھ کو ہے اگر زیست کے جوہر کی تلاش
یا راہ میں ہے میل کے پتھر کی تلاش
منزل ہے ادھر تیری، تو جاتا کدھر ہے
مے خانے میں کر اپنے مقدر کی تلاش
ظفر کمالی

ٹکڑے ٹکڑے دل کا آئینہ آج
قریہ قریہ لب پر ہے نوحہ آج
کیا پوچھو کیسے کٹتے ہیں دن رات
دیکھو پرخوں پرخوں ہر چہرہ آج
علقمہ شبلی

ثواب مرے گھر میں ٹھہرا ہے آج
ہر شہر سے جب اس کا ہوا ہے اخراج
اترا رہے سبھی جسم سے عفت کا لباس
خبطی نے سنبھالا ہے جب سے یہ راج
عبدالمتین جامی

لڑنے کا کبھی من نہ بنانا ہرگز
چنگاری کو گلخن نہ بنانا ہرگز
دشمن کو کمزور سمجھنے والا
کمزور کو دشمن نہ بنانا ہرگز
طہور منصوری نگاہ

لذت میں خودی کی کھو گیا ہے زاہد
یوں دور خدا سے ہو گیا ہے زاہد
سنتا نہیں رب شکستہ مسجد کی صدا
مسجد میں کچھ ایسا سو گیا ہے زاہد
پرویز شاہدی

اس طرح اگر ایک ایک رباعی بھی یہاں ہر رباعی گو شعرا کے خزانے سے نکال کر پیش کی جائے تو کئی صفحات سیاہ ہو جائیں گے۔

سن امّی کے بعد جن شعرا نے اپنی انفرادیت کا احساس دلایا اور اپنی فنکارانہ خوبیوں سے لوگوں کی توجہ حاصل کی اور اپنی تخلیقیت خیزی سے شعر و

ادب کے گلشن میں رقص بہاراں کا سماں پیدا کیا اس کی فہرست اگر بہت طویل نہیں تو مختصر بھی نہیں ہے۔ ان سبھوں کے نام یہاں لینا آسان نہیں ہیں۔ اور نہ فی الفور ان کے اسمائے گرامی کا یاد آجانا آسان ہے۔ اسّی کے فوری بعد کے شعرا میں ایک اہم نام ابراہیم اشک کا ہے۔ وہ اپنے تیور سے پہچانے جاتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت رؤف خیر کی بھی ہے۔ فی الفور رؤف خیر کی کوئی رباعی یاد نہیں آرہی ہے۔ ابراہیم اشک کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:

خود اپنے ہی پتھر سے مقدر پھوٹا
ثابت وہ سرعام ہوا ہے جھوٹا
دشمن نے کل کوئی نہیں چھوڑی لیکن
بلی کے کہے سے نہیں چھینکا ٹوٹا

اسی کے بعد کے شعرا میں اکرم نقاش، اقبال خسرو قادری، جمال اویسی، خالد عبادی، فراغ روہوی، اور بہت سارے دوسرے شعرا نے بہ کثرت رباعیاں کہی ہیں۔ جمال اویسی کا انفراد یہ ہے کہ ان کی غیرت نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ کسی اکادمی یا کونسل کا جزوی مالی تعاون لے کر کتاب شائع کروائیں۔ انہوں نے آج تک اپنا کوئی شعری مجموعہ بھی کسی اکادمی کو انعام کے لیے نہیں بھیجا۔ ان کے مزاج کی اس انفرادی خوبی سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کسی قسم کے شاعر ہوں گے۔ ویسے اسّی کے بعد انہوں نے جس کثرت سے نظمیں کہی ہیں اس کی مثال شاید کوئی دوسرا شاعر نہ پیش کر سکے۔ جبکہ غزل میں بھی ان کا مقام محفوظ ہے۔ ایک رباعی دیکھئے:

خاشاک کے درمیان گھر ہے اپنا
پھر بھی اک طور سے گذر ہے اپنا
کچھ لوگ بلند ہیں ہمالہ جیسے
ان لوگوں کے درمیان سر ہے اپنا

اکرم نقاش اسّی کے بعد کے غالباً پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے رباعیوں کا مجموعہ پیش کر کے فن شاعری پر اپنی گرفت کا احساس دلایا اور اپنے فنکارانہ کمال کے اظہار کے لیے خاص طور پر رباعی کے میدان کا انتخاب کیا وہ نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھنے والے شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی رباعیاں بھی اپنا الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ یہ رباعی دیکھئے:

آیا ہے مری راہ میں یہ کون پڑاؤ
نے راہ گذر آگے نہ ہی کوئی گھماؤ
سب نقش ہیں معدوم جو مڑکر دیکھوں
نے عشق کا شعلہ نہ جنوں کا ہی الاؤ

اسّی کے بعد کے شاعروں میں خالد عبادی کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ان کی شاعری کا رنگ کسی سے نہیں ملتا ہے۔ وہ ایک خاص انداز کی نہایت معیاری اور متاثر کرنے والی شاعری کرتے ہیں۔ ان کی شاعری بہ یک وقت دل اور دماغ پر وارد ہوتی ہے۔ اور قاری کو قلب ماہیئت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ وہ قطعہ، دوہا، نظم، غزل، رباعی ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک رباعی دیکھئے:

وہ کاٹ رہا ہے جو گلا بھائی کا
اے کاش وہ کچھ کرتا بھلا بھائی کا
بسمل کی طرح گر کے تڑپتا دیکھا
اک بھائی پہ خنجر جو چلا بھائی کا

اسّی کے بعد اور اس کے فوری پیش روؤں میں بے شمار ایسے شاعر ہیں جنہوں نے رباعی گوئی کی طرف بھی توجہ کی اور اس صنف کی آبیاری میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ عمر کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جن لوگوں نے رباعی گوئی میں اپنی دلچسپی دکھائی ہے ان میں سے چند لوگوں کی ایک ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اردو زبان وادب میں رباعی کے روشن مستقبل کے کتنے امکانات ہیں؛

الفاظ و معانی کے نقابوں میں سانپ
دانش گہہ عظمت کے زمانوں میں سانپ
پڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں اکثر احباب
بل کھاتے ہیں شاید کہ کتابوں میں سانپ
راہی فدائی

زنجیر شب و روز کی کٹ جاتی ہے
رفتار مہ و مہر کی گھٹ جاتی ہے
جب قہر کے ماحول میں ہوتا ہے بشر
مرکز پہ زمیں اپنی سمٹ جاتی ہے
علیم صبا نویدی

ہم گیسوئے دوراں کو سنواریں گے سدا
ہم حسن و جمال اس کا نکھاریں گے سدا
فن اپنا سلامت ہے تو فن پاروں میں
ہم اس کے خدّ و خال ابھاریں گے سدا
فراغ روہوی

ہر قید سے باغی ہے یہ بندگلی
خود ساختہ شاہی ہے یہ بند گلی
جب سیر فلک سے لوٹتی ہیں ارواح
پاتال میں کھلتی ہے یہ بند گلی
اقبال خسرو قادری

ہر سمت سلگتی ہے فضا جانتے ہیں
کیوں شہر کی بدلی ہے ہوا جانتے ہیں
اب امن کے نعرے بھی لگائیں گے وہی
جو لوگ فسادوں کو دوا جانتے ہیں
شارق عدیل

دریا کی طرح موج میں بہنے والا
ساگر کی طرح قطرے میں رہنے والا
دیوار سے ٹکراتا ہوں جھونکا بن کر
سائے کی طرح دھوپ کو سہنے والا
مامون ایمن

گریہ نہیں کرتے کسی دیوار کے پیش
جھکتے نہیں ہم پتھر و اشجار کے پیش
جس نے ہمیں جینے کا شرف بخشا ہے
خم ہوتے ہیں اس خالق و مختار کے پیش
حافظ کرناٹکی

گو جرم نہیں کوئی ہے پھر بھی ماخوذ
ماخوذ ہیں مے خوار، ہے ساقی ماخوذ
قانون کوئی ہے نہ کوئی دستور
حد یہ ہے کہ ہیں پیر مغاں بھی ماخوذ
عاصم شہنواز شبلی

کھل جاتا ہے اس سے ہو اگر بند دماغ
ہر قسم کے کانٹوں سے ہے پاک اس کا باغ
کر دیتا ہے دور ہر اندھیرا عادل
ہے علم بلا شبہ اندھیرے کا چراغ
عادل اسیر دہلوی

اب کچھ خواتین رباعی نگاروں کی رباعیاں بھی دیکھ لیجئے تا کہ آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ اردو ادب میں صرف مرد حضرات ہی شاعری کرتے ہیں اردو میں ابتدا ہی سے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی شعر و ادب کی خدمت کی ہے۔ اور ہر دور میں ادب کی ہر صنف میں اپنی انفرادیت کا احساس دلایا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ یہ روایت آج بھی زندہ ہے اور آج بھی ہماری خواتین قلمکار شعر و ادب کی تخلیق و ترویج میں جی جان سے لگی ہوئی ہیں۔ کچھ رباعیاں ملاحظہ فرمائیے؛

افسانے بہت تھے جو سنائے نہیں گئے
جو زخم ملے وہ بھی دکھائے نہیں گئے
جب تک جیئے اک عالم برزخ میں جیئے
لگتا ہے کہ دنیا میں ہم آئے نہ گئے
رفیعہ شبنم عابدی

کاندھوں پر سفر باندھے ہوئے خانہ بدوش
پیکر پہ جمی گرد نگاہوں میں خروش
ہجرت کی کڑی دھوپ کا بے مہر حذر
بس زخم سہے پھرتے ہیں یہ جان بردوش
خان کنیز فاطمہ

کردار کو نیکی سے سجایا ہوتا
دنیا میں مقام اپنا بنایا ہوتا
خواہش تھی اگر نام ملے دنیا میں
کچھ کام بڑا کر کے دکھایا ہوتا
شگفتہ غزل

خوش رنگ مرے ملک کی پھلواری ہے
ہر لب پہ جو تسبیح وفاداری ہے
پل بھر میں بدل جاتا ہے رشتوں کا سفر
ہر شخص پہ دولت کا نشہ طاری ہے
خوشبو پروین

اے ملک تجھے خوار نہ ہونے دیں گے
دھندلے ترے آثار نہ ہونے دیں گے
ہم عظمت رفتہ کی نشانی کو کبھی
مٹ جائیں گے مسمار نہ ہونے دیں گے
سعدیہ صدف

اردو رباعی گوئی کے اس مطالعاتی سفر سے کم از کم اتنی بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ اردو میں فن رباعی کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اور اس صنف میں ہر طرح کے موضوعات کو برتنے کی غزل کے شعر سے زیادہ وسعت ہے۔

☆☆☆

رباعی: آہنگ وارکان اور ہیئت وقوافی کے تجربے

اسلم حنیف
(گنور، ضلع سنبھل یوپی۔موبائل:9997429226)

رباعی کے حوالے سے اب تک ہیئت وآہنگ اور قافیہ وردیف کے جومختلف قسم کے تجربات کئے جا چکے ہیں ان پر گفتگو سے قبل اس کے اوزان موجد پر بھی اجمالی بحث ضروری معلوم ہوتی ہے۔رباعی کی ایجاد کے سلسلے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں۔شبلی نعمانی نے دولت شاہ سمرقندی کی پیروی میں یعقوب صفاء کے بیٹے کی جوزبازی کا قصہ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اس کمسن بچے کا ایک اخروٹ گڑھے میں جا گرا تو اس کی زبان سے بے ساختہ ''غلطاں غلطاں ہمی رود طالب گور'' جیسا مصرعہ نکلا۔صفاء کو یہ موزوں معلوم ہوا، چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے۔اس نے شعراء کو بلا کر بحر دریافت کی، انہوں نے کہا بحر ہزج ہے اور تین مصرع لگا کر اسے رباعی کر دیا اور دوبیتی کا نام دیا۔(۱)

کچھ تذکرہ نویسوں نے مذکورہ مصرعہ میں طالب گور کی جگہ طالب گو اور بعض نے تابہ ستون کے جملے تحریر کیے ہیں اسی طرح محمد حسین آزاد نے مذکورہ واقع کو دہراتے ہوئے صفاء نے جن شعراء سے وزن دریافت کیا تھا ان میں ابودلف عجلی اور ترتیب اللعب کے نام تحریر کیے ہیں۔(۲)۔فرہنگ ادبیات فارسی میں رباعی کے موجد کا نام رودکی کی تحریر ہے۔(۳) طلحہ رضوی برق نے مذکورہ روایت کو کئی انداز میں بیان کیا ہے اور رباعی کی ایجاد کا سہرا بھی رودکی ہی کے سر باندھا ہے۔(۴)

یہ حقیقت ہے کہ یعقوب بن لیث صفاء ۲۵/اکتوبر ۸۴۰ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کی تاریخ وفات ۵/جون ۸۷۹ء ہے جبکہ رودکی اس کے اٹھارہ سال بعد یعنی ۲۵/دسمبر ۸۵۸ء میں پیدا ہو کر سنہ ۹۴۱ء میں وفات پاتا ہے اور ولادت کا یہی فرق واقعہ کو مشکوک کر دیتا ہے۔دوسری بات یہ کہ کمسن لڑکے کے مصرعہ پر جو تین مصرعہ رودکی یا دوسرے کسی شاعر نے لگائے تھے وہ کسی تذکرے میں کیوں دستیاب نہیں ہوتے؟ تیسری بات یہ کہ سمرقندی اور شبلی نعمانی کے بقول بحر ہزج کا متذکرہ وزن فارسی میں موجود نہیں تھا، اسی لیے یعقوب صفاری نے مصرعہ کا وزن رودکی یا دوسرے شعرا سے دریافت کیا تھا۔اس کے برعکس فارسی کے محقق قائل خاں لری رباعی کے ایک وزن مفعول مفاعلن مفاعیلن فع کو ترانہ کا ایک وزن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اصل ایں وزن فارس است۔''(۵) جس سے اس بات کی ازخود تردید ہو جاتی ہے کہ یعقوب صفاء کے استفسار پر بیٹے کے منھ سے نکلنے والے مصرع کو شعراء نے بحر ہزج قرار دیا اور یہ کہ ہزج کا زیر بحث وزن فارسی میں موجود نہیں تھا۔

اگر چہ تذکرہ نویسوں کی افسانہ طرازی نے رباعی کے اوزان اور رودکی کی ذہانت کو مشکوک تو کیا ہے مگر ان کی بنیاد پر کچھ محققین نے کھل کر رودکی اور رباعی کی حقیقت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں محمود شیرانی زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ رباعی کسی فرد واحد کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنف خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں کوئی شخصی ایجاد نہیں بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔''(۶)

محمود شیرانی اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے عربی میں شعر معقد اور مربع بحروں سے مثمن بحور کے وجود میں آنے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب عربی عروض کو فارسی والوں نے اپنایا تو ہزج کے اشعار مربع میں لکھے گئے۔اس طرح رباعی مربع میں لکھی گئی اور اس میں چار شعر ہونے کی وجہ سے اس کا نام چار بیتی پڑا۔ایک عرصے کے بعد جب اہلِ فارس سے اصول مثمنات دریافت کیے تو انہوں نے مربعات ترک کر کے مثمنات کو اختیار کر لیا اور ترانہ جو چار مربع پر شامل تھا وہ دوبیت مثمن کے قالب میں ڈھل کر دوبیتی کہلایا۔دوبیتی ہی کو چار مصرعوں کی وجہ سے رباعی کہا گیا۔حالانکہ شبلی پر تنقید کے لیے محمود شیرانی کی یہ تحریر رودکی کی ذہانت کو مسترد نہیں کرتی اور پھر ترانا اور دوبیتی میں پہلے سے بحر ہزج کے مثمن وزن کا ثبوت مل جاتا ہے تو شیرانی کی وہ منطق جو رباعی کے وجود میں آنے کے لیے پیش کی گئی ہے ازخود بے وزن ہو جاتی ہے۔شیرانی کے برعکس ناوک حمزہ پوری ایک طرف یہ فرماتے ہیں:

''بطور نمونہ ہمارے پاس رودکی کے سرمایہ کلام ہی میں رباعی پہنچی اس لیے چار و ناچار اسے رباعی کا اولین شاعر یا موجد تسلیم کر لیا پھر جن ایرانی محققین نے بھی'' راہ تحقیق بستہ امت'' کہہ کر ہتھیار ڈال دیئے تو ہم ہندوستان میں بیٹھ کر مزید تگ و دو کیا کر سکتے ہیں۔''(۷) دوسرے ہی لمحہ وہ فیصلہ بدل کر محمود شیرانی کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔

''کل ملا کر احتیاط کا تقاضہ ہے کہ رباعی کا موجد کسی فرد واحد کو قرار نہ دیا جائے۔ رباعی کی سی معرکہ آرا صنف چشم زدن میں وجود پذیر نہ ہوئی ہوگی بلکہ فارسی کی قدیم ابتدا ہی سے رباعی کی ایجاد اور اس کے اوزان کے تعلق سے رودکی ہی کا نام جڑا ہوا ہے۔ وہ لوگ جو رباعی کو رودکی کی ایجاد تصور نہیں کرتے وہ بھی کسی دوسرے موجد کا حوالہ پیش نہیں کرتے اگر رودکی کے علاوہ دوسرے شاعر یا مجتہد نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہوتا تو اس کا ذکر کسی نہ کسی تذکرے یا محقق کے یہاں ضرور ملتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ ترانے اور دوبیتی میں پہلے سے رباعی کے بعض اوزان دستیاب ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے بعض ارباب دانش رودکی کو موجد رباعی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک سطحی سوچ ہے۔ کیونکہ دوبیتی یا ترانے میں رباعی کے ایک دو اوزان کا ہونا یا بعض دوبیتیوں کی خارجی ہیئت کا رباعی کے مشابہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں بنتی کہ رباعی کی ہیئت اور اس کے لیے بحر ہزج سے حاصل کیے گئے چوبیس اوزان رودکی کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ بحر ہزج اور پہلے سے موجود ترانوں اور دوبیتیوں کے مختلف نمونوں کو سامنے رکھ کر رودکی نے رباعی کو ایک منفرد صنف کے طور پر وضع کیا ہوگا اور یہ نئی صنف اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ترانے، دوبیتی اور مختصر قطعہ سے ممتاز اور دلکش ہونے کی وجہ سے فارسی کی اہم ترین اصناف میں شامل ہوگئی۔

بعض لوگ عربی نام ہونے کی وجہ سے رباعی کو اہل فارس کی ایجاد تصور کرنے میں شک و شبہ پیدا کرتے ہیں حالانکہ بعض زحافات اور بحریں جو فارسی عروضیوں کی فکر کا نتیجہ ہیں، ان کے نام بھی عربی ہیں تو کیا یہ مان لیا جائے کہ یہ بحریں اور زحافات بھی اہل فارس کے وضع کردہ نہیں ہیں؟

بقول ناوک صاحب ایرانی محققین کا راہ تحقیق بستہ است، کہہ کر ہتھیار ڈالنا اور اسی مجبوری کے تحت رودکی کو موجد رباعی تسلیم کرنا فہم سے بالاتر بات ہے۔ تحقیق کی ذمہ داریاں پورا کرنے والا کسی بھی ملک کا ہو سکتا ہے اور اس کی کاوشیں قابل قدر ہی رہیں گی اس کے برعکس اپنے ہی ملک اور اپنی زبان سے متعلق کام کرنے والا محقق اگر اصول تحقیق سے واقف نہیں ہے تو اس کی ساری محنت بیکار ہی رہے گی۔ خود رباعی کے حوالے سے آقائی محمد قریب ''دبیر'' ادبیات فارسی کا یہ عجیب و غریب انکشاف ملاحظہ فرمائیے:

''رباعی: چہار تا پی دور اصطلاح عروض چہار مصراع شعر کہ مصراع اول و دوم و چہارم آں با قافیہ و بہ اوزان ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ باشد اگر ایں وزن نباشد آن را ''دوبیتی'' می گویند۔(۹)

لیجئے ماہرین رباعی تو لاحول ۔۔۔۔الخ کو چوبیس اوزان میں سے ایک وزن رباعی قرار دیتے ہیں اور آقائی محمد قریب صرف لاحول الخ کو رباعی کا وزن قرار دے کر بقیہ اوزان کو دوبیتی کے اوزان میں شامل کر دیتے ہیں۔ کیا فارسی کے اس ماہر ادبیات کی یہ بات صرف اس کے اہل فارس ہونے کی وجہ سے صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے؟

عنوان چشتی یعقوب بن لیث کے لڑکے کی جوز بازی کے قصے کو مسترد کرتے ہوئے یہ صحیح لکھتے ہیں کہ ''رباعی کے اوزان کسی اتفاقی امر کے مرہون منت نہیں بلکہ عروض کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں بحر ہزج سے حاصل کیے گئے ہیں۔''(۱۰)

سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ عروض کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں بحر ہزج سے رباعی کے باقاعدہ اوزان کس نے حاصل کیے؟ اگر وہ رودکی نہیں تھا تو مخالفین رودکی رباعی کے اصلی موجد کا نام کیوں پیش نہیں کرتے؟

بحر حال یہاں رودکی پر اجمالی گفتگو کے بعد اسی کو موجد رباعی تسلیم کرتے ہوئے اس کے وضع کردہ چوبیس اوزان کے بارے میں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ رودکی نے عروض خلیل ہی کی روشنی میں بحر ہزج سے بنیادی مزاحف وزن مفعول فعاعیل مفاعیل فعل افعول اور عمل معاقبہ سے مفعول مفاعلن مفاعیل فعل افعول اخذ کر کے تحسنیق کے ذریعہ چوبیس اوزان حاصل کیے اور ان کو رباعی کے لیے مخصوص کر دیا۔ خواجہ حسن قطان خراسانی نے ان اوزان کو شجرۂ اخرب و اخرم میں بانٹ کر خرم، بتر، شتر اور زلل جیسے حافات کو بھی اوزان رباعی کی برآمدگی کا اہم وسیلہ بنا دیا جس کی وجہ سے اوزان رباعی کی تعداد کا مسئلہ مغالطوں کا شکار بنتا چلا گیا۔ چنانچہ رباعی کے متداول اوزان کی مختلف ترتیب سے بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے اوزان کی بیاسی ہزار نو سو چوالیس شکلوں کا ذکر کیا ہے۔ اور عنوان چشتی نے مروجہ اوزان میں بارہ نئے اوزان کے اضافے کے پیش نظر رباعی کے اوزان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار چار سو قرار دے دی۔ (۱۱) گویا رباعی کے

اوزان کا حصول علم عروض کی صحیح تفہیم کی بجائے ریاضی کے اصول تقسیم وضرب کا نتیجہ بنا دیا گیا۔

سحر عشق آبادی پہلے ماہر عروض ہیں جنہوں نے رودکی کے حکم معاقبہ کے تحت حشو اول میں مفاعیل کی جگہ مفاعلن لانے کو دلیل بنا کر حشو دوم کے مفاعیل کی جگہ مفاعلن رکھ کر مزید بارہ اوزان کا اضافہ کیا۔ ان کا یہ تحقیقی مضمون لاہور ویکلی ، لاہور ۱۹۶۱ء کے حوالے سے منظر عام پر آیا۔ مگر ۱۹۸۵ء میں عنوان چشتی نے اپنی کتاب ''عروضی اور فنی مسائل'' میں یہ تو اقرار کیا کہ رکن سوم مفاعلن (مقبوض) لانے کے سلسلے میں پہلی بار توجہ علامہ سحر عشق آبادی نے دلائی۔ (۱۲) مگر مضمون اس انداز سے لکھا ہے گویا نئے اوزان کا اضافہ انہیں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ (ان کے اس طریقہ کار سے بیس سال قبل میں بھی مغالطہ کا شکار ہو چکا ہوں) سحر عشق آبادی کی اس تحقیق سے شارق جمال، ناوک حمزہ پوری اور سکندر احمد جیسے عروضی متفق نظر آتے ہیں مگر ذاکر عثمانی اس کو کلی طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ (۱۳)

سحر عشق آبادی کے بعد ان کے شاگرد رشید زار علامی نے صدر وابتدا میں عمل معاقبہ اور خرم کے استعمال فاعلن کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہوئے مزید اٹھارہ اوزان کا اضافہ کر دیا۔ (۱۴) زار علامی کے دلائل کو ناوک حمزہ پوری غلط قرار نہیں دیتے۔ (۱۵) حالانکہ یہ سحر عشق آبادی کے دلائل سے بھی زیادہ بے بنیاد ہیں۔

استاذی علامہ رمز آفاقی زیادت خرم کے حوالے سے صدر وابتدا میں مفعول اور مفعولن کی جگہ مفاعیل اور مفاعیلن لانے کے قائل تھے مگر خرم یا موفور سے ارکان کی یہ تبدیلی میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔

چونکہ ہمارا موضوع براہ راست رباعی کے اوزان وارکان کا عروضی تجزیہ نہیں ہے بلکہ اس صنف کے حوالے سے آہنگ وہیئت اور ہیئت وقوافی کے اب تک کئے گئے تجربات کا اجمالی جائزہ پیش کرنا ہے اس لیے آہنگ کے تعلق سے رباعی کے تخلیقی عمل کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی کی یہ رائے پیش کر کے بحث کو آگے بڑھانا مناسب سمجھتا ہوں۔

''اردو والوں نے عام طور پر تین چار اوزان ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔'' (۱۶)

اس بات سے قطع نظر کہ موصوف تین اور چار کے درمیان ''ہی'' کا استعمال ہی غلط کیا ہے۔ ان کی تحقیق بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ ناوک حمزہ پوری نے تحریر کیا ہے کہ ''حضرت جلیل مانک پوری نے متعدد اساتذہ کی رباعیوں کے عروضی تجزیاتی مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اردو رباعی گو شعرا نے سولہ اوزان ہی کثرت سے برتے ہیں۔ اسی طرح شمیم احمد کی کتاب ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں'' میں مذکور ہے کہ ولی گجراتی نے صرف گیارہ اوزان سے کام چلایا ہے تیرہ سے واسطہ نہیں رکھا۔ مرزا غالب اور ان کے ہم عصر ذوق نے محض بارہ بارہ اوزان برتے ہیں۔'' (۱۷)

عموماً ناقدین رباعی نے مختار ہاشمی کا ذکر تک کرنا گوارہ نہیں کیا ہے جبکہ حقیقت یہ کہ ان کا مجموعہ شاعری ''گردش رنگ'' کے عنوان سے ۱۹۷۵ء میں لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ سے طبع ہوا تھا اور اس مجموعے میں چوبیس اوزان کی چوبیس رباعیاں موجود ہیں۔ ہر رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع بنیادی وزن پر ہے اور تیسرا مصرع اس سے مستثنیٰ ہے۔

(۲) مختار ہاشمی نے جس طرح چوبیس اوزان کی چوبیس رباعیوں میں تیسرے مصرع کو بنیادی وزن سے مستثنیٰ کر دیا ہے خاکسار نے اسی طریقہ کو پسند کرتے ہوئے ۱۹۸۲ء میں چھتیس اوزان کی چھتیس رباعیاں کہہ کر مختلف رسائل میں شائع کرائی تھیں۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اپنے رسالے ماہنامہ صریر کے سالنامہ ۲۰۰۱ء میں انہیں ایک ساتھ شائع کیا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ ناقدین رباعی کی نظریں ان پر نہیں پڑیں۔

(۳) اگرچہ زار علامی نے اپنی عروض کی کتاب کلید عروض میں اوزان کی بحث کے ساتھ بطور نمونہ چون اوزان کی رباعیاں بھی تحریر کی ہیں مگر ان پر مشتمل باقاعدہ مجموعہ ارمغان رباعیات کندن کے نام سے ۲۰۰۳ء میں کندن لال کندن نے شائع کیا ہے۔

(۴) استاذی رمز آفاقی کے مجوزہ اصولوں کی روشنی میں رباعی کے اوزان کی تعداد چوراسی ہوجاتی ہے۔ جمنا پرشاد راہی نے ان چوراسی اوزان میں رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی چوراسی اوزان پر مشتمل یہ رباعیاں ان کے مجموعہ رباعیات ''سفر گداز'' میں شامل ہیں۔

(۵) مذکورہ بالا اوزان وآہنگ کے تجربات کے عملی نمونوں کو بخوف طوالف قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اردو میں چھ رباعیوں میں چوبیس اوزان کا تجربہ بے حد اہمیت رکھتا ہے، اس لیے رباعی کے اوزان اور ان کے تحت کہی گئیں رباعیوں کو اوزان کی نشاندہی کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

شمس الدین فقیر نے حدائق البلاغت میں اپنی تصنیف کردہ جو چھ رباعیاں چوبیس اوزان پر مشتمل تحریر کی ہیں وہ فارسی میں ہیں۔ اردو میں اس طرح کی رباعیوں کا ذکر دبی پرشاد سحر بدایونی نے ''معیار البلاغہ'' میں کیا ہے۔

"ان چھ رباعی عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی کا ہر مصرع ایک وزن رباعی پر ہے"(۱۸)

بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے بھی عزیز بریلوی کی چھ رباعیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ''معیار البلاغہ'' میں موجود ہیں اور میں انہیں یہاں نمونتہً پیش کرنا چاہتا تھا مگر تقطیع کرنے پر معلوم ہوا کہ شجرۂ اخرب کے تحت تخلیق کردہ تین رباعیات میں کچھ اوزان کی تکرار کی وجہ سے شجرے کے دس اوزان ہی استعمال ہو سکے ہیں۔ اسی طرح شجرۂ اخرم کی تین رباعیوں میں دو مصرع ناموزوں ہیں اور اس وجہ سے اس میں بھی دس اوزان ہی استعمال ہو سکے ہیں۔ اسی طرح شجرۂ اخرم کی تین رباعیوں میں دو مصرعے ناموزوں ہیں اور اس وجہ سے اس میں بھی دس اوزان ہی استعمال ہو سکے ہیں۔ اس تخلیقی تسامح کی بنا پر رباعیاں چھوڑ کر میں اپنی رباعیات یہاں نقل کروں گا۔

خواجہ حسن قطان نے شجروں کی تقسیم اخرب واخرم کے عنوان سے کی ہے جو غلط ہے۔ لیکن آہنگ وغنائیت کے تحت اگر شجروں کو مفعول اور مفعولن کے خانوں میں بانٹ کر اوزان لکھ دیئے جائیں تو یہ مناسب عمل ہوگا۔ رباعیوں سے پہلے ذیل میں اوزان لکھے جا رہے ہیں تا کہ ان کے تحت رباعیات کی نشاندہی کی جا سکے۔

	مفعول سے شروع ہونے والے اوزان		مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان
۱	مفعول مفاعیلن مفعول فعل	۱	مفعولن مفعولن مفعول فعل
۲	مفعول مفاعیلن مفعول فعول	۲	مفعولن مفعولن مفعول فعول
۳	مفعول مفاعیلن مفعولن فع	۳	مفعولن مفعولن مفعولن فع
۴	مفعول مفاعیلن مفعولن فاع	۴	مفعولن مفعولن مفعولن فاع
۵	مفعول مفاعلن مفاعیل فعل	۵	مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
۶	مفعول مفاعلن مفاعیل مفعول	۶	مفعولن فاعلن مفاعیل فعول
۷	فعول مفاعلن مفاعیل فع	۷	مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
۸	مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع	۸	مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
۹	مفعول مفاعیل مفاعیل فعل	۹	مفعولن مفعول مفاعیل فعل
۱۰	مفعول مفاعیل مفاعیل فعول	۱۰	مفعولن مفعول مفاعیل فعول
۱۱	مفعول مفاعیل مفاعیلن فع	۱۱	مفعولن مفعول مفاعیلن فع
۱۲	فعول مفاعیل مفاعیلن فاع	۱۲	فعولن مفعول مفاعیلن فاع

اب دونوں شجروں کے تحت تخلیق کردہ خاکسار کی رباعیاں ملاحظہ کیجئے

مفعول سے شروع ہونے والی رباعیاں (۱)		مفعولن سے شروع ہونے والی رباعیاں (۱)	
وحشت کے ہوئے پیدا ساماں سرِ شام	(۲)	گہرائی باطن کی ٹٹولے مراجع	(۹)
ہونے لگا پھر ذہن پریشاں سرِ شام	(۱۰)	اس کی رگ رگ میں زہر گھولے مراجع	(۵)
پھر دل میں تیرے غم کی کرامت جاگی	(۱۱)	کانپ اٹھتا ہے کذب سے روشن وچشم	(۱۲)
کھینچ آیا نگاہ میں بیاباں سرِ شام	(۶)	جب لہجے کی رہیں کھولے مراجع	(۱)
(۲)		(۲)	
کس غم کے نئے سانچے میں ڈھلنے لگا میں	(۹)	بعد مدت جب دیکھا آئینہ	(۳)
کس کرب سے کروٹیں بدلنے لگا میں	(۵)	آنکھیں حیران کر گیا آئینہ	(۷)
نیندوں کا نشہ بدن میں پھیلا ہی تھا	(۷)	روشن تھی رخ پہ نامرادی کی گرد	(۷)
بستر سے اٹھا، اٹھ کر چلنے لگا میں	(۱)	مجھ کو پڑھ کر ہنسنے لگا آئینہ	(۱۱)
(۳)		(۳)	
یوں دل میں نہ تاریکیاں بوتا احساس	(۱۲)	ہو کر مختار ذہن محکوم ہے آنکھ	(۶)
ہر داغ گناہ و جرم دھوتا احساس	(۸)	سرتا پا مجبور ہے مظلوم ہے آنکھ	(۱۰)
تو ایک مثالی انساں بن جاتا	(۳)	اے راتو! کھولو مجھ پر بھی یہ راز	(۴)
تجھ میں جو اگر زندہ ہوتا احساس	(۴)	اب تک کیوں خوابوں سے محروم ہے آنکھ	(۲)

خاور نقیب کے اصرار پر ۲۰۰۵ء میں میں نے یہ رباعیات ان کے رسالے میں سلسلہ وار ترویج میں اشاعت کے لیے روانہ کر دی تھی جو شائع بھی ہوئیں۔ ان کی اشاعت کے بعد طہور منصوری نگاہؔ نے پھر ابراہیم اشک نے اور سب سے بعد میں علامہ ناوک حمزہ پوری نے چھ رباعیوں میں چوبیس اوزان کا استعمال کیا۔ (ناوک صاحب نے رباعیات کے ایک انتخاب میں یہ رباعیاں مع تخلیقی فارمولے کے ۱۹ر جنوری ۲۰۱۰ء کو مکتوب لکھ کر مجھ سے طلب کی تھیں۔ انتخاب تو آج تک شائع نہیں ہوا مگر ان کی رباعیات مع فارمولے کے کئی رسائل میں شائع ہو گئیں۔)

(۶) شجروں کے غلط اوزان کے ساتھ کمال احمد صدیقی نے بھی چوبیس اوزان پر مشتمل اپنی چھ رباعیات اپنی عروضی کتاب ''آہنگ اور عروض'' میں اوزان کی نشان دہی کے ساتھ پیش کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۷) چاروں مصرعوں کے آخری حروف کی قرأت میں خفت وزیارت سے چار مصرعی نظم ذوفن ہو جاتی ہے اس لیے اگر مصرعوں کو فعول مفاعیل مفاعیل فعول کے وزن پر پڑھا جائے تو نظم رباعی بن جاتی ہے اور اگر مصرعوں کو مفعولن مفاعیل مفاعیل فعولن کے وزن پر پڑھا جائے تو نظم دوبیتی کی ایک ہیئت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

خوشبو سے محبت کی ہوں لبریز ہوائیں
ہر طرح کی نفرت سے ہوں بیگانہ فضائیں
قدروں کے امینو! ہے ہماری یہی رائے
اس شہر کے مابین کوئی گاؤں بسائیں
(اسلم حنیف)

(۸) رباعی کے تخلیقی تجربات میں ہم دواوین کے تدوینی عمل کو غیر اہم قرار نہیں دے سکتے۔ اردو کے باکمال شاعروں نے جہاں اردو غزل کے دواوین کی ترتیب پر ابتداء ہی سے توجہ دیتے رہے ہیں۔ رباعی کے دواوین کی تدوین کے مشکل ترین عمل سے بھی اسلاف بے بہرہ نہیں رہے۔ حروف تہجی کو بالترتیب ردیف بنا کر باقاعدہ رباعی کی تخلیق کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے۔

''جعفر علی حسرت لکھنوی غالباً واحد شاعر ہیں جنہوں نے ایک پورا دیوان رباعیات مرتب کیا تھا۔''(۱۹)

کوثر صدیقی کی مجموعہ رباعیات ''موج سبو'' کے مقدمہ میں فاروقی صاحب مولوی اموجان کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ جعفر علی حسرت اور اموجان ولی دہلوی شاگرد غالب کے علاوہ شاید کسی پرانے اردو شاعر نے دیوان رباعیات مرتب نہیں کیا۔''(۲۰)

رباعیات کے پہلے صاحب دیوان شاعر پر بحث سے قبل اس بات کا اشارہ بے محل نہیں ہوگا کہ ۱۸۹۹ء میں مولانا حسرت موہانی نے جعفر علی حسرت لکھنوی کا دیوان شائع کیا تھا جس میں انہوں نے حسرت کی رباعی گوئی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کلیات کے ضائع ہوجانے پر بھی اظہار افسوس کیا ہے۔ جعفر علی حسرت کی رباعیات دستیاب نہ ہونے کا تذکرہ شمس الرحمن فاروقی نے بھی کیا ہے۔ اس لیے رباعیات کا دیوان نہ ملنے کی وجہ سے ان کے بارے میں رائے قائم کرنا غیر مناسب ہے۔ جہاں تک اموجان ولی کا تعلق ہے انہوں نے رباعیات کا دیوان مرتب کیا تھا۔ اس سلسلے میں مالک رام نے تلامذۂ غالب میں اموجان ولی کے دیوان رباعیات کا نام ''عجائبات اموجان ولی'' تحریر کرتے ہوئے اسے تاریخی نام قرار دیا ہے۔ اور اس نام سے دیوان کے مرتب ہونے کی تاریخ ۱۸۰۲ء میں ولادت اور ۱۸۷۹ء میں وفات ہوئی۔ آپ کا مجموعہ رباعیات ''ترانۂ خامہ'' ۱۳۰۲ھ بمطابق ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا جس کا نیا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔(۲۱)

بعض لوگ عبدالغفور نساخ کو رباعی کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ نساخ کے دیوان سے بھی سینتالیس سال قبل غمگین دہلوی رباعیات کا دیوان مرتب کر چکے تھے۔

میر علی غمگین دہلوی (۱۷۵۳ء۔۱۷۵۱ء) نے اٹھارہ سو رباعیات کے مجموعہ ''مکاشفات الاسرار'' کے عنوان سے ۱۲۵۵ھ میں مرتب کیا تھا اس قلمی نسخہ کے پہلے حصے میں ایک سو چار دوسرے حصے میں چھ سو اور تیسرے حصے میں ایک سو پچپن رباعیات شامل ہیں۔ حصہ اول وسوم سے قطع نظر دوسرے حصے کی رباعیات جو واردات قلبی کے اظہار پر مشتمل ہیں۔ ''الف'' تا ''یے'' ردیف وار درج ہیں۔ اس نسخہ کو یعنی ''مکاشفات الاسرار'' کو علمی کتاب گھر، کراچی نے پہلی بار ۲۰۰۸ء میں شائع کیا ہے۔ بہرحال اب تک کی معلومات کے پیش نظر میں غمگین دہلوی کو رباعیات کے دیوان کا پہلا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔

(۹) عموماً دیوان کی ترتیب میں حروف تہجی کی ترتیب کو من وعن برقرار رکھا جاتا ہے مگر شاہ حسین نہری نے اپنے دیوان رباعیات ''ربیعہ'' (مطبوعہ ۲۰۰۹ء) میں حروف تہجی کو معکوس (یائے لین تا الف) کی شکل میں برتا ہے۔

(۱۰) طلباء میں بیت بازی کے مقابلہ کے لیے بغیر کسی صنف کی تخصیص کے کئی مجموعہ موجود ہیں۔ بیت بازی کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خالص رباعیات پر مشتمل تالیف یقیناً قابل قدر کارنامہ ہے۔ شمیم احمد نگینوی نے ڈھائی سو شعراء کی ڈھائی ہزار رباعیات کو اصول بیت بازی کے تحت مرتب کر کے گنجینۂ رباعیات کے عنوان سے پہلی بار ۲۰۱۴ء میں شائع کیا ہے۔

(۱۱) تضمینی رباعیات کا چلن بھی اردو میں بہت پہلے سے قائم ہے۔ سنجیدہ رباعیات کے حوالے سے شمس الرحمن فاروقی کی یہ رباعی ملاحظہ فرمائیے جو شیخ ابوسعید ابی الخیر کی رباعی پر تضمین کا نتیجہ ہے۔

ملتی نہیں غیر سے یہ سرحد ہرگز
اوروں کے لیے نہیں یہ مسند ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر کسے وگر نہ روید کرو
(ماخوذ آسمان محراب)

(۱۲) خاکسار نے اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ رباعی کے مصرعہ پر مزاحیہ مصرع چسپاں کر کے تضمین کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہر جملہ میں رکھا ہوا اک چاقو ہے
ہر سطر کہ نقش قدم آہو ہے
یہ خط ہے کہ یا میری محبت کا مذاق

''القاب میں دیکھئے ڈیر کلو ہے''

(۱۳) فیضی کی تفسیر بے نقاط ایک اہم اور نادر کارنامہ ہے۔ اردو میں انشاء اللہ خاں نے نثر اور نظم دونوں میں صنعت غیر منقوط کے تجربے کیے ہیں۔ ان کا ایک شعری دیوان اسی صنعت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے غیر منقوط رباعیات بھی تخلیق کی ہیں۔

گم ہوگا واللہ اور دکھ کا عالم
کر ورد درود کا مسلم ہر دم
رکھ آس سدا کہا کر ان شاء اللہ
اللہ ارحم ارحم ارحم ارحم

(۱۴) اساتذہ نے غزل اور مثنوی میں صنعت ذوقافیتین اور ذوقافیتین مع الحاجب کا استعمال کیا ہے مگر رباعی میں ان کا استعمال میری نظر سے نہیں گذرا۔ ہم عصر شعرا میں ابراہیم اشک نے ثانی الذکر تجربہ کا اعادہ رباعی کے حوالے سے کیا ہے:

گھر چھوڑ کے فرزا نے نکل جاتے ہیں
در چھوڑ کے مستانے نکل جاتے ہیں
دنیا کے لیے دارورسن پر اپنے
سر چھوڑ کے دیوانے نکل جاتے ہیں

(۱۵) اردو شعراء کی غزلوں میں کئی کئی قوافی کے متواتر استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ رباعی میں اس طرح کی مثال مجھے دوسرے شعراء کے یہاں نہیں ملی اس لیے اپنی رباعی لکھ رہا ہوں:

غم نغمۂ غفلت میں جو ڈوبا ہوا آئے
دو لاکھ ہر اک حد سے گزرتا چلا جائے
بس اتنی دعا کا ہوں میں طالب تجھ سے
یارب! وہ مرے دل کو نہ صحرا بنا پائے

(۱۶) تاریخ نویسی ایک مشکل ترین فن ہے لیکن اس کے ماہرین نے اس فن کی بھی قسمیں وضع کر کے اسے مزید مشکل اور متنوع بنا دیا۔ کسی لفظ، جملے یا مکمل مصرعہ کے حروف کے اعداد کو جمع کرنے پر کسی کے مکان، کتاب یا کسی اور شئے کی ابتداء یا تکمیل یا کسی کی پیدائش اور موت وغیرہ کی تاریخ نکالنے کو ''سالم تاریخ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ دیگر طریقوں سے زیادہ مقبول رہا ہے۔ موجودہ عہد کے رباعی گو شاہ حسین نہری نے شمیم احمد کے مرتبہ مجموعہ رباعیات ''گنجینہ رباعیات'' کے سن اشاعت حاصل کرنے کے لیے ذیل کی رباعی تخلیق کی ہے۔

گل ریز رباعیات کش مجموعہ (۱۴۳۵ھ)، قطبین رباعی کا امٹ گلدستہ (۱۴۳۵ھ) تدوین شمیم احمد صدیقی شاہ، (۱۴۳۵ھ) خوش رو یہ رباعیات ہیں گنجینہ (۲۰۱۴ء)

متذکرہ رباعی کے ابتدائی تین مصرعوں سے سن ہجری اور آخری مصرع سے سن عیسوی اخذ کیا گیا ہے جس سے شاعر کی مہارت فن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱۷) توشیح بھی ایک قدیم صنعت ہے۔ اس صنعت کے تحت نظم کے ابتدائی حروف کو جمع کرنے پر ممدوح یا کتاب وغیرہ کا نام برآمد ہوجاتا ہے۔ اسلاف توشیح کے ابتدائی حروف کو مصرعوں سے قبل نہیں لکھتے تھے۔ خاکسار نے اسے ایک صنف کے طور پر متعارف کراتے ہوئے حروف کو قبل مصرع لکھنے کی روش کو عام کیا ہے۔ توشیح رباعیات سب سے پہلے میں نے ہی کہی ہیں:

م۔ محروم تجلیات حق تھا یہ جہاں
ح۔ حیوان کی صورت میں تھا زندہ انساں
م۔ مختار جہاں نے تجھے پیدا کرکے
د۔ دنیا سے مٹا ڈالے ظلمت کے نشاں

م، ح، م، د کو یکجا کرنے پر آپ کا اسم گرامی محمد برآمد ہوجاتا ہے۔

(۱۸) دوسری صدی ہجری کے اندلسی شعراء نے موشح کے عنوان سے ہیئت وقوافی کے بے حد عجیب وغریب تجربات کیے تھے۔ ان تجربات میں معریٰ، آزاد اور نثری شاعری کے علاوہ نظم کے ہر مصرع سے قبل، یا ہر مصرع کے بعد یا دونوں جانب چھوٹے چھوٹے مقفیٰ ٹکڑے لگانے کے نمونے بھی دستیاب ہوجاتے ہیں۔ فارسی کا مستزاد بھی عربی کا موشح ہے۔ اہل فارس نے غزل اور رباعی وغیرہ میں مستزاد کے جو تجربے کیے تھے، انہیں کے تحت اردو میں بھی مستزاد غزل اور مستزاد رباعیاں تخلیق کی گئیں۔ مومن کی مستزاد رباعی ذیل میں نقل کی جارہی ہے:

گہہ دین میں تھا لقب یگانہ اپنا — تھے بت سے خفا
گاہے صنموں کو ہم نے جانا اپنا — اللہ رے خطا
سب دیر وحرم کی خاک چھانی مومن — کیا خاک کہیں
دیکھا تو کہیں نہیں ٹھکانا اپنا — جی بیٹھ گیا

چونکہ متذکرہ رباعی کے اضافی ٹکڑے اس طرح لگائے ہیں کہ انہیں ہٹانے پر رباعی کا مفہوم متاثر نہیں ہوتا اس لیے یہ اضافہ مستزاد عارض کے زمرے میں آتا ہے۔ مستزاد کی دوسری قسم مستزاد لازم کہلاتی ہے جس میں اضافی مصرعوں کے بغیر مفہوم نامکمل رہ جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کے مفہوم کا گتھاؤ دراصل بنیادی وزن کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس لیے میں کم

ازکم رباعی میں اس اضافے کو قطعاً غیر مناسب قرار دیتا ہوں۔

(۱۹) موشح کی وہ قسم جس میں ہر مصرع سے چھوٹے چھوٹے مصرع چسپاں کیے جاتے ہیں، اردو نظم اور رباعی میں ان تجربات کا احیاء سب سے پہلے خاکسار ہی نے کیا ہے۔ اس طرح کی موشح نما رباعی ملاحظہ کیجئے:

کوتاہ نظر تسکین وحلات کی کہانی لکھ دے
اب ظلم نہ کر احساس پہ ندرت کی کہانی لکھ دے
بیتاب ہوں میں اب چوم کے ہونٹوں سے میری پیشانی
دنیا سے نہ ڈر آج اپنی سخاوت کی کہانی لکھ دے

(۲۰) موشح نما رباعی کی دوسری قسم جس میں دونوں جانب چھوٹے چھوٹے مصرع چسپاں کیے گئے ہیں۔ یہ ہے:

الفت کے ثنا گر آپ کی نہ تفریق مٹائیں گے اگر
بڑھ جائیں گے آزار بیکار ہیں شہپر
تبدیلیاں فکروں میں نہ لائیں گے اگر

(۲۱) ۱۹۷۲ء کے شاعر کے ایک شمارے میں تفضیل احمد کی آزاد رباعیاں شائع ہوئی تھیں۔ اسی سال تفضیل احمد نے اپنی آزاد رباعیوں کا مختصر کتابچہ بھی شائع کرادیا تھا۔ تفضیل احمد نے رباعی کے بنیادی اوزان کو آزاد نظم کی طرح استعمال کیا ہے البتہ قافیہ کے التزام کو مسترد نہیں کیا ہے۔

ہارے ہوئے لشکر میں پریشاں ہم لوگ
آتے ہوئے ساعات کے اندیشوں سے لرزاں ہم لوگ
برفیلی ہواؤں سے بدن ٹھٹھرے ہوئے
اندر کا نگر پاتے ہیں ویراں ہم لوگ

(۲۲) آزاد رباعی ہی کے عنوان سے عبدالمتین جامی نے بھی رباعیاں کہیں ہیں۔ انہوں نے رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرع کو رباعی کے بنیادی اوزان ہی پر تخلیق کیا ہے مگر تیسرے مصرع کو رباعی کے ابتدائی دوارکان تک محدود کردیا ہے۔

دنیا کی نفرت سے ہیں واقف ہم لوگ
ہیں قصہ دوراں کے منصف ہم لوگ
یہ بات بھی سچی ہے
ہر کار غلط کے ہیں مخالف ہم لوگ

یہ حیثیت صنف رباعی کی دو بنیادی خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ بحر ہزج کے مخصوص اوزان ہی میں چار مصرع تخلیق کیے گئے ہوں۔ دوم یہ کہ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع اور غیر خصی رباعی میں تیسرا مصرع بھی باہم ہم قافیہ ہم ردیف ہو۔ اگر ان خصوصیات میں سے کوئی بھی خصوصیت مجروح ہوتی ہے تو ایسی تخلیق کو نظم کے کسی بھی زمرے میں رکھا جائے اسے رباعی نہیں کہہ سکتے۔ مستزاد الزام اور آزاد رباعیات کے تجربے رباعی کی خصوصیات کے قطعاً منافی ہیں۔ اس لیے بحیثیت تجربہ ان کی تاریخی اہمیت تو ہے مگر فنی اعتبار سے انہیں اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح جو اضافی اوزان از روئے عروض غلط زحافات واصول رباعی کے خلاف ہیں، میں انہیں بھی تاریخی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ پیش کردہ بائیس تجربات میں سے اگر کچھ غیر اہم تجربات خارج کردیئے جائیں تب بھی رباعی جیسی محدود مختصر صنف کے حوالے سے کیے گئے تجربات کی تعداد اٹھارہ وانیس رہ جاتی ہے جو یقیناً حیرت انگیز ہے۔

انیس ودبیر نے واقعات کربلا پر جو رباعیاں تخلیق کی ہیں انہیں ''رثائی'' کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن رباعی، مرثیہ اور قصیدے کی طرح موضوعاتی صنف نہیں ہے او رنہ ہی کسی مخصوص موضوع کی رباعیات کو موضوع کی نسبت سے نیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے تجربوں کے ذیل میں میں نے ''رثائی'' کو بطور مثال پیش نہیں کیا ہے۔

تعجب ہے کہ شمس الرحمن فاروقی جیسا صاحب فکر ناقد رباعی جیسی غیر موضوعی صنف کو موضوع کے حدود میں قید کردینا چاہتا ہے۔

''رباعی کی نظری تنقید میں یہ کمی رہ گئی ہے کہ رباعی کے موضوعات کا کوئی تعین نہیں کیا گیا لہٰذا بہت سے لوگ رباعی کو غزل کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اس کے موضوعات میں کوئی قید روا نہیں رکھتے۔'' (۲۴)

ہم جانتے ہیں کہ ابتداء غزل کے موضوعات بھی طے تھے لیکن دھیرے دھیرے غزل نے مروج لفظیات کو رمز وکنایہ اور استعارۂ علامت کے روپ میں ڈھال کر پیش کرنا شروع کیا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ عصری مسائل کو واضح انداز میں اپنے اظہار کے لیے قبول کرلیا۔ غزل کی اسی لچک نے اسے ہر دور کی پسندیدہ اور نمائندہ صنف بنائے رکھا۔ تاریخ کی یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریزی تعلیم کی وجہ سے جو ذہنی اور علمی انقلاب کے آثار رونما ہوئے تھے ان کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا۔ غزل پر طرح طرح کے اعتراضات ہوئے۔ قصیدہ اور مرثیہ جیسی اصناف کا تخلیقی رجحان بھی کمزور پڑتا چلا گیا۔ رباعی یوں بھی اساتذہ ہی کہا کرتے تھے لیکن اس صنف کے ارتقا پر تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور غزل کے ساتھ رباعی بھی اپنے سفر کی طرف گامزن رہی۔

اردو میں ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ ان کے عروج کے دور میں کئی روایتی اصناف اور نظم کی کئی ہیئتوں کے خلاف تنقیدی آوازیں بلند ہوئیں مگر ان کے دوائر سے باہر لاتحریکیت

پسند فنکاروں نے جہاں بعض روایتی اصناف کو زندہ رکھا وہیں رباعی کی صنفی حیثیت کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ تحریکوں کے زوال کے بعد جدید لاتحریک نسل کے فنکار ابھر کر پوری ادبی بساط پر پھیل گئے۔ اور انہوں نے رباعی کو نہ صرف ایک نئی زندگی عطا کی بلکہ اسلاف کے اس مفروضے کو بھی مسترد کر دیا جس کی رو سے یہ مغالطہ عام ہو گیا تھا کہ رباعی نہایت مشکل صنف سخن ہے اور اس کی تخلیق صرف باکمال اساتذہ فن ہی کر سکتے ہیں۔ لاتحریک فنکاروں ہی کی قربانیوں کے نتیجے میں لگ بھگ سن ۸۰ء کے بعد رباعی جس ارتقائی منزل میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا یہ سفر اس کے بے حد تابناک مستقبل کا ضامن ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ موضوعی اعتبار سے ابتداءً رباعی اخلاق و مذہب، حکمت و فلسفہ، پند و نصیحت اور شراب و شباب کے مضامین تک محدود تھی۔ خواجہ میر درد نے اس میں عارفانہ رنگ کا اضافہ کیا۔ میر تقی میر نے اس میں غزل کی نشتریت اور سوز و گداز کی کیفیت کو ابھارا۔ انشاء اللہ خاں نے ''ریختی'' میں رباعیاں کہہ کر ایک نئے پہلو سے رباعی کو آشنا کیا۔ انیس و دبیر نے مرثیہ رنگ رباعیات بھی کہیں اور اس میں سماجی پہلوؤں کی آمیزش بھی کی۔ جرأت نے مختلف رنگ کی رباعیاں تخلیق کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف مضامین بھی رباعی کے حوالے سے پیش کیے۔ حالی نے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے پیش نظر نہ صرف اخلاقی اور فلسفیانہ رباعیات تخلیق کیں بلکہ سیاسی اور اصلاحی رباعیات کہہ کر قوم میں سدھار لانے کی کوشش کی۔ اکبر الہ آبادی نے کھل کر انگریزوں اور مغربی کلچر کے خلاف رباعی کو وسیلۂ اظہار بنا کر رباعی کے تخلیقی دائرے کو مزید وسعت عطا کر دی۔ امجد حیدر آبادی نے صرف رباعیاں ہی کہیں اور تصوف و معرفت کے مضامین تک ہی اپنے اظہارات کو محدود رکھا۔ جوش ملیح آبادی نے عمر خیام کے تخلیقی ورثہ کو اردو میں ایک نئے آہنگ و ولولے کے ساتھ پیش کیا۔ البتہ فراق گورکھپوری نے ''شرنگار رس'' کے تحت عورت کے حسن و جمال اور خط و خال کی عکاسی کر کے رباعی میں ایک نئے موضوع کا اضافہ کیا۔ عبدالعزیز خالد نے نہایت ثقیل عربی فارسی لفظیات کو رباعی کے آہنگ میں ڈھال کر اظہار کے طریقہ کو ماضی کے اسلوب کی طرف موڑ دیا۔ سیماب اکبر آبادی اور ابر حسنی گنوری، یاس یگانہ چنگیزی رنگ میں رباعیاں کہیں۔ یاس یگانہ چنگیزی اور جگت موہن لال رواں، شمس الرحمن فاروقی اور ناوک حمزہ پوری کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ فضا ابن فیضی نے رباعی میں دلکش آہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ حافظ کرناٹکی نے بچوں کے مزاج و صلاحیت کے پیش نظر جو رباعیاں تخلیق کی ہیں، وہ اس صنف میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتی ہیں۔ کوثر صدیقی نے بعض قرآنی آیات کے مفاہیم کو رباعیات میں ڈھال کر ایک اہم اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

ظہیر غازی پوری، مظفر حنفی، خوشتر مکرانوی، حماد انجم، احسان سہگل، فرید پرپتی، طہور منصوری نگاہ، عبدالمتین جامی، اصغر ویلوری، عبید اعظم اعظمی، اسلم حنیف، عبدالاحد ساز، شارق عدیل، کرشن کمار طور، عاقمہ شبلی، مناظر عاشق ہرگانوی، سلطان اختر، سید رحمانی، فراغ روہوی، اختر بارکپوری، ریاض اختر ادیبی، طاہر رزاقی، ارمان نجمی، قیصر شمیم، مقبول احمد مقبول، مشتاق انجم، مامون ایمن اور بہت سے ہم عصر رباعی گویوں کی ایک لمبی کہکشاں ہے جس نے رباعی کو غزل کی طرح عصری حسیت کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ اگر فاروقی صاحب کے بقول رباعی کی نظری تنقید میں اس کے موضوعات بھی طے کر دیئے جاتے تو اس کا حشر بھی قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی جیسی اصناف سخن جیسا ہی ہو جاتا۔

کتابیات:

۱۔ شعر العجم حصہ اول، ص/ ۹۔ ۱۰، ۲۔ سخندان فارس۔
۳۔ فرہنگ ادبیات فارسی ص/ ۲۳۸۔ ۴۔ نقد و بخش، ص/ ۲۹۔
۵۔ تحقیق انتقادی در عروض فارسی، ص/ ۱۰۴۔ ۶۔ تنقید شعر العجم، ص/ ۱۷۔
۷۔ تفہیم رباعی ص/ تفہیم رباعی، ص/ ۱۵۔ ۸۔ تفہیم رباعی، ص/ ۱۵۔
۹۔ وشہ نامہ، ص/ ۵۰۳۔ ۱۰۔ عروضی اور فنی مسائل، ص/ ۵۹۔
۱۱۔ عروضی اور فنی مسائل، ص/ ۲۲۷۔ ۱۲۔ عروضی اور فنی مسائل، ص/ ۷۰۔ ۷۱۔
۱۳۔ عروضی خلیل مکتفی ص/ ۱۳۲۔ ۱۴۔ کلید عروض، ص/ ۲۳۷۔ ۲۴۰۔
۱۵۔ تفہیم رباعی ص/ ۳۷۔ ۱۶۔ درس بلاغت، ص/ ۱۰۲۔
۱۷۔ تفہیم رباعی، ص/ ۳۷۔
۱۸۔ معیار البلاغت، ص/ ۱۰۹۔
۱۹۔ درس بلاغت، ص/ ۱۰۳۔
۲۰۔ موج سبو، ص/ ۵۔ ۶۔
۲۱۔ ناشر اثبات و نفی ترتیب شاہد ساز۔
۲۲۔ کتابچہ رباعی مطبوعہ ۱۹۷۲ء۔
۲۳۔ کوہسار جرنل۔
۲۴۔ موج سبو (مجموعہ رباعیات کوثر صدیقی) ص/ ۶۔

☆☆☆

رباعیاں

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ (9450097929)

تو خالق کُل اور میں بندہ تیرا
دشت و جبل و وادی و صحرا
تیرا تابع ہیں ترے حکم کے خورشید و قمر
جو کچھ ہے دو عالم میں وہ صدقہ تیرا

آئینۂ ہستی میں سنورتا ہوں میں
آغازِ سفر شوق سے کرتا ہوں میں
جھرنا میں نہیں ہوں جو بلندی سے گروں
سبزہ ہوں زمیں پر بھی اُبھرتا ہوں میں

دو وقت ملے مجھ کو فقط روٹی، دال
دل کو مرے ہوگا نہ کبھی رنج و ملال
یارب! تو مجھے بخش دے توفیق اتنی
بچوں کو کھلاؤں میں سدا رزق حلال

دولت رہی ہاتھوں میں، نہ ایمان رہا
انگشت بدنداں، کبھی حیران رہا
ہو پائے میسر نہ سکوں کے لمحے
جب تک رہا دنیا میں پریشان رہا

توفیق جنہیں دی ہے خدا نے نکلے
اسلام کی حرمت کو بچانے نکلے
لازم ہے مسلماں پہ بہ رنگِ شبیرؓ
سر اپنا رہِ حق میں کٹانے نکلے

محنت کا صلہ رہ کے وطن میں پایا
اک منفرد انداز سخن میں پایا
نا قابلِ تردید حقیقت یہ ہے
کامل نہ کسی کو کسی فن میں پایا

انسان کی عظمت کہ کہاں تک پہنچا
محبوب، خدائے دو جہاں تک پہنچا
جبریلؑ نے سدرہ پہ پہنچ کر یہ کہا
مقدور جہاں تک تھا وہاں تک پہنچا

ساقی کہاں، میخانہ کہاں، جام کہاں
دل کو کسی صورت مگر آرام کہاں
میں جوشِ جنوں میں نکل آیا گھر سے
اب دیکھئے ہو صبح کہاں شام کہاں

سرمایۂ اسلاف بھی کھویا ہم نے
نیکی کا کوئی بیج نہ بویا ہم نے
پھر اپنی تباہی کا گلہ کیا کرنا
جب خود سفینے کو ڈبویا ہم نے

ایسی کسی منصف میں بھی جرأت نہ ملی
بیٹے کو سزا دینے کی ہمت نہ ملی
تاریخ ہے انصاف کی شاہد مخمورؔ
دنیا میں عمرؓ جیسی عدالت نہ ملی

صنفِ رباعی اور اس کا فن

انس مسرور انصاری

(قومی اُردو تحریک فاؤنڈیشن، سکراول، اُردو بازار، ٹانڈہ۔ امبیڈکر نگر، یوپی۔ موبائل: ۹۴۵۳۳۴۷۷۸۴)

اردو شاعری کی تمام اصنافِ سخن میں ''رباعی'' مشکل ترین فن ہے۔ اسے ''ترانہ'' ''دوبیتی'' اور ''چار مصرعی'' بھی کہتے ہیں۔ لیکن بالعموم اب ''رباعی'' کے نام سے اس صنف کو مستقل شہرت حاصل ہے۔ قدیم ایران کے فارسی شاعر رودکی کو اس صنف کا موجد کہا جاتا ہے۔ ''رباعی'' میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ لازماً ہم قافیہ ہوتا ہے اور اگر تیسرا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو تو کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ جبکہ ''رباعی'' کے مقابلہ میں چار مصرعوں کے ''قطعہ'' کے لیے رباعی جیسی پابندیاں اور بندشیں نہیں ہیں۔ قطعہ کے لیے نہ پہلے دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے اور نہ ہی شعر کی بحریں اور تعداد مقرر ہیں۔ رباعی اور قطعہ میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ قطعہ ہر بحر میں کہا جا سکتا ہے لیکن رباعی کے لیے چوبیس مخصوص بحریں ہیں جو بحر ''ہزج'' سے مستخرج ہیں۔ ان سے باہر کسی بھی دوسری بحر میں رباعی نہیں کہی جا سکتی ہے البتہ وہ قطعہ ہو سکتا ہے۔

''بحرِ ہزج'' کے رکن ''مفاعیلن'' کی یوں تو متعدد شاخیں اور بھی ہیں لیکن رباعی کے لیے جو چوبیس بحریں مخصوص ہیں اور وہ جن ارکان پر مشتمل ہیں وہ ارکان مفاعیلن کی تراش خراش سے بنائے گئے ہیں اور زحافوں کی ضربوں سے اس سالم رکن کو خوب خوب مجروح کیا گیا ہے۔ اس طرح رباعی کی بندشوں سے کچھ آزادیاں حاصل کی گئی ہیں۔ مذکورہ دس ارکان یہ ہیں۔

مفعول، مفعولن، مفاعلن، مفاعیل، مفاعیلن، فاعلن، فع، فاع، مفع مفاع۔

اوّل چھ ارکان مصرعہ میں بدل بدل کر لائے جاتے ہیں۔ باقی بعد کے چار ارکان یعنی فع، فاع، مفع، مفاع، ہمیشہ مصرعہ کے آخر ہی میں آتے ہیں۔ یعنی شعر کے حصۂ عروض یا ضرب میں۔ ان کے علاوہ کہیں اور کسی مقام میں مستعمل نہیں ہوتے۔

رباعی کے لیے جو چوبیس بحریں مخصوص کی گئی ہیں ان کو دو شجروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک شجرہ کا نام ''اخرب'' اور دوسرے کا ''اخرم'' ہے۔ بارہ بحریں شجرۂ اخرب سے مخصوص ہیں اور بارہ شجرۂ اخرم سے۔ مگر مصرعہ و شعر کی روانی اور موسیقیت کے پیشِ نگاہ رباعی کی چوبیس بحروں میں سے صرف چودہ بحریں مقبول ہو سکیں۔ فارسی اور اردو زبانوں میں رباعی کے لیے یہی چودہ بحریں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔ باقی دوسری بحروں میں رباعی کہی بھی گئی ہے تو محض عروض دانی اور استادانہ فن کے اظہار کے لیے۔

رباعی کی ان چودہ مقبول بحروں میں آٹھ تو شجرۂ اخرب سے متعلق ہیں اور چھ بحروں کا تعلق شجرۂ اخرم سے ہے۔ بعد کی ان چھ بحروں میں بھی دو بحریں ایسی ہیں جن میں رواں شعر نہیں کہے جا سکتے۔ گویا مختصر یہ کہ بارہ بحریں ہی رباعی کے شعر کو رواں دواں رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ شجرۂ اخرب کی آٹھ مقبول بحریں۔

۱۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فع	۲۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
۳۔ مفعول مفاعیل مفاعیل مفاع	۴۔ مفعول مفاعیل مفاعیل مفع
۵۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	۶۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
۷۔ مفعول مفاعلن مفاعیل مفع	۸۔ مفعول مفاعلن مفاعیل مفاع

شجرۂ اخرم کی چھ مقبول بحریں۔

۱۔ مفعولن فاعلن مفاعلن فع	۲۔ مفعولن فاعیلن مفاعیلن فاع
۳۔ مفعولن فاعلن مفاعیل مفع	۴۔ مفعولن فا علن مفاعیل مفاع
۵۔ مفعولن مفعولن مفعول مفع	۶۔ مفعولن مفعولن مفعول مفاع

رباعی کے ارکان کو آپس میں خلط ملط کر دینا جائز قرار دیا گیا ہے۔اخرب کے ارکان اخرم کے ارکان کے ساتھ بلاتکلّف استعمال کیے جا سکتے ہیں۔یعنی کسی مصرعہ کے شروع میں ایک مفعول آجائے یا دو اور تین۔اسی طرح اخرم کی بحر میں ایک مفعولن تو شروع میں آتا ہے لیکن اگر اسی مصرعہ میں کسی اور جگہ آجائے اور استعمال کر لیا جائے تو اس ہیرا پھیری سے کوئی حرج اور فرق واقع نہیں ہوتا۔

رباعی کی ایک عجیب وغریب صفت یہ بھی ہے کہ اس کا ایک مصرعہ چوبیس/ ۲۴ مخصوص بحروں میں سے کسی ایک بحر میں ہوسکتا ہے اور دوسرا مصرعہ دوسری کسی بحر میں۔انتہا یہ کہ چار مصرعوں میں چار جداگانہ بحور کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔اساتذۂ فن نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔البتہ بحر کے معاملہ میں مخصوص چوبیس/ ۲۴ بحروں کی پابندی بہرطور لازمی ہے۔

رباعی کے دس ارکان کے ابتدائی سالم چھ ارکان کو مصرعہ میں کہیں بھی گھما پھرا کر استعمال کیا جا سکتا ہے مگر ضروری ہے کہ شعری آہنگ اور مصرعہ کی روانی وموسیقیت کو ملحوظ رکھا جائے۔بلکہ آہنگِ شعری کو اوّلیت دی جائے۔حالی نے اپنی ایک رباعی کے چار مصرعوں میں چار بحروں کو استعمال کیا ہے۔مثلاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
مفعول مفاعلن مفاعیل مفاع
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں خود کو مجبور
مفعول مفا عیل مفا عیلن فاع
شپّر کو نکلنے کی نہ سوجھی کوئی راہ
مفعول مفاعیل مفاعیل مفاع
خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور
مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

ہر چند کہ چار مصرعوں میں چار مختلف بحریں آئی ہیں تاہم حالی کے ذوقِ سلیم کا یہ کمال ہے کہ پوری رباعی میں لہجہ اور آہنگ کہیں مجروح نہیں ہونے پایا ہے۔اس تفصیل اور تمثیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ رباعی کس قدر دشوار اور مشکل ترین فن ہے۔اس صنفِ سخن کے لیے کتنی پابندیاں اور اُصول وضوابط اور تحدید قائم ہیں۔اتنی قید وبند کے باوجود رباعی کو جو قبولیت اور اہمیت حاصل ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

عصری اردو شاعری میں رباعی کے فن کو زوال آمادہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ہمارے شعراء کی صنفی اور فکری سہل پسندی کے سبب اسے وہ عروج وارتقاء حاصل نہ ہوسکا جس کی وہ مستحق ہے۔

ہمارا یہ مشینی اور صنعتی عہد ادبی ولسانی اظہار کے لیے اختصار بیانی کا متقاضی ہے اور یہی سبب ہے کہ ادب میں مختصر افسانہ، مختصر آزاد منظومات اور غزل میں کم اشعار کا رواج عام ہوا لیکن رباعی کی جو اپنی حد درجہ اختصار بیانی، جامعیت اور سمندر کو کوزہ میں بند کر دینے کی آپ اپنی مثال ہے اور غزل کے بعد دوسری سب سے زیادہ خوبصورت صنف ہے، صرف اس لیے نئے شعراء کے اغماز اور چشم پوشی کا شکار ہے کہ یہ صنف غایت درجہ علوم وفنون اور مشکل پسندی کو دعوت دیتی ہے۔جب کہ یہی وہ نازک ترین صنف سخن ہے جو استعاروں اور کنایوں کے اہتمام سے کبھی کبھی آسمان ادب کو چھونے لگتی ہے اور رباعی کے سامنے غزل اور اس کی نازک خیالی اور نزہت بیانی بھی مات کھانے لگتی ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ جدید عہد میں جدید غزل کی طرح جدید رباعی کی وسیع امکانیات کی طرف بعض شعراء نے جدید اسلوب ومسائل کے ساتھ اس کی طرف خصوصی توجہ کی اور اسے کافی بلندیوں تک پہنچایا۔ان عصری اور جدید رباعیات کا مطالعہ بتاتا ہے یہ کہ صنف فرسودہ نہیں ہے اور غزل ہی کی طرح جدید رنگ وآہنگ کو مکمل طور پر اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اردو رباعی کو اس کے ضوابط وشرائط کے ساتھ جدید اسلوب میں متعارف کرانے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔یہ ہمارے سہل پسند شعراء کی کوتاہی ہے نہ کہ صنف رباعی کی قدامت اور فرسودگی۔خوش آیند بات یہ ہے کہ عہدِ جدید میں بعض اردو شعراء نے اس طرف خصوصی توجہ کی ہے اور رباعیات کے مجموعے منظرِ عام پر آرہے ہیں تاہم اردو رباعی کے حوالے سے امجد حیدر آبادی (۱۸۸۸ء-۱۹۶۱ء) کے بعد ابھی تک کوئی بڑا نام سامنے نہیں آسکا ہے۔

بلاشبہ فارسی رباعیات کا ذخیرہ بے حد وقیع اور بہت زیادہ ہے۔حتیٰ کہ بعض فارسی رباعی گو شعراء صرف اپنی رباعیات کی وجہ سے عالمگیر

شہرت کے مالک ہوئے۔اس کی بہترین مثال عمرؔ خیام ہے۔جس کی رباعیات نے عالمی ادب کو متاثر کیا۔مغربی ادیبوں نے اس خالص مشرقی صنف سخن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے صنفی اور معنوی استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ اسے یورپ کی کئی زبانوں میں منتقل بھی کیا۔

عمرؔ خیام کے بعد سرمدؔ شہید کا نام بھی فارسی رباعی گو شعراء کی فہرست میں بہت روشن اور نمایاں ہے۔ان کے علاوہ فارسی زبان کے بیشتر ممتاز شعراء نے بکثرت رباعیاں کہی ہیں اور غزل کے بعد رباعی کے سوا کسی بھی صنف کو اتنا اہم مقام نہ مل سکا۔اور نہ ہی کوئی دوسری صنف رباعی کی اہمیت اور اس کے مسلّمات سے آنکھیں چار کر سکی۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ فارسی شاعری کے دامن میں رباعیات کے عدیم المثال خزانے موجود ہیں۔ان روشن اور واضح ترین حقائق کے باوجود کہ فارسی کے رباعی گو شعراء کی عالمی شہرتیں، حیثیتیں اور مراتب اردو شاعروں سے پوشیدہ نہ تھے۔کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ اس صنف کی طرف سے تغافل نما بے نیازی برتی گئی اور محض برائے نام رباعیاں کہہ کر گویا ایک صنفی رسم کو ادا کر دینے کی ناتمام سی کوشش کی گئی۔بظاہر کوئی خاص وجہ مانع نظر نہیں آتی۔زبان کا بھی کوئی خاص مسئلہ اور معاملہ نہ تھا۔ایک طرح سے اردو زبان فارسی کے دودھ پر پلی بڑھی اور جوان ہوئی تھی۔مزاج بھی فارسی زبان سے الگ نہ تھا۔حالات اور ماحول بھی مانع نہ تھے۔پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ قدیم شعرائے اردو میں کوئی بڑا رباعی گو شاعر پیدا نہ ہوسکا، اور کسی نے رباعی کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کی وہ مستحق تھی اور ہے۔یوں تو منہ کا ذائقہ بدلنے اور تفریح طبع کے لیے کم و بیش تمام قابلِ ذکر شعراء نے رباعیات بھی کہی ہیں مگر وہ سنجیدگی نہیں پائی جاتی جو فارسی کے رباعی گو شعراء کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ اردو میں رباعی کو مستقل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے اور تمام تر توجہ اور قوتِ فکر غزل، قصیدہ، مراثی اور مثنوی کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئی ہو۔یہی سبب ہے کہ ابتدائی اور بعد کے ادوار میں اردو شاعری کا دامن اس اہم اور قیمتی خزانہ سے تقریباً خالی خالی سا ہے۔اگر متقدمین شعرائے اردو نے 'رباعی' کی طرف سے اس قدر بے التفاتی نہ برتی ہوتی تو آج صورتِ حال یکسر مختلف ہوتی اور غزل ہی کی طرح رباعی بھی مقبول ترین صنف ہوتی اور باوقار بھی!

بعد کے اردو شاعروں نے اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس ادبی و صنفی نقصانات کی کسی قدر تلافی کی کوشش بھی کی، جس کے نتیجہ میں آج کم کم ہی سہی، بہرطور اردو شاعری کا دامن بیش بہا رباعیات سے مالا مال ہے۔اس سلسلہ میں خود صنفِ رباعی کی اپنی کشش اور حسنِ کمال کی بھی افسوں گری ہے کہ اس صنف کی جامعیت کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف سے زیادہ عرصہ تغافل نما بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی تھی۔چنانچہ جب شعراء متوجہ ہوئے تو غزل ہی کی طرح عصری موضوعات کو بھی رباعی کا مرکز و محور بنایا اور ایسی خوبصورت رباعیاں کہی گئیں کہ صنف رباعی کا سارا افادی اور دوامی حسن نکھر کر سامنے آ گیا۔

ہمارے جدید شعراء نے رباعی کو اپنے مخصوص لب ولہجہ، جدید رنگ و آہنگ اور تازہ و شگفتہ اسلوب دے کر نئے امکانات کی تلاش و جستجو کی ہے۔مشینی اور صنعتی دور کے سنگین مسائل تک کو رباعی نے غزل کی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹا ہے۔رمز و کنایہ اور استعارات و علائم اور نادر تشبیہات کو رباعی میں عصری مسائل اور اسلوب کے ساتھ برت کر معاصر شعراء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رباعی ہر قسم کے موضوعات و مضامین کی متحمل ہے اور اپنی تمام تر پابندیوں کیساتھ اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اختصار بیانی اور جامعیت کا دوسرا نام رباعی ہے۔

اردو میں رباعی کے حوالے سے خواجہ الطاف حسین حالیؔ، میر ببر علی انیسؔ، مرزا سلامت علی دبیرؔ، جگت موہن لال رواںؔ، اکبرؔ الہ آبادی، تلوک چند محرومؔ، امجدؔ حیدر آبادی، یاس یگانہؔ چنگیزی، سیمابؔ اکبر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ ملسیانی، جاں نثار اخترؔ، اخترؔ رضوانی، شمس الرّحمن فاروقی، فنؔا پرتا بگڑھی، حافظؔ کرناٹکی، اور بہت سے معروف نام ہیں۔ضرورت ہے کہ اس صنف کی طرف خصوصی توجہ کی جائے۔اسے جدید اسلوب اور نئی معنویت سے زینت دی جائے۔

☆☆☆

مزید امکانات رباعی کے وزن میں

محمد انور ضیا
(عسکر گنج، گورکھپور، موبائل۔9532534809)

ہر چند کہ عرب میں رباعی کا دستور نہ تھا۔ شعرائے عجم نے یہ بحر ہزج میں سے نکالی ہے۔ معیار البلاغت میں اس کا موجد استاد رودکی کو لکھا ہے۔ جب کہ تذکرہ دولت شاہ میں یعقوب بن لیث صفار کو۔ وجہ ایجاد میں واقعہ کی مماثلت ہے۔ کہ ایک لڑکا جو بازی کر رہا تھا، چند جوز گی چی میں ڈالنا چاہتا تھا کہ چھ جوز گو چی میں جا پڑے اور ایک جوز جو کہ باقی رہا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے لڑھک کر گو چی میں چلا گیا۔ خوشی میں لڑکے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ؎

''غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو''

استاد رودکی کو یہ جملہ پسند آیا، مصاحبوں کو حکم دیا کہ اس کو جانچیں کہ شعر کی قسم سے ہے یا نہیں، تقطیع کی تو بحر ہزج میں موزوں پایا۔ ایک مصرع اس کے ساتھ لگا دیا اور پھر ایک بیت بڑھا کر دوبیتی کہنے لگے۔ اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد رباعی نام مقرر کیا۔ ترانہ اس کو اس لئے کہتے تھے کہ ارباب موسیقی نے اس وزن پر اچھے اچھے راگ بنائے۔

وہ زحاف جو رباعی میں مستعمل ہیں عرب کے اشعار میں نہ تھے۔ متاخرین عرب نے اس میں دلچسپی لی اور عربی میں اس کا رواج ہو گیا۔ بہر حال زحاف اس میں نو(۹) آتے ہیں۔

خرم، خرب، قبض، کفّ، ہتم، شتر، جبّ، بتر، زلل

وہ دس ارکان جن سے باہم ترکیب ہو کر رباعی کے چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہیں

۱۔ رکن مفاعیلن سالم ہے
۲۔ رکن مفعولن اخرم ہے
۳۔ رکن مفعول (بضم لام) اخرب ہے
۴۔ رکن مفاعلن مقبوض ہے
۵۔ رکن فاعلن اشتر ہے
۶۔ رکن مفاعیل (بضم لام) مکفوف ہے
۷۔ رکن فعول (بسکون لام) اہتم ہے
۸۔ رکن فعل (بسکون لام) مجبوب ہے
۹۔ رکن فع ابتر ہے
۱۰۔ رکن فاع ازل ہے

بھلا ہو نصیر الدین محقق طوسی کا جنھوں نے ''تسکین اوسط'' کے نام ایک ایسا زحاف دریافت کر دیا کہ تبدیلیوں کے ساتھ آہنگ کو مجروح نہیں کرتا خیال رہے کہ رباعی کی بحر میں اس زحاف کا عمل حشو و عروض و ضرب تک محدود رہے۔ کیونکہ رباعی کا آہنگ و امتیاز صدر و ابتدا میں دو سبب خفیف کا ہونا ہے۔ (اگر چہ فاصلہ صغریٰ، اور فاصلہ کبریٰ (شروع کے تین متحرک اور چار متحرک والے رکن) والے ارکان میں بغیر کسی قید کے اساتذہ نے تسکین اوسط' کو روا رکھا ہے)

مثال کے طور پر غالب کے اس شعر میں

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　نالہ پابند نے نہیں ہے

پہلا مصرعہ مفعول مفاعلن فعولن کے وزن پر ہے جب کہ دوسرا مصرع مفعولن فاعلن فعولن کے وزن پر ہے۔

اسی طرح فَعِلَتُن جیسے رکن میں تسکین اوسط بعد فاعلن یا فعولن کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ تمام بحور میں اس زحاف کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ انتہائی کارآمد زحاف ہے۔

چند رباعیاں اساتذہ کی

(۱) میر تقی میرؔ

جاناں نے ہمیں کبھو نہ جانا افسوس
جو ہم نے کیا سو وہ نہ مانا افسوس
تب آنے میں دیر کی قیامت اب تو
آیا نزدیک جی کا جانا افسوس

(۲) منشی اسماعیل حسین منیرؔ

جس روز سے دخل بے بسی نے پایا
ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا
اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیرؔ
ڈھونڈھا تو مجھی کو بے کسی نے پایا

(۳) امیر مینائیؔ

بالفرض حیات جاودانی تم ہو
بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو
لیں نام نہ پیاس کا جو پانی تم ہو

(۴)

ہیں باغ عالم میں کیا کیا گل وخار
لیکن ہے دیدۂ بصیرت درکار
بینائی آنکھوں میں نرگس کے ہو
گلشن میں تب کرے تماشائے بہار

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

رباعی کے بنیادی مصرعے

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

اگرچہ بعضوں نے یہ قید لگائی تھی کہ اگر رباعی کا پہلا مصرعہ اخرب رکن سے شروع ہو تو چاروں مصرعے اخرب سے شروع ہوں گے اسی طرح اگر رکن اخرم سے شروع ہوں تو پھر چاروں مصرعے اخرم سے شروع ہونگے۔ لیکن اساتذہ کے کلام میں اس کی قید کم دیکھی گئی ہے۔ ان سب کا جمع کرنا جائز اور روا ہے۔

خواجہ امام حسن قطان نے تو جو کہ خراسان سے ہے ان چوبیس اوزان کے منضبط ہونے کے لئے دو شجر بھی ایجاد کر ڈالے۔ حالانکہ بعد میں کچھ سخنوروں نے صدر وابتدا کے رکن اخرم واخرب میں تحریف کرنا چاہی تھی لیکن اجماع کی بے رخی سے وہ خاموش ہو گئے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اساتذہ نے شاید اسی آہنگ (صدر وابتدا میں دو سبب خفیف کا ہونا) کو رباعی کی تخصیصی صفت گردانا ہے۔

حاصل یہ کہ اس بحر کا نام بحر رباعی ہے کیونکہ رباعی سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی شاید اسی سبب محمود الٰہی نے اسے ایک کٹر صنف کہا ہے قصیدہ اور غزل کا رباعی کے وزن میں کہا جانا درست ہے۔ حالانکہ بغور دیکھا جائے تو بحر رباعی کے حشو وعروض وضرب میں تسکین وتخنیق کے عمل سے ہی چوبیس اوزان ترتیب پاتے ہیں۔ شاید انھیں ہیئتی تبدیلیوں کی بنا پر ادب کے ارباب حل وعقد نے اس کو ایک صنف گردانا ہے اگرچہ کسی طرح کے مضمون، نفس مضمون کی قید نہیں رکھی۔

برعکس اس کے ذرا اس بحث سے ہٹ کر ماہرین عروض ولسانیات سے عرض ہے کہ ایک موقع پر ہم نے محترم شمس الرحمٰن فاروقی سے سوال کیا تھا کہ کیوں بحر رمل کے صدر رکن میں فاعلاتن کی جگہ فعلاتن درست ہے تو موصوف نے ذرا ٹھٹھک کر فرمایا کہ اساتذہ نے ایسا ہی روا رکھا ہے۔ ہماری ہمت نہیں پڑی کہ بحر ذخار سے ''کیوں'' اور ''کیسے'' کرتا؟ آپ غور کریں تو یہی عمل آپ کو بحر خفیف میں ملے گا۔ لہٰذا وہ سوال بطور اشکال آج بھی ہمارے ذہن میں منطقی طور سے ہم اس کا جواب چاہیں گے۔

حال جب کہ عام اجماع کے مطابق رباعی کے چوبیس اوزان موجود ہیں اور ان کے استعمال کی مخلوط آزادی دی گئی ہے تو یہی بڑی حد تک کافی ہے۔ ہاں آگے چل کر نئے امکانات پر غور کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بے قاعدگی اور بے آہنگی سے دوچار نہ ہوں۔

مثال کے طور پر اس سلسلہ میں اہل عروض ولسانیات سے ایک امکان پر توجہ چاہتا ہوں کہ رباعی کا یہ وزن جو ''مفعولن مفعولن مفعولن فع'' واقع ہوا ہے کیا اس

کے پہلے حشو میں مفعولن کو ''مفعولان'' نہیں کر سکتے۔ یعنی مطلوبہ وزن ''مفعولن مفعولان مفعولن فع'' ہوجائے۔ جب کہ بعد میں دوسرا حشو مفعولن اور ضرب فع بدستور بدلے جاتے رہیں۔ بس دیکھنا یہ ہوگا کہ آہنگ مجروح نہ ہو اور کسی طرح کا سکتہ حائل نہ ہو۔

اس کی نظیر بحر رجز کے ایک وزن ''مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن'' سے لی جاسکتی ہے جہاں اساتذہ نے رکن مخبون (مفاعلن) کو حشو اور ضرب دونوں جگہ مخبون مذال (مفاعلان) استعمال کیا ہے۔ جیسے ؎

اس نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
(مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلن)
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
(مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلان) غالبؔ
کھیل کھیلاڑی کے یہ دیکھ کیا ہی بہم یہ ہوگئے
(مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلن)
ایک پہ ایک مہرباں آتش وبادوآب وخاک
مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلان) انشاءؔ

صاف ظاہر ہے کہ استاذہ کے شعروں کے درمیان رکن مخبون مذال (مفاعلان) کے استعمال سے کہیں کوئی سکتہ نظر نہیں آتا۔

واضح رہے کہ مخبون مذال (مفاعلان) جو کہ درمیان میں ہے اس کے دن (نون) پر آواز معدوم کی جائے گی، ورنہ 'نون' کے متحرک ہونے سے وزن ہی بگڑ جائے گا۔

تو کیا بحر رجز کے اس وزن ''مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن'' کے ساخت وعمل کی روشنی میں تسبیغ کے ساتھ وزن ''مفعولن مفعولان مفعولن فع'' کا بھی رباعی میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ خیال رہے کہ رباعی کے پہلے حشو میں مفاعیلن رکن بھی آئے گا جہاں تسبیغ کے بعد رکن مفاعیلان ہوجائے گا۔ اس طرح ''مفعولان'' اور ''مفاعیلان'' دونوں کے نون پر آواز کا معدوم ہونا شرط ہے۔ ورنہ وسط میں نون کے متحرک ہونے سے مصرع بحر سے خارج ہوجائے گا۔

آخر میں از راہ تفنن،

سنتے ہیں کہ عموماً ایک آدمی لنچ اور ڈنر میں بیس یا اکیس لقمے کھاتا ہے۔ ماترا کے طور سے دیکھا جائے تو رباعی کے ہر مصرع میں بیس یا اکیس ماترائیں ہوتی ہیں۔

☆☆☆

رباعیات

شاہ حسین نہریؔ

ہم اپنی نظر سب سے جدا رکھتے ہیں
کچھ اور ہے وہ جس کو بچا رکھتے ہیں
مقصود ہمارا ہے نرالا سب سے
ہم آپ سے اپنے کو رِہا رکھتے ہیں

ہم دل کی نظر ہی سے نظر رکھتے ہیں
ہم اصل میں اصلی کی خبر رکھتے ہیں
وجدان کا میدان کشادہ بے داغ
ہم ثبت ہر اک شے کا اثر رکھتے ہیں

تنقیص کہاں کسی کی روا رکھتے ہیں
اخلاص کی ہم خاص ادا رکھتے ہیں
بے لوث نگاہوں کی ارادت مطلوب
ہے ایک خطا، قلب صفا رکھتے ہیں

آنکھوں میں اسے سجا سجا رکھتے ہیں
معمور بھی یہ دل کا سما رکھتے ہیں
جینا یہ سنبھل جائے ذرا جینے دے
ہاں سامنے ہوں گے یہ جیا رکھتے ہیں

ہم مال کہاں اپنا اٹھا رکھتے ہیں
خوش ذوقیِ بازار میں جا رکھتے ہیں
مِلنا ہے جو مِل جائے گا، پانا ہی ہے
کل کے لیے قیمت کو گھٹا رکھتے ہیں

رباعی: فن اور روایت

راشدہ خاتون
(محلہ پچھّم طرف جلال پور، امبیڈکر نگر (یو۔پی) 224149، موبائل : 6307850086)

رباعی اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ 'ربع' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی چار کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں چار مصرعوں والی نظم کو 'رباعی' کہتے ہیں۔ یہ چار مصرعوں کی ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے گویا رباعی اردو کی وہ مختصر ترین صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدت خیال زور تسلسل بیان کی پابندی از بس ضروری ہے۔ رباعی کے پہلے مصرعے میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جاتا ہے، دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خط وخال کچھ اور نمایاں کیے جاتے ہیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جاتا ہے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہو کر نہ رہ جائے یوں سمجھ لیجئے کہ رباعی کے پہلے تین مصرعے رباعی کے مجموعی شاعرانہ حسن واثر کے لیے ایک ایسی لطیف اور سادہ فضا تیار کرتے ہیں جس سے سامع اکثر بے خبر رہتا ہے لیکن یہی سادہ پرکار فضا جب چوتھے مصرعے میں ڈرامائی انداز سے سامنے آتی ہے تو بڑی جرأت آزما بن جاتی ہے۔ چوتھا اور آخری مصرع رباعی کی جان ہوتا ہے کیوں کہ شاعر اپنے فکر وفن، ندرت بیان اور تخلیقی صلاحیت کا سارا زور اس آخری مصرع پر ہی صرف کرتا ہے۔ رباعی میں بحر اور قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ رباعی مقررہ بحر میں کہی جاتی ہے اس کے لیے مخصوص بحر ہزج مقرر ہے۔

اردو کی کلاسیکی اصناف شاعری میں رباعی ایک ایسی صنف ہے جس میں تاریخ کے ہر دور میں طبع آزمائی ہوئی ہے لیکن اس کا تخلیقی تسلسل کبھی بھی باقاعدگی سے قائم نہیں رہا۔ جس کا سبب اس صنف کے سخت اصول وضوابط اور تکنیکی مشکل پسندی ہے۔ رباعی کا فن قطرے میں دریا اتارنے کا فن ہے۔ اس کی صنفی شناخت کا دارومدار اس کی ہیئت سے زیادہ اس کے مخصوص اوزان پر ہے۔ روایتی عروض کی رو سے اس کے کل چوبیس اوزان مقرر ہیں اور وہی رائج بھی ہیں۔ لیکن بعد میں غلام سحر عشق آبادی نے عمل تحقیق سے اس میں بارہ اوزان کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح رباعی کے اوزان کی مجموعی تعداد ۳۶ ہو جاتی ہے اور ان سب اوزان کا خط ایک رباعی بھی آئین عروض کے عین مطابق ہے۔

ابتدا میں رباعی صرف عورتوں اور بچوں تک محدود تھی۔ تاہم جب رباعی کو پسند کیا جانے لگا تو صوفیائے کرام نے اس صنف سے دلچسپی لی اور اس میں تصوف ومعرفت، عشق ومحبت، عمل واخلاق، فکر وغنا اور توبہ ومغفرت کے موضوعات شامل کیے۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی میں مذہبی، اخلاقی اور صوفیانہ، حکیمانہ اخلاقی باتیں کہی جاتی ہیں۔ فارسی شاعر 'رودکی' کو عام طور پر رباعی کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔

رباعی ایک تو انا صنف شاعری ہے اس میں کامیابی کے لیے شاعر کے فکری سرچشمے کا وسیع ہونا ضروری ہے کیونکہ احساسات وجذبات اور مشاہدات کی بیکرانی جب خاص فنی اصول وضوابط کے ساتھ دلکش ترتیب سے چار مصرعوں میں سمٹ جاتی ہے تو رباعی کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔ رباعی کی صنف بڑی مشکل بھی بڑی دلربا بھی ہے۔ اس کو ایک شوخ چنچل اور آفت کی پرکارہ صنف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، جو بڑے بڑوں کو اپنے پٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتی ہے۔ فارسی میں عمر خیام نے اس دلربا صنف سے آنکھ لڑائی اور آفاقی شہرت حاصل کی۔ ابوسعید ابوالخیر، مولانا روم اور شیخ سعدی شیرازی وغیرہ بھی اس کی ادا و ناز کے شکار ہوئے۔ اس کے آگے اردو کے بڑے بڑے پہلوان سخن کا پتہ پانی ہونے لگا اور اس کی زلف کے سر ہونے تک کم ہی لوگ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ چنانچہ جوش ملیح آبادی جیسے قادرالکلام شاعر کو کہنا پڑا کہ:

''رباعی ایسی کمبخت چیز ہے جو سارا جوبن بالے تو ایک باطک پالے کی طرح چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ وہ کمبخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر اندوختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ زمانے کی سرد وگرم ہوائیں شاعر کے احساس تفکر زندگی کے چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی''۔

اردو شاعری میں رباعی گوئی کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اردو زبان۔اس کی ایجاد ایران میں ہوئی۔عربوں نے اہل ایران سے مستعار لیا اور اردو میں دیگر اصناف شاعری کی طرح رباعی بھی فارسی سے درآمد کی گئی۔اردو رباعی فارسی کے رنگ میں کہی جاتی ہے لیکن اس میں ہندوستانی اثرات شامل کیے گئے۔اردو رباعی ہندوستان کے ہر دور کی شاعرانہ خصوصیات اور انقلابات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔دکنی شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی، شاہی، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، اور میرا یعقوب وغیرہ کے یہاں رباعی کے ابتدائی نمونے پائے جاتے ہیں۔شمالی ہند میں ولی، سودا، میر، نظیر، قائم، انشاء، جرأت، رنگین، انیس، دبیر، غالب، مومن اور ذوق وغیرہ شعرا نے اچھی رباعیاں کہی ہیں۔۱۸۵۷ء سے قبل رباعی بھی دیگر اصناف شاعری کی طرح ایک بندھے ٹکے دائرے میں محدود تھی لیکن انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جب مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی کوششوں سے اردو شاعری میں جدید طرز کی شاعری کی ابتدا ہوئی تو دیگر اصناف شاعری کی طرح رباعی بھی جدید حالات و ماحول سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ نئے مضامین و موضوعات پر مشتمل جہاں مولانا حالی نے اصلاحی، اخلاقی اور فلسفیانہ رباعیاں کہیں وہیں ایسی صنف شاعری کو قومی اصلاح کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے اس میں تنوع اور نئے امکانات کے لیے راہ ہموار کی گئی جس سے متاثر ہوکر اکبر الہ آبادی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، علامہ اقبال، فانی، یگانہ، اثر صہبائی، اثر لکھنوی، رواں اناوی، امجد حیدر آبادی وغیرہ نے اس صنف کو ترقی دی۔

بیسویں صدی کے نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول میں اس صنف کو جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری جیسے شعرا نے موضوعاتی اور فکری وسعتیں عطا کیں۔امجد حیدر آبادی نے خاص رباعی گو شاعر کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت حاصل کی اور رباعی کی صنف کو گونا گوئی بخشی جس سے اس صنف کو ہمہ جہت ترقی حاصل ہوئی۔موجودہ دور میں نازش پرتاپ گڑھی، پرویز شاہدی، مخمور سعیدی، شمس الرحمٰن فاروقی اور فضا ابن فیضی جیسے قادر الکلام رباعی گو شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اس صنف کو فکر و فن کے نئے افق سے آشنا کیا۔

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں رباعیاں بھی ملتی ہیں۔اس نے حمد و نعت کے موضوعات کو رباعی میں پیش کیا ہے۔دکنی کے دیگر اہم شعرا نے بھی رباعی گوئی کے فن میں طبع آزمائی کی ہے۔شمال میں درد، میر سوز، سودا، میر حسن، میر انیس اور میر تقی میر رباعی کے ابتدائی دور کے مشہور شعرا ہیں۔میر درد کی رباعیوں میں تصوف کی جھلک ملتی ہے۔وہ کہتے ہیں ؎

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں
ہر حرف میں کتنے ہی ورق پڑھتا ہوں
اس علم کی انتہا سمجھنا آگے
اے درد ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

شمال میں رباعی کے بڑے شاعر کے طور پر انیس ابھر کر آتے ہیں۔ انیس نے مرثیہ کے علاوہ رباعی گوئی کے فن کو بھی عروج تک پہنچا دیا۔ انیس کے کلام میں انسانی اقدار اور اخلاقیات کے موضوعات ملتے ہیں۔انیس نے ایک رباعی میں انسانی زندگی کے حقائق اس طرح پیش کیے ؎

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

حالی نے سرسید کی اصلاح تحریک کے زیر اثر اپنی رباعیوں میں اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کو پیش کیا۔۱۸۵۷ء کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ لوگوں میں پائی جانے والی بے عملی کو دور کرنا چاہتے تھے۔اس کے لیے فرد کی تعمیر ضروری تھی۔چنانچہ حالی نے رباعی گوئی کے مقررہ موضوعات سے اچھا کام لیا۔ان کی ایک رباعی لوگوں کو یہ پیغام دیتی ہے ؎

یارو نہیں وقت ہے آرام کا یہ
موقع ہے آخیر فکر انجام کا یہ
بس حب وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے اب کام کا یہ

حالی کی مقصدیت کو آگے بڑھاتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے روپ میں اپنی رباعیاں پیش کیں۔اکبر نے اپنی نظموں کی طرح رباعیوں میں بھی انگریزی تہذیب کی مخالفت کی۔انگریزی تہذیب کے اثرات کی بدولت مسلمان مذہب اسلام سے بیزاری اختیار کر رہے

تھے۔اس بات سے فکرمند ہوکر اکبر کہتے ہیں ؎

سید صاحب جو سکھا گئے ہیں شعور
کہتا نہیں تم سے کہ ان سے نفور
سوتوں کو جگایا ہے انھوں نے لیکن
اللہ کا نام لیکے اٹھنا ہے ضرور

رباعی گوئی کے اس سفر میں ایک اہم نام جوش کا ہے۔جوشاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے مشہور ہیں۔اپنی رباعیوں میں انھوں نے عیش کوشی اور غم فراموشی کو موضوع بنایا۔ان کی ایک رباعی اس طرح ہے ؎

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں لوگ اپنی ہی عبائیں سی رہے ہیں لوگ
انسان کو بھی ہے کیا شراب پینے سے گریز ان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

فانی نے غزل کے موضوعات کو اپنی رباعیوں میں بھی برتا۔اور غم کے جذبات کو پیش کیا۔فانی ایک رباعی میں زندگی کے تصویر یوں بیان کرتے ہیں ؎

ناکام ازل کی کامرانی معلوم
قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے مرنا شاید
ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

رباعی کے اس سفر میں اہم نام امجد حیدر آبادی کا ہے امجد کو سرمد ثانی کہا گیا ان کی رباعیاں تصوف، اخلاق اور انسانی اصلاح کا اہم سبق فراہم کرتی ہیں ؎

ہر چیز مسبب سے سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

فراق کی رباعیاں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی رباعیوں کے مجموعے کا نام 'روپ' ہے۔انھوں نے رباعی کے دامن کو وسیع کیا اور سنسکرت کے سنگھار رس کو اردو رباعی میں برتا۔رباعی کے عمومی موضوعات بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔انسان کو اس کے مقام کا تعین کراتے ہوئے ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں ؎

پاتے جانا ہے اور نہ کھوتے جانا ہے
ہنستے جانا ہے اور نہ روتے جانا ہے
اول اور آخر پیام تہذیب
انسان کو انسان ہوتے جانا ہے

اردو رباعی کے فروغ میں چند ایک غیر مسلم شعرا نے بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔فراق کے علاوہ رباعی کے فروغ میں ایک اہم نام جگت موہن لال رواں کا ہے۔انھوں نے رباعی کے روایتی موضوعات کو برتا۔ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں ؎

افلاس اچھا ، نہ فکر دولت اچھی
جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاح نفس ناممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

انیس و دبیر کی رباعیوں کی بڑھتی ہوئی شہرت و مقبولیت نے دوسرے شعرا کو اس طرح متوجہ کیا کہ اردو رباعی مجلس اعزا کے حلقہ سے نکل کر عام ادبی جلسوں اور مشاعروں میں جگہ پانے لگی چنانچہ انیس و دبیر کے فوراً بعد حالی، اکبر، اسماعیل میرٹھی، پیارے صاحب رشید اور شاد جیسے ممتاز رباعی نگار پیدا ہوئے جنھوں نے اردو رباعیات کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

رباعی کا اردو شاعری پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اس نے اردو شاعری کے عام لب و لہجہ کو سنجیدہ بنانے میں مدد کی ہے۔رباعی کی وجہ سے جتنا اردو ادب کا لب و لہجہ متین و باوقار رہا غالباً کسی ایک صنف سے اتنا نہیں ہوا۔غرض کہ انیس و دبیر کی بدولت اردو رباعی عوام سے روشناس ہوئی اور حالی اور اکبر نے اس میں قومی، وطنی اور سیاسی رجحانات کو داخل کر کے اسے اردو کی ایک اہم مفید اور ہمہ گیر صنف سخن بنا دیا۔رباعی نے محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے لیکر آج تک کے درمیانی چار سو سال میں فکر و فن کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔رباعی گوئی کا سفر اردو شاعری کے سفر کے ساتھ جاری و ساری ہے۔رباعی کے ساتھ قطعات کہنے کا رواج عام ہونے لگا ہے لیکن موضوعات کے اعتبار سے آج بھی اردو شاعری رباعی کے ذریعے سماجی اصلاح کا اہم کام لے سکتی ہے۔

☆☆☆

رُباعی کا فن اور اس کا ارتقاء

سفیان احمد انصاری

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔ موبائل: 9839574196)

شعری اصناف میں رُباعی چار مصرعوں پر مشتمل صنف ہے جس میں بیان کا تسلسل، الفاظ و تراکیب کا برمحل استعمال، مناسب و موزوں الفاظ اور اسلوب کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اُسلوبِ بیان اچھا ہو، زبان درست اور رواں ہو، تشبیہات، استعارات، لطافت، تراکیب وغیرہ کا بھی خصوصی خیال رکھا گیا ہو۔ نیز رباعی اس بات کی بھی متقاضی ہوتی ہے کہ اس میں کثیر اور عمدہ معانی پر مبنی مضامین کو رقم کیا جائے۔ رُباعی میں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں، جس کے پہلے تین مصرعوں میں سامع کو تجسس رہتا ہے، جبکہ چوتھا مصرع سامع کے اُس تجسس کو دور کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رباعی کا چوتھا مصرع زبردست ہوتا ہے، جس میں بے ساختگی، برجستگی اور حد درجہ شدت پائی جاتی ہے۔

شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 1958ء میں فنِ رباعی پر "اردو رُباعی (فنّی و تاریخی ارتقاء)" کے نام سے ایک نہایت اہمیت کی حامل کتاب تصنیف کی تھی، جس میں موصوف نے رباعی سے متعلق بیش قیمتی معلومات فراہم کی ہیں، اور رباعی کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ بقول نیاز فتح پوری: "میں سمجھتا ہوں کہ صنفِ رباعی کا کوئی تاریخی یا فنّی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انھوں نے کامل غور نہ کیا ہو یا اُس کی پوری تحقیق نہ کی ہو، اور اسی غور و تحقیق کا نتیجہ یہ کتاب ہے جسے میں ہر لحاظ سے قدر اول کی تصنیف خیال کرتا ہوں۔" (1)

اسی کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رُباعی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے۔ پہلے مصرعے میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خدوخال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔" (2)

صنفِ رُباعی کا فن گویا سمندر کو کوزے میں سمیٹنا اور بند کرنا ہے۔ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں:

> "فارسی کے اصنافِ سخن میں رباعی چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے، مگر اس کوزہ میں سمندر بند ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا فلسفیانہ خیال، دقیق سے دقیق اخلاقی نکتہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ صوفیانہ مسئلہ جو صفحوں اور دفتروں میں سماتا اُن دو سطروں میں پورا کا پورا ادا ہو جاتا ہے۔" (3)

یہی وجہ ہے کہ عروضی اعتبار سے رُباعی ایک مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ کیوں کہ بحر ہزج اور اس کے اوزان پر اشعار کہنا آسان نظر نہیں آتا، اسی طرح معنوی اعتبار سے بھی رباعی کو مشکل ترین صنف تصور کیا جاتا ہے، اس لیے رُباعی میں صرف چار مصرعوں میں پورے مضمون یا خیال کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں جوشؔ ملیح آبادی کا درج ذیل خیال ملاحظہ فرمائیے کہ:

> "رباعی چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد قابو میں آتی ہے۔" (4)

رُباعی کا ارتقا

فنّی اعتبار سے رباعی بھی دوسری اصناف کی طرح ہی نظر آتی ہے، بلکہ ایک حد تک غزل، قصیدہ اور مثنوی کے مماثل اور مانند ہی ہوتی ہے، مثلاً قصیدہ اور غزل کی طرح رباعی کے پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں البتہ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ رباعی اپنے مخصوص وزن اور دو شعروں میں محدود ہوتی ہے۔ اسی طرح جیسے مثنوی میں بیان کا تسلسل پایا جاتا ہے اسی طرح رباعی کے چار مصرعوں میں بھی بیان کا تسلسل ہوتا ہے۔ اس لیے رُباعی ایک اہم اور مقبول صنف تسلیم کی جاتی ہے۔

اُردو میں رباعی فارسی سے آئی ہے، لیکن فارسی میں رباعی کا جنم کب ہوا؟ اس سلسلے میں محققین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر رباعی کی پیدائش اور اُس کے وجود میں آنے کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ یعقوب بن لیث صفار کے کمسن بیٹے کی زبان سے خوشی میں کچھ ایسے الفاظ نکل گئے جو ایک مصرع کی شکل اختیار کر گئے اور جب ان الفاظ کو بحر کے ترازو میں تولا گیا تو وہ بحرِ ہزج میں پائے گئے۔ اس پر رُودکی نے رُباعی کے لیے چوبیس وزن ایجاد کیے۔ یہ واقعہ تیسری صدی ہجری میں پیش آیا تھا، اس طرح رباعی کی تاریخ ایک ہزار سال قدیم کہی جاسکتی ہے۔

اس شعری صنف میں عرب اور ایران، ہر دو ملکوں کے شاعروں نے کلام پیش کیا ہے لیکن ایرانیوں نے اسے بہت رواج دیا اور مقبول بنایا۔ پہلے پہل یہ چار بیتوں میں لکھی جاتی تھی۔ فارسی شعرا میں ابوسعید ابوالخیر اور خیام نے اپنی زبان میں رباعیاں کہہ کر رباعی کے فن کا عروج بخشا۔ پھر جب رباعی فارسی سے اردو میں آئی تو تقریباً ہر دور کے شعرائے اُردو نے رباعی کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ اُردو کے پہلے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے خواجہ بندہ نواز کا نام لیا جاتا ہے، اگرچہ اُن کی کوئی تصنیف خود کی نہیں بلکہ بعد کے لوگوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے تاہم اُردو رباعی گوئی کی حیثیت سے وہ اولین شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطبؔ شاہ کی کلیات میں 38 رباعیاں ملتی ہیں، جو اس بات کی غماز ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں رباعیات کو خاصی اہمیت دی۔ قلی قطب شاہ کی رباعیوں میں اس کی غزلوں کی طرح موضوعاتی تنوع، غنائیت، تصورِ عشق کے علاوہ عجب طرح کی سرشاری و سرمستی ملتی ہے، مثلاً

ہے پھول کا ہنگام مدسوں باراں حاضر
پھولاں کے نمن سارے ہیں یاراں حاضر
اس وقت کیوں توبہ کیا جائے مجھے
توبہ شکناں ہور نگاراں حاضر(5)

قلی قطب شاہ کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی ایسا شاعر تھا جس کی شاعری میں قدیم وجدید شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں فارسی کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جس طرح اس کی شاعری میں تڑپ، گداز اور بے ساختگی پائی جاتی ہے اسی طرح یہی ساری خصوصیات اس کی رباعیوں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ نصرتی اور غواصی کے یہاں بھی رباعی کے نمونے ملتے ہیں مگر بہت کم۔ البتہ ان کے بعد ولیؔ دکنی نے اپنے عارفانہ اور متصوفانہ مزاج سے رباعی کے دامن کو آباد اور گلزار کیا، اور شمالی ہند میں دکن ادب سے عوامی زبان کو روشناس کرنے کے ساتھ رباعی میں پہلی بار وحدت الوجود کو جگہ دی، کہتے ہیں ؎

دل جامِ حقیقت ستی مست ہوا
ہر مست مجازی سوں زبردست ہوا
یہ باغ دسا نظر میں تنکے سوں کم
اور عرشِ عظیم پگ تلے پست ہوا(6)

شاہ حاتمؔ کی رباعیوں میں بھی حکیمانہ اور صوفیانہ نوعیت کے مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں، ساتھ ہی ان کی رباعیوں میں ہندی و اردو الفاظ کی آمیزش کے علاوہ جدّت اور تازہ کاری بھی ملتی ہے، جیسے ؎

گزری ہے یوں ہی اب کچھ سو اب کچھ ہو
بے اُس کی رضا کچھ نہ ہو کب کچھ ہو
چاہا، اپنا ہوا نہ کچھ اب تک کچھ
وہ چاہے تو اک آن میں سب کچھ ہو

اسی طرح آبروؔ، فائزؔ، مضمونؔ، شاکرؔ، ناجیؔ اور رنگؔ نے بھی رباعیاں کہی ہیں لیکن ان کے کلام کے نمونے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اس کے بعد شمالی ہند میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر سوزؔ، مظہرؔ جانِ جاناں، مرزا غالبؔ اور مومن خاں مومنؔ جیسے شعرا بھی رباعی کے دامن سے وابستہ ہوئے، اور رباعی کو ایک مقام عطا کیا۔ لکھنؤ میں میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ اور نئے دور میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، اسمٰعیلؔ میرٹھی، شادؔ عظیم آبادی، مجروحؔ سلطان پوری، امیرؔ مینائی، نظمؔ طباطبائی، ریاضؔ خیرآبادی، عزیزؔ لکھنوی، شوقؔ قدوائی، جوشؔ ملیح آبادی، یگانہؔ چنگیزی، امجدؔ حیدرآبادی، فراقؔ گورکھپوری، جگرؔ مرادآبادی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی اور حسرتؔ موہانی جیسے شعرا نے رباعی کے میدان میں بھرپور طبع آزمائی کی، اور کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے۔ ان میں حالیؔ وغیرہ نے رباعیوں کے ذریعے عوامی رائے کو ہموار کرنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ اسی دوران اُردو رباعی گو شعرا نے اپنی رباعیوں میں طنز و مزاح سے بھی کام لیا جن میں اکبرؔ الٰہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ جدید دور میں بھی شعرا نے فنی لوازم کی پاسداری کرتے ہوئے رباعیاں کہی ہیں اور یہ سفر ہنوز جاری و ساری ہے۔

رباعی کے معنی اور تعریف

رُباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادّہ "رب ع" ہے۔اس کے لغوی معنی "چار" ہوتے ہیں۔اور رُباع کے معنی چار چار ہوتے ہیں، اور آخر میں یائے نسبتی ہے، اب رباعی کے معنی ہوئے: چار چار والے۔حمید عظیم آبادی اپنی کتاب جامع العروض میں لکھتے ہیں:

"عربی میں رُبع کے معنی کسی چیز کے چوتھے حصے کے ہیں، اور رُباعی کے معنی چار والے کے ہیں، اس لیے چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہتے ہیں۔"(7)

چوں کہ رباعی چار مصرعوں پر یا دو بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس لیے رباعی کہلاتی ہے۔دو بیتوں کی وجہ سے اسے "دو بیتی" بھی کہا جاتا ہے۔قدیم زمانے میں اسے "ترانہ" بھی کہتے تھے۔اسی طرح رُباعی کو چہار مصرعی اور چہار بیتی بھی کہتے تھے، چہار مصرعی کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے لیکن چہار بیتی کہنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے چار مصرعوں کو چار بیت شمار کرلیا اس لیے اُن کے نزدیک "چہار بیتی" نام پڑ گیا۔اس مسئلہ کو سلجھاتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریر کرتے ہیں:

"موجودہ رباعی کے وجود میں آنے سے قبل ایران قدیم میں ایک وزن ایسا رائج تھا جس کا ہر مصرع دو رُکنی ہوتا تھا۔گویا موجودہ چار رُکنی مصرعوں کے دو بیت اس وقت پورے چار بیت شمار کیے جاتے تھے، چنانچہ اس قدیم وزن کی رعایت سے دو بیت کا نام بھی چہار بیتی پڑ گیا۔"(8)

اصطلاحاً رُباعی اُس مختصر نظم کو کہتے ہیں جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں کسی خیال یا مضمون کو بیان کیا جائے۔

رُباعی صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے۔

عروضی ہیئت کے اعتبار سے رُباعی وہ صنفِ سخن ہے جس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہو، یا ہم ردیف ہو، یا ہم قافیہ وہم ردیف دونوں ہو۔جبکہ تیسرے مصرعے کا ہم قافیہ یا ہم ردیف یا ہم قافیہ وہم ردیف ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر تیسرا مصرع بھی پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے کی طرح مقفّیٰ ومردّف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔یعنی چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ وہم ردیف ہو سکتے ہیں۔جیسے ذیل کی رباعی دیکھیے۔

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار
بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار ہے مگر نہ اتنا دشوار
بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

اسماعیل میرٹھی

رباعی مردّف اور غیر مردّف کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

"غزل کی طرح رباعی بھی مردّف اور غیر مردّف ہو سکتی ہے خواہ صرف قافیہ لائیں یا قافیہ اور ردیف دونوں۔چونکہ عربی شاعری میں ردیف کا رواج نہ تھا اس لیے قدیم فارسی داں عربی شعراء نے اکثر غیر مردّف رباعیاں کہی ہیں۔"(9)

رباعی کی طرح بعض قطعات بھی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے بعض حضرات رباعی کو قطعہ اور قطعہ کو رباعی سمجھ لیتے ہیں، جبکہ رُباعی اور قطعہ کے درمیان واضح فرق ہے۔پہلا فرق تو یہ ہے کہ رُباعی کے لیے مخصوص بحریں اور اوزان ہوتے ہیں، جب کہ قطعہ کے لیے بحر اور وزن جیسی کوئی شرط نہیں ہے۔اس لیے اگر رباعی کے وزن سے ہٹ کر چار مصرعے کہے گئے تو وہ قطعہ کہلائے گا، رباعی نہیں۔مہذب اللغات میں قطعہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"قطعہ دو یا دو سے زیادہ بیتوں کی نظم جو ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہے۔قطعہ دو شعر سے کم کا نہیں ہوتا اور زیادہ کی تو حد نہیں ہوتی ہے۔اس قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا۔اس کے شعروں کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔قطعہ کو قطعہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ غزل یا قصیدہ کا ٹکڑا ہوتا ہے۔"(10)

دوسرا فرق یہ ہے کہ غزل کی طرح قطعہ کے پہلے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ وہم ردیف ہونا ضروری ہے، لیکن رباعی کے لیے ہم قافیہ وہم ردیف ہونا ضروری نہیں بلکہ رباعی میں صرف ردیف ہو قافیہ نہ ہو، یا صرف قافیہ ہو، ردیف نہ ہو۔یہ بھی ممکن ہے۔اس لیے اگر چار مصرعوں میں صرف قافیہ پایا جائے یا صرف ردیف پائی جائے، اور رُباعی کی بحر میں ہو تو وہ یقینی طور پر رُباعی ہے۔قطعہ ہرگز نہیں ہے۔

رباعی کا موضوع

رُباعی کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مختلف النوع مضامین وخیالات کو بیان کیا جاسکتا ہے۔یعنی رباعی میں کسی بھی

موضوع کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ تمام مصرعوں میں خیال کا تسلسل و ارتقا پایا جاتا ہے اور چوتھے مصرع میں خیال اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ گویا چوتھا مصرع رباعی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رباعی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رباعی عربی کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں۔ شاعرانہ مصطلحات میں رباعی اس صنف سخن کا نام ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے۔ گویا رباعی اردو کی وہ مختصر ترین صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدتِ خیال، اور تسلسل بیان کی پابندی از بس ضروری ہے۔"(11)

شروع شروع میں زیادہ تر رباعیاں پند و نصائح، حکمت ،تصوف، حمد، نعت، منقبت، فلسفہ، اخلاقیات اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں، مگر وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور حسن وعشق سے لے کر حالاتِ حاضرہ کے موضوعات تک پر رباعیاں کہی جانی لگیں، اور اس طرح رُباعی ایک موضوعاتی صنف بن گئی۔ اسی طرح رُباعی کا ایک اہم موضوع "اصلاح" بھی رہا ہے، اور اس موضوع کو سب سے پہلے صوفیا، علما اور مذہبی شخصیات نے رباعیات میں جگہ دی، اور اپنی اصلاحی رباعیوں کے ذریعے قوم کی اصلاح کی کوشش کی، پھر یہ روایت آگے بڑھتی رہی تا آنکہ تقریباً ہر دور کے رباعی گو شعرا نے اصلاحی رباعیاں کہیں، یہی وجہ ہے کہ ادوارِ رفتہ کی طرح دورِ حاضر کی رباعیوں پر بھی اصلاح کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اور اصلاح کے ساتھ مذہبی، فکری، اور تجرباتی موضوعات اردو رباعیوں میں وافر مقدار میں ملتے ہیں، جیسے درج ذیل رباعی ملاحظہ فرمائیں:۔

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
روئیدادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

الطاف حسین حالی

اسلام ہی کو آپ اپنی ملت سمجھو
بیگانہ روش میں اپنی دولت سمجھو
جو اس کے خلاف رائے رکھے اکبر
خاموش رہو سمجھ کی قلت سمجھو

اکبر الہ آبادی

رباعی کی بحریں واوزان

رباعی کے ہر مصرعے میں صرف چار ارکان ہوتے ہیں نہ اس سے کم تین ارکان ہو سکتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ چار ہو سکتے ہیں۔ اور جب سے رباعی کا وجود ہوا ہے تب سے رُباعی کے اوزان ۲۴ رہی رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی اُنھیں متعینہ بحروں اور اوزان میں رباعیاں کہی جارہی ہیں۔ رباعی کی بحروں اور اوزان کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ بنیادی طور پر رباعی کی ایک بحر "بحرِ ہزج سالم" بتائی جاتی ہے۔ یعنی: **مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن**۔ اس بحر سے اوّلاً دس ارکان نکلتے ہیں پھر انھیں سے چوبیس اوزان تیار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"رباعی کے ہر مصرعے میں انھیں دس ارکان میں سے کوئی چار ضرور آئیں گے۔ علمائے عروض وقواعد اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کا ہر مصرعہ چار رکنی ہوتا ہے اور بحر ہزج مثمن اخرب واخرم کے چوبیس اوزان کے سوا رباعی میں کوئی اور وزن نہیں آتا۔"(12)

بعض حضرات "**لاحول ولا قوۃ الا باللہ**" کو ہی رباعی کا وزن مانتے ہیں، لیکن اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ "**لاحول ولا قوۃ الا باللہ**" بھی رباعی کے اوزان میں شامل ہے۔ اس لیے اگر اس وزن پر رباعی کہی جاتی ہے تو وہ رباعی ہی ہوگی۔

رباعی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ رباعی کا پہلا مصرع جس وزن میں ہو، اسی وزن میں بقیہ مصرعے بھی ہوں بلکہ وہ ان مختلف اوزان میں سے کسی بھی وزن میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بعض شاعروں نے اخرب اور اخرم کے اوزان کو آپس میں ملانے پر اعتراض کیا ہے لیکن اکثر شعرا کے نزدیک ایک ہی رباعی میں مختلف اوزان آسکتے ہیں۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ عہدِ حاضر میں جب کہ کئی اصناف دم توڑ چکی ہیں یا دم توڑ رہی ہیں، صنف "رباعی" ہنوز زندہ ہے۔ فی زمانہ متعدد ایسے شعرا ہیں جنھوں نے ترجیحی طور پر مشکل پسندی کے باوجود رباعی کی طرف خاصی توجہ دی ہے، مثلاً درج ذیل شعرا کی رباعیاں ملاحظہ کیجیے:۔

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دولت پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے
الطاف حسین حالی

سانچے میں گھٹا کے ڈھل رہا ہے کوئی
پانی کے دھویں میں جل رہا ہے کوئی
گردوں پہ اِدھر جھوم رہے ہیں بادل
سینہ میں اُدھر مچل رہا ہے کوئی
جوش ملیح آبادی

اسی ضمن میں فراق گورکھپوری کی رباعیاں بھی آتی ہیں، فراق نے اپنی رباعیوں میں بہت ہی کھل کر حسن و عشق، محبوب کا سراپا، اس کی زلفیں، اس کا مکھڑا، اس کی آنکھیں، اس کے قد اور اس کے پیکر کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ فراق نے حسن کے مختلف زاویوں سے صرف محسوس ہی نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے محبوب کی اداؤں کی دل نشینی کو اپنی رباعیوں میں بڑے جذباتی انداز میں پیش بھی کیا ہے، اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت ہی فراخ دلی اور کشادہ قلبی سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں:

مکھڑا دیکھیں تو ماہ پارے چھپ جائیں
خورشید کی آنکھ کے شرارے چھپ جائیں
رہ جانا وہ مسکرا کے تیرا کل رات
جیسے کچھ جھلملا کے تارے چھپ جائیں
فراق گورکھپوری

حواشی

(1) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقاء، ص 20، 21، اشاعت 1982
(2) ایضاً، ص 10 (دیباچہ)
(3) سید سلیمان ندوی، خیام، ص 220
(4) رباعیات انیس، ص 38، اشاعت 1985
(5) کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، ص 1027
(6) کلیاتِ ولی، ص 355 مطبوعہ 1982ء
(7) جامع العروض، ص 94
(8) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقاء، ص 32، 33
(9) ایضاً، ص 20
(10) مہذّب اللّغات، ص 22 جلد نہم، بحوالہ تنقید رباعی ص 11
(11) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقاء، ص 20
(12) ایضاً، ص 47

☆☆☆

رباعیات

پروفیسر عراق رضا زیدی

شاعر کا تخیل ہے رباعی کہ غزل
جمنا میں کھِلا ہے کوئی خوش رنگ کنول
تصویر، کلنڈر، کہ تراشا ہوا سنگ
ہر گھر میں نشانی ہے تری تاج محل

پھر جانِ ازل اور نہیں بن سکتا
یہ نازِ اجل اور نہیں بن سکتا
انگریز بنا لیتے بنا سکتے اگر
اب تاج محل اور نہیں بن سکتا

قلعوں کے کھنڈر دیکھ کے دل روتے ہیں
عاشق بھی یہیں عشق میں جاں کھوتے ہیں
اک شاہ جہاں نے یہ دیا ہے تحفہ
سب تاج محل دیکھ کے خوش ہوتے ہیں

تھی سنگ مرمر کی مورت بھی عجب
کرتی تھی وہ شہ جہاں سے الفت بھی عجب
یہ تاج محل کے حسن میں دیکھ بغور
ممتاز محل تھی خوبصورت بھی عجب

مرنے کے لیے کم تری صورت کیا ہے
عاشق کے لئے حاصل جنت کیا ہے
انداز، ادا، ناز، تغافل، شوخی
شامت ہے یہی، اور قیامت کیا ہے

رباعی مشکل ترین فن

احتشام افسرؔ

(نزد ایس ٹی اسکول، رسولپور، گرکھناتھ، گورکھپور۔ موبائل-7905476790)

اردو کے اصناف سخن میں رباعی ایک مشکل ترین صنف تصور کیا جاتا ہے۔ رباعی کے اوزان پر بحث تو بہت ہو چکی ہے۔ اس کے مخصوص اوزان اور بحور پر بھی خاصی زبردست بحثیں ہوئیں ہیں۔ رباعی سے متعلق قدماء کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رباعی کے بارے میں جوش ملیسانی نے اپنی کتاب آئینہ اصلاح میں فرمایا ہے کہ:

> ''رباعی عربی کے لفظ رُبَع میں یائے نسبتی بڑھا کر بنایا گیا ہے جس کے معنی چار کے ہیں یعنی چار مصرعے آپس میں مربوط ہوں اور تسلسل بیان ہو، الفاظ و تراکیب کا موزوں اور برمحل استعمال ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فن سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے۔''
>
> (آئینہ اصلاح جوش ملیسانی صفحہ ۹۴)

اس قول کی روشنی میں ضروری ہے کی رباعی میں استعمال کئے جانے والے الفاظ بھی دلکش ہوں اور اسلوب بیان پر مضبوط گرفت رکھی جائے۔ خود جوش ملیح آبادی نے برج لال رعنا کی رباعیوں کے مجموعے پر پیش لفظ لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

> ''رباعی ایسی کم بخت چیز ہے جو سارا جوبن کھالے تو بالک پالے، کی طرح چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔''
>
> (بہ حوالہ رعنائیاں برج لال رعنا دیباچہ جوش ملیح آبادی)

یہ سچ ہے کہ رباعی کہنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین فن ہے۔ یہ مختصر صنف ہے اور اس میں بیان کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کا تخیل بلند اور بیان میں پختگی ہو۔ وہ چار مصرعوں کو دلکش الفاظ میں اس طرح سے قلمبند کرے کہ قاری کے دل پر اثر ہو جائے۔ اس کے آخری دو مصرعے پہلے کے دو مصرعوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں کیونکہ پہلے کے دو مصرعے تمہید کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اس لیے اگر دوسرا شعر پر زور نہیں ہے تو رباعی کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر اختر ریاض:

> ''رباعی سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصروں پر مبنی ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جبکہ تیسرا مصرع بے قافیہ ہوتا ہے لیکن اگر تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہو تو افضل سمجھا جاتا ہے۔ رباعی کے مصرعے میں قافیے مردف بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مردف بھی۔ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے اصطلاحاً ''مصرع'' کہلاتے ہیں اور تیسرا بے قافیہ ہونے کی سبب ''خصی'' کہلاتا ہے۔ رباعی کی صنفی شناخت مخصوص اوزان سے ہوتی ہے جو بحر ہزج سے مستخرج ہیں۔ ایک مطلع اور ایک شعر کی وجہ سے اس کا نام دوبیتی بھی مشہور ہے۔ اس کا قدیم نام ترانہ بھی ہے۔''

جہاں تک رباعی کے اوزان اور ان کے استخراج کا سوال ہے اس سلسلے میں کئی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں۔ صاحب معیار البلاغت نے صفحہ ۱۰۷-۱۰۸ پر لکھا ہے کہ ''رباعی جس کو ترانہ اور دوبیتی اور جفتی اور چار مصراعی بھی کہتے ہیں، متفق الوزن اور قوافی ہیں اور اس کا موجد درود کی ہے۔''

اس بات کی تصدیق عرش ملسیانی اور کالی داس گپتا رضا نے بھی کی ہے۔ ابن قیس کی مانیں تو خواجہ امام حسن قطان نے چوبیس (۲۴) اوزان کے منضبط ہونے کے لئے دو شجرہ، شجرہ اخرب اور شجرہ اخرم ایجاد کیے۔ جس میں ۹/زحاف آتے ہیں۔ خرب، خرم، قبض، کف، ہتم، جب، بتر، شتر بل وغیرہ

زیادہ تر علماء کا خیال ہے کہ رباعی کا موجد رودکی ہے جس کی بنیا اس نے غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور یعنی مفعول فاعلن مفاعیل فعل/فعول پر رکھی۔ جبکہ رباعی کا اصل عون خاص "لاحول ولاقوۃ الا باللہ، مفعول مفاعیلن مفعولن فاع ہے۔

رباعی کے اوزان اخرم اور اخرب کو ملا کر کل چوبیس (۲۴) ہوتے ہیں ۔ ۱۲ / اخرب کے اور ۱۲ / اخرم کے ان دونوں شجروں کو مولانا حکیم محمد نجم الغنی رامپوری نے بحر فصاحت میں صفحہ ۱۳۷ پر یوں پیش کیا ہے۔

---شجرہ اخرب---

(۱) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعلن فاعیلن فاع
(۲) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفاعیل فاع
(۳) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفاعیل فعل
(۴) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعلن مفعولن فاع
(۵) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعلن مفاعیلن فع
(۶) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفاعیلن فع
(۷) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفعول فعول
(۸) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیلن مفعولن فع
(۹) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفعول فعل
(۱۰) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعیل مفاعیل فعول
(۱۱) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعلن مفاعیل فعول
(۱۲) مفعول۔۔۔۔۔۔مفاعلن مفاعیل فعل

---شجرہ اخرم---

(۱) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفاعلن مفاعیلن فاع
(۲) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعول مفاعیلن فاع
(۳) مفعولن۔۔۔۔۔۔فاعلن مفاعیل فعل
(۴) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعولن مفعولن فاع
(۵) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعولن مفعولن فع
(۶) مفعولن۔۔۔۔۔۔فاعلن مفاعیلن فع
(۷) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعول مفاعیل فعول
(۸) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعول مفاعیل فع
(۹) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعول مفعول فعل
(۱۰) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعول مفاعیل فعل
(۱۱) مفعولن۔۔۔۔۔۔فاعلن مفاعیل فعول
(۱۲) مفعولن۔۔۔۔۔۔مفعولن مفعول مفعول

پروفیسر عنوان چشتی نے رباعی کے اوزان میں ۱۲ مزید اضافہ کر کے ۳۶ بتایا ہے۔

رباعی کے بنیادی اوزان --

مفعول، مفاعیل مفاعیل فعل/فعول
مفعول، مفاعلن، مفاعیل، فعل/فعول

بعض اساتذہ کے نزدیک اخرب اور اخرم شجرہ کے اختلاط سے ۱۳۶ اوزان بنائے گئے ہیں مگر میرے نزدیک یہ اختلاط نامناسب ہے اور آئین عروض کے خلاف ہیں۔

انشاء اور جرأت کے عہد میں سید امام بخش ناسخ جو محسن اردو ہیں انہوں نے بہت سے متروک الفاظ کو نکال کر اردو کو نئی زندگی بخشی۔ انہیں پہلوان ادب کے القاب سے نوازا جاتا ہے لیکن اب تو بہت سے شاعر خود ساختہ امام رباعی کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ بعض شاعروں نے اخرب اور اخرم کے اوزان کو آپس میں ملانے پر اعتراض کیا ہے یعنی رباعی کا پہلا مصرعہ اخرم ہے تو بقیہ مصرعے بھی اخرم کے ہی ہوں گے لیکن اکثر شاعر اس بات کی پابندی نہیں کرتے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> "دونوں دائروں کے اوزان کا ایک دوسرے سے منسلک کرنا جائز ہے۔ مگر یہ مناسب نہیں اور اصول قواعد کے خلاف ہے۔ زیادہ تر شعراء یہ خیال رکھتے ہیں کہ چوبیس (۲۴) اوزان میں سے کوئی بھی چار اوزان رباعی میں نظم کیا جائے تو مباح ہے۔

جگت موہن لال رواں، اکبر الہ آبادی، حالی، داغ، انیس، یگانہ چنگیزی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری نے فن رباعی کو جس بلندی پر پہنچایا اسے اور آگے لے جانے کی ضرورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ فراق جنہیں اس صدی کا مشہور رباعی گو شاعر مانا جاتا ہے جن کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں ۳۵۱ رباعیاں ہیں جن کا تعلق عشق سے ہے مگر فراق رباعی کے حدود کو پھلانگ کر ان کے موضوعات کو عشق مجازی سے اور محبوب کے مختلف اعضاء جسم سے جوڑتے ہیں جس سے وہ جنس زدہ معلوم ہوتی ہیں جبکہ ان میں سماجی عکاسی، سماج اور کلچر کی عکاسی ہونی چاہیے تھی۔ اس میں بے راہ روی غلط روی سے الگ ہٹ کر نصیحت آمیز باتیں سلیقے سے کہی گئی ہوتیں تو یہ دل پر اثر کرتیں اور کامیاب رہتیں۔

☆☆☆

حصہ دوم

رباعی: تنقید و تحقیق

رباعی پس منظر سے پیش منظر تک

پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال

(پروفیسر وصدر شعبہ اردو گورنمنٹ گریجویٹ کالج بھکر/ الحمد یونیورسٹی اسلام آباد، پاکستان)

رباعی ایک اہم صنف شاعری ہے جو عام طور پر فلسفیانہ، اخلاقی، فکری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پر مبنی ہوتی ہے لیکن اس کا عام رنگ وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں Lyrical کہتے ہیں۔ یعنی یہ خطابیہ اور اصلاحی انداز سے عموماً گریز کرتی ہے۔(۱) چار مصرعوں پر مبنی یہ صنف غزل کے دو اشعار کے برابر ہوتی ہے فرق اس کی اندرونی ہیئت یعنی وزن کا ہوتا ہے۔ جس کا تعلق خاص عروض سے ہے۔ محمد ارشاد، رباعی تکنیک اور فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''رباعی میں بیک وقت ایک ہی خیال جاگزیں ہوسکتا ہے۔ پہلے مصرعے میں خیال کو متعارف کروایا جاتا ہے۔ دوسرے میں اس کی وضاحت کی ہوتی ہے۔ تیسرا مصرع پہلے دو مصرعوں کا چوتھے مصرعے سے ربط پیدا کرتا ہے اور چوتھا مصرع خیال کا نقطۂ عروج، پنچ لائن ،جس کی گونج تا دیر سنائی دیتی رہتی ہے۔''(۲)

رودکی کو فارسی کا پہلا رباعی گو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں۔ عمر خیام اور سرمد کا نام فارسی رباعی گو میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ادب کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں بھی رباعیات لکھی گئی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ: (۱۵۸۰ء۔۱۶۱۱ء) اردو رباعی کا پہلا شاعر ہے۔(۳) اُن کے دیوان میں ۳۹ رباعیاں ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے شاعری کی ہر صنف کو آزمایا۔ ان کے دیوان میں تقریباً پچاس ہزار اشعار موجود ہیں۔ اس سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اردو رباعی کا سراغ نہیں ملتا۔

تجھ حسن سے تازہ ہے سدا حسن وجمال
تجھ یار کی بستی سے ہے عشق کو جمال
تو ایک ہے تجھ سا نہیں دوجا کوئی
کیوں پاوے جگت صفحہ میں کوئی تیری مثال

ملا وجہی:۔ عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر اور غواصی کا ہم عصر تھا۔ ''سب رس'' ۱۲۳۶ء میں تصنیف کی۔ ملا وجہی نے بھی اردو رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔

دنیا کے سو لوگاں وفا دستا نہیں
دھن دیکھے جفا باز جفا دستا نہیں
بے مہری آدم ہے اس سوں اس کی
دل باندنے میں کچھ دغا دستا نہیں

غواصی: اپنے زمانے کا ممتاز شاعر تھا اس نے غزل، مرثیہ، مثنوی اور رباعیات لکھی ہیں:

عبدالقادر حیدرآبادی:۔ ولی اورسراج کا ہم عصر تھا۔ ان کو غلطی سے اردو کا پہلا رباعی گو شاعر سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ محمد قلی قطب شاہ کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔(۴)

ہر چند ہمن سب سے اٹھایا ہے ہاتھ
اس پر بھی نہ آزاد کیہائے ہیہات
عالم سے ہر ایک یہ کہتا ہوگا
دکھن میں ہے قادر ابھوں در قیدحیات

سراج اورنگ آبادی:۔سراج اورنگ آبادی کی کلیات میں چھ فارسی اور نو اردو کی رباعیاں شامل ہیں۔سراج کا سارا کلام ولی کی زبان کے اثر کی وجہ سے سلیس،صاف ستھرا، رواں دواں اور کیف انگیز ہے۔انھوں نے عشقیہ جذبات کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے۔

اس شامِ جدائی میں مجھے آ دیکھو
الطاف وکرم کو کارفرما دیکھو
خورشید ڈوبا شفق کے لہو میں تمام
ٹک اپنے شہید کا تماشا دیکھو

ولی:۔(۱۶۶۸ء۔۱۷۰۹ء)ولی نے اردو غزل کو نیا لہجہ اور آہنگ عطا کیا ہے اور وہ اردو غزل گو شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔مگر ان کی رباعیاں اتنی معیاری نہیں ہیں۔ان کے دیوان میں صرف چھ رباعیاں موجود ہیں۔ولی نے ان رباعیوں میں بھی محبوب کی سراپا نگاری اور اس کے جسم کے اعضاء کی حرکات وسکنات کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔وہ صرف چار مصرعوں یں محبوب کی تصویر اور سراپا سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

تجھ مکھ کا یہ پھول ہے چمن کی زینت
تجھ شمع کا شعلہ ہے اگن کی مورت
فردوس میں نرگس نے اشارے سوں کہا
یہ نور ہے عالم کی نین کی زینت

سید عمادالدین عماد پھلواری(وفات ۱۷۲۱ء) کے ہاں بھی رباعی موجود ہے۔

شیخ ظہورالدین حاتم:۔۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے ان کے دیوان ''دیوان زادہ'' میں غزلیں،مخمس رباعیاں،مستزاد، ساقی نامہ اور دو مثنویاں قہوہ اور تمباکو کی تعریف میں ہیں۔اور ایک شہر آشوب ہے۔(۶) شاہ حاتم کہلاتے تھے۔آخر میں دنیا داری سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ان کا مزاج ظریفانہ تھا۔ایہام گوئی کی طرف مائل تھے۔

دہلی اور لکھنو کے صاحب دیوان شعراء نے دوسری اصناف شعری کے علاوہ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔میر،درد، سودا، میر حسن، حسرت، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین، مومن، غالب وغیرہ کے کلیات میں بھی رباعیات موجود ہیں۔

انعام اللہ یقین: مرزا مظہر جان جاناں کے شاگردوں میں سے تھے ۲۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔انھوں نے رباعیات بھی لکھی ہیں۔

جس طرح کے لاتے ہیں مضامین یقین
اشعار میں ریختہ کے سودا ویقین
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں
سجاد و کلیم و میرو درد و تمکیں

خواجہ میر درد: (۱۷۲۱ء۔۱۷۸۵ء)ایک صوفی منش اور درویش آدمی تھے مگر عاشقانہ طبیعت نے تصوف میں بھی دلکشی اور چاشنی کا رنگ بھر دیا ہے۔ان کی رباعیوں میں گداز اور مٹھاس پائی جاتی ہے۔خواجہ صاحب نے اپنی رباعیوں میں بھی صبر وقناعت،تسلیم ورضا اور تصوفانہ مضامین کے علاوہ عاشقانہ جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔درد اپنے عشق حقیقی کے لیے مشہور ہیں۔رباعیات میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی
اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کرے اس کا اس کو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی(۷)

میر تقی میر:۔(۱۷۲۲ء۔۱۸۱۰ء)میر تقی میر کی رباعیات میں زیادہ تر عشقیہ مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ان کی رباعیوں میں بھی وہی مٹھاس ،کسک،سوز وگداز اور اثر انگیزی ہے جو کہ ان کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔میر کی کلیات میں سوا سو کے قریب رباعیات ہیں۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے
خوں نابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلت عمر کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مرمر کے غرض تمام کی ہے میں نے

سودا:۔(۱۷۱۳ء۔۱۷۷۶ء) سودا کی کلیات میں ۸۰ کے قریب رباعیات موجود ہیں جو کہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔محمد رفیع سودا کی کلیات میں ۴۳ قصیدے،ہجویں، مراثی، رباعیاں،مستزاد،قطعات واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔

چاہی تھی بتوں سے آشنائی ہم نے
پر عقل کی مانی رہنمائی ہم نے
اس دل کے کنارے سے ہمارے یارو
کچھ آگ لگی تھی سو بجھائی ہم نے(۸)

میر حسن:۔میر حسن اگر رباعی میں مستقل طبع آزمائی کرتے تو یقینا ''سحر البیان'' کی طرح انمٹ نقوش چھوڑ جاتے۔انھوں نے بہت کم رباعیاں کہی ہیں۔دور محمد شاہی کے شعراء میں سے تھے حاتم کے شاگرد تھے۔ان کا کلام سادہ،شیریں اور سلیس ہے۔زبان اور بول چال کا لطف

ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

ہرآن میں آپ کو دکھا جاتے تھے
مشتاق کو تسکین دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے کس نے روکا تم کو
اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

شیخ قیام الدین قائم: نے غزل قطعات مثنوی قصیدے کے علاوہ رباعیات بھی لکھی ہیں۔

عبدالحئ تاباں: ۔کی رباعیاں بھی عشقیہ مضامین سے بھرپور ہیں۔ ان کی رباعیوں میں تغزل اور سوز وگداز پایا جاتا ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجئے:

مت میں نے حقیقت اس جہاں کی جانی
یاں دل کا لگانا ہے بہت نادانی
دانا ہے گرچہ تو سمجھ اے تاباں
باقی با اللہ اور سب کچھ فانی

احسن اللہ خاں کی رباعیوں کا اپنا مخصوص رنگ ہے جو کہ دلکشی اور سلیس انداز رکھتا ہے۔ وہ محاورات بڑی خوبی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کے خیالات پاکیزہ، بلند اور نازک ہیں۔ فغاں اور راسخ کی رباعیات میں وہی عاشقانہ مضامین ملتے ہیں جو ان کے جذبات کی پختگی اور قادرالکلامی کی واضح آئینہ دار ہے۔

سوز کی رباعیات میں تصوفانہ موضوعات، فنا، دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا بیان ملتا ہے۔ وہ آزاد منش آدمی تھے۔ ان کا کلام سیدھا سادہ ہے تکلف اور تصنع سے عاری۔ ان کے کلام میں شیرینیٔ زبان اور محاورہ کی وجہ سے لطف وسرور پایا جاتا ہے۔

جعفر علی حسرت کے دو دیوان غزلوں کے اور ایک رباعیات کا تھا۔ ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی۔

غلام علی ہمدانی مصحفی: ۔(۱۱۶۱۔ ۱۲۴۰ھ) دبستان دہلی کے ممتاز شاعر ہیں۔ ٹیکسالی شاعری کے سلسلے میں آخری بزرگوں میں تھے جنھوں نے قدیم محاورات اور سادگی کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں میر کی جھلک ہے۔ میر کی گہرائی نہیں۔

افسوس کہ دل کی بے قراری نہ گئی
فریاد و فغاں و آہ وزاری نہ گئی
وہ کون سا روز ہے کہ تجھ بن جوں شمع
روتے ہوئے مجھ کو رات ساری نہ گئی

انشاء اللہ خاں انشاء: ۔بے چین اور سیماب صفت آدمی تھے۔ خوش طبع اور خوش ادا تھے۔ دہلی آکر اردو مشاعروں میں جان ڈال دی اور سرکاری دربار گل افشاں کردیا۔ آخری عمر غربت میں بسر کی۔ ان کی رباعیوں میں سادگی ہے۔

نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۶ء۔ ۱۸۳۰ء) کی عمر کا زیادہ تر حصہ نظمیں لکھنے میں صرف ہوا۔ مگر نظموں کے ساتھ ساتھ حمد، نعت اور اخلاقی موضوعات پر مبنی رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کے مجموعہ میں ۲۳ کے قریب رباعیات موجود ہیں۔ جن میں نصیحت آمیز باتیں ہیں۔

گو یار سے ہر روز ملاقات نہیں
اور ہو بھی گئی تو پھر مدارات نہیں
دل دے چکے اب قدر ہو یا بے قدری
جو کچھ ہوا سو ہوا بس کی کچھ بات نہیں

جرأت، تسلیم، اسیر اور ناسخ نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔

جرأت: کی شاعری میں معاملہ بندی اور زنانہ پن کے جذبات وافر ہیں۔ ان کی شاعری میں شوخی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ریختی بھی لکھی ہے اور رباعی بھی۔ ناسخ کے دیوان میں ۶۳ کے قریب رباعیاں ملتی ہیں جن میں الفاظ کی نشست و برخواست کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ان کی رباعیوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ مگر رباعی کے ارتقا میں کردار ادا کیا۔

مصحفی نے کئی نعتیہ قصائد لکھے ہیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں:

نادان گئے جہاں سے اور دانا بھی
پیدا جو ہوئے ہوئے وہ ناپیدا بھی
ہے ہستی دنیا تو ہمارے دم سے
جب ہم نہ ہوئے تو ہو نہ ہو دنیا بھی (۱۲)

معروف ریختی گو شاعر رنگین نے ۴۴ رباعیات لکھی ہیں۔

میر انیس (۱۸۰۱ء۔ ۱۸۷۴ء) مرثیہ نگاری میں بہت اہم نام ہے۔ مرثیے کے علاوہ ان کی ۵۵۴ رباعیات کی نشاندہی بھی ہوئی ہے جو مختلف اوقات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل تھے کھلے مرجھا نہ گئے

مرزا دبیر (۱۸۰۳ء۔ ۱۸۷۵ء) اردو مرثیے میں ممتاز حیثیت کے

حامل ہیں۔ مرثیے کے علاوہ انھوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ان کے معاصرین میں میر انیس، غالب، مومن اور ذوق کا نام آتا ہے۔ڈاکٹر جاوید منظر لکھتے ہیں:

''مرزا سلامت علی دبیر دراصل اردو زبان وادب کا ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنے کلام سے جہاں اردو زبان کے الفاظ میں بیش بہا اضافہ کیا وہیں نئے محاوروں کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا اہم کام بھی انجام دیا۔بغیر نقطوں کا کلام بھی دبیر کے قلم کا شاہ کار ہے۔''(۱۳)

ادنیٰ ہے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہے ،دریا وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی
سمجھے جو برا آپ کو ،اچھا وہ ہے

ابراہیم ذوق(۱۷۸۸ء۔۱۸۵۴ء):کو خاقانیٔ ہند کا لقب ملا ہوا تھا۔الفاظ کی نشست وبرخواست کے ماہر تھے۔ان کے کلام میں مضامین کی تازگی،خوبصورت تراکیب،محاورے کی چستی اور عام فہم شاعری ہے۔محاورہ اور روزمرہ کے استعمال میں محتاط ہیں۔قصیدہ گوئی کے لیے مشہور ہیں۔رباعیات مدح بھی لکھی ہیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کا ترک
دنیا ہے بری بلا، ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا
جب تک نہ کرے آپ اسے دنیا ترک

غالب(۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء):جدت اسلوبِ بیاں اور ندرتِ خیال اور متنوع مضامین کی وجہ سے غالب کی شاعری منفرد اور بلیغ ہے۔ان کی شاعری میں جذبات واحساسات نئے انداز میں بیدار ہوتے ہیں۔انھوں نے بہت کم رباعیاں لکھی ہیں۔

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

مومن خان مومن(۱۸۰۰ء۔۱۸۵۲ء) کے کلام میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری میں تغزل اور معاملہ بندی انتہا کی ہے۔وہ عام روش سے الگ راستہ اختیار کرتے ہیں۔

میں شمع نہیں میرے رلانے سے حصول
لوبان نہیں میرے جانے سے حصول
میں خوردۂ گل نہ آب بارانِ بہار
ظالم میرے خاک میں ملانے سے حصول

امیر مینائی:نے نعتیہ اور عشقیہ رباعیاں لکھی ہیں۔ان کی رباعیوں میں ادبی شان موجود ہے۔

اے جان جہاں یہ بے وفائی ہم سے
اغیار سے اخلاص،رُکھائی ہم سے
بیگانہ روش بیٹھے ہو اس طرح الگ
گویا نہ کبھی تھی آشنائی ہم سے (۱۴)

محسن کاکوروی جو نعت گوئی کے لیے مشہور ہیں انھوں نے رباعی میں بھی نعتیہ مضمون باندھے ہیں۔

بندہ کو نگاہِ لطفِ مولا بس
حضرت کا مرے لیے وسیلہ بس ہے
میں مشتِ غبار ہوں سہارا مجھ کو
دامانِ رسولِ مصطفٰے کا بس ہے(۱۵)

آرزو لکھنوی(۱۲۸۹ھ)، جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ان کی کتاب ''سریلی بانسری''مشہور ہوئی۔فلمی گیت اور ترانے بھی لکھے۔انھوں نے غزل کے علاوہ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی۔

جب پانوں نئے دیس میں دھرنا ہوگا
جو جو ہو گا چلن سو کرنا ہو گا
مرنے کے لیے ہے چار دن کا رونا
جینے کے لیے پھر ابھی مرنا ہوگا

خواجہ الطاف حسین(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء):حالی نے غزلیہ اور نظمیہ شاعری کی طرح اپنی رباعیوں میں بھی اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے۔ان کی رباعیوں میں قومی محبت کا احساس ملتا ہے۔انھوں نے سو اسو کے قریب رباعیاں لکھی ہیں۔یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں:

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء): حالی طرح اکبر کا بھی رباعی نگاری کا مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے۔مگر ان کے اور حالی کے انداز میں بہت فرق ہے۔حالی کے یہاں سنجیدگی، سادگی اور متانت پائی جاتی ہے جب کہ اکبر کی رباعیوں میں طنز وظرافت اور شوخی کے عناصر ملتے ہیں۔

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اسمٰعیل میرٹھی: نے زیادہ تر شاعری بچوں کے لیے کی ہے رباعیات میں انھوں نے مصلحانہ انداز اختیار کیا ہے۔زندگی کے مسائل، قومی وملکی ضرورتوں کے حوالے سے رباعیاں لکھی ہیں۔

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار
بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار ہے مگر نہ اتنا دشوار
بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

مہدی مجروح: غالب کے شاگرد تھے۔ان کی زبان میں صفائی، سادگی اور سلاست ہے۔ان کے دیوان مظہر معانی میں بتیس رباعیات ہیں۔جن میں پختگی تو ہے مگر جدت اور تازگی نہیں ہے۔(۱۶)

شاد عظیم آبادی: کی رباعیوں میں تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔انھوں نے اخلاق، تصور اور معرفت کے حوالے سے رباعیاں لکھی ہیں۔

تنہا ہے چراغ دور پروانے ہیں
اپنے تھے جو کل آج بیگانے ہیں
نیرنگیٔ دنیا کا نہ پوچھو احوال
قصے ہیں کہانیاں ہیں افسانے ہیں

پیارے صاحب رشید میاں: منفرد اظہارِ بیان کے حامل ہیں۔اُن کی رباعیات میں دلکشی اور تاثر پایا جاتا ہے انھوں نے بڑھاپا کے موضوع پر بھی خوب رباعیاں لکھی ہیں۔

نامی ہوئے بے نشاں ہونے کے لیے
افسانہ ہوئے بیاں ہونے کے لیے
کی موت کی خواہش کہ چلیں جنت میں
ہم پیر ہوئے جواں ہونے کے لیے

برج نرائن چکبست (متوفی: ۱۹۲۶ء) اکبر کے ہم عصر تھے ان کی رباعیاں ایک نیا احساس لیے ہوئے ہیں۔انھوں نے وطن سے محبت کے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔

پھر لالہ وگل ہیں زیب تن دامانِ چمن
پھر جھوم رہے ہیں وہ ترکان چمن
ہے صحن چمن میں تہنیت سنج بہار
یعنی ہیں ترانہ ابرو مرغان چمن

شوق قدوائی: کی شاعری میں جذبات کا بہاؤ ہے۔انفرادیت ہے۔

آیا تھا قمر شب کو پانی میں
غیرت سے تیری گرا مگر پانی میں
سورج نے نکالا ہے اسے دن نکلے
ڈوبا رہا ہے ورنہ رات بھر پانی میں

نظم طباطبائی نے بہت کم رباعیات لکھی ہیں ان کے دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کے موضوعات ملتے ہیں۔عزیز لکھنوی نے بھی رباعیات لکھی ہیں مگر ان کے ہاں بھی زیادہ گہری فکر موجود نہیں۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد دنیا میں بہت کچھ تبدیل ہوگیا۔ادب کی قدریں اور زندگی کے میلانات میں واضح تغیر پیدا ہوا۔غزل کی جگہ نظم نے لے لی اور رباعی نے بھی خوب ترقی کی۔

بعض شعرا نے رباعی کو اپنا خاص موضوع بنالیا۔۔۔اس دور کے امجد حیدر آبادی، اخگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، ،فراق گورکھپوری مشہور ممتاز رباعی گو ہیں۔(۱۷)

شوکت علی خان فانی بدایونی: (متوفی ۱۹۴۱ء) ان کی شاعری میں المیہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ان کا طرز بیان اور اسلوب دلکش ہے کبھی کبھی ان کی غم پرستی قنوطیت میں بدل جاتی ہے۔

اے فتنہ روزگار آہستہ گزر
آشوب دل فگار آہستہ گزر
نازک ہے بھر دماغِ اربابِ جنوں
اے نکہتِ زلفِ یار آہستہ گزر

جوش ملیح آبادی: کی رباعیات فکری تسلسل کی غماض ہیں۔ان کی رباعیات میں وحدت خیال شکوہ الفاظ اور زور بیان نظر آتا ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ ''جنون وحکمت'' کے نام سے شائع ہوا۔ان کے مجموعے ''سموم وصبا'' میں بھی ڈھائی سو کے قریب رباعیات شامل ہیں۔

کشتی مرے احساس کی کھیتا ہے کوئی

ہر سانس میں پیغام سے دیتا ہے کوئی
یارب وہ کبھی زینتِ پہلو بھی بنے
یہ دل میں جو کروٹیں سی لیتا ہے کوئی

امجد حسین امجد حیدرآبادی: اول وآخر صرف رباعی گو شاعر ہیں۔ان کے رباعیات کے دو مجموعے شائع ہوئے وہ نظمیں بھی رباعی کے وزن میں لکھتے ہیں۔ان کی رباعیات میں تصوف وعرفان، اخلاق وفلسفہ اور عبادتِ الٰہی کے موضوعات ہیں۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لا حول ولا قوۃ الا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

کرامت علی خان شہیدی کے دیوان (مطبوعہ ۱۹۵۱ء اول) میں غزلیات، قطعات، مثنوی اور خمسہ کے علاوہ ۶ رباعیاں بھی شامل ہیں۔(۱۸)

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری: (متوفی ۱۹۸۱ء) کو جدید اردو کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی رباعیوں میں جمال پرستی اور رومانویت ملتی ہے ان کا اسلوب بیان نرم اور سادہ ہے۔

غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے
مطرب کوئی ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن
مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

یاس یگانہ چنگیزی (متوفی: ۱۹۵۶ء) خود پسند اور انا پرست تھے۔ ان کی رباعیات میں زندگی اپنی پوری تحریک کے ساتھ حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ان کا مجموعہ کلام ''گنجینہ'' میں ایک سو بہتر رباعیاں شامل ہیں۔

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جاں پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

سید عاشق حسین سیماب اکبرآبادی: (متوفی: ۱۹۵۲ء) نے اپنے اختراعی ذہن کی بدولت اپنی رباعیات میں جدت برتنے کی کوشش کی۔ان کی رباعیات دلکش اور توانا ہیں۔ان کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' کے نام سے شائع ہوا۔

صحرا بن کر پہاڑ ڈھل جاتا ہے
لوہا صفتِ آب پگھل جاتا ہے
آنا ہے جن انقلاب کا تیز قدم
جغرافیہ ملکوں کا بدل جاتا ہے

ریاض خیرآبادی (متوفی: ۱۹۳۴ء) نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔عبدالباری آسی نے چھ سو رباعیات کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے، جن میں کوئی فکری گہرائی نہیں۔آغا شاعر قزلباش نے فارسی شاعر خیام کی رباعیات کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور اسے 'میخانۂ خیام' کے نام سے شائع کرایا۔حامد حسن قادری، ابوسعید ابوالخیر، صفیہ شمیم، اثر لکھنوی (متوفی: ۱۹۶۷ء) نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا رباعیات کا مجموعہ 'رباعیات شاد' کے نام سے شائع ہوا۔

خواجہ دل محمد کے رباعیات کے مجموعے ''صد پارہ دل'' میں سائنسی مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے۔اخگر مرادآبادی کی رباعیات کا مجموعہ دہلی سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔اثر صہبائی، رگھویندر راؤ جذب عالم پوری نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔ڈاکٹر آر آر سکسینہ رام کی رباعیات کا مجموعہ 'سب رس' کے نام سے شائع ہوا۔نریش کمار شاد کا مجموعہ رباعیات ''قاشیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

رضا علی وحشت کلکتوی (متوفی: ۱۹۵۶ء)، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ماہر القادری، حیدر دہلوی، ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، شاعر لکھنوی، سیف الدین سیف، فارغ بخاری، اور رعنا اکبرآبادی نے بھی رباعی کی صنف میں لکھا ہے۔آج کل کے ادبی منظرنامے میں رباعی لکھنے والے کم نظر آرہے ہیں۔جس کی وجہ رباعی کے اوزان کی پابندی میں درپیش مشکلات ہیں۔متعدد شعرا ان پابندیوں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھ سکتے اور وہ قطعہ کی صنف کی طرف نکل جاتے ہیں۔انور سدید لکھتے ہیں:

> ''وہ اصناف سخن جو ایک خاص قسم کے فنی ریاض کا تقاضا کرتی ہیں اب صرف قادرالکلام شاعروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ان اصناف سخن میں رباعی بھی شامل ہے۔''(۱۹)

اقبال شوقی (۱۹۱۹ء۔۱۹۹۰ء) رباعیات کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی، سید مرتضیٰ، عبدالعزیز خالد، شمس الرحمٰن فاروقی، ظہیر غازی پوری، عمر فیضی، اختر شیرازی وہ شاعر ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کی

آخری دہائیوں میں رباعیات لکھی ہیں۔

نور محمد یاس کی رباعیات کی کتاب ''خوشبو کے جزیرے'' انڈیا سے شائع ہوئی۔قمر ساحری کی رباعیات کا مجموعہ ''موجِ رواں'' انور دہلوی کا مجموعہ ''کشیدِ فکر''، کے نام سے شائع ہوا۔ان کے علاوہ ڈاکٹر مقصود زاہدی، خالد علیم، احمد محفوظ اور رفیق جابر کے نام رباعی گو شعراء میں نظر آتے ہیں۔

افسوس سے ہاتھوں کو ملے گا برسوں
تپتی ہوئی مٹی پہ چلے گا برسوں
لا حول ولا قوۃ الا باللہ
حاسد مری شہرت سے جلے گا برسوں

(اشرف کمال)

حوالہ جات:

۱۔شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۶۹
۲۔محمد ارشاد، رباعی تکنیک اور فن، مشمولہ، فنون، مئی اگست ۲۰۰۴ء، ص ۳۹
۳۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو رباعی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۲ء طبع دوم، ص ۶۴
۴۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء، مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ، ص ۳۱۳
۵۔ الف ۔د۔نسیم، ڈاکٹر، مشائخ اور دوسرے مصنفین، مشمولہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد اول، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۲
۶۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستان شاعری، ص ۱۱۸
۷۔ایضاً، ص ۱۷۲
۸۔مرزا سودا حالات و انتخاب، فیروز سنز لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۷۸
۹۔صباح الدین عبدالرحمٰن (مرتب) مقدمہ، دیوان فغاں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۰ء، ص ۳۸
۱۰۔دہلی کا دبستان شاعری، ۱۷۴
۱۱۔دیوان ناسخ، لاہور مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳۸
۱۲۔لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۳۱۹
۱۳۔جاوید منظر، ڈاکٹر، مرزا دبیر اور اردو غزل، مشمولہ قومی زبان، کراچی، مارچ ۲۰۱۴ء، ص ۲۱
۱۴۔دیوان امیر معروف بہ اسم تاریخی مرآۃ غیب، دیوان اول، امیر مینائی، ترتیب و تدوین اسرائیل احمد مینائی، ۲۰۰۵ء ص ۴۱۵
۱۵۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستان شاعری، ص ۵۵۲
۱۶۔نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستان شاعری، لاہور، بک ٹاک، ۱۹۹۱ء، ص ۲۶۱
۱۷۔حامد حسن قادری، تاریخ و تنقید، ص ۱۱۷
۱۸۔عامر سہیل، سید، حوالہ، شعبہ اردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۳ء ص ۵۰
۱۹۔انور سدید، ڈاکٹر، ادب کہانی ۱۹۹۶ء، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۸ء، ص ۸۶

☆☆☆

رباعیات

پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال
اسلام آباد (پاکستان)

اک زخم نیا لگا دیا ہے یارو
سولی پہ ہمیں چڑھا دیا ہے یارو
افسوس کہ آج غیر ہیں سب اپنے
ان چاہتوں نے بھی کیا دیا ہے یارو

■

تاریک ہے رہگذر سحر ہونے دو
بے نور ہے ہر نظر سحر ہونے دو
کچھ دیر کی مہمان ہے یہ ظلمتِ شب
بے تاب ہیں بام و در سحر ہونے دو

■

خود زندگی بھر سہا اندھیرا ہم نے
دنیا کو دیا یہاں اجالا ہم نے
ہم ڈوب گئے تو غم نہیں ہے یارو
لوگوں کو دکھادیا کنارا ہم نے

■

تیرا غم ہے اگر تو پھر غم کیا ہے؟
تو میرے دل میں ہے تو کم کیا ہے؟
تیرے ہوتے ہوئے پریشاں کیوں ہیں؟
آنکھیں ہنستی ہیں جب تو پرنم کیا ہے؟

■

تیرا غم ہو تو پھر خوشی رہتی ہے
بس تنہائی سے دوستی رہتی ہے
اس کی زلفوں میں شام ہوجائے گی
اس کی بستی میں چاندنی رہتی ہے

کرناٹک میں اردو رباعی: ماضی تا حال

پروفیسر مقبول احمد مقبول
(شعبۂ اردو، مہاراشٹر ادے گیری کالج، ادگیر-413517 ضلع لاتور، مہاراشٹر، موبائل:9028598414)

'رباعی' فارسی اور اردو کی کلاسیکی شعری اصناف میں سے ایک اہم صنف ہے جو چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے لیے بحرِ ہزج کے چوبیس اوزان مخصوص ہیں۔ یہ صنف اردو کی دیگر کلاسیکی اصناف کی طرح فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ اور اصناف سخن کی طرح اس صنف کا آغاز بھی دکن میں ہوا۔ ریاستِ کرناٹک دکن کی ریاستوں میں سے ایک اہم ریاست ہے جس کی اپنی علمی ادبی اور تہذیبی وثقافتی تاریخ ہے۔ قدیم دور میں اردو زبان وادب کے فروغ واشاعت کے حوالے سے یہاں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور میسور ایسے علاقے رہے ہیں جہاں اردو زبان وادب کی جڑیں بڑی مضبوط اور گہری ہیں۔ اردو کی تقریباً تمام کلاسیکی اصناف کو یہاں پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے ہیں۔

غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیے کے مقابلے میں اگرچہ یہاں رباعیات کم کہی گئی ہیں لیکن ابتدا ہی سے رباعی گوئی کی روایت رہی ضرور ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں کرناٹک میں اردو رباعی گوئی کی روایت کو زمانی ترتیب کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے تاکہ اس روایت کے آغاز اور اس کے تسلسل سے ہم واقف ہوسکیں۔ اردو رباعی کے آغاز کے حوالے سے پروفیسر سیدہ جعفر نے قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب ''دکنی رباعیاں'' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوچکی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اردو کے قدیم رباعی گو شعرا کی جو رباعیات دی گئی ہیں وہ اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ مقالے میں تمام شعرا کو کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کے سالِ پیدائش کے اعتبار پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ رباعی گوئی کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہوسکے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز (پ:۱۳۲۱ء م:۱۴۲۲ء) فیروز شاہ بہمنی کے عہدِ حکومت میں ۱۳۹۸ء میں دہلی سے گلبرگہ (موجودہ نام کلبرگی) آئے اور اسی شہر کو رشد وہدایت کا مرکز بنالیا اور مدفون بھی یہیں ہوئے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنی کتاب میں اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد کی بیاض کے حوالے سے خواجہ بندہ نواز کی ایک رباعی دی ہے جو یہ ہے:

مشہور بہ حیرت ہو دیگر ہیچ ہے واللہ مرنے کے انگے مر کے ہو فانی فی اللہ
خناس کے وسواس سوں تو ہو پائمال لا حول ولاقوۃ الا با اللہ

گلبرگہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز کا قیام تقریباً پچیس برس رہا۔ ممکن ہے انھوں نے اور بھی رباعیاں کہی ہوں لیکن دستیاب ایک ہی ہوئی ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے رباعی گو شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں۔ اس طرح کرناٹک میں اردو رباعی کا آغاز بہمنی دورِ حکومت میں ہوتا ہے۔

فیروز شاہ بہمنی (وفات:۱۴۲۲ء) یہ بہمنی سلطنت کا آٹھواں حکمران تھا۔ مذہب اور شعروادب کے علاوہ دیگر کئی علوم وفنون سے اسے رغبت تھی۔ عربی فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بھی کئی زبانوں سے واقف تھا۔ فیروزیؔ اور عروجیؔ تخلص کرتا تھا۔ اس کی بھی ایک رباعی ملتی ہے جو محبوب کے حسن وجمال کی تعریف میں ہے:

گلبرگہ میں حضر تجھ مکھ چنداجوت دسے سارا جیوں تجھ کان پہ موتی جھمکے تارہ جیوں
فیروزی عاشق کو ٹک یک چاکن دے تجھ شوخ ادھر لب اہے شکر پارہ جیوں

فیروز شاہ بہمنی کی ایک فارسی رباعی کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اور رباعیاں کہی ہوں گی لیکن یہ محفوظ نہیں رہ سکیں۔ بہمنی دورِ حکومت میں اردو رباعی کے حوالے سے مذکورہ بالا دو شاعروں ہی کا نام سامنے آتا ہے۔

قدیم زمانے میں اردو زبان وادب کے فروغ کے حوالے سے بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ عادل شاہی حکومت کے تمام بادشاہ شعروادب کے قدردان تھے اور ان میں بیشتر خود اچھے شاعر تھے۔ ایسے ہی بادشاہوں میں علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ (پ:۱۶۳۸ء م:۱۶۷۲ء) کا نام آتا ہے۔ نصرتیؔ اسی کے دورِ حکومت کا شاعر تھا۔ بقول نصیرالدین ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی نہ صرف نصرتیؔ کا سرپرست ومربی تھا بلکہ نصرتیؔ نے اس کی

شاگردی بھی اختیار کی تھی۔(۱)اس سے علی عادل شاہ ثانی کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے پاس چار رباعیوں کا پتہ چلتا ہے۔ان میں تین عشقیہ موضوع کی حامل ہیں تو چوتھی اخلاقی نوعیت کی ہے۔ایک عشقیہ رباعی ملاحظہ کریں جس میں شاعر اپنے محبوب سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے میرے یار تو میرے سوا کسی اور سے کئی میل ملاپ یا دوستی نہ رکھ۔اے سخت دل محبوب! تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے۔ تو مجھے خود سے دور نہ کر:

مج باج سکی کس سوں ترا میل نکو
مل غیر سے ہرگز تو کدھیں کھیل نکو
لٹ پٹ جو پنٹ ہوں تو تجھے بھور بھلی
اے جیو کی کڑی! ہات دے مج ٹھیل نکو

نصرتی (م:۱۶۷۴ء) بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کا سب سے بڑا شاعر تھا۔علی عادل شاہ ثانی نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔اس نے مثنویات،قصائد اورغزلوں کے علاوہ رباعیات بھی کہی ہیں۔ بیجاپور کے شاعروں میں یہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے پاس سب سے زیادہ یعنی پچیس رباعیاں ملتی ہیں۔نصرتی کی رباعیات میں مضامین کا تنوع ہے۔حمد،نعت،توکل علی اللہ ،عشق،اخلاق، ،وعظ ونصیحت جیسے موضوعات اس کی رباعیوں میں پائے جاتے ہیں۔ایک رباعی میں وہ کہتا ہے کہ ناداں کو نصیحت کرنا کھارے پانی میں شکر گھولنے کے برابر ہے۔یعنی نصیحت اس کے لیے بے فیض ہے۔ اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔پھر کہتا ہے کہ موتی کی قدر دھنگر (ایک ذات جس کا کام بکریاں پالنا اور چرانا ہے) کیا جانے۔یعنی جنگلی آدمی کو کیا معلوم کہ موتی کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے۔بقول کسے: قدرِ گوہر شاہداند یا بداند جوہری۔ملاحظہ کریں:

ناداں سو نصیحت کے بچن بول نکو
پانی منے کھارے تو شکر گھول نکو
کیا قدر گہر کی بوجے گا بد گوہر
دھنگر کے انگے مانک کا گھر مول نکو

بیجاپور کے صوفی شاہ برہان الدین جانم (م:۱۵۹۱ء) کے فرزند امین الدین اعلیٰ (م:۱۶۷۵ء) کی اولاد میں سے بھی کئی بزرگ شاعر تھے۔ان میں بعض بزرگوں مثلاً بابا شاہ حسینی،جانمِ ثانی،علی پیر حسینی،پیر پاشا حسینی،سید بادشاہ حسینی کے یہاں بھی رباعیوں کا پتہ چلتا ہے۔کسی کے پاس ایک،کسی کے پاس دو،وکسی کے پاس تین تو کسی کے پاس چار رباعیاں ملتی ہیں۔ان تمام بزرگوں کا تعلق صوفی خانوادے سے تھا۔ ان کے خانوادے میں شاہ برہان الدین جانم کے والد شاہ میراں جی شمس العشاق (پ:۱۴۰۷ء) کے زمانے ہی سے تصوف اور سلوک کی روشن روایت رہی ہے اس لیے ان تمام بزرگوں کی رباعیات میں صوفیانہ مضامین پائے جاتے ہیں۔مثلاً سید بادشاہ حسینی ایک رباعی میں وحدت الوجود کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کون ومکاں میں اللہ کے نور کے سوا کچھ نہیں۔توحید ہی سچ ہے باقی سب وہم ہے،فریب ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

بیچ کون ومکاں نئیں ہے جُز یک نور
ظاہر ہوا وہ نور بہ انوارِ ظہور
حق نور وو کئی بھانت ظہور اس کا عالم
توحید ہی سچ ہے ودیگر وہم وغرور

شاہ کمال (م:۱۸۰۹ء) اپنے وقت کے بڑے صوفی تھے۔اگرچہ ان کا تعلق کڈپہ (آندھرا پردیش) سے تھا لیکن والیِ میسور حیدر علی خان نے انھیں اوران کے بڑے بھائی شاہ میر کو سری رنگا پٹن بلا لیا تھا۔(۲) چنانچہ ایک عرصے تک ان کا قیام سری رنگا پٹن میں بھی رہا۔ اس طرح شاہ کمال کا شمار کرناٹک کے شعرا میں کرنا کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شاہ کمال کے دیوان ''مخزن العرفان'' (مخزونہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد) کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہ کمال کے اس دیوان میں ۱۱۵ رباعیاں موجود ہیں۔''دکنی رباعیاں'' میں ڈاکٹر صاحبہ نے شاہ کمال کی بارہ رباعیاں دی ہیں۔

شاہ کمال چوں کہ صوفی تھے اس لیے ان کی رباعیات پر صوفیانہ وعارفانہ رنگ غالب ہے۔شاہ کمال کی رباعیات میں سلوک اور تصوف کی اصطلاحات کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔مثلاً: ہست،نیست،ہست مطلق،مشہود،معدوم،ذات، موجود وجود،حباب، موج وغیرہ ۔ کہیں کہیں فلسفیانہ رنگ بھی ہے۔یوں بھی تصوف خود ایک فلسفہ ہی تو ہے۔ شاہ کمال کا زمانہ دکنی زبان کے اختتام کا زمانہ ہے اس لیے ان کی زبان دکن کے دیگر شاعروں کی بہ نسبت صاف اور موجودہ اردو زبان کی طرح ہے۔شاہ کمال کی دو رباعیاں پیش ہیں:

سائل کو جواب کیا بجا کہتا ہوں
نا آپ کو بندہ نہ خدا کہتا ہوں
میں نیست ہوں راست فی الحقیقت اما
ہستِ مطلق کا رونما کہتا ہوں

■

بے صورت ہے حقیقتاً حق اما
مشہود بہ صورتِ حقیقی کے سوا
معدوم بعینہ ہے عالم لیکن
موجود بہ ہستیِ حقیقی موجود

غلام مصطفی عشقی کی پیدائش بیدر میں ہوئی لیکن مسکن حیدرآباد تھا۔ یہ نواب سالار جنگ بہادر (پ: ۱۸۸۹ء م: ۱۹۴۹) کے ہم عصر تھے اور پوچم پلی (موجودہ تلنگانہ) میں تحصیلداری کی خدمت پر مامور تھے۔ مظفرالدین خاں صاحبؔ حیدرآبادی نے اپنی کتاب ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی میں اطلاع دی ہے کہ ان کا نعتیہ دیوان موسوم بہ ''محامدِ محمدی'' حیدرآباد سے شائع ہوا ہے جس میں ۴۷ رباعیات ہیں۔ (۳) صاحبؔ حیدرآبادی نے اپنی اس کتاب میں عشقی کی چند رباعیات دی ہیں۔ ان رباعیات کے مطالعے سے عشقی کی حضور اکرم ﷺ سے ان کی والہانہ ظاہر ہوتی ہے۔ بطورِ نمونہ ایک رباعی پیش ہے:

فرقت میں نبی کی زندگانی ہے تلخ
پیری کی طرح عہدِ جوانی ہے تلخ
پانی کی طرح خونِ جگر پیتا ہوں
فرقت کی یہ تلخی ہے کہ پانی ہے تلخ

نامیؔ نظامی شاہ پوری (پ: ۱۸۴۴ء م: ۱۹۵۰ء) کا مولد و مسکن شاہ پور تھا جو آج ضلع گلبرگہ (کلبرگی) کا ایک تعلقہ ہے۔ موصوف خواجہ حسن نظامی کے مرید تھے۔ یہ شاہ پور کے مڈل اسکول میں فارسی کے مدرس تھے۔ نامیؔ کے انتقال کے بعد شائع ہونے والے مجموعے ''سخنِ نامی'' (جس کے مرتب ان کے فرزند وقار خلیل ہیں) میں رباعیات کے عنوان سے گیارہ تخلیقات ہیں۔ ان میں دو تخلیقات رباعیاں نہیں بلکہ قطعات ہیں کیوں کہ یہ رباعی کے اوزان میں نہیں ہیں۔ نامیؔ کی نو رباعیاں فنی اعتبار سے بہترین ہیں۔ ان رباعیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا کہ نامیؔ رباعی کے اوزان اور فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان سے وزن کی غلطی کا امکان نہیں۔ ممکن ہے مرتب کی غلطی سے یہ دو قطعات رباعیوں میں شامل ہو گئے ہوں۔ نامیؔ کی دو رباعیاں پیش ہیں:

انسان کی ہے نشو ونما خوبی سے
پھلتا ہے ہمیشہ یہ شجر خوبی سے
انجام برائی کا برا ہوتا ہے
اچھا ہے وہی جو رہے خوش خلقی سے

■

کیا دل کو خوشی ہو کہ جوانی نہ رہی
وہ طبع کی تیزی وہ روانی نہ رہی
پیری کا ہے عنوان سفیدی اپنی
ہلکے ہوئے اتنے کہ گرانی نہ رہی

جذبؔ عالمپوری (پ: ۱۸۹۴ء م: ۱۹۷۳ء) گنگاوتی ضلع رائچور میں پیدا ہوئے۔ پیشے سے وکیل تھے۔ انھیں ''خیامِ آندھرا'' کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ (۴) 'رباعیاتِ جذب' 'ارمغانِ جذب' 'صد پارۂ جذب' 'تحفۂ جذب' 'آہنگِ جذب' کے نام سے جذبؔ کی رباعیوں کے پانچ مجموعے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران میں ان کی حیات ہی میں شائع ہو چکے ہیں۔ آخری مجموعہ 'آہنگِ جذب' دراصل دو مجموعوں 'احساساتِ جذب' اور 'معلوماتِ جذب' پر مشتمل مشترکہ مجموعہ ہے۔ اس طرح جذب کے چھے مجموعے ہیں جن میں لگ بھگ چھے سو رباعیات ہیں۔ جذبؔ نے مختلف موضوعات کی حامل رباعیاں کہی ہیں لیکن ان کی رباعیوں پر ناصحانہ رنگ غالب ہے۔ جذب کے چوتھے مجموعے ''تحفۂ جذب'' سے دو رباعیاں پیش ہیں:

انسان خیال ہی خوشی کا نہ کرے
خوش رہنے کی حسرت ہے تو ایسا نہ کرے
جو چاہے کہ ہو اس کی تمنا پوری
اس سے کہہ دو کوئی تمنا نہ کرے

■

جو فلسفۂ حیات کا دانا ہے
وہ رنج سے اور خوشی سے بے پروا ہے

ہیں رنج وخوشی صرف فریبِ ہستی
دنیا اپنی جگہ خوداک دھوکا ہے

دامودر ذکیؔ (پ: ۱۹۰۳ء) کوڑنگل میں پیدا ہوئے ۔یہ گاوں ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید سے قبل ضلع گلبرگہ (موجودہ نام کلبرگی) میں تھا۔آج یہ تلنگانہ کے ضلع محبوب نگر کا تعلقہ ہے۔پیشے کے اعتبار سے وہ مدرس تھے۔''سفینۂ ذکی'' ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ۵۹ رباعیاں شامل ہیں ۔صاحبؔ حیدرآبادی کے مطابق ذکیؔ کا ایک اور مجموعہ بنام ''ارج'' ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا ہے جس میں اکسٹھ رباعیاں ہیں۔(۵) میرے پیشِ نظر ذکیؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔صاحبؔ حیدرآبادی نے ذکیؔ کے پہلے مجموعے کا نام ''سفینۂ زندگی'' لکھا ہے جو غلط ہے۔دامودر ذکیؔ کی رباعیاں اخلاق وحکمت اور پند ونصائح کے مضامین سے معمور ہیں ۔انھوں نے جو بھی کہا ہے اپنے اسلوب میں کہا ہے۔زبان صاف ستھری اور اندازِ بیاں سادہ ہے:

بندہ ہوں ترا چاہ رہا ہوں درشن
معلوم بھی ہے میں ہوں گنہ کا مخزن
جل سکتا ہے جب طور تو کیا ذکرِ گناہ
پھینک اپنی تجلی کی ادھر ایک کرن

■

تنکے کئی ملتے آشیانہ ملتا
پانی بہت ، افراط سے دانہ ملتا
یا رب! غلطی کی کہ نہ مانگا تجھ سے
ورنہ مجھے دنیا کا خزانہ ملتا

دامودر ذکیؔ کی رباعیوں میں کہیں کہیں عروضی لغزشیں نظر آتی ہیں۔تاہم بحیثیتِ مجموعی لحاظ سے ان کی رباعیاں فکر وخیال کے لحاظ سے اچھی ہیں۔

عطاؔ کلیانوی (پ: ۱۹۰۵ء م:۶ مئی ۱۹۸۵ء) کا وطن بسوا کلیان تھا۔عطاؔ کلیانوی پیشۂ درو تدریس سے منسلک تھے۔کچھ مدت کے لیے سررشتۂ عدالت منصفی کلیانی اور پھر منتظمِ پیشی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ،آخر میں منصرمِ تحصیلدار بھی رہے۔(۶) علامہ عطاؔ کلیانوی کا شمار اپنے وقت کے مشہور صوفی شعرا میں ہوتا ہے۔اگرچہ عطاؔ نے شعر گوئی کی ابتدا غزل سے کی اور نظمیں بھی لکھیں لیکن ان کے حقیقی جوہر صنفِ رباعی میں کھلے۔انھیں صنفِ رباعی سے فطری مناسبت تھی۔عطاؔ کلیانوی کا مجموعۂ رباعیات ''وجود وشہود'' کے نام سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

الٰہیات وعرفانیات علامہ عطاؔ کی رباعیات کا خاص موضوع ہے۔عطاؔ نے اہلِ نظر کے لیے رباعیات کی صورت میں گہر ہائے تابدار کا انمول خزانہ چھوڑا ہے۔تصوف اور روحانیت کا صحت مند رجحان آپ کی رباعیات میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔کہیں فلسفیانہ رنگ ہے تو کہیں عالمانہ شان،تو کہیں رموزِ حقائق ومعارف بیان ہوے ہیں عطاؔ کی رباعیوں میں علمی واخلاقی نکتے بھی ہیں اور پند ونصائح کی باتیں بھی ہیں ۔ایک طرف عظمتِ انسانیت کے ترانے ہیں تو دوسری طرف صوفیانہ وقلندرانہ بے نیازی ہے۔عطاؔ کی رباعیات فنی چابک دستی ، زبان وبیاں کے حسن اثر آفرینی،سلاست وروانی ،تشبیہات و استعارات،نادر تراکیب،سوز وگداز،خیالات کی رفعت،فکر کی گہرائی اور احساس کی شدت کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔فنِ رباعی پر دسترس،موضوعات اور اسلوب کے پیشِ نظر عطاؔ کو چند باکمال رباعی گو شعرا کی فہرست میں خصوصی جگہ دی جاسکتی ہے۔خمریات کا رنگ بھی عطاؔ کی رباعیات میں ملے گا لیکن تصوف اور الٰہیات ان کی رباعیوں کے دو خصوصی موضوعات ہیں اور یہی رنگ ان کی رباعیات کا طرۂ امتیاز ہے۔عطاؔ کی رباعیات کے غائر مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ الٰہیات،عرفانیات اور تصوف ان کی رگ وپے میں خون بن کے دوڑ رہا ہے۔جدید افسانہ نگار ڈاکٹر اکرام باگ نے عطاؔ کلیانوی کی کی شخصیت اور فن پر گلبرگہ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ہے۔وہ اپنے مقالے میں امجدؔ حیدرآبادی اور عطاؔ کلیانوی کے فن اور فکر ونظر کا موزانہ کرتے ہوے لکھتے ہیں:

عطاؔ کلیانوی کا شعری کینوس امجدؔ کے مقابلے میں زیادہ وسیع ، گہرا اور آفاقی ہے۔امجدؔ کے یہاں اخلاقیات اور رشد وہدایات کا منظر نامہ ملتا ہے ۔جبکہ عطاؔ کے ہاں تصوف ،عرفان کی کائنات روشن ہے۔۔۔ان کی شاعری کا سرسری جائزہ ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کو تصوف اور اس کے متعلقہ مضامین سے گہری وابستگی ہے۔۔۔واقعہ یہ ہے کہ عطاؔ کلیانوی نے تصوف کے جن مسائل کو شدت اور گہرائی سے بیان کیا ہے وہاں تک امجد کی رسائی بھی نہ ہوئی تھی۔(۷)

الٰہیات وعرفانیات کے موضوع پر چند ایسی رباعیاں ملاحظہ فرمائیں جن میں گہرے تفکر اور فلسفیانہ رنگ کی آمیزش بھی ہے:

جب ذاتِ احد کوہوا اک شوقِ نمو د
اے دوست ہوئی میمِ محمد مشہود
عنوان اس افسانے کا جز عشق نہیں
اک آگ نے بخشا ہے سمندر کو وجود

■

کچھ دل کے مقام سے بھی ہو جا آگاہ
یہ کعبہ و بت خانہ، نہ منزل ہیں نہ راہ
پردہ ہوئی جاتی ہیں نگاہیں تیری
گر دیکھنا ہو حق کو تو لا، حق کی نگاہ

■

آزاد ہو پابندِ روایات نہ ہو
سالک ہے اگر، وقفِ مقامات نہ ہو
تو مستِ، مئِ ذات نہ ہوگا ہرگز
جب تک ترے کعبے میں خرابات نہ ہو

■

نغماتِ حقیقت کے لیے ساز ملا
ہمدم مری آواز میں آواز ملا
تا، سینۂ لو لاک پہنچنا ہے اگر
جبریل کی پرواز سے پرواز ملا

عطاؔ کلیانوی کی رباعیات عشقِ حقیقی کے جذبات سے معمور ہیں ۔سوز وگداز ،اثر آفرینی ،گھلاوٹ ،شیرینی اور سحر انگیزی کے اعتبار سے بھی ان کی رباعیاں اپنی مثال آپ ہیں ۔عارفانہ خیالات ،متصوفانہ افکاراور فلسفیانہ موشگافیوں کی وجہ سے عطاؔ کی رباعیاں اردو رباعی کے ذخیرے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں ۔فکری اور فنی ہر اعتبار سے ان کی رباعیاں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں ۔ بلاشبہ عطاؔ کلیانوی کو اردو کے چند بڑے رباعی گوشعرا میں جگہ دی جاسکتی ہے۔عطاؔ کلیانوی نے لگ بھگ ایک ہزار رباعیاں کہی ہیں ۔ ان میں سے تقریباً تین سو رباعیاں ''وجود شہود'' میں شامل ہیں ۔عطاؔ کے انتقال کے بعد ڈاکٹر اکرام باگ نے ''صوتِ سرمدی'' اور'' عطا وخطا'' کے عناوین سے دو اور مجموعے ترتیب دیے ہیں ۔ان میں اولذکر میں تین سو پچاس اور آخر الذکر میں دو سو چھیتر رباعیاں شامل ہیں(۸) جو ہنوز اشاعت کے منتظر ہیں ۔مختصر یہ کہ مستند رباعی گوشاعر کی حیثیت سے عطاؔ کلیانوی اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

میر شمس الدین علی خاں شمسؔ اصلاً حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔کچھ عرصے تک ضلع رائچور میں منصرم ناظمِ ضلع کی حیثیت برسرِ خدمت رہے اور یہیں سے ۱۹۴۶ء کو وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔''جنوبی ہند میں رباعی گوئی'' کے مولف صاحبؔ حیدرآبادی کے مطابق شمسؔ کی رباعیات وقطعات کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔(۹) شمسؔ کی رباعیات میں روانی اور سلاستی پائی جاتی ہے۔فکر وخیال کے اعتبار سے بھی ان کی رباعیاں اچھی ہیں ۔عام طور پر رباعی میں جو موضوعات برتے جاتے ہیں وہی موضوعات شمسؔ کی رباعیات میں پائے جاتے ہیں ۔صاحبؔ حیدرآبادی کی مذکورہ کتاب سے شمس کی رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

سمجھا اگر اس طرح تو بے جا سمجھا
کیا تجھ کو سمجھنا تھا مگر کیا سمجھا
حد ذہنی ترقی کی نہیں ہے کوئی
نادان ہے تو کہ خود دانا سمجھا

■

زیبا نہیں انساں کے لیے لاف وگزاف
کینہ وعداوت سے رکھو دل کو صاف
باتوں سے ٹپک پرتا ہے دل کا کینہ
پوشیدہ نہیں رہتا ہے باطن کا لفاف

محمد عبدالکریم ماہرؔ کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ریاست کی تقسیم (۱۹۵۶ء) کے بعد وہ بنگلور منتقل ہوئے۔وہاں سرکاری ملازم رہے اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد واپس حیدرآباد آ گئے۔صاحبؔ حیدرآبادی کے مطابق بشمول رباعیات مختلف اصناف پر مشتمل ماہرؔ کا ضخیم مسودہ ہے جو ۱۹۸۴ء تک تو غیر مطبوعہ تھا۔ماہرؔ کی رباعیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں رباعی گوئی سے خاص شغف تھا۔انھوں نے اخلاقی ،عشقیہ، نعتیہ اور منقبتیہ ہر قسم کی رباعیاں کہی ہیں ۔دو رباعیاں پیش ہیں:

سینے میں خزانہ تھا چھپایا نہ گیا
دروازے پہ تالا بھی لگایا نہ گیا

دل میرا گیا تو کس پہ الزام رکھوں
جز آپ کے کوئی یہاں آیا نہ گیا

■

بے سود عبادت میں بشر جاگتے ہیں
کچھ شوق لیے تا بہ سحر جاگتے ہیں
اللہ کرے ان کی آنکھیں کھل جائیں
دل تو نہیں بیدار مگر جاگتے ہیں

سید احمد ایثارؔ (پ: ۱۹۲۲ء م: ۲۰۲۱ء) کا مولد و مسکن بنگلور تھا۔ ایثارؔ مترجمِ اقبالِ فارسی کی حیثیت سے اردو ادب میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کے تمام فارسی شعری مجموعوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی مولانا روم، رباعیاتِ شمس تبریزی، رباعیاتِ عمر خیام، رباعیاتِ حافظ شیرازی، رباعیاتِ سعدی شیرازی کے تراجم بھی ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'ترانہ و ترنگ' میں ۱۸۳ رباعیات ہیں۔ شاعری میں ایثارؔ کا میلان اور اصناف کی بہ نسبت رباعی گوئی کی طرف زیادہ رہا ہے۔ ''ترانہ و ترنگ'' میں شامل تمام رباعیات کو ایثارؔ نے ''اسرارِ حیات'' کا عنوان دیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر ان رباعیوں کو موضوعات کے لحاظ سے الگ الگ عناوین کے تحت رکھا گیا ہے۔ مجموعے میں شامل نصف رباعیاں خالص مذہبی نوعیت کی حامل ہیں۔ متفرقات کے ذیل کی بیشتر رباعیوں پر بھی مذہبی و اصلاحی رنگ غالب ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایثارؔ کی فکر و نظر کا خمیر مذہب اور اخلاق سے اٹھا ہے۔ ایثارؔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ وہ دل کی گہرائی کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قرآن ساری انسانیت کے لیے اکمل ترین دستورِ حیات ہے۔ ایثارؔ نے بیشتر رباعیوں میں اپنے اس یقین کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن کی عظمت و تقدیس اور شیرینی و تاثیر پر بھی رباعیاں کہی ہیں۔ مثلاً

دستور زمانے کے بدل جاتے ہیں بنتے ہیں
بگڑ کے سر سے ٹل جاتے ہیں
انساں کو ہے قانونِ الٰہی موزوں
اس راہ سے کیوں لوگ پھسل جاتے ہیں

■

الفاظ کی شیرینی و آہنگ کا رنگ
تاثیر کا یہ حال، پگھل جائے سنگ
اللہ کا کلام اور محمدؐ کی زباں!
دنیائے ادب سب اس کے آگے پاسنگ

سید احمد ایثارؔ نے حمد نعت اور منقبت کے بعد متفرق موضوعات کی حامل رباعیاں کہی ہیں۔ مثلاً: اخلاق و حکمت، پند و نصیحت، تصوف، حرص و ہوس کی مذمت، غرور و تکبر کی برائی، ایثار و قربانی، ہمدردی و اخلاص، خود احتسابی کی تلقین وغیرہ۔

اکملؔ آلدوری (پ: ۱۹۳۱ء) ضلع چکمگلور کے گاؤں آلدور میں پیدا ہوئے۔ اکملؔ آلدوری کو رباعی گوئی سے خاص شغف تھا ''نور و ظہور'' اور ''سلگتے پھول'' کے عنوانات سے ان کی رباعیات کے دو مجموعے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئے۔ جن میں رباعیات کے ساتھ ساتھ کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔ ایک اور مجموعہ ''ساغرِ اخلاص'' میں بھی کچھ رباعیاں ہیں۔ اکملؔ نے اپنی تمام رباعیوں کو ''جادۂ اخلاص' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے جس میں ڈھائی سو سے زائد رباعیاں ہیں۔ ان تمام رباعیوں کو مختلف عناوین کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

حمد، نعت، منقبت، اخلاق، تصوف اور اصلاحِ معاشرہ اکملؔ آلدوری کے اہم موضوعات ہیں۔ حمد نعت اور منقبت اور تصوف سے اکملؔ کا مذہبی مزاج نمایاں ہوتا ہے تو اخلاقی اور اصلاحی رباعیوں سے ان کی پاک باطنی اور اصلاحِ معاشرہ کی تڑپ ظاہر ہوتی ہے۔ خمریات اور عشق و محبت کے موضوعات بھی ان کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ''آئینۂ حیات'' کے زیرِ عنوان رباعیاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان رباعیوں میں کہیں کہیں فلسفیانہ رنگ نظر آتا ہے۔ بطورِ نمونہ دو رباعیاں پیش ہیں:

ہے مسئلۂ حیات کتنا مبہم
آغوشِ وجود میں ہے پوشیدہ عدم
ہنسنے پہ اجل کے ہمیں معلوم ہوا
ہستی ہے حقیقت میں فریبِ پیہم

■

کتنا ہے منظم انتظامِ ہستی
ہے کون و مکاں میں اژدھامِ ہستی
جو آتا ہے ہوتا ہے گرفتار اس میں
پھیلا ہوا ہے حسیں دامِ ہستی

مجموعی اعتبار سے اکمل آلدوری کی رباعیاں قابلِ تحسین ہیں۔ان کی رباعیات میں گہرائی وگیرائی کے علاوہ موضوعات کی رنگارنگی بھی ہے۔زبان وبیان اورفنی نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیا جائے تو ان کی رباعیاں اچھی ہیں۔

ڈاکٹر راہی قریشی (پ: ۱۹۳۴ء م:۲۰۱۰ء) کا وطن اورنگ آباد (دکن) تھا۔گلبرگہ وطنِ ثانی تھا جہاں وہ گلبرگہ یونی ورسٹی گلبرگہ کے شعبۂ اردو استاد کی حیثیت سے برسرِ کار تھے۔ویسے تو وہ غزل کے شاعر تھے لیکن رباعی گوئی سے بھی انھیں شغف تھا۔جس کا ثبوت ان کا مجموعۂ رباعیات ''چار سُو'' ہے۔یہ مجموعہ تقریباً دوسو رباعیات پر مشتمل ہے۔راہی قریشی کی بیشتر رباعیات میں درد واور کسک، احساسِ محرومی، کرب وغم اور افسردگی کی کیفیات نظر آتی ہیں۔زیادہ تر رباعیاں ان کی اپنی ذات وشخصیت کے حوالے سے کہی گئی ہیں۔مثلاً:

اک دشت کی تقدیر ہوا جا تا ہوں
خاموشی کی تقریر ہوا جاتا ہوں
اب گھر میں بس اتنی ہے ضرورت میری
دیوار کی تصویر ہوا جاتا ہوں

■

ذرہ ہوں جو چمکے بھی تو اختر نہ بنے
کانٹا ہوں کہ جو پھول کا ہمسر نہ بنے
تکمیل مری ہوگی کہاں کب کیسے
قطرہ ہوں ،صدف میں بھی جو گوہر نہ بنے

راہی قریشی کی رباعیاں رواں اور سلیس ہیں۔زبان عام فہم اور طرزِ ادا سادہ ہے مشکل اور نامانوس الفاظ استعمال کر کے اپنی رباعیوں کا بوجھل نہیں بناتے۔سادگی سلاست اور سوز وگداز ان کی رباعیات کا خاص وصف ہے۔خطابیہ لہجہ کم اور خود کلامی زیادہ ہے۔

وحید واجد (پ: ۱۹۴۵ء) کا وطن رائچور ہے۔کرناٹک کے بزرگ شاعروں میں موصوف کا شمار ہوتا ہے۔تقریباً پچاس پچپن برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں مگر مزاج میں بے نیازی ایسی ہے کہ اب تک انھوں نے اپنا کوئی شعر مجموعہ شائع نہیں کیا۔ایک عرصے سے رباعیات بھی کہہ رہے ہیں جو آئے دن اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔وحید واجد کے پاس ڈیڑھ دوسو رباعیاں تو ضرور ہوگی۔ان کی بیشتر رباعیات میں طنز اور تلخی کے ساتھ ساتھ موجو د ہ سماجی ،سیاسی،علمی وادبی ناہمواریوں پر جھلاہٹ نظر آتی ہے۔

وحید واجد نے ''تہجی رباعیات'' کے نام سے رباعی میں ایک تجربہ کیا ہے۔اس تجربے میں انھوں نے ہر رباعی کے چاروں مصرعے مسلسل حروفِ تہجی میں کہے ہیں۔یعنی پہلی رباعی کے چاروں مصرعے ا،ب،پ، ت سے شروع ہوتے ہیں،دوسری رباعی کے چاروں مصرعے ٹ،ث،ج،چ سے شروع ہوتے ہیں۔یہ سلسلہ 'ے' پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح نو رباعیات کے چھتیس مصرعوں کی ابتدا میں سوائے 'ڑ' کے تمام حروفِ تہجی آ گئے ہیں۔دو رباعیاں دیکھیں جن کے چاروں مصرعوں کی ابتدا بالترتیب ا،ب،پ،ت،ٹ،ث،ج،چ سے ہوئی ہے:

اسلام مصیبت سے بچاتا ہے میاں
بدبخت کو خوش بخت بناتا ہے میاں
پستی سے بلندی کی طرف ہی واجدؔ
توحید کا کلمہ ہی اٹھاتا ہے میاں

■

ٹکڑا کے تلاطم سے سفینے کو بچا
ثروت سے بھی بچ خود کو گھمنڈی نہ بنا
جاہل کی رفاقت سے بچا لے خود کو
چوروں کو کسی طرح تجوری نہ بتا

خالد سعید (پ:۱۹۵۰ء م:۲۰۲۱ء) کا وطن گلبرگہ تھا۔وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو کے پروفیسر تھے۔

جدید لب ولہجے کے شاعر تھے۔اپنی وفات سے کچھ برس قبل رباعی گوئی کی طرف مائل ہوئے تھے۔خالد سعید نے زیادہ نہیں پچیس تیس رباعیاں کہی ہیں۔غزل کی طرح رباعیوں میں بھی انھوں نے اپنا منفرد اسلوب برقرار رکھا ہے۔ خالد سعید کا رنگِ رباعی ان کی درجِ ذیل دو رباعیوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے:

آئینے سے الجھوں یا سر پیش کروں
قاتل سے نہ خود کو کم تر پیش کروں
سرجائے کہ رہ جائے تماشا کیا ہے
قامت رہے باقی وہ ہنر پیش کروں

ٹھہرے ہیں شجر شجر یہاں بے مطلب
جاتے ہیں لوگ گھر یہاں بے مطلب
مستی میں طے کیا سفر، لاحاصل ہیں
میرے بال وپر یہاں بے مطلب

حامد اکمل (پ:۱۹۵۰) گلبرگہ کے متوطن معروف صحافی ہیں۔غزل اور نظم کے شاعر ہیں۔ذائقے کی تبدیلی کے لیے کبھی کبھی رباعی بھی کہتے ہیں لیکن بہت کم۔حامد اکمل نے اپنی نظموں اور غزلوں کی طرح رباعیوں میں بھی اپنا مخصوص لہجہ برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔لفظیات اور اسلوبِ بیان میں تازگی اور جدت نظر آتی ہے۔تصوف کی طرف حامد اکمل کا میلان شروع سے رہا ہے جس کا پرتو ان کی رباعیات میں دکھائی دیتا ہے۔مثلاً:

کیا راس رچائی ہے عجب اللہ ہو
میں، میں نہ رہا اور رہا تو ہی تو
انفاس کے پردے میں چھپا بیٹھا ہے
پاؤں تجھے ،ہو جاؤں اگر میں یک سُو

در در سے بھٹک کر تو یہاں پہنچے ہیں
معلوم نہیں پھر بھی کہاں پہنچے ہیں
اے صاحبِ امکان ومکاں تو بتلا
یہ تیرا ٹھکانہ ہے ، جہاں پہنچے ہیں؟

اکرم نقاش (پ: ۱۹۶۱ ء) کا وطن گلبرگہ ہے ۔پیشے سے سول انجینیئر ہیں ۔جدید لہجے کے غزل گو شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ادھر چودہ پندرہ برسوں سے وہ رباعیاں بھی کہہ رہے ہیں۔ اکرم نقاش کی سو رباعیات پر مشتمل ایک مجموعہ بعنوان'' حشر سی برسات'' ۲۰۰۹ ء میں شائع ہوا ہے۔دوسرے مجموعے'' بے سحر رات'' میں بھی کچھ رباعیاں موجود ہیں۔اکرم نقاش کی رباعیاں، رباعی میں برتے جانے والے عام موضوعات سے علاحدہ ہیں ۔غزل کی طرح ان کی رباعیوں میں بھی انفرادیت ہے۔انھوں نے اپنی رباعیوں میں رنگِ تغزل لانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اکرم نقاش کے مزاج پر رومانیت غالب ہے جس کا پرتو ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتا ہے۔مثلاً:

ممکن نہیں دل اور کہیں آجائے
جس سمت بڑھوں تیری زمیں آجائے
کچھ میری صدا اے سببِ راحت سن
دل چیر کے رکھ دوں جو یقیں آجائے

نغمہ سا رگ وپے میں اتر جاتا ہے
اک سحر سا اعصاب پہ کر جاتا ہے
ریشم ہے کہ خوشبو کہ اجالا ہے بدن
ہر رنگ ترے رنگ سے بھر جاتا ہے

حافظ کرناٹکی (پ: ۱۹۶۴ ء) کا تعلق شکاری پور ضلع شیموگہ سے ہے۔حافظ صاحب نے شاعری کی ابتدا بچوں کی شاعری سے کی ۔بچوں کے لیے سینکڑوں نظمیں تخلیق کیں اور بیسیوں مجموعے شائع کیے۔شاعرِ اطفال کی حیثیت سے مستحکم شناخت قائم کی ۔پھر غزل گوئی اور رباعی نگاری کی طرف توجہ دی۔ابتداً غزلیں اور رباعیاں بھی بچوں ہی کے لیے تخلیق کیں۔چنانچہ ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ''موجِ تسنیم'' بچوں کے لیے تخلیق کردہ رباعیوں پر مشتمل ہے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے'' رباعیاتِ حافظ'' کے نام سے چار حصے شائع ہوئے۔۲۰۲۱ء میں'' کلیاتِ رباعیاتِ حافظ'' کے نام سے ان کی رباعیات کا کلیات شائع ہوا ہے جس میں تقریباً سات ہزار رباعیاں موجود ہیں۔قدیم وجدید اردو کے رباعی گو شاعروں میں ایسا کوئی شاعر نہیں جس نے اتنی کثیر تعداد میں رباعیاں کہی ہوں۔یہ انفراد حافظ کرناٹکی ہی کو حاصل ہے ۔حافظؔ صاحب کا ذہن بے حد زرخیز اور قلم میں بلا کی روانی ہے۔وہ بڑی تیزی سے شعر کہتے ہیں۔رباعی تو جیسے ان کی رگ وپے میں سرائیت کر گئی ہے۔حیات وکائنات کے بے شمار موضوعات پر انھوں نے رباعیاں کہی ہیں۔ان کی اس زود گوئی پر حیرت ہوتی ہے:

ہر شخص کے رخ پر ہیں نقابیں کتنی
کستی ہیں تعیش کی طنابیں کتنی
تفریح، فحش فلمیں، سیاست، کرکٹ
پیتے ہیں یہاں لوگ شرابیں کتنی

پستی میں کہیں ڈال نہ دے بامِ عروج
اترا کے نہ چل باندھ کے احرام ِعروج
چل عجز سے اخلاص کا انداز برت
پاتال دکھا سکتا ہے انجامِ عروج

■

سوتا ہوں تو اٹھتے ہیں سوالات کئی ڈستے ہیں
دل وذہن کو خدشات کئی
بستر پہ بکھرتے ہیں مسائل لاکھوں
تکیے سے ابھرتے ہیں خیالات کئی

مقبول احمد مقبولؔ (پ:۱۹۶۵ء) کا تعلق چٹگوپہ، ضلع بیدر سے ہے ۔وطنِ ثانی اُودگیر (مہارشٹرا) ہے جہاں وہ ایک کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔اٹھائیس برس کی عمر سے رباعی کہہ رہے ہیں۔ان کی رباعیوں کا دیوان بعنوان ''احساس وادراک'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا (ان کے پاس تقریباً اتنی رباعیاں اور بھی ہیں جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوں گی)۔ ۲۴۴ رباعیوں کے اس دیوان میں تمام حروفِ تہجی پر مشتمل ردائف اور قوافی کی حامل رباعیاں موجود ہیں۔یہی نہیں بلکہ مقبول احمد نے رباعی کے مروجہ چوبیس اوزان میں رباعیاں قلمبند کی ہیں۔

خود اپنی ذات سے جو واقف نہ ہوا
اسرارِ حیات کا ،جو کاشف نہ ہوا
کہہ لے وہ لاکھ خود کو عارف
لیکن سچ بات تو یہ ہے، کہ وہ عارف نہ ہوا

■

نیت ہو اگر، بندۂ دنیا بن جاے
گرٹھان لے ،تو دوست خدا کا بن جاے
مائل ہوبدی پر، بنے شیطاں، انسان
نیکی پہ ہو راغب تو فرشتہ بن جاے

کرناٹک میں اردو رباعی کے اس عہد بہ عہد جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اردو رباعی کی روایت ابتدا ہی سے رہی ضرور ہے بلکہ اردو رباعی کا آغاز یہیں سے ہوا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رباعی لکھنے والے شعرا یہاں کم رہے ہیں۔قدیم دور میں نصرتیؔ ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے پاس پچیس رباعیوں کا پتا چلا ہے۔باقی شعرا کے یہاں دو چار رباعیاں ہی ملتی ہیں۔نصرتیؔ کے سوسوا سو سال بعد شاہ کمال ایسے شاعر ہیں جن کے پاس ۱۱۵ رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ان کے بعد کے شعرا کے پاس بھی تیس چالیس، زیادہ سے زیادہ پچاس رباعیاں ملتی ہیں۔البتہ دامودر ذکیؔ کے پاس ۱۲۰ رباعیاں موجود ہیں۔

خالص رباعیوں کے مجموعوں کی بات کی جائے تو ہمیں صرف سات شعرا ایسے ملتے ہیں جن کی رباعیات کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔جذبؔ عالم پوری (چھے مجموعے، رباعیوں کی مجموعی تعداد چھے سو) عطاؔ کلیانوی (تین مجموعے ایک مطبوعہ دوغیر مطبوعہ، رباعیو ں کی مجموعی تعداد ایک ہزار) اکملؔ آلدوری (دو مجموعے رباعیوں کی مجموعی تعداد دوسو) راہیؔ قریشی (ایک مجموعہ، رباعیوں کی مجموعی تعداد دو سو) اکرم نقاش (ایک مجموعہ رباعیوں کی مجموعی تعداد ایک سو) حافظؔ کرناٹکی (پانچ مجموعوں پر مشتمل کلیات، رباعیوں کی مجموعی تعداد تقریباً سات ہزار) مقبول احمد مقبول (ایک مجموعہ رباعیوں کی مجموعی تعداد ۲۴۴)۔کرناٹک میں عصرِ حاضر میں اکرم نقاش، حافظ کرناٹکی اور مقبول احمد مقبول تین ایسے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گوئی کو سنجیدگی سے اپنایا ہے اور اس فن کی آبیاری میں جی جان سے منہمک ہیں۔

حوالے:

(۱) دکن میں اردو، (قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی، ۲۰۱۶ء) ص ۲۰۸
(۲) دکنی رباعیات (آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد، ۱۹۶۶ء) ص ۲۱۷
(۳) جنوبی ہند میں رباعی گوئی (ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد، ۱۹۸۴ء) ص ۱۸۰ تا ۱۸۱
(۴) حیدرآباد کے شاعر جلد اول مرتب خواجہ حمیدالدین شاہد (آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد،) ص ۸۸
(۵) جنوبی ہند میں رباعی گوئی (ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد ۱۹۸۴ء) ص ۱۲۱
(۶) حسن الدین احمد، حرفِ آغاز مشمولہ وجود وشہود از عطا کلیانوی (ولا اکیڈیمی حیدرآباد، ۱۹۷۳ء) ص ۴
(۷) یادِ رفتگاں (کرناٹک اردو اکاڈیمی، بنگلور، ۲۰۰۹ء) ص ۱۰۱
(۸) ایضاً ص ۱۲۳ تا ۱۲۴
(۹) جنوبی ہند میں رباعی گوئی (ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد، ۱۹۸۴ء) ص ۱۵۱ تا ۱۵۲
(۱۰) احساس وادراک (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۵ء) ص ۱۵ اور ۱۲

☆☆☆

رواںؔ: منفرد رُباعی گو

پروفیسر صغیر افراہیم
(سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

رُباعی مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ یہ ایجاز و اختصار کا فن ہے۔ اِس میں عمیق فلسفیانہ خیالات، دقیق اخلاقی نکات اور پیچیدہ مسائل محض چار مصرعوں میں خوبی سے ادا کیے جاتے ہیں۔ بحر کی پیچیدگی اور عروضی قیود کی پابندی کی وجہ سے اسے اساتذہ کی صنف کہا گیا ہے۔ تلوک چند محروم اس بابت لکھتے ہیں:

''رُباعی لکھنے کے لیے کافی مشقِ سخن اور پختگیٔ عمر کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور
پر شاعر کی زندگی میں رُباعی نویسی کا دور آخر میں آتا ہے۔''

(مقدمہ رعنائیاں، ص ۴۰)

یہ شاعر کی فکر و نظر اور فہم و بصیرت کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس کا فن قلزم کو قطرے میں منتقل کرنے یا دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہے۔ بقول جوشؔ ملیح آبادی:

''رُباعی ایک بہت بڑی بلا، اور جان لیوا صنفِ کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے
پیش تر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔۔۔''

(مقدمہ قطرہ و قلزم، ص ۱)

یہ اقتباسات اِس جانب بھی توجہ دلاتے ہیں کہ رُباعی کی ڈگر کٹھن اور پُرخار ہے۔ اسی وجہ سے عموماً شعرا کی اس صنفِ سخن کی جانب کم توجہ رہی ہے۔ نومشق شعرا اس راہ میں گھبراتے بلکہ ناکام نظر آتے ہیں، لیکن کچھ شعراء جو سنگلاخ زمینوں اور مشکل صنف کو آسان بنانے کا ہُنر جانتے ہیں، اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رواںؔ بھی اُن ہی میں سے ایک ہیں۔

چودھری جگت موہن لال رواںؔ نے بیس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پچیس سال کی عمر میں وہ کامیاب رُباعی گو کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور پھر اپنی ۴۵ سالہ زندگی میں آخر عمر تک رُباعی کہتے رہے۔ انھوں نے بیس پچیس سال کے ادبی سفر میں تقریباً ڈھائی سو رُباعیاں لکھیں جو خیال اور آہنگ کو تازگی اور رعنائی بخشتی ہیں۔ مذکورہ صنفِ سخن کے علاوہ انھوں نے چند غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان میں سے بھی بیش تر رُباعی کی ہی بحر میں ہیں۔

یہ کج کلاہ شاعر جس نے زندگی کی صرف ۴۵ بہاریں دیکھیں اور بہترین رباعیاں خلق کیں، اُس کی ادبی خدمات کو اُجاگر کرنے کے لیے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جو عرصہ تک نیم تاریکی میں رہی ہے۔ ایسا کیوں اور کن وجوہات کی بنا پر ہوا کہ اُن کی ادبی قدر و قیمت کا تعین نہیں جا سکا؟ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی وجہ ادب میں اجارہ داری ہے جس نے نہ جانے کتنی انمول شخصیتوں کو پردۂ خفا میں ڈھکیل دیا یا پھر ان کی نامکمل تصویر عوام کے سامنے آئی۔ رواںؔ بھی اس ادبی اجارہ داری کے شکار ہوئے ہیں۔ اُن کا نام رُباعیات کی تاریخ میں درج ضرور رہا ہے۔ لیکن ادھورا، محض خانہ پُری کے بطور۔

ماضی کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو سنہرے حروف میں درج ملے گا کہ جگت موہن لال رواںؔ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۹ء میں قصبہ موراواں ضلع اناؤ کے ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری گنگا پرشاد اناؤ میں مختاری کرتے تھے۔ صاحب حیثیت اور ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کے پانچوں بیٹے (۱۔ کنہیا لال، ۲۔ بلدیو پرشاد، ۳۔ کرتا کرشن، ۴۔ جگت موہن، ۵۔ تربھون ناتھ) نیک، محنتی اور تعلیم یافتہ تھے۔ جب جگت موہن لال ۹ر سال کے تھے والد گنگا پرشاد کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا وہ اپنے بڑے بھائی کنہیا لال کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ اُن کی تعلیم کا آغاز اناؤ کے مشہور صوفی مولوی ضیاء الدین کے مکتب سے ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ پھر اُن کا داخلہ لکھنؤ کے کیننگ کالج میں کرا دیا گیا جہاں سے انھوں نے ۱۹۰۹ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۱۱ء میں بی اے کی سند لی۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے اور ۱۹۱۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ یہ سبھی امتحان انھوں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیے اور ۱۹۱۷ء میں اناؤ

واپس آکر وکالت شروع کی۔ کچہری اور کاشت کی مصروفیات کے علاوہ اُن کا بیش تر وقت دوستوں کی طویل صحبت، انسانی فلاح و بہبود کے کاموں اور دوسروں کے دُکھ درد بانٹنے میں گزرتا تھا۔ وہ غلام دیس کی صورت حال سے بے چین اور وطن کی آزادی کے لیے کوشاں تھے ؎

اس وقت ہو اپنی قوم شایانِ نبرد
جب ایک ہی جذبے سے ہوں مضطر زن و مرد
کُل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو
اور دل میں ہو فرد کے کل قوم کا درد

اس حسّاس اور نیک دل شاعر کی رُباعیوں میں قومی اور وطنی جذبے کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ ملک، قوم اور زبان و ادب کے لیے وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۴۵ سال کی مختصر عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا ؎

جگت موہن لال رواںؔ کا مجموعۂ کلام ۱۹۲۸ء میں ''روحِ رواںؔ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا طویل مقدمہ مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی نے لکھا تھا۔ ۲ یہ اکمالانِ لکھنؤ میں عزیزؔ کے مرتبے اور ان کے مجموعے ''گل کدہ'' سے کون واقف نہ ہوگا، عزیزؔ لکھنوی وہ عالی مرتبت شخص ہیں کہ جنھوں نے لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ایک نسل کی آبیاری کی ہے۔ اُن کا مبسوط مقدمہ اس امر کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ جگت موہن لال رواںؔ اردو کے موقر و معتبر شاعر تھے۔ عزیزؔ نے رواںؔ کی شاعری پر جو گفتگو کی ہے وہ اپنی صراحت و وضاحت میں حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ لسان الہند کا یہ مقدمہ فرمائشی نہیں ہے۔ اُس زمانے میں باطن اور ضمیر کی آزادی کے لیے کوئی معمولی آواز نہیں تھی۔ حریت وطن کی خاطر آزادی کے متوالے جان کی قربانی پیش کررہے تھے ؎

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے
دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواں
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

پروفیسر سید ابوالحسنات حقی، سید محمد علی شاہ اور سید ابوالبرکات نظمیؔ نے جگت موہن لال رواںؔ کے تعلق سے منعقد ۳ ایک اہم مذاکرے میں کہا تھا کہ:

''فقیری اور آزادیٔ فکر و خیال، لکھنے لکھانے والوں کا ایک عام اور بنیادی وصف تھا۔ مداح اور ممدوح دونوں انھی اخلاق و اوصاف سے بندھے ہوئے تھے۔ خوبیوں کے سراہنے میں یہ نسل کوئی پہلو دبا کر نہیں رکھتی تھی۔ آج کے نقاد، پہلوانوں کے اس استاد (خلیفہ) کی طرح ہیں جو ایک داؤ شاگرد سے بچا کر رکھتا تھا کہ پتہ نہیں کب شاگرد منہ آجائے۔ آپ دیکھیں کہ مذکورہ بالا روش آج عام ہے، لیکن عزیزؔ اور رواںؔ ہی نہیں اس دور کا ہر منتہی و مبتدی اس مرض سے دُور تھا۔ حرفِ حق دوستی و دشمنی کو مانع نہ تھا۔ وہ کہ جس سے مختلف مسائل و معاملات پر اختلاف بھی ہوتا تھا اس کے خوب صورت احساس و افکار پر خاموش رہنا اس عہد میں کفر اور خودستائی کی دلیل تھا۔ غالبؔ کی دماغ داری اور خودستائی کے دفتر یاروں نے سجا رکھے ہیں مگر وہ اعتراف کرتا ہے، ہے تو یہ کہ اب مجھے کچھ یاد نہیں اور جو دو ڈھائی شعر یاد ہیں ان میں خود اس کا اپنا ایک مصرعہ بھی نہیں ؎

''دام واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے''

عزیزؔ لکھنوی نے اپنے مقدمہ میں جس طرح رواںؔ کے حُسنِ شاعری کو اُجاگر کیا ہے، وہ خود اُن کے ذوقِ سلیم اور ناقدانہ مزاج کے لیے ایک مستند حوالہ ہے۔ شاعری کے حسن کو محسوس کرنا اور اُس سے لطف اندوز ہونا، اچھی بات ہے اور یہ عطیہ خداوندی ہے، مگر اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے محسوسات کو بیان کرنے پر قدرت بھی حاصل ہو۔ اظہار کی یہ دولت ہمیشہ کم یاب رہی ہے لیکن مولانا عزیز میں یہ دولت فراوانی کے ساتھ موجود تھی اور انھوں نے اس دولت خداداد سے خوب خوب کام لیا ہے۔ ابوالحسنات حقی کا کہنا ہے کہ ان اصحاب کا دامن کفرانِ نعمت کے عیب سے پاک تھا۔ مرزا ہادی رسواؔ جو کہ مولانا عزیزؔ کے بزرگ ہم عصر تھے، اُن کی عالمانہ مثنوی کو منظرِ عام تک لانے کا سہرا بھی عزیزؔ لکھنوی کے سر ہے، جسے 'زمانہ' کانپور، میں انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس طرح انھوں نے ادب کی ایک بڑی خدمت انجام دی۔ لسان الہند کی اس خدمت سے پروفیسر محمد حسن نے بھی فیض اُٹھایا اور اسے کتابی صورت دے دی۔

یہ ذکر ضمنی نہیں بلکہ رواںؔ کے مقدمہ نگار کے اُن اوصاف کو منظرِ عام پر لانا ہے جو اُن میں خلقی طور پر موجود تھے۔ ایک بڑا شاعر جب اس طرح

کی خدمت انجام دیتا ہے تو اس کا قد اور بلند ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا عزیز بحیثیت شاعر مرزا ہادی رسواؔ اور جگت موہن لال رواںؔ دونوں سے بڑے شاعر تھے۔ مگر انھوں نے مذکورہ دونوں شاعروں کے محاسن شعری سے ہمیں یوں روشناس کیا ہے کہ محابا کا کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا۔ آج ہمارے پاس صلاحیتوں کی کمی نہیں، مگر ہم یہ سب کچھ کر گزرنے سے محض اندیشوں (غلط اندیشوں) کے سبب پہلو بچاتے رہتے ہیں اور ہماری سوچ یہی رہتی ہے کہ ؎

فریب دوستی روز اک نیا پیکر بدلتا ہے
خدا جانے ہمارے ہاتھ میں کل کس کا دامن ہو

اپنے طویل مقدمے میں عزیزؔ نے رواںؔ کی غزلوں اور رُباعیوں سے الگ الگ بحث کی ہے اور ہر مبحث کا حق ادا کیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے اس مجموعہ کلام میں پہلے کچھ نظمیں ہیں، ترجمے ہیں، (انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے)۔ اس کے بعد رواںؔ کی نظم نگاری کا تفصیلی جائزہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رواںؔ نے شاعری کی ابتدا موضوعاتی نظموں سے کی تھی۔ فاضل مقدمہ نگار کا مندرجہ ذیل اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ابتدائی زمانے کی بعض نظمیں مصنف نے خارج کر دیں۔ لیکن پھر بھی ۱۹۰۲ء سے دسمبر ۱۹۲۶ء تک کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ اس میں بھی اکثر نظمیں حذف کر دینے کے قابل تھیں کیوں کہ کوئی خاص خصوصیت ان میں نہیں بلکہ اکثر خامیاں بھی موجود ہیں جن پر خود مصنف نے بھی نظر ثانی نہیں کی، صرف اس خیال سے کہ کلام کا تدریجی ارتقا معلوم ہو جائے۔'' (ص:۱۸)

تبصرہ و انتقاد کا یہ انداز اب کہاں رہ گیا ہے؟ حقائق کی معرفت کا یہ قرینہ ہم بزرگوں ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے اغلاط پر ٹوکنے والے اور ان کا علم کرانے والے ناگوار گزرتے ہیں۔ جہاں حسن و قبح کا اظہار برملا ہوا، ایسی تحریروں کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اب تو صرف دو صورتیں ہی نظر آتی ہیں یا تو سب کچھ بہتر یا سب لائق گردن زدنی۔ عزیزؔ لکھنوی نے رواںؔ کی غزلوں پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے دل کو خوشی ہوتی ہے۔ یہ کام اس لیے بھی لائقِ ستائش ہے کہ اس طرح بے کد و کاوش ہمیں قیمتی اشعار کا انتخاب حاصل ہو جاتا ہے اور یہ انتخاب بھی لسان الہند کے ہاتھوں ملتا ہے۔

اس تقابلی گفتگو کے بعد اب کچھ رواںؔ کی رُباعی گوئی کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے چند رُباعیات ؎

فطرت کہتی ہے ظلمتوں کے پس پشت
کیا ہو باران نور اگر ہو یک مشت
ہنگامۂ طور کر رہی ہے برپا
صبح خنداں کی اک حنائی انگشت

شاعر نے ہنگامۂ طور کی تلمیح کا سہارا لے کر رُباعی کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ رُباعی علی الصباح کے منظر کی بے پناہ دلکش تصویر ہے۔ آفتاب کی پہلی کرن کے لیے صبح درخشاں کو حنائی انگشت کے استعارہ نے کس قدر حسین بنا دیا ہے گویا ایک معشوق از راہ شوخی انگشتِ حنائی بلند کر کے عاشقوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ اس کے تلقین کرنے کا یہ دل رُبا انداز دیکھ کر فطرت کی ہر شے گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ جب ایک انگشت حنائی (سورج کی کرن) کے نظارے نے کوہِ طور کو جلا کر خاک کر دیا تو اُس وقت تو شاید قیامت ہی برپا ہو جائے جب شاہ خاور (آفتاب) یکا یک نظروں کے سامنے آجائے۔ وسیع معنوں کی حامل اس رُباعی کے پہلے مصرع سے صبح کا دُھندلکا مترشح ہے۔ دوسرے میں ظلمت کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے۔ تیسرا فطرت کے حُسن کی عکّاسی کرتا ہے اور چوتھا مصرع حاصل رُباعی ہے کہ تمام فطرت، تاریکی سے بیزار ہو کر ظہورِ صبح کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کا اشتیاق اور اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے کہ اُفق مشرق سے صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتی ہے اور قلب عارف کے سرور اور وجدان کو دو چند کر دیتی ہے۔ تاریکی سے روشنی کے سفر اور پھر پہلی کرن سے سورج کے مکمل طلوع ہونے تک کی کیفیت کے فاصلہ کو جگت موہن لال رواںؔ نے جس موثر انداز میں بیان کیا ہے وہ فطرت کی حسین عکّاسی کی عمدہ مثال ہے۔

فنا و بقا کے فلسفہ کو رُباعی کے موضوعات میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ جگت موہن لال رواںؔ نے بھی زندگی کی حقیقت اور ماحصل زندگی کو موضوع بنایا ہے ؎

اس دار فنا میں مقصد دل کیا ہے
کہیے تعبیر خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی
آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

شاعر کو تعجب ہے کہ اس دنیا کا اور میری ہستی کا منشا کیا ہے؟ چوں کہ

وجودِ عالمِ امکان اور وجودِ بشر کو عام انسانی ذہن نہیں سمجھ سکتا، اس لیے رواںؔ بے چین اور مضمحل نظر آتا ہے۔ کہتا ہے دل کو جب لحہ بھر سکون نہیں، کسی پل قرار نہیں تو پھر اس زندگی کا لطف کیا ہے، مقصد کیا ہے؟ یہ راز اس پر منکشف نہ ہو سکا، اور وہ اسی سلسلۂ علت و معلول پر شکوہ کرتا ہے کہ جب خالقِ کائنات کو یہ دنیا ویران کرنی تھی، فنا کرنی تھی تو پھر اسے بنانے، سنوارنے کی ضرورت کیا تھی (بقول ثاقب کانپوری اس مقام پر اگر رواںؔ اسلامی فکر سے بھرپور استفادہ کر لیتے تو پھر گوں مگوں کی حالت نہ رہتی) اس پر کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں وہ کہہ اُٹھتا ہے ؎

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکر فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

یہ رُباعی جدّتِ خیال کی اچھوتی مثال ہے۔ رواںؔ نے اس میں عبرت اور نصیحت کے ساتھ شکایت زمانہ اور ویرانیٔ دل کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

صوفیاء کرام نے قربت، محبت، یگانگت اور انسانی عظمت کا راز نفس پر قابو پانے کو قرار دیا ہے لیکن چند روزہ زندگی کی چمک دمک اور نام و نمود کی نمائش اُسے ہر پل تگ و دو میں مصروف رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیاوی ہوس اُسے مر کر بھی چین نہیں لینے دیتی ہے ؎

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواںؔ
مر کر بھی اُمید زندگانی نہ گئی

انسان اس قدر زندگی کا شائق اور حریص ہے کہ مرنے کے بعد بھی آرزوئے زیست باقی رکھتا ہے۔ مزار پر نام کندہ کیا جا رہا ہے، پتھر لگایا جا رہا ہے تو گویا اب بھی دنیا میں رہنے کی تمنا باقی ہے۔ حالاں کہ جب خاک ہو گئے تو پھر اس کی ضرورت کیا تھی۔ شاعر نے مذکورہ رُباعی میں اس فلسفیانہ نکتہ کو اُجاگر کیا ہے کہ انسان موت کو منافی حیات سمجھتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ غور طلب مسئلہ ہے کہ اصل منشائے زندگی کیا ہے؟ آخر اس دنیا اور ہستیٔ دنیا کا انجام کیا ہے؟ یہی نہ کہ اپنے اصل مرکز کی طرف واپس جانا۔ اگر یہ راز انسان کی سمجھ میں آجائے تو وہ موت سے بے تعلق ہو جائے اور پھر یہ زندگی کا درخت اس طرح لہلہاتا ہوا پروان چڑھتا رہے کہ اس کو کبھی خزاں کا اندیشہ نہ رہے ؎

کیوں کر فکر کریں کہ حکم مولا کیا ہے
دنیا کیا ہے مآل دنیا کیا ہے
سر گرم عمل ہیں تابہ امکانِ عمل
اس سے بے فکر ہیں نتیجا کیا ہے

زندگی اور موت کی کشمکش اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا انسان کو امرت اور ''آبِ حیات'' کی تلاش میں سرگرداں کر دیتی ہے اور وہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ حیاتِ ابدی کس طرح حاصل ہو، جب کہ شاعر اس بات کو اُجاگر کرتا ہے کہ زندگی اور موت دراصل ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ جسے ہم اجل سمجھتے ہیں وہی اصل اور حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ اس لیے موت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ؎

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواںؔ
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

انسان دو چیزوں کے درمیان معلق ہے، زندگی اور موت۔ زندگی اور مقصد زندگی سمجھے بغیر موت کے معنی نہیں سمجھے جا سکتے۔ جس قدر انسان موت کے سایہ میں جئے گا، زندگی دشوار تر ہوتی جائے گی۔ لہٰذا رواںؔ کہتے ہیں کہ پہلے زندگی اور جہانِ فانی کو سمجھو پھر بعد الموت عقبیٰ کا صحیح صحیح عقدہ سمجھ میں آسکے گا۔

زندگی کی دو متضاد کیفیتوں یعنی فنا اور بقا کو رواںؔ نے اپنی اکثر رُباعیوں میں پیش کیا ہے ؎

تخریبِ حیات میں ہے تعمیرِ حیات
ہے باعثِ انحطاط تدبیرِ حیات
شیرازۂ دو جہاں ہے تشریحِ فنا
کڑیاں لاکھوں ہیں ایک زنجیرِ حیات

اکثر شعرا نے ''انسانی عمل'' کو مختلف تاویلات کے ذریعہ پیش کیا ہے کہ انسانی عقل یہ راز جاننے سے قاصر ہے کہ اس کا کون سا عمل بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوگا اور کون سا عمل اس کی ناراضگی کا سبب بنے گا۔ اسی کشمکش میں رواںؔ بھی مبتلا ہیں۔ مندرجہ ذیل رُباعی میں اپنی فکر، درد اور معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

انسان معذور فکر انساں معذور
یہ کس کو خبر کہ کیا ہے اُس کو منظور
پیمانہ بدست رند اور اس سے قریب
تسبیح بدست واعظ اور اُس سے دور

غور طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ رُباعی نہ صرف بندش بلکہ بلندیٔ فکر اور فصاحت بیان کا بہترین نمونہ ہے، بلکہ بہ اعتبار فکر بہترین رُباعی قرار دی جا سکتی ہے۔ حالاں کہ شاعر نے اس میں ایک عام سا قول قلمبند کیا ہے کہ تمام عمر عبادت و ریاضت میں صرف کرنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ سجدے قبول بھی ہوئے یا نہیں۔ کیوں کہ کبھی کبھی ایک نعرۂ مستانہ بھی اس کے تقرّب کے لیے کافی ہوتا ہے۔ رازِ عبادت کو دائرۂ کار میں لاتے ہوئے شاعر تلقین کرتا ہے کہ سب سے پہلے دل میں انسانی عظمت اور خوفِ خداوندی پیدا ہونا چاہیے۔ محض دکھاوے کی عبادت بے سود ہے ؎

انجام کی فکر ہو شریعت یہ ہے
جان صرفِ وفا رہے ریاضت یہ ہے
زاہد سے کہو ، نماز روزہ بے سود
دل خوفِ خدا کرے عبادت یہ ہے

موعظت و اخلاق کے موضوع پر رواںؔ نے کثرت سے رُباعیاں لکھی ہیں جن میں نصیحتوں کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ باریکیاں بھی بیان کی ہیں۔ شاعر نے فقیری کو ضمیر کی آزادی اور امیری کو دل کا استغنا ٹھہرایا ہے اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسیری خیالات کی حد بندی ہے اور جب تک خیالات آزاد ہیں، طوق و سلاسل کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ اصل میں خیالات کی تجدید ہی اسیری اور وسعتِ خیال آزادی ہے۔ صاف ستھرے اور عام فہم انداز میں انھوں نے پند و نصائح کے لیے اکثر ساقی، جام اور مے نوشی جیسی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے ؎

مطلوب ہے زخم دل جو سیتے نہ بنے
جینا کس کام کا جو جیتے نہ بنے
ہے مجھ کو حلال ہی نہیں بلکہ ثواب
مے اُس پہ حرام جس سے پیتے نہ بنے

شاعر کہتا ہے کہ یہ مے نوشی اگر حکیمانہ اصول و آداب کے موافق ہے تو مجھ پر حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ چونکہ شاعری میں شراب سے مراد ہر جگہ بادہ نوشی نہیں ہے بلکہ وہ حقائق و معارف کی گفتگو کا اظہار بھی ہے۔ رواںؔ نے اپنی سرمستی کا اظہار اس رُباعی میں عجب دل کش انداز سے کیا ہے جس میں زخمِ دل اور زندگی کو بظاہر رندی کے موقف سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس میں ایک لطیف ظرافت کے پیرایہ میں معنویت بھی موجزن ہے۔ اِس کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ مشکل گھڑی میں بندہ، اللہ کی جانب راغب ہوتا ہے اور فراغت اور سکون میسّر ہوتے ہی پھر علائق دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جب کوئی دیگر مشکل درپیش ہوتی ہے تو پھر اپنے رب کی جانب راغب ہوتا ہے۔ یہ دوطرفہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ وہ مزید کہتا ہے کہ اللہ کی رضا کے مطابق کام کرنا، ایک نشہ کی طرح ہے۔ جب یہ دنیاوی کام اُس کی مرضی کے عین مطابق کئے جاتے ہیں تو وہ صرف حلال ہی نہیں بلکہ ثواب کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ اور یہ نشہ اور یہ سرور ان لوگوں پر حرام ہے جنھیں معارفت کی اس مئے کے پینے کا سلیقہ نہیں ہے یعنی وہ جو اللہ کے احکام کی روح سے واقف نہیں ہیں۔ اسی موضوع پر ان کی ایک اور مشہور رُباعی ہے ؎

نو روز ہے غرق بادہ دنیا کردے
میرا ارمان آج پورا کردے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کردے

ظفر قدوائی، عطر چند کپور، خواجہ قمر الدین، عرفان عباسی، اور سلیمان اطہر جاوید نے بھی اس موضوع پر خوب لکھا ہے۔ ان دانشوروں کی تحریروں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خیال و مضامین کا ایک محشرستان رُباعی کا موضوع ہے مگر ان موضوعات سے انصاف کرنے کے لیے صرف عمر کی بالیدگی، ذہن کی پختگی اور زبان و بیان پر قابو درکار نہیں، بلکہ اس کے لیے دل گداختہ کی بھی ضرورت ہے اور دل گداختگی ہی کا عمل جگت موہن لال رواںؔ کی پُرتاثیر رُباعیوں کا سرنامہ ہے۔ ان کی رُباعیاں ہمارے لیے سررشتۂ تعلیم و تعلم ہیں۔ ان کو یکسوئی سے پڑھ کر ہم فنا و بقا کے فلسفے کے ساتھ ساتھ اس صنف سخن کی وادیوں سے بھی کما حقہ واقف ہو سکتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ مونوگراف جگت موہن لال رواںؔ، صغیر افراہیم، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء
۲۔ ''روحِ رواں''، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، نیا ایڈیشن، ۱۹۸۳ء
۳۔ یہ مذاکرہ ۱۴؍جنوری ۱۹۹۲ء کو آفتاب پریس اناؤ (محلہ قلعہ) کے میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت روزنامہ ''اناؤ ٹائمس'' کے مدیر جناب سوتنتر کمار مشر، نے کی تھی۔

☆☆☆

نقد رباعیات جمیل مظہری

پروفیسر عراق رضا زیدی
(سابق صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ موبائل: 9818818215)

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعی گو شعرا کو بڑی قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فارسی تذکروں میں یہ فضیلت صرف 'رباعی گو' اور 'تاریخ گو' شعرا کو حاصل ہے کہ صاحب تذکرہ نگار لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''او رباعی یا تاریخ گوئی ہم سرودہ است'' یہ امتیاز کسی دوسری صنف سخن کے شاعر کو حاصل نہیں ہے۔

رباعی میں ہمیشہ سے ہر طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں، لیکن عرفانی، حکیمانہ، فلسفیانہ اور جمالیاتی مضامین نے رباعی کو ایک خاص شناخت عطا کی ہے۔ خصوصا مرثیہ گو شعرا نے اسے ایک خاص پاکیزگی عطا کی ہے۔ دور حاضر کے مشہور رباعی گو ناوک حمزہ پوری کے قول کے مطابق:

> ''رباعی فارسی و اردو شاعری کی غالبا بہت مشکل لیکن بڑی محترم صنف سخن ہے۔ خصوصا صاحب دل شعرا کو ہر زمانے میں بہت مرغوب رہی ہے۔ متصوفانہ خیالات و نکات کے اظہار کے لیے ہماری شاعری میں اس سے بہتر اور معزز صنف سخن نہیں۔ اخلاقی و مذہبی نکات، پند و نصائح، حمد و نعت اور منقبت و مناجات کے مضامین کے بیان میں کیا فارسی اور کیا اردو کے شعرا نے اس پیمانہ سخن سے خوب خوب کام لیا ہے''۔

آج جب کہ مشاعروں کی چکا چوندھ اور بھاری مختانے نے عوام کی پسند کو شاعروں اور غزل پر حاوی کر دیا ہے، شاعری کے معیار کو گرانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے تو ایسے میں شعرا رباعی کے ذریعے ہی اپنی شناخت قائم کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ رباعی اور قطعے سے نا آشنا شاعروں نے ایک ایسا نام گڑھ لیا ہے جو کسی صنف سخن کے ذیل میں نہیں آتا۔ آج اکثر شعرا رباعی یا قطعے کو اسی لیے ''چار مصرع'' کہہ رہے ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ رباعی اور قطعے میں کیا فرق ہے۔ چار مصرعوں میں تو یہ دونوں اصناف ہی کیا اور بھی بہت کچھ سما سکتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی ادبی جریدوں میں اس بدعت کا آغاز نہیں ہوا ہے جن کے ذریعے آج بھی معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

مرثیہ گو شاعروں کے علاوہ اردو زبان میں رباعی گو شعرا کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ رباعی کہنے والے شاعروں کی تعداد بھی سامنے آ چکی ہے۔ آزادی کے بعد جن شاعروں نے اس صنف سخن کی آبیاری کی ہے ان میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، قلم سیتھلی اور جمیل مظہری کے نام سرفہرست ہیں۔ جوش، فراق اور جمیل مظہری کا دور تقریبا ایک ہی ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک تین سالوں کے درمیان ان تینوں رباعی گو شاعروں نے اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ یہی وہ دور ہے جب مشرقی روایات، مغربی روایات سے ٹکراتے ٹکراتے تھک چکی تھیں اور مغرب کا اثر خوب قبول کرنے لگی تھیں۔ آزادی کے بعد کے آخری تیس سال کی کشمکش بھی بیان سے باہر ہے۔ اسی دور میں جمیل مظہری کی رباعیات افق ادب پر نمودار ہوئیں۔ اس دور کو علامہ اقبال کے بعد کے دور سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے صرف ایک رباعی پر اکتفا کیا تھا۔ وہ بھی طنز و مزاح کے ذیل میں، لیکن جمیل مظہری پر اقبال کا اثر بہت نمایاں ہے۔ کہیں وہ ان کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور کہیں ان سے معذرت کے ساتھ ان کے افکار کی دھجیاں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی اکثر نظمیں دیگر مذاہب کے رہنماؤں سے منسوب کی ہیں۔ دانشوران جہان پر بھی اقبال کی نظمیں ملتی ہیں۔ جمیل مظہری کی رباعیات کے عنوانات سے اقبال کی پیروی بہت واضح ہے۔ جمیل مظہری نے غالبا پہلی بار اکثر رباعیات کے عنوانات رکھے ہیں۔ یہ چلن فارسی زبان میں بھی نہیں تھا۔ البتہ جمیل مظہری کی وفات کے بعد امام خمینیؒ کی رباعیات پر عنوانات ضرور نظر آئے۔ اس کے بعد یہ چلن عام ہو گیا۔

جمیل مظہری نے مذہبی رہنماؤں میں گوتم بدھ، زرتشت، عیسیٰ مسیحؑ، محمد عربی، علیؑ ابن ابیطالبؑ اور حسینؑ ابن علیؑ کے علاوہ گم شدہ مذہب کے رہنماؤں مزدک کے عنوان سے بھی ایک رباعی موزوں کی ہے۔ جس سے موصوف کے علمی تبحر، تاریخ شناسی اور وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔

قومی رہنماؤں اور دانشوروں میں سے شو پنہار، اپی کیورس، دیوجانس کلبی، نیطشے، گاندھی، کارل مارکس وغیرہ کے خیال کی عکاسی اپنی رباعیات میں انہیں عنوانات کے تحت کی ہے۔ انہوں نے اقبال کی نظموں کی طرح 'واعظ اور شاعر' کا مکالمہ رباعیات میں موزوں کیا ہے۔ شاعر اور خدا کے درمیان بھی طرح طرح کے مفکرانہ مضامین سے پر مکالماتی رباعیاں موجود ہیں۔ جہاں وہ فلسفہ اقبال سے اتفاق نہیں کرتے وہاں بھی عنوان سے اقبال کی عظمت آشکار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اقبال نے اپنے پسندیدہ پرندے 'شاہین' پر طرح طرح کے مضامین موزوں کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اقبال کی تصویر کے ساتھ بھی اکثر شاہین پرندے کا عکس بہت واضح نظر آتا ہے۔ لیکن جمیل مظہری اس پرندے کو قابل ستائش یا لائق پیروی نہیں سمجھتے۔ اسی لیے اپنی تین رباعیات کا عنوان 'اپنے مرشد فن علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ' رکھتے ہیں۔

اقبال نے شاہین یا شہباز لفظ کا استعمال تقریباً ۳۹ بار کیا ہے۔ وہ اسے بہادری، جوش و ولولے کا استعارہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ طلوع اسلام میں فرماتے ہیں:

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

(بانگ درا ۲۴۹)

بال جبریل میں تو ایک نظم کا عنوان ہی 'شاہین' ہے، جس میں شاہین کی طرح طرح کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور قوم کو اس کی طرح بننے کی دعوت دی گئی ہے۔ انہیں صفات میں جہاں لہو کو گرم رکھنے کا بہانہ تلاش کیا گیا ہے وہیں اسے پرندوں کی دنیا کا درویش بتا کر درویشانہ زندگی کی اہمیت برقرار رکھی ہے:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

دور حاضر میں قوم کے خلاف جو سازشیں رچی جا رہی ہیں خصوصاً عالمی طاقتیں اسرائیلی چنگل میں پھنس کر ہماری بربادی کا پیش خیمہ بنی ہوئی ہیں وہاں افغانیوں اور ایرانیوں کی طرح شاہینی قلب کی ضرورت ہے دوسری عرب طاقتوں کی طرح گنجشک بننے سے رسوائی بھی ہے اور غلامی کی عادت بھی، لیکن دونوں کے درمیان اعتدال کی ضرورت ہے گو کہ جمیل مظہری نے شاہین نہ بننے کی سفارش کی ہے۔ ممکن ہے ان کے زمانے کے حالات یا ماحول اس کی اجازت نہ دیتا ہو جیسا کہ موصوف نے لکھا ہے:

عنقا ہے تو شاہین کا دم ساز نہ بن
شہباز نہ بن جمیل شہباز نہ بن
تو اور فضاؤں میں شکاروں کی تلاش
اے طائر عرش نوک پرواز نہ بن

جمیل مظہری، اقبال کی فکر سے مکمل انحراف نہیں کر سکے اسی لیے انہوں نے اپنے خیال کو 'مشروط' موزوں کیا کہ اگر 'عنقا' ہے، تو آج ہم عنقا کہاں ہیں، جب کبھی عنقا ہوئے تو یہ فکر ضرور کامیابی و کامرانی کی دلیل بن سکے گی، لیکن جب وہ حدیث میخانہ کی بات کرتے ہیں تو فکر اقبال کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں:

اے رند بھرے خم کو لنڈھانا بھی سیکھ
پی پی کے سرور اپنا لٹانا بھی سیکھ
پینا نہیں صرف میکدے کی تہذیب
پیتا ہے تو ساقی سے پلانا بھی سیکھ

فارسی زبان میں رباعی کے حوالے سے خیام کا نام سرفہرست ہے۔ خیام نے انسانی زندگی کے جن مسائل کو موضوع رباعی بنایا ہے، جمیل مظہری نے ان مضامین سے بھی فیض اٹھانے کی کوشش کی ہے، انسان کی نشوونما اور پیکر تراشی میں مٹی کا اہم رول رہا ہے۔ حضرت آدمؑ کا پیکر مٹی سے ہی بنایا گیا تھا اسی لیے انسانوں پر مٹی کھانا حرام قرار دیا گیا۔ بقول امام جعفر صادقؑ:

"حق تعالیٰ نے کیوں کہ حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔
پس حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کے لیے مٹی کھانا حرام کر دیا"۔

خیام نے اسی مناسبت سے مٹی سے تراشے گئے کوزہ کو استعاراتی طور پر موضوع سخن بنایا تھا۔ کوزہ میں مٹی کے علاوہ بھی وہ تمام عنصر موجود ہیں

جو انسانی خلقت میں شامل ہیں۔ مٹی کے ساتھ، آگ، پانی اور ہوا گویا روح کے علاوہ انسان کی خلقت اور کوزہ کی تخلیق میں خاصی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہی تخیلات جمیل مظہری کی رباعیات میں بہت واضح نظر آتے ہیں:

ساقی کفِ آرزو ہیں تیرے کوزے
دریوزہ گر سبو ہیں تیرے کوزے
اس پر یہ ستم کہ میکدے سے باہر
ٹوٹے ہوئے کوبکو ہیں تیرے کوزے

یا

قسمت ہے تری عجیب بیکس کوزے
ٹوٹے ہوئے بدنصیب بیکس کوزے
رندوں نے بھی منہ لگا کر توڑا تجھ کو
کوزے کوزے غریب بیکس کوزے

خیام کہتا ہے:

زان کوزہ می کہ نیست دردی ضرری
پر کن قدحی بخور بہ من دہ دگری
زان پیشتر ای صنم کہ در رہگزری
خاک من و تو کوزہ کند کوزہ گری

یا

برخیز و بیا بتا برای دل ما
حل کن بجمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ شراب تا بھم نوش کنیم
زان پیش کہ کوزہ ھا کنند از گِلِ ما

دونوں کی پہلی رباعی میں کوزہ کا استعمال تین بار کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جمیل مظہری کی دونوں رباعیوں میں کوزے کو ردیف بنا کر باہتمام استعمال کیا گیا ہے۔ جب کہ موضوع کے اعتبار سے خیام نے دنیا کی بے ثباتی اور اس کے مسائل کو حل کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے، انسان کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں جو وقت ہے وہ خوشی سے گزر جائے اس سے قبل کہ 'کوزہ ھا کنند از گِلِ ما' یا 'خاک من و تو کوزہ کند کوزہ گری'۔

جمیل مظہری نے بھی کوزے کو حقارت بھری نظر سے اسی لیے دیکھا ہے کہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ صراحی یا ٹھلیا سے کوزے میں شراب انڈیلنے کے منظر کو دریوزہ گر سبو کی ترکیب بنا کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اپنی حقیقت میں صرف زندگی مستعار کا حقدار ہے۔ انسان اپنی آخری منزل میں جلایا جائے، دفن کیا جائے یا گدھوں کے حوالے کیا جائے، اس کی اپنی حقیقت میخانے سے باہر پڑے ہوئے ٹوٹے ہوئے کوزوں سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی لیے شاعر انسان کی بے کسی، بے بسی اور بے بضاعتی کا احساس کراتے ہوئے مخاطب ہے۔ ''کوزے کوزے غریب بیکس کوزے''۔

جمیل مظہری اپنے دور کے ایک بڑے شاعر تھے اور شاعر کی عظمت کے طرفدار بھی۔ وہ اس کے پروازِ تخیل کی حد کو محدود نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر ہی دنیا میں وسعت نظر کا حامل ہے۔ اس کی سوچ تک پہنچنا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ خصوصا مذہب کے ٹھیکیدار تو اپنی تنگ نظری کے باعث باہر کی دنیا سے بالکل نابلد ہیں۔ ان کی نظر مسجد کے مسائل تک محدود ہے، جبکہ شاعر کا تخیل:

ممکن ہے کہ سرحد گماں تک پہنچے
یا قیدِ مکاں سے لامکاں تک پہنچے
واعظ کی نظر نہیں کہ مسجد تک جائے
شاعر کا خیال ہے کہ جہاں تک پہنچے

دوسرا مصرعہ 'یا قید مکاں سے لامکاں تک پہنچے' عرفانی مسائل کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے، گو کہ جمیل مظہری کے نظریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت اور مارکسزم سے بھی متاثر تھے۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اسلام نے جن چیزوں کو ارکان دین بنا کر پیش کیا اکثر مسلمان اس سے مکر گئے مثلا زکوٰۃ، خمس اور صدقہ وغیرہ انہیں چیزوں کو چھین کر اور لاٹھی، بندوق کے زور پر لے لینے کا نام اشتراکیت یا کمیونزم ہے، لیکن ان کے دینی رجحان اور تحت الشعور میں جو شے نظر آتی ہے وہ عرفان ہے جو انسانی برادری اور برابری کا احساس کرانے میں نئے دور کے ہر مشن سے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'وہ' کے عنوان سے تین رباعیاں، رباعیوں کے اصل مضمون تصوف سے ہم آہنگ ہیں۔ آخری رباعی سنیے:

اے دوست حجاب چشم بینا بھی وہی
نیرنگِ تصور و تماشا بھی وہی
ہم کیا ہیں؟ فریب حسن کھانے والے
پردہ بھی وہی ہے پردے والا بھی وہی

جمیل مظہری ایک نہایت حساس ذہن کے مالک تھے، وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے ہی نہیں بلکہ دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی آہٹ پر بھی کان لگائے بیٹھے تھے اور اہل وطن قوم اور دانشوران ملت کے سامنے اپنی رباعیوں کے ذریعے نتیجے پیش کررہے تھے، یا قوم وملک کے عوام اور نمائندوں کو بیدار کررہے تھے۔

اسی لیے نظائر و بصائر کے تحت اللہ وظل اللہ، آمریت اور فسطائیت، قیصریت و جمہوریت اور اشتراکیت جیسے عنوانات قائم کرکے ان سب کی اصلیت اور پس پردہ ان کے دگرگوں یا رہبروں کے غلط ارادوں اور کارناموں سے پردہ اٹھایا ہے۔ پہلے صرف ایک بادشاہ یا اس کے چند وزیر ہوتے تھے جو ظلم یا انصاف کے دلدادہ ہوتے تھے ان میں بھی سب کی نظر صرف بادشاہ کی نظر پر مرکوز ہوتی تھی لیکن جمہوریت میں ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا نیتا بادشاہ جیسی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اسی 'قیصریت و جمہور' پر وار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسمیں توحید کی اٹھائیں تم نے
بت خانے میں مورتیں سجائیں تم نے
اک تخت شہی کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے
ہر ٹکڑے سے کرسیاں بنائیں تم نے

اصناف سخن میں صرف رباعی ہی وہ صنف سخن ہے جو بغیر عروض دانی کے موزوں نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے رباعی کہنے کے لیے نہایت مشاقی اور فن عروض سے واقفیت لازمی ہے۔ اس میں یہ بھی سہولت ہے کہ رباعی کے مروج بارہ اوزان جنہیں ۲۴ بھی کہا جاتا ہے، میں رباعی کا ہر مصرعہ کسی بھی وزن میں موزوں کیا جاسکتا ہے۔ جمیل مظہری کی رباعیات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہیں فن عروض پر بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اس لیے ان کی رباعیات ایک دو تین یہاں تک کہ چاروں مصرعوں کو جداگانہ وزن میں موزوں کیا گیا ہے، یہ مہارت کافی ریاضت نہایت دقیق نظر اور مشق مسلسل کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ایسی ہی ایک رباعی مع اوزان نذر قارئین کی جارہی ہے۔

کل رات کو اک رند کے کاشانے میں — مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
تھی بحث سبو میں اور پیمانے میں — مفعول مفاعلن مفاعیلن فع
ساقی نے سبو کو مے سے بھر کر یہ کہا — مفعول مفاعلن مفاعیل فعل
دیکھا جاتا ہے ظرف میخانے میں — مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

اس طرح کی بہت سی مثالیں رباعیات مظہری میں موجود ہیں۔

آخر میں وہ اپنے راز کو منکشف کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں ہوتے ہوئے اس دنیا اور دنیا والوں سے ناراضگی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ سب سے خفا ہوکر سوئے خدا جانے کی تیاری کرتے ہیں، حالانکہ وہ خدا سے بھی خوش نہیں ہیں، لیکن اس کی قربت کا لطف ہی کچھ اور ہے:

میں دل میں لیے سب سے گلہ جاتا ہوں
میں سب سے خفا سب سے خفا جاتا ہوں
ہر چند کہ اس سے بھی نہیں خوش لیکن
میں سوے خدا سوے خدا جاتا ہوں

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے جمیل مظہری کی رباعیات ان کے خیالات، تفکرات، پرواز تخیل اور ان کی شخصیت کا مظہر ہیں۔ ان رباعیات میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو ایک صف اول کے رباعی گو کی رباعیوں میں ہونا چاہیے۔ ان کی تمام شاعری غزل، مثنوی، مرثیہ اور قصائد کا نچوڑ ان کی رباعیات میں ملتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف رباعیاں ہی لکھتے اور کچھ نہ لکھتے تو بھی اردو ادب میں ان کا ایک اہم مقام ہوتا۔ یہ بات رباعیات پر ایک تحقیقی مکمل مقالہ لکھنے کے بعد ثابت کی جاسکتی ہے۔ یہ بحث اس مختصر مقالے کی متقاضی نہیں ہے۔ جب بھی اردو ادب میں رباعیات کو موضوع نقد و تحقیق بنایا جائے گا جمیل مظہری کا نام انیس و دبیر، یگانہ، رواں، جوش، اکبر الہ آبادی اور فراق وغیرہ کے ساتھ ضرور لیا جائے گا۔

☆☆☆

ظفرؔ کمالی کی رباعیاں

صفدر امام قادری
(شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ)

فن کاروں کی صف میں تو شامل ہی نہیں؟ یا فن کی عدالت میں عادل ہی نہیں؟
کیوں تجھ سے گریزاں ہیں نقّاد ظفرؔ تو کچھ بھی نہیں؟ ذکر کے قابل ہی نہیں؟

■

سُن! سُرمۂ اربابِ بصیرت ہوں میں قسمت سے جو ہاتھ آئے، وہ دولت ہوں میں
اے دورِ رواں مجھ سے کترا کے نہ چل پہچان مجھے، تیری ضرورت ہوں میں

ظفر کمالی کی رباعی گوئی پر گفتگو کی حدود مذکورہ دونوں رباعیوں سے متعیّن ہوتی ہیں۔ ایک طرف ناقدریِ زمانہ کی شکایت ہے تو دوسری طرف اپنے کارناموں پر مکمّل اعتماد بھی ہے۔ یہ دونوں اگر ''شاعرانہ صداقت'' کے بجائے حقیقی صورتِ حال کے ترجمان بن جائیں تو نقّادوں کی گریز پائی کا تدارک اور شاعر کے اپنے بارے میں دعوے کی جانچ پرکھ اور ثبوت کے لیے ایک نثری تحریر کا جواز قائم ہوتا ہے۔ ''سمٹے تو دلِ عاشق'' کے انداز میں کہہ دیں کہ ظفر کمالی کا دعوا صحیح ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک تنقیدی خدمت گار کے لیے اس دعوے کی تہہ میں اُتر کر شاعر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس تحریر کو شاعر کے دعوے کی تصدیق و توثیق یا نادرستی کے عالَم میں انکار کی مدلّل تصویر سمجھنا چاہیے۔

ظفر کمالی پچھلے بیس پچیس برسوں سے گوشہ نشینی کے عالَم میں رہتے ہوئے دھیرے دھیرے تنقید، تحقیق، ظرافت، شخصی مرثیہ گوئی، ادبِ اطفال، ترجمہ نگاری، مقدّمہ نویسی، ادبی صحافت، اردو اور فارسی میں کتبِ نصاب کی معیاری تدوین وغیرہ شعبوں کے تحت پختہ روشنائی میں ہزاروں صفحے شائع کر چکے ہیں۔ ایک درجن کے آس پاس مطبوعہ جلدوں کے ساتھ رسائل کے اوراق میں بکھری تحریریں بھی کئی کتابوں میں سمائیں گی۔ تصنیفی وفور کا یہ فضلِ خدا یہ عالَم ہے کہ ان کے پاس ہر وقت کئی کتابوں کے مسوّدات غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ اس مقدار، معیار اور جاں فشانی کے باوجود نہ قدر و منزلت کی طلب اور نہ شہرت پسندی کا رتّی بھر ہَوکا۔ کتاب آئی، احباب اور عمائدین کے حلقے میں پہنچا دی گئی اور اگلے دن سے دوسری کتاب کی تیّاری شروع ہو گئی۔ کسی سے تبصرہ لکھوالیں، کسی سے تقاضہ کریں کہ ہماری کتاب پر بھی دو صفحے لکھ دو؛ ایسی کوئی خو نہیں اپنائی۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی متعدّد کتابوں پر کسی نے نہ تبصرہ کیا اور نہ ان کے کسی کارنامے کا احتساب۔ کسی اکادمی نے مالی اعانت دی اور نہ انعام کے لائق سمجھا۔ دل میں بہت ملال ہوا تو قدر دانوں کو کبھی ظریفانہ لہجے میں اور کبھی رباعی کی نزاکتوں کے پردے میں حرفِ شکایت پیش کر کے پھر واپس گوشۂ گم نامی میں سمٹ جانا ظفرؔ کمالی کو اگلے وقتوں کے لوگوں میں پہنچا دیتا ہے۔ شعر و ادب کی یہ فقیرانہ لَے ہوس پسند زمانے میں شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آئی ہو۔ خوبی یہ کہ سُر تال اتنے سَدھے ہوئے ہیں کہ متعدّد طرح کے ہنگاموں کے بیچ اس ادبی صوفی کا آہنگ ایک لمحے کے لیے بھی بگڑتا نہیں۔ اصول بہ قولِ شاعر پہلے سے موجود ہے: گوشے میں ادب کے مجھے آرام بہت ہے۔

ظفر کمالی کی شخصیت اور کارناموں پر جب نگاہ پڑتی ہے تو نہ جانے کیوں الطاف حسین حالی کی شبیہہ آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔ وہ جن لوگوں کے بیچ رہے، اپنے عہد میں ان سے کم شہرت پائی۔ جہاں جہاں گئے، کبھی بھی کوئی بڑا منصب انھیں پیش نہیں ہوا۔ 'انجمنِ پنجاب' میں محمد حسین آزاد کے سامنے حالیؔ معمولی حیثیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ علی گڑھ کی کانفرنسوں میں حالی سے زیادہ شبلی کی نظموں کا انتظار کیا جاتا تھا۔ غالب کے حلقۂ ارادت کے صفِ اوّلین میں حالی کی گنتی کہاں ہوتی ہے؟ حالی نے کبھی اپنی ادبی اہمیت کے لیے کوئی بلند بانگ دعوا کیا اور نہ کوئی منضبط انداز میں اپنی پہچان کے لیے وہ مُصر رہے۔ ادارہ سازی جس سے شناخت کا اضافی سلسلہ قائم ہوتا ہے، اس سے بھی وہ غافل رہے۔ حالی کی وفات کے اب سَو برس پورے ہونے کو آئے، کتنے مسلّمات از خود وقت کی گرد میں ہَوا ہو گئے لیکن ایک الطاف حسین حالی ہیں جنھیں ہم اردو زبان کا عظیم غزل گو، نظم نگار، نقّاد، سوانح نگار، معاشرتی ناول نگار

نہ صرف یہ کہ مانتے ہیں بلکہ گذشتہ سَو برسوں میں ان کے مقام و مرتبے میں دوسرے ہم عصروں کے مقابلے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ اپنی علمی صلاحیت کا ایک ایک رَس نچوڑ کر بے مثال ادبی صحیفوں کا روپ دے دیا۔ سرسید، نذیر احمد، شبلی اور محمد حسین آزاد کے طلسماتِ ہنر کے فیضان میں ایک ٹھہراؤ دکھائی دیتا ہے لیکن حالی جیسا گوشہ نشیں اور خاموش طبع شخص اپنے سَو برس سے زیادہ پُرانے کارناموں کی نئی نئی تعبیرات کی بہ دولت اپنے زمانے کے مقابلے میں آج زیادہ مقبول و محترم ہوتا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں یہ سلسلہ یقینی طور پر قائم رہے گا۔ ظفر کمالی کی شخصیت اور کارناموں کو حالی کے تناظر میں دیکھنے سے اپنے آپ بہت ساری چیزیں روشن ہو جائیں گی۔

ظفر کمالی کے کارناموں کا ایک بنیادی محور تحقیق ہے۔ قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی روایت میں ظفر کمالی کو نہیں شامل کرنا ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ متعدد رسائل و جرائد میں اُن کے جو تحقیقی تبصرے سامنے آئے، وہ اہلِ علم کے لیے چشم کُشا ہیں۔ آج سے تقریباً دو دہائی قبل ماہنامہ ''شاعر'' میں عطا کاکوی کی کتاب 'غلطی ہائے مضامین' اور ''زبان و ادب'' میں 'قاضی عبدالودود اور گیان چند جین' عنوانات سے جو اُن کے تحقیقی تبصرے شائع ہوئے، وہ اس بات کا ثبوت تھے کہ ادبی تحقیق کی آئندہ فصلِ بہار میں ایک شاخ ظفر کمالی بھی ہوں گے۔ بعد میں رشید حسن خاں، گیان چند جین، حنیف نقوی، ابوالبرکات وغیرہ کی کتابوں اور سیّد محمد محسن کے مضمون پر اُن کے شائع شدہ تحقیقی نوعیت کے تبصرے ظفر کمالی کے عمقِ علمی کا واضح ثبوت ہیں۔ ڈراموں کی تحقیق و تنقید ظفر کمالی کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتی ہے جسے انھوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ 'روحِ ادب'، 'معلّمِ اردو'، 'زبان و ادب' اور 'عہد نامہ' وغیرہ رسائل میں اُن کے شائع شدہ ڈرامے سے متعلق بنیادی نوعیت کے مضامین ایک مدّت پہلے شائع ہو چکے ہیں جن کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔

گذشتہ برسوں میں ظفر کمالی نے نہایت سنجیدگی سے مقدّمہ نویسی کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ظفر کمالی جیسے گوشہ نشیں صاحبِ نظر سے کوئی مقدّمہ یا تقریظ کیوں لکھوائے؟ عام طور سے یہ کام چمکتے ہوئے ستاروں اور پورے طور پر بزرگ نقادوں کے سپرد ہوتا ہے جن کی تحریروں کے بارے میں صاحبانِ کتب کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اُن کے ادبی قدو قامت میں اضافہ کا باعث بنیں گی۔ چاہے وہ بڑی شخصیت اُن کے مسوّدے کو سونگھ کر یا اِدھر اُدھر سے تاک جھانک کر ہی دس بیس جملے عمومی انداز کے گھسیٹ مارے۔ ظفر کمالی کے مقدّمے ماسوائے غضنفر، اکثر ان ہی لوگوں پر ہیں جو عرفِ عام میں ''مقامی'' قرار دیے جاتے ہیں۔ غضنفر کا وطن بھی 'سارن' ہی ہے، اس اعتبار سے انھیں غیر مقامی کیوں سمجھا جائے — 'نوید سحر' (فہیم جوگاپوری)، 'شرائع نظمیں' (طلحہ رضوی برق مرتّبہ التفات امجدی)، 'رباعیاتِ قمر' (قمر سیوانی)، 'میرا فرمایا ہوا' (مظاہر الحق)، 'دریا ٹوٹ جاتا ہے' (فاروق سیوانی)، 'خاکسارانِ جہاں' (خورشید احمد خاں)، 'جنوں کی آگہی' (کوثر سیوانی) کے سلسلے سے ظفر کمالی کے جو تفصیلی مقدّمے شائع ہوئے ہیں، انھیں اگر وسیع پیمانے پر توجّہ سے پڑھ لیا جائے تو اُن سے مقدّمہ لکھوانے کے لیے اہلِ قلم کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ انھوں نے جس مصنّف کی کتاب کا بھی مقدّمہ لکھا، اس مصنف اور وہ کتاب پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہے۔ وہ مدلّل مداحی کے مقابلے تحقیقی اور علمی مواد جمع کر کے اس مصنّف کا ایسا بھرپور تعارف پیش کر دیتے ہیں جس سے لکھنے والے کا ادبی مقام، جس قدر بھی وہ ہے، اسے متعیّن کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان مقدّموں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اُن سے کتاب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ غضنفر کے خاکوں کے مجموعے 'سرخ رو' میں ظفر کمالی نے جو مقدّمہ لکھا، اُس سے زیادہ بھرپور کوئی دوسرا مضمون ابھی تک غضنفر کی خاکہ نگاری کے بارے میں سامنے نہیں آ سکا۔ ایک مقدّمہ نویس کے حیثیت سے ظفر کمالی کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ کتاب کی طرفیں اور تہیں اتنا دل لگا کر کھولتے ہیں جس سے زیادہ کی عام صورتوں میں گنجائش ہی کم ہوتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ مقدّمہ نویس کے طور پر وہ کتاب اور صاحبِ کتاب کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

ظفر کمالی کی تحقیق کا ایک مرکز اُن کے استاد احمد جمال پاشا کے سلسلے سے تحقیق و تنقید سے قائم ہوتا ہے۔ ''متعلقاتِ احمد جمال پاشا'' عنوان کی تحقیقی کتاب ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس سلسلے سے رسائل و جرائد میں ان کے دیگر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ احمد جمال پاشا سے متعلق یہ تمام متفرّقات کم از کم چار پانچ کتابوں کا حصہ بنیں گے۔ ظفر کمالی کی تحقیق کا اساسی موضوع ظرافت اور تذکرہ نویسی بھی ہے۔ شاید یہ احمد جمال پاشا کی تربیتِ خاص سے صیقل ہوا۔ انھوں نے 'بہار میں اردو ظرافت'، 'سارن میں اردو ظرافت' اور سارن کے شعرا اور نثر نگاروں کے حوالے سے متعدّد تحقیقی مضامین رسائل میں شائع کیے ہیں۔ ان کی کتاب 'نمک دان' کے فلیپ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ درج بالا موضوعات پر اُن کی مختلف جلدیں شائع ہوں گی۔

ان تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ گذشتہ بیس برسوں میں ظفر کمالی نے شعر گوئی پر خاص توجّہ دی۔ ظریفانہ شاعری کے تین مجموعے ____ 'ظرافت نامہ' (۲۰۰۵ء)، 'ڈنک' (۲۰۰۹ء)، 'نمک دان' (۲۰۱۱ء) کے علاوہ بچّوں کے سلسلے سے منظومات کا مجموعہ 'بچّوں کا باغ' (۲۰۰۶ء)۔ اس کے علاوہ 'متعلّقاتِ احمد جمال پاشا' میں ان کی بارہ غزلیں اور سَو اشعار پر مشتمل ایک شخصی مرثیہ احمد جمال پاشا کی یادوں کے نام اس کتاب میں موجود ہے۔ شاعری کا مطبوعہ متن پانچ سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ رسائل میں بکھری ہوئی تخلیقات اس پر اضافہ ہیں۔ ظریفانہ اور بچّوں کی شاعری سے الگ انھوں نے رباعی گوئی پر توجّہ کی تو ۲۰۱۰ء میں ۳۸۵ رباعیات کا مجموعہ 'رباعیاں' عنوان سے سامنے آیا۔ رباعی کو سب نے مشکل فن مانا ہے اور استادانہ رکھ رکھاو کے بغیر یہاں لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ دو ڈھائی برس کی مدّت میں اب یہ تازہ 'رباعیاتِ ظفر' ہمارے مطالعے میں شامل ہے جہاں پانچ سو سے زیادہ رباعیاں موجود ہیں۔ تین ظریفانہ مجموعے، دو مجموعۂ رباعیات اور ایک بچّوں کی شاعری کے مجموعے کے باوجود ظفر کمالی اپنی شاعرانہ شناخت اور عظمت کا اعلان کرنے کی طرف بڑھنے کے بجائے خاموشی سے اگلی کتابوں کا خام مواد تیار کرنے میں منہمک ہیں۔ ایسی بھرپور اور تصنیف و تالیف کی کثیر الجہتی کو دیکھتے ہوئے آخر ہمیں حالی کیوں نہ یاد آئیں۔ آخر کوئی تو بات ہوگی کہ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کا مرثیہ لکھنا طے کیا تو انھیں حالی کے 'مرثیۂ غالب' کی بحر اور ایک بند میں اشعار کی تعداد، سب نے اس طرح مبہوت کر دیا کہ انھوں نے بھی اسی رنگ اور روپ کو اپنے مرثیے کے لیے رہنما مانا۔

ظفر کمالی صنفِ رباعی کی طرف سرِ راہے نہیں چلے آئے۔ پُرانے زمانے میں قصائد اور موجودہ زمانے میں رباعیات ہر شاعر اپنے دیوان یا مجموعۂ کلام میں دو چار دس کی تعداد میں اس لیے شامل رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کے استادانہ رُخ کا اقرار ہو سکے۔ لیکن یہ اکثر و بیش تر منہ کا مزا بدلنے کے لیے ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ آج سے پچیس برس قبل ظفر کمالی نے 'زبان و ادب' میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں رباعی کے اوزان کے سلسلے سے اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن بہت عالمانہ گفتگو کی تھی۔ یہ ذوق اور علم تہہ نشیں موج کی طرح دو دہائیوں میں تپ کر ایک مستقل تخلیقی شوق میں اب سامنے آیا ہے۔ رباعیوں کے دونوں مجموعوں پر غور کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کمالی شاید رباعی گوئی کے لیے ہی بَنے تھے۔ ایک خاص بات ان رباعیوں میں یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ظفر کمالی کی ادبی شخصیت کے تینوں اساسی پہلو تحقیق، ظرافت اور شاعری یہاں باہم شیر و شکر ہو کر رباعی کے فن میں اس طرح ڈھل گئے ہیں جیسے یہیں مکمّل ظفر کمالی ہمیں ملیں گے۔ میرؔ کی غزل میں میرؔ کی پوری شخصیت ایک مرکز پر سمٹ آتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح ظفر کمالی کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی شخصیت، ان کے فلسفیانہ اور فکری زاویے، زندگی اور کائنات کے بارے میں مخصوص تصوّرات سب کے سب ان رباعیوں میں یوں روشن ہوئے ہیں جیسے یہ تمام کام رباعیات کے لیے ہی مخصوص تھے۔ شاید قدرتِ کلام کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

رباعیات کو بالعموم تفکّر اور تبلیغ و اصلاح کا محور مانا جاتا ہے۔ تھوڑے سے نمونے ان سے الگ موضوعات کے بھی ہیں لیکن رباعیوں کے مجموعی سرمایے میں اس موضوعاتی گریز کی حیثیت آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔ ہیئت اور اوزان میں تو یوں بھی پہلے سے ہی سب کچھ طے شدہ ہے۔ اس لیے رباعیوں میں اکثر ایسے شعر از یادہ کامران اور مقبول ہوتے ہیں جن کے خمیر میں فکر و فلسفہ کی مٹّی ذرا زرخیز ثابت ہو۔ اسی لیے رباعی گوئی شاعری کی دوسری صنفوں کے مقابلے زیادہ سنجیدہ، علمی اعتبار سے باوقار اور باعثِ توجّہ تسلیم کی جاتی ہے۔ جن شعرا نے باضابطہ طور پر رباعیاں کہی ہیں، اکثر نقّاد اُن کے فکری دریچوں کو کھولنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ لازمی فائدہ غزل گو کے حصے میں اکثر و بیش تر نہیں آتا۔

ظفر کمالی نے اپنی تحقیق میں بار بار باطل ادبی قوتوں کا بڑی کامیابی کے ساتھ دلائل و شواہد کے ساتھ بطلان کیا ہے۔ ظریفانہ شاعری میں تو ایسے ہر چہرے کو نشانۂ طنز بنایا ہے جو حقیقت میں کھرا تو نہیں ہے لیکن خود کو کھرا ظاہر کرنے کا فریب کر رہا ہے۔ اپنی رباعی گوئی میں بھی ظفر کمالی بنیادی طور پر وہی بات کہہ رہے ہیں کہ سچ حقیقی ہے اور جھوٹ باطل ہے۔ یہ ایک پُر لطف جستجوے علمی ہے اور تفتیش و تحقیق کا امتحان کہ ایسے فکری حصار میں رہتے ہوئے ظفر کمالی رباعیوں کی تخلیق کے دوران کیا ظرافت نگار یا محقّق کے طور پر موجود ہوتے ہیں یا رباعیات کے کاغذی پیرہن کی نرمی اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے نئے سِرے سے رباعی گو کی اپنی ایک علاحدہ شخصیت خلق کرتے ہیں؟ اپنے افکار و نظریات کی پیش کش میں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رباعی گو کی جگہ پر کبھی محقّق اور کبھی نرے ظریف بن کر اُبھرتے ہیں؟ کیا انھوں نے صنفِ رباعی کے اصول و ضوابط کو اس قدر جی جان سے لگایا کہ وہ سارے تجربے اور صنفی توسیعات کے کام دھرے رہ گئے جس کے بغیر کوئی

بڑا شاعر وجود میں نہیں آ سکتا؟

دنیا کا ہر مذہب اور ادب، صالح اقدار کی تبلیغ اور تشہیر اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے۔ رباعی کی روایت کہیں نہ کہیں مشاہدۂ کائنات کے مرحلے میں پند و موعظت کی پیش کش سے بندھ گئی۔ چار مصرعوں کی ذرّہ برابر دنیا ہے مگر اصول اور روایت کی ایک مستحکم شاہ راہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس پُل صراط کے ایک طرف آگ ہے تو دوسری طرف گہری کھائی۔ کب اچھا بھلا شاعر بزمِ رباعی میں راندۂ درگاہ قرار دیا جائے گا، یہ کسی کو پتا نہیں۔ اچھی اور بڑی باتیں کرنے والے بہت سارے افراد پہلے بھی آ چکے ہیں اور تمام مذاہب کے مبلّغین انھی کاموں پر مامور ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا آج کی دنیا میں اخلاق اور پند کی باتیں سُنی جا سکتی ہیں؟ کیا ادبی معاشرہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی صنفِ ادب کے گھر آنگن میں بیٹھ کر تبلیغ و اصلاح کے لازمی بندھن میں پڑھنے یا لکھنے والا بندھا رہے؟

ان سوالوں کے بیچ ظفر کمالی کی رباعیات کا مطالعہ کئی جہات سے تازہ اور خوش گوار ہَوا کے جھونکے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ظفر کمالی کی ظرافت نگار کی حیثیت بنیادی ہے، اس لیے ان سے بہتر کون یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ظرافت ہو یا تبلیغ و اصلاح، ادب میں انھیں تہہ نشیں موجوں کی طرح ہی رہنے دینا ہے۔ اس سے جہاں بھی بات آگے بڑھی، ادب عریاں ڈھنڈورا بن جائے گا؛ اور تب اسے ادب کون مانے گا؟ 'رباعیاتِ ظفر' میں خیر و شر کا کوئی اعلان تو نہیں کیا گیا لیکن ان تمام باتوں کو پیش کرنے کا ایک علاحدہ ڈھب شاعر نے اختیار کیا۔ وہ سچ اور جھوٹ یا اچھّے بُرے کی مبارزت میں انسانوں کو نفسیاتی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں وہ کئی بار دونوں طرف سے خود ساختہ کردار قائم کرتے ہیں اور ان کی گفتگو یا مباحث میں کب خیر کی تبلیغ یا شر کی مخالفت شروع ہو گئی، یہ پتا ہی نہیں چلتا۔ کبھی کبھی رباعی کے ظاہری الفاظ تو کچھ کہتے ہیں لیکن وہاں بین السطور میں کچھ دوسرے ہی بڑے گہرے معنی پیوست رہتے ہیں۔ صنفِ رباعی کی مزاج شناسی کا ظفر کمالی کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

جو جُھکنے کی منزل پہ اَکڑ جاتی ہیں
قومیں وہ نہیں بنتیں، بگڑ جاتی ہیں
اخلاق کی میراث اگر لُٹ جائے
تہذیب کی سانسیں بھی اُکھڑ جاتی ہیں

■

مت رکھ تو کبھی بغض کے زینے پر پانو
رکھنا ہے تو رکھ، دل کے کینے پر پانو
تو راہِ صداقت سے نہ کھینچ اپنے قدم
رہنے دے شیطان کے سینے پر پانو

■

کہتے ہیں جنھیں لوگ قرینے والے
ہیں تلخیِ ایّام کے پینے والے
طوفان میں کھیتے ہیں وہ اپنی کشتی
مرنے سے کہاں ڈرتے ہیں جینے والے

ظفر کمالی صورت سے مذہبی رنگ میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہراً مذہبی افراد اکثر ہمارے غزل گو شعرا کا نشانہ بنتے رہے ہیں لیکن ظفر کمالی نے مذہب سے زندگی کا وہ آفاقی راگ اپنے لیے منتخب کیا جس کی ضرورت اس کائنات کو ہمیشہ رہے گی۔ یہاں نفرت کے بجائے محبّت، باطل کے مقابلے حق، بُرے کے مقابلے اچھّے کے لیے انتہائی درجے کی جو جستجو ہے، وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر مذہبی فکر کی سماجی بنیادوں کو روشن تر کرنے کی شاعر کی مُہم کا ایک حصّہ ہے۔ یہ کام عام طور پر مذہبی مبلّغین کو زیادہ سوجھتا ہی نہیں۔ کبھی بھولے بھٹکے سے اس موضوع کے اِرد گرد یہ لوگ پہنچ بھی جاتے ہیں تو اکثر اُن کے اعمال سے اس کی مطابقت قائم نہیں ہوتی اور بات بے اثر ہو جاتی ہے۔ 'رباعیاتِ ظفر' کے آغاز میں ۳۹ حمدیہ اور نعتیہ رباعیات ہیں۔ انھیں روایت کا حصّہ سمجھ کر یہاں سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں۔ یہ بھی موزوں نہیں کہ ان رباعیات کو شاعر کی مذہب پسندی کا ایک ثبوت تسلیم کر کے چھوڑ دیا جائے۔ میرے لیے یہ رباعیاں عصرِ حاضر کے ایک دیانت دار اور مضطرب دل کی ایسی تڑپ ہیں جہاں ذات اور کائنات کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر مذہبی فکر کی نرمی سے یہ صورت پیدا کی جا رہی ہے کہ راستوں کے کچھ کانٹے کم ہو سکیں اور لوگوں کے پانو میں چھالے نہ پڑیں۔ خدا، رسول اور مذہبی امور کی گفتگو ظفر کمالی کے یہاں زندگی کی نرمی، محبّت اور سچّائی میں گھُل مل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اقبال کی دائمی حیثیت اس وجہ سے بھی قائم ہوئی تھی کیوں کہ ان کے یہاں مذہب انسانوں کے سماجی اور قومی مسائل میں ایک قطب نما کا کام کرتا ہے۔ ظفر کمالی اپنی رباعیات سے ایسے نازک اور لازم کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

دُکھ کے مارے، گِرے پڑے، سب بیمار
تیرے در پر آئیں ہو کر لا چار
سننے والا یہاں کہاں اور کوئی
مظلوموں، بے کسوں، گداؤں کی پُکار

تھک جائیں قدم، ذوقِ یقیں تھک جائے
کمزور نہ منزل کے قریں تھک جائے
اللہ! مرے سجدوں کی سُن لے پکار
ڈر ہے نہ کہیں میری جبیں تھک جائے

جاہل ہوں، مجھے علم کی تنویر بھی دے
آئینے کو میرے نئی تصویر بھی دے
احساس کی جاگیر بھی کر مجھ کو عطا
خوابوں کو مِرے خیر کی تعبیر بھی دے

تاریک نگاہوں میں چمک دے یارب
چہرہ ہے مرا زرد، دَمک دے یارب
قاروں کے خزانے کی طلب مجھ کو نہیں
کھانے کے لیے نان و نمک دے یارب

ظفر کمالی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ''مکاتیبِ ریاضیہ'' سے کیا تھا۔ مولانا ریاض احمد کے اپنے مریدوں کے نام لکھے گئے یہ خطوط ہیں۔ مولانا ریاض احمد ایک صاحبِ طریقت صوفی تھے۔ ظفر کمالی کے خانوادے میں مولانا ریاض کے متعدّد مریدین موجود ہیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ ظفر کمالی کس صوفیانہ سلسلے یا کس صوفی سے براہِ راست وابستہ ہیں لیکن مولانا روم کے اصول کے مطابق:

''شعر می گویم بہہ از قند و نبات من نہ دانم فاعلاتن فاعلات''

ایک نئی حقیقت سامنے آتی ہے۔ مولانا روم سیکڑوں شعرا سے اعلا شاعر اور ہزاروں صوفیوں سے بڑے صوفی ہیں۔ ظفر کمالی کی ظریفانہ تخلیقات، متعدّد تحقیقی مضامین اور خزائنِ رباعیات میں ایک بھرپور صوفیانہ آہنگ اُبھرتا ہے۔ آخر یہ سوچنے کی بات ہے کہ تمام ظریفانہ نظموں کا انجام یا بین السطور میں پیوست مفاہیم میں دردمندانہ رقّت پسندی کیوں عُود کر آتی ہے۔ گیان چند جین اور سیّد محمد محسن کے سلسلے سے ان کے سخت ترین تحقیقی مضامین کی پُشت پر کون سا جذبہ کارفرما رہا؟ وہاں اصل معاملہ تحقیقی اخلاقیات اور اسلاف کے کارناموں کے احتساب کے اصول وضوابط سے متعلّق ہے۔ ''رباعیاتِ ظفر'' میں بار بار انا پسندی، شہرت پسندی، بے عملی، تصنّع، لالچ اور ہَوس پرستی کو آخر کیوں نشانۂ طنز بنایا جا رہا ہے؟ ظفر کمالی کو معلوم ہے کہ وہ کوئی پند نامہ نہیں تیار کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی پتا ہے کہ وہ کوئی تبلیغی یا اصلاحی مہم نہیں چلا رہے ہیں۔ لیکن کوئی درد مند دل رکھنے والا انسان جب ننگی آنکھوں سے زندگی اور کائنات کی سچّائیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے تو وہ کب تک خاموش بیٹھ سکتا ہے؟ یوں بھی روایتی طور پر فکری موشگافیوں کے لیے رباعیات کی زمین بہت ہم وار مانی گئی ہے لیکن ظفر کمالی نے یہ موضوعات علم بگھارنے کے لیے رباعیات میں شامل نہیں کیے۔ یہ باتیں جان اور روح سے نکلی ہوئی ہیں۔ میرؔ کی شاعری کو دل اور دلّی کا مرثیہ کہتے ہیں۔ سب مانتے ہیں کہ زندگی اور کائنات سب ایک مرکز پر سمٹ آئیں تو ایسے مصرعے برآمد ہوتے ہیں:

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں

ظفر کمالی نے زندگی کے اس سوچ کو متصوّفانہ نسخۂ کیمیا سے غور وفکر کا حصّہ بنایا ہے۔ یہ صبر، ضبط اور انہماک کا امتحان بھی ہے۔ زندگی اور کائنات کی خوں آشامی، جھوٹ، مفاد، کینہ اور فریب کی حکمرانی کے بیچ دیکھیے، ظفر کمالی کس صوفیانہ راگ سے اپنے لیے ایک معقول گھنی چھانو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں:

ہو تم میں جو ادراک کے جوہر کی آگ
محسوس کرو، کیا ہے اندر کی آگ
دیکھو تو سہی چیر کے سینہ اُس کا
پانی کی تہوں میں ہے سمندر کی آگ

دریا سے نہیں ریگِ رواں کا رشتہ
کیسے ہو بہاروں سے خزاں کا رشتہ
دشوار بہت ہے اجتماعِ ضدّین
کب سود سے ہوتا ہے زیاں کا رشتہ

دیکھی ہے کبھی تم نے قلندر کی آنکھ
دریا کی نظر گہرے سمندر کی آنکھ
موجود ہیں تم میں بھی یہ آنکھیں ناداں
کھولو تو ذرا اپنے اندر کی آنکھ

قسمت میں تری دیدۂ گریاں کیوں ہے
دشوار بہت زیست کا ساماں کیوں ہے
سوچا ہے کبھی تونے اے میری قوم
دنیا میں لہو ترا ہی ارزاں کیوں ہے

رباعیات کے اختصار اور اپنے آپ میں مکمل ہونے سے تحریک پاکر متعدّد شعرا نے افراد کے نام منسوب رباعیات لکھنے کا سلسلہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں ظفر کمالی نے اپنے پہلے مجموعۂ رباعیات میں احمد جمال پاشا، حنیف نقوی، ناوک حمزہ پوری، طلحہ رضوی برق، اعجاز علی ارشد، کوثر سیوانی، قمر سیوانی اور التفات امجدی کے سلسلے سے پچاس سے زیادہ رباعیات موجود ہیں لیکن 'رباعیاتِ ظفر' میں یہ سلسلہ باضابطہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، شہاب الدین ثاقب، سید حسن عباس، عامر سبحانی، بسمل رانی پوری، اظہار احمد ندیم اور خاکسار کے سلسلے سے کم از کم چھے رباعیات ضرور شامل ہیں۔ احمد جمال پاشا اور کوثر سیوانی کو پھر سے یاد کرتے ہوئے چھے چھے نئی رباعیات اس کتاب میں درج ہیں۔ افرادِ خاندان میں اپنی شریکِ حیات کے بارے میں بارہ رباعیات موجود ہیں۔ اپنے دو بہنوئیوں کے انتقال پر نو۔نو رباعیات اور محمد وجیہہ الحق کی شادی کے موقعے سے تہنیتی رباعیاں اس کتاب کا حصہ ہیں۔ دو کتابوں---'خاکسارانِ جہاں' اور 'تذکرہ شعرائے سارن' اور اپنے وطن رانی پور اور شہرِ بنارس پر بھی رباعیات شامل ہیں۔ ناوک حمزہ پوری اور زاہد سیوانی کے بارے میں ظریفانہ رباعیات شاملِ کتاب ہیں۔ رباعیاتِ ظفر میں اشخاص اور مقامات وکتب کے بارے میں جو رباعیات شامل ہیں، ان کی مجموعی مقدار تیس فی صد کے قریب ہے۔

ظفر کمالی کی رباعی گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے اس حصّے سے بے التفاتی مناسب نہیں۔ اس میں یہ جانچ پرکھ بھی شامل رہے کہ انھوں نے اس انداز کی شاعری پیش کرنے والوں کی ناکامیوں سے آخر کیا سیکھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ظفر کمالی یہ کام رسمِ دنیا نبھانے کے لیے کر رہے ہیں؟ کیا یہ غور کرنے کا موقع نہیں کہ جس شاعر کے پاس یہ حوصلہ ہے کہ ایسی رباعیات کے لیے اپنے مجموعے کا ایک تہائی وقف کر رہا ہو، وہ اگر اس حصّے میں ناکام ہُوا تو پورے مجموعے کا توازن اور معیار متزلزل ہوجائے گا۔ انھی اسباب سے اس حصّے کا آزادانہ طور پر جائزہ لینا ضروری سمجھ میں آتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشیں تھی کہ ایسی تحریریں اکثر وبیش تر رسومیات کے ذیل میں ڈال دی جاتی ہیں اور پڑھنے والے اُن سے سرسری گزر جاتے ہیں جو بعض اوقات شاعر کے ساتھ بے انصافی کی بات ہوجاتی ہے۔

ظفر کمالی نے ان رباعیات میں شخصیت شناسی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ جن اشخاص کے بارے میں یہ رباعیات ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جن سے ظفر کمالی کے ذاتی روابط نہ رہے ہوں۔ اکثر سے کئی کئی دہائیوں کا اور شب وروز کا رشتہ رہا ہے۔ اس لیے یہ رباعیاں رسمی دائرے میں قید ہوکر بے رَس اطّلاعات کا خزینہ بننے کا ذریعہ نہیں بنتیں۔ ایک فن کار کی حیثیت سے ظفر کمالی کی یہ حیرت انگیز ہوش مندی ہے کہ انھوں نے اطّلاعات اور رسومیات کے بجائے شخصیت شناسی پر اِن رباعیات کا مدار رکھا۔ اگر وہ ادیب اور شاعر ہیں تو اُن کے ادبی مقام پر بھی نظر ہے لیکن وہاں بھی مضمون نویسی کے لوازمات سے بہر طور پرہیز کیا گیا ہے۔ ایسی شاعری میں مصنّف یا کتاب کی رعایت سے کچھ نہ کچھ ادبی مشغلہ قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن ظفر کمالی نے سمجھ بوجھ کر، ایسی کسی ادبی کرتب بازی میں خود کو اُلجھا کر اپنے شعر کو بگاڑنے یا بے مزہ کرنے کا خطرہ نہیں اٹھایا۔ انھوں نے اشخاص کی زندگی کے صرف انھی پہلوؤں پر توجّہ کی، جن کو اطّلاعات سے بوجھل بنانے کی لازمی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات انھیں یہ بھی معلوم تھی کہ ممدوحین کے اوصافِ عمومی پر اُن کا قاری کیوں کر متوجّہ ہوگا؟ اگر معلوم حقائق پر ہی زور ہو تو پڑھنے والے کے لیے اِن رباعیات میں کشش کیوں ہوگی؟

انھی اسباب سے ظفر کمالی نے شخصیت شناسی کے مراحل میں ایسے اجزا پر زیادہ توجّہ دی جو دوسروں کی نگاہ سے عموماً اوجھل ہوتے ہیں۔ ہر زندگی میں نہ جانے کتنے اَنجانے پہلو اور گم شدہ زندگیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں طے کرنا ہے کہ سرسری گزر جائیں یا جہانِ دیگر کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ اشخاص پر توجّہ کرتے ہوئے ظفر کمالی نے بالعموم اُن زندگیوں سے ایسے 'جہانِ دیگر' ڈھونڈ نکالے ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رباعیات جن کے بارے میں لکھی گئی ہیں، وہ یا انھیں نہایت قریب سے جاننے والے اس کے مطالعے کے دوران نہ صرف شاعر کو داد

وتحسین سے نوازیں گے بلکہ انھیں اس بات پر استعجاب بھی ہوگا کہ زندگی کی اس بھولی بسری گلی میں آخر وہ (ظفر کمالی) کس طرح پہنچ گئے؟

شخصیت شناسی میں ظفر کمالی کی کامیابی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ انھوں نے ایسے اشخاص کو اپنا موضوع بنایا جنھیں وہ بہت گہرائی سے جانتے تھے اور جن کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور دنیا جہان کے معمولات سے واقف تھے۔ دوسرا پہلو اَقدار کے تعلّق سے اشخاص کو سمجھنے کا ہے۔ وہ ظرافت نگار بھی ہیں، حسبِ ضرورت افراد اور اقوام کا مذاق بھی اڑاتے ہیں لیکن نہ جانے ان میں کون سا صوفیانہ راگ ہے جس میں افراد اقوام کے صالح کردار کا ترجمان بن کر اُبھرتے ہیں۔ پیغمبروں، صوفیوں اور پیروں فقیروں کا ایسا مزاج دیکھا گیا ہے۔ دوسروں کے اندھیروں میں بھی انھیں اجالا لگنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روشنی اُن کے اندر سے پھوٹتی ہوئی سامنے آتی ہے۔ شخصیت کے تعلّق سے ظفر کمالی کی رباعیوں میں پہلی قرات کے نتیجے میں وہ مخصوص شخصیت اُبھرتی ہے جس کے نام رباعیاں کہی گئی ہیں لیکن جیسے ہی ہم وردِ دوم کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں، وہاں سے قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد یا صفدر امام قادری کی شبیہیں مدّھم ہوجاتی ہیں اور ہمارے معاشرے کی ایک خوب صورت، معنیٰ آفریں، علم پرور، کاروبارِ دنیا سے گریزاں، اونچے خواب دیکھنے والی اور حق کے لیے آخری بازی کھیل جانے والی قوم کی مجموعی تصویر اُبھرتی ہے۔ ان افراد کے شعری تذکرے سے ظفر کمالی نے جو کولاژ تیار کیا ہے، وہ خوبصورت، حوصلہ افزا، زندگی بہ داماں اور روشن تر ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ کیجیے، یہ ثبوت اپنے آپ مل جائے گا کہ شاعر نے افراد کے ساتھ ساتھ اُن سے تشکیل پانے والے معاشرے اور اس کے آئندہ کو بھی کس طرح نگاہ میں رکھا ہے:

سچّے ہیں، یہ سچ بولیں گے؛ وہ بھانپتے تھے
جھوٹے تو انھیں دیکھ کے منہ ڈھانپتے تھے
تھی سہل پسندوں میں دہشت پھیلی
یہ نام ہی سنتے تھے تو وہ کانپتے تھے
(قاضی عبدالودود)

عالَم تھا عجب اُس کی بے باکی کا
شکوہ تھا بہت اُس کی سفّاکی کا
وہ وقت بھی آیا کہ سبھی مان گئے
کچھ توڑ نہ تھا اُس کی درّاکی کا
(کلیم الدین احمد)

نام اپنا کبھی کہیں اُچھالا ہی نہیں
ڈَول اپنا کسی حال میں ڈالا ہی نہیں
ہم کیوں نہ کہیں اُن کو ادب کا صوفی
شہرت کے جھمیلے کو پالا ہی نہیں
(شہاب الدین ثاقب)

حافظؔ کے خیاباں میں چلے آئے ہیں
سعدیؔ کے گلستاں میں چلے آئے ہیں
عبّاس کے گھر جاؤ تو لگتا ہے یہی
ہم ہند سے ایراں میں چلے آئے ہیں
(سید حسن عبّاس)

ظفر کمالی کے اس مجموعۂ رباعیات میں ان کے دو برادرانِ نسبتی کی وفات کے سلسلے سے ۱۸ رباعیات شامل ہیں۔ ان رباعیوں کو شخصی مرثیہ گوئی کے خانے میں رکھنا چاہیے۔ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی وفات پر پورے سو اشعار کا مرثیہ کہا تھا۔ موت ایک حقیقت ہے لیکن ہر آدمی کا تاثّر ذاتی ہوتا ہے۔ ہر بڑا لکھنے والا ذاتی احساسِ غم میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ غم دوسروں کو بھی اپنا لگنے لگتا ہے۔ جاں نثار اختر نے جب اپنی بیوی کی موت پر ''خاکِ دل'' اور ''خاموش آواز'' جیسی نظمیں کہیں تو یہ محسوس ہوا کہ نئے عہد میں بھی مرثیہ گوئی ممکن ہے اور اس کی کوئی بھی ہیئت ہوسکتی ہے۔ ظفر کمالی نے تو واقعی یہ کارنامہ انجام دیا کہ مرثیہ گوئی کے لیے رباعی جیسی صنف کا انتخاب کیا۔ دونوں اشخاص کے لیے الگ الگ رباعیاں ہیں۔ ایک ایک رباعی پڑھتے ہوئے زینہ بہ زینہ زندگی کی اصل حقیقت کا ذاتی عرفان ہوتا جاتا ہے۔ مرثیہ گوئی کے لیے رقّت آمیزی اور فنا پذیری کا جو عرفان چاہیے، وہ ظفر کمالی کے یہاں بھرپور طریقے سے موجود ہے ورنہ اُن سے ایسی رباعیات کہی ہی نہیں جاسکتی تھیں:

اب کس کو کہیں زیست کا حاصل مت پوچھ
بے سمت مسافر کی منزل مت پوچھ
کیا تجھ کو بتائیں وہ ہمارا کیا تھا
دفنا کے کسے آئے ہیں، اے دل مت پوچھ

■

ہر دکھ سے مصیبت سے بچا کر رکھنا
اے قبر کلیجے سے لگا کر رکھنا

ہم اپنے چہیتے کو تجھے سونپتے ہیں
بانہوں میں اسے اپنی چھپا کر رکھنا

■

ملنے کو ہم آئے ہیں، نہ جاؤ ایسے
کیا بات ہے، منہ کو نہ پھراؤ ایسے
ناراض اگر ہو تو ہمیں کردو معاف
چہرے کو کفن میں نہ چھپاؤ ایسے

■

اپنے تو سبھی موتی ہیرے ڈوبے
اس دل کے تھے جتنے بھی ذخیرے ڈوبے
طوفان سمندر میں اٹھا ایسا
اشکوں میں ان آنکھوں کے جزیرے ڈوبے

ظفر کمالی کی تمام منظومات مع رباعیات کے دونوں مجموعے پیشِ نظر ہوں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کے بیچ کے بڑے چھوٹے اجارہ دار انھیں سب سے زیادہ ناپسند ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنا ایک ادبی مقصد بنالیا ہے کہ علم کے نام پہ جہل پھیلانے والے اور دوسروں کے کلام کے بل بوتے پر شاعر کی طرح سرِ بزم اِترانے والے متشاعروں کی خوب خوب خبر لی جائے۔ نقّادوں اور بڑے بڑے لکھنے والوں کے ادبی گھوٹالوں پر بھی ظفر کمالی بپھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی ایسی رباعیوں میں ادب کے صالح اور سنجیدہ کام کو کھیل تماشا بنادینے والوں پر بار بار ضرب پڑتی ہے۔

ظفر کمالی احمد جمال پاشا کے شاگردِ رشید ہیں۔ ایک زمانے میں احمد جمال پاشا کے دو مضامین بڑے مشہور ہوئے تھے: ''ادب میں مارشل لا'' اور ''ادب میں بانس کی اہمیت''۔ یہ مضامین ادبی معاشرے کا مرثیہ ہیں لیکن لکھنے والے نے ظریفانہ پردے میں کھڑے ہو کر ہمیں ایک سوچی سمجھی گمراہی میں مبتلا کر دیا۔ ظفر کمالی نے صدفی صد حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ آج سے چالیس برس پہلے پاشا نے جب یہ مضامین لکھے تھے، اس وقت ادیبوں اور شاعروں میں باضمیر اور علم پرور افراد کی ایک صف بہر طور بچی ہوئی تھی۔ کچھ نقّاد بھی تھے جو اَبتری پھیلانے والوں کو روکتے اور ٹوکتے تھے۔ آج ابتری پھیلانے والی طاقتیں ادبی معاشرے کے میمنہ اور میسرہ دونوں کو توڑ چکی ہیں اور ادب کی اصل بنیادوں پر بالکل صدر سے حملہ کر رہی ہیں۔ ہلاکو اور چنگیز خاں یا پھر نادر شاہ نے جس طرح آبادیوں کو نیست و نابود کرنے کا کام کیا تھا؛ آج پورے ملک میں ادبی اجارہ دار معصوم تخلیق کاروں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں۔ حضورِ اقدس صلعم نے آنے والے وقت کے بُرے ماحول کے بارے میں ایک بار گفتگو کرتے ہوئے قیامت سے پہلے کی ابتری کا نقشہ کھینچا تھا۔ ایک صحابی محترم نے حضور صلعم سے یہ سوال کیا کہ اگر ہم میں سے کوئی اس عہد تک باقی رہ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ حضورؐ نے یہ جواب دیا تھا کہ گوشہ نشینی ہی سب سے مناسب طریقہ ہوگا۔ آج اردو معاشرے میں سچّے لکھنے والے اپنی عزّت و آبرو اور اپنے ادب کی حفاظت میں گوشہ نشینی کے عالَم میں حاشیے تک پہنچ گئے ہیں۔ نمایاں مقامات پر وہ چہرے ہیں جو واقعتاً گھٹنوں کے بل بھی چلنے لائق نہیں۔ ظفر کمالی نے چار درجن سے زیادہ رباعیوں میں ادب کی جمہوریت اور ادب کی آزادی پر خطرے کو محسوس کرتے ہوئے واقعتاً خدا لگتی کہی۔ چند رباعیات ثبوت کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

عظمت کی وہ نخوت ہے، تنے بیٹھے ہیں
لگتا ہے کہ غالب کے جنے بیٹھے ہیں
معلوم نہیں ربع کے معنی جن کو
شاعر وہ رباعی کے بنے بیٹھے ہیں

■

بھاری ہے بھرم، خالی پٹارا ہے تو کیا
گردش میں مقدّر کا ستارا ہے تو کیا
سر میں ہے یہ سودا کہ بڑا شاعر ہے
استاد کے شعروں پہ گزارا ہے تو کیا

■

تنقیدی دربار سجائے رکھنا
مغرب کے افکار سجائے رکھنا
بندھ جائے گی نقّادی کی پگڑی
لفظوں کا بازار سجائے رکھنا

ظفر کمالی کا مزاج احتجاجی ہے۔ لیکن یہ عجب المیہ ہے کہ انھوں نے اظہار کے لیے رباعی اور ظرافت کے شعبوں کا انتخاب کیا۔ یہ دونوں ایسے نازک تن اور چھوئی موئی ذرائع ہیں جن کا زور آوری اور loudness سے کہیں دور کا بھی رشتہ نہیں۔ اعلا رباعی گوئی پند و نصیحت کا پشتارا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بہترین ظرافت فن کے عروج پر پہنچ کر نرم اور ملائم ہو جاتی ہے۔ ظفر کمالی نے اپنی ادبی زندگی میں یہ سب سے بڑا جوکھم اٹھایا کہ اپنے مزاج کی سخت گیری اور انقلابیت سے سرِ مُو گریز نہ کرتے ہوئے رباعی اور

ظرافت دونوں کی حدوں کو توڑ کر ایک نئی صنفی کیفیت پیدا کی ہے جسے ممکن ہے، آنے والا وقت ظفر کمالی کے نام سے یاد رکھے۔ چند نمونے ملاحظہ کریں:

تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار نہ پوچھ
قدروں کے بدلنے کی رفتار نہ پوچھ
ایسا بھی کوئی دل ہے کہ مجروح نہیں
اس عہدِ تغیّر کی یلغار نہ پوچھ

■

دل دوز ہی تحریر لکھی جائے گی
جب خواب کی تعبیر لکھی جائے گی
اب میری تمنّاؤں کے خوں سے شاید
اس ملک کی تقدیر لکھی جائے گی

رباعی گوئی کو تاریخی طور پر فنّی اور علمی نزاکتوں کا حامل مانا جاتا ہے۔ ایک بڑا طبقہ تو صرف روایتِ فن اور عروضی موشگافیوں کے امتحان گاہ کے بہ طور رباعی کو دیکھتا ہے۔ ظفر کمالی کی رباعیات پر گفتگو کرتے ہوئے ان روایتی اور تکنیکی لوازم سے اجتناب کیوں کیا جائے؟ شاعر جس صنف کو اپنی تحویل میں لیتا ہے تو اسی وقت اس صنف کے سابقین کی پابندیاں اور آزادیاں اپنے آپ اس پر فرض ہوجاتی ہیں۔ ظفر کمالی کے اب تک جتنے شعری نمونے اشاعت پذیر ہوئے، وہ سب پابند شاعری کے نمونے ہیں۔ اوزان و بحور سے ظفر کمالی نہ خائف ہیں اور نہ ہی آزاد اور نثری نظم کے دائروں میں پہنچنے کے امیدوار معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں شاعر روایت کے حصاروں میں رہتے ہوئے اپنے خیال کی علاحدہ اور انفرادی دنیا بسا لینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

عروضی اعتبار سے غور کریں تو ظفر کمالی کی قدرتِ کلام کا بہ آسانی اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رباعی کے تمام ۲۴ اوزان اپنی کتاب میں استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رباعی کا کلاسیکی شعور ان کے یہاں ہے اور عروضیوں کے امتحان میں وہ بہ صد خوشی اُترنے اور کامیابی کا سودا پالنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ کسی رباعی گو کے لیے یہ تو لازم نہیں کہ وہ تمام اوزان استعمال میں لائے۔ اکثر مجموعۂ رباعیات میں یہ التزام بھی نہیں رہتا۔ لیکن ظفر کمالی نے اگر تمام اوزان کا استعمال کیا ہے تو یہ بے ارادہ ممکن نہیں۔ شاید یہ وہی تازیانہ ہے جو کبھی میر انیسؔ نے اس شعر کی معرفت اہلِ فن کے روبہ رو پیش کیا تھا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار
خبر کرو مِرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

رباعی گوئی کا ایک کلاسیکی اصول یہ بھی ہے کہ چوتھا مصرع اس انداز میں کہا جائے جس سے پڑھنے والا چونک جائے۔ یہ موضوع، زبان، قافیہ اور مافی الضمیر ہر جہت سے انوکھا ہونا چاہیے۔ بعض فن کار غزل کے مطلع کے بارے میں بھی یہ اصول نافذ کرتے ہیں کہ شاعر اپنی تمام تخلیقی قوتیں اِن پر صَرف کر کے وہ بات پیدا کر دے جس سے غزل سُبک خرامی سے دلوں میں اتر جائے۔ آخر دو غزلہ سہ غزلہ وغیرہ میں الگ سے مطلع شامل کرنا اور قصیدے میں تو باضابطہ مطلع کہہ کے نئے سلسلۂ خیال کو آگے بڑھانے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ شعرائے کرام نے مطلعوں کے زور آور ہونے پر خوب خوب توجّہ کی ہے۔ اسی طرح بعض ماہرین اس بات پر بھی مُصر ہیں کہ جب مقطع کہا جائے تو اس میں شاعر اپنے کلیجے کا خون نکال کر رکھ دے۔ میرؔ اور غالبؔ کے دواوین کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے مطلعے اور مقطعے زیادہ مشہور اور ان کے نمائندہ اشعار میں شمار ہوتے ہیں؛ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان عظیم شعرا نے انھی روایات کو گِرہ میں باندھ لیا تھا اور غزل گوئی کے مرحلے میں انھی دائروں میں کامرانی ڈھونڈنے سے پرہیز کرنا لازم نہ سمجھا۔

ظفر کمالی نے بھی ماہرینِ رباعیات کے اتّباع میں چوتھے مصرعے کا طلسم نہ صرف یہ کہ خود پر لازم کیا بلکہ اپنی مہارتِ فن کے ثبوت کے طور پر اس ہنر کو بھی پیش کیا۔ اپنے فن اور قدرتِ کلام کے تئیں انھیں جو اعتماد حاصل ہے، اسی نے انھیں رباعی کے آخری مصرعے کی تنگ گلی میں مقید ہو کر فن کے کسی انوکھے نمونے کی تلاش کے لیے اُکسایا ہے۔ پڑھنے والوں نے گذشتہ صفحات میں جن رباعیات کو بہ طورِ مثال ملاحظہ کیا ہوگا، وہاں بہت ساری رباعیات میں چوتھے مصرعے کی زور آوری یوں بھی ظاہر ہو چکی ہوگی، اس لیے علاحدہ سے مثالیں پیش کرنے سے گریز مناسب ہے۔

فنّی طور پر ظفر کمالی نے کئی اور بھی تجربے کیے ہیں۔ ایک خاص بات انھوں نے مخصوص ردیفوں کو متعدد رباعیوں میں استعمال کر کے پیدا کی ہے۔ کئی بار ردیف تو وہی ہوتی ہے لیکن اگلی رباعی میں اس کے مفاہیم بالکل بدل جاتے ہیں۔ کئی ردیفوں میں پانچ پانچ رباعیات ترتیب دی گئی ہیں۔ بابا، اینٹھ، زعم، اے دل، کا احساس، سورج جیسی ردیفوں میں ظفر کمالی نے اگر بہترین رباعیات نکال لی ہیں تو یہ ان کا واقعی کارنامہ ہے۔ ان سلسلے وار رباعیوں میں کچھ بات پیدا کر لینا اور دہراو کی کیفیت سے گریزاں ہو کر کامران نکل جانا ظفر کمالی کی شاعرانہ قدرت ہے۔

ظفر کمالی کی ایک حیثیت خالص نثر نگار کی ہے، اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کو سادگی کے دائرے میں رکھتے ہوئے اس میں پُرکاری کے بیج ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ لفظوں کی چمک دَمک پیدا کرنا اور اس کے تو تے

مینا اُڑانے کا سودا پالنا ظفر کمالی کے خمیر میں نہیں ہے۔ وہ نہایت سادہ انداز میں شعر کہتے ہیں اور اُسی سادگی میں ایسی کوئی بات پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بات دل کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں چمکتے ہوئے مصرعے اور بارُعب تراکیب اور استعارے آسانی سے نہیں تلاش کیے جا سکتے۔ ظفر کمالی فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں لیکن اپنے اشعار میں فارسیت کا زور ڈالنے کی کوئی مہم نہیں چھیڑتے۔ رباعی کے اوزان کی پابندیوں سے یوں بھی اضافتوں اور تراکیب در تراکیب کی گنجائش کم تھی لیکن کچھ تراکیب، شعری پیکر، تشبیہ اور استعارے ضرور ان رباعیات میں ایسی مستعمل ہیں جنھیں ذرا غور سے ملاحظہ کرنا پڑے گا، اس کے بعد ہی یہ عقدہ کھُلے گا کہ کیسے سادگی اور غیر فارسیت میں بھی کچھ تراکیب اور پیکر سامنے آسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: گناہوں کی دیوار، احساس کی جاگیر، تاروں کا فلک پہ جال بُننے والے، فن کی آگ، ساغر کی آگ، سمندر ٹوٹے (سمندر کا ٹوٹنا)، گل زارِ ستم گار، پُرسوز نظاروں کے بھنور، سفّاک اشاروں کے بھنور، شراروں کا بھنور، احسان کے مرہم، بہری دھند، تم عشق کی سرکار کے نو کر ٹھہرے، دھوکے کی دیوار، سورج کی کشتی، کرنوں کی پتوار، اخلاق کے دریا کی روانی، غفلت کا سمندر، خوف کی دیواریں، تنہائی کی بزم وغیرہ۔ یہ تراکیب زبان کا خوف، رعب اور آنکھوں کو چوندھیا دینے والی روشنی نہیں ہیں۔ یہاں شاعر ہندوی آدابِ زبان کا زیادہ رَسیا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تمام تراکیب غور وفکر کرنے والے ذہن کی عکّاس ہیں۔ ہر ترکیب معنیٰ کی ایک انوکھی دنیا تک قاری کو پہنچانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ کسی بھی زبان میں تراکیب معنوی وسعت کا ہی اہم پیغام بر ہوتی ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں ان سے یہی کام لیا۔

یہ مجموعۂ رباعیات ظفر کمالی کا بہ حیثیتِ شاعر ایک مستقل پڑاو ہے۔ انھیں صرف محقّق یا ظرافت نگار سمجھ کر چھوڑ دینا اب کسی سنجیدہ قاری کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ ہم عصر رباعی گویوں کے درمیان بہت خاموشی سے لیکن مکمل استادانہ رکھ رکھاو کے ساتھ باوقار انداز میں جلوہ افروز ہیں۔ اُن کے ذہن اور فکر، ادبی مزاج، علمی گہرائی اور طبیعت کے ٹھہراو کے نہایت خوش آئند نتائج برآمد ہوں گے۔ رباعی کی عارفانہ، عالمانہ، کاملانہ اور ظریفانہ چوٹیاں تو انھوں نے سَر کرلیں، آنے والے وقت میں وہ کون سا شعری مدار ڈھونڈتے ہیں جس کے دائرے میں رہ کر وہ بالکل نئے شاعر کے طور پر ہمارے سامنے آئیں گے؟ گل کا مورّخ اور نقّاد ظفر کمالی سے اس کا موزوں جواب چاہتا ہے۔

☆☆☆

رباعیات

طہور منصوری نگاہؔ
(ریوا، مدھیہ پردیش)

بس پاؤں کے نیچے کی زمین ہے میں ہوں
تاحد نظر کوئی نہیں ہے میں ہوں
آواز نہ آہٹ نہ اجالا پھر بھی
اتنا تو بہرحال یقیں ہے، میں ہوں

■

فرصت میں کبھی حال ہمارا سوچو
سوچا ہو جو پہلے تو دوبارا سوچو
جاتی ہے کہاں دھوپ میں اڑ کر شبنم
گرتا ہے کہاں ٹوٹ کے تارا سوچو

■

وہ مجھ پہ تری نیم نگاہی توبہ
وہ زلف وہ کاجل کی سیاہی توبہ
ہونٹوں پہ تبسم کی گلابی لہریں
دل پر وہ نشہ ہے کہ الٰہی توبہ

■

کچھ اپنے مقدر کی سیاہی بھی ہے
شاید یہی منظور الٰہی بھی ہے
دل یوں ہی تباہی پہ نہیں ہے مائل
آنکھوں کی تری پشت پناہی بھی ہے

■

کشتی بھی اس کی تھی اسی کی پتوار
یہ دل کہ جو کہتا تھا لگا دے گا پار
دریا کا یہ کارندہ یہ گھر کا بھیدی
لے ڈوبا مجھے بیچ بھنور ناہنجار

شاہین رضا زیدی کی رباعیاں

پروفیسر احمد محفوظ
(صدر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

رباعی کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ بہت مشکل صنفِ سخن ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس مشکل کا اصل سبب رباعی کا مخصوص وزن ہے، جس میں مصرعے موزوں کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن شعر گوئی کے بنیادی تقاضوں کو سامنے رکھ کر اگر دیکھا جائے تو یہ خیال پوری طرح درست نہیں ٹھہرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رباعی کہنا منجملہ دیگر اصناف کے نسبتاً مشکل ہے، لیکن یہ مشکل محض رباعی کے مخصوص وزن پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ کسی وزن کے مشکل اور آسان ہونے کا معاملہ شاعر کے مزاج کی مناسبت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں مستعمل بہت سے معروف اور غیر معروف اوزان کچھ لوگوں کے لیے بہت آسان معلوم ہوتے ہیں، اور انھیں اوزان میں طبع آزمائی کرنا دوسروں کے لیے مشکل کا سبب بن جاتا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ رباعی کا مشکل ہونا محض اس کے وزن کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس فن کے کچھ اور تقاضے ہیں جن کی مکمل اور کامیاب پابندی لوگوں کے لیے عام طور سے مشکل پیدا کرتی ہے۔ مثلاً رباعی سے متعلق بنیادی شرائط میں ایک شرط یہ ہے کہ کوئی بات پوری رباعی میں اس طرح بیان کی جائے کہ رباعی کا ہر مصرع اس بات کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرے، اور بیجا تکرار بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ دوسری شرط یہ کہ پہلے مصرعے میں جو کچھ کہا جائے وہ اگلے تین مصرعوں کے لیے بنیاد کا کام کرے، یعنی پہلے مصرعے سے بات شروع ہو اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں تک وہ بات آگے بڑھتی رہے۔ تیسری اور شاید سب سے صبر آزما شرط یہ ہے کہ تیسرے مصرعے میں مضمون کا وہ پہلو لایا جائے جس سے بات اپنی انتہا کی طرف رجوع کرے لیکن وہ انتہائی صورت حال چوتھے مصرعے میں کھل کر سامنے آئے، اور ایسا محسوس ہو کہ آخری مصرعے میں جو بات بیان ہوئی ہے، اس کے لیے پہلے تین مصرعوں کی یہی صورت سب سے بامعنی اور مناسب تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی فنِ رباعی کے لیے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہے کہ چوتھا مصرع ایسا غیر معمولی، زوردار اور برجستہ ہونا چاہئے کہ اسے پوری رباعی کا جوہر کہا جا سکے۔

ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رباعی کے مشکل ہونے کی اصل وجہ کیا ہے؟ ظاہر ہے، اس میں محض وزن کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ رباعی کے چوبیس آہنگ وزن کی سطح پر رباعی گو کے لیے کچھ نہ کچھ آسانی ہی پیدا کرتے ہیں، کیوں کہ اس صورت میں اس کے سامنے مصرعوں کو کئی طرح سے موزوں کرنے کی آزادی اور گنجائش رہتی ہے۔

فن رباعی کے تعلق سے اوپر چند بنیادی باتیں اس لیے بیان کی گئیں کہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ زیر نظر مجموعۂ رباعیات جس میں تقریباً پانچ سو رباعیاں شامل ہیں، اس میں شاہین رضا زیدی نے رباعی گوئی کے میدان میں اپنی مہارت فن کا کس طرح مظاہرہ کیا ہے۔ رباعیات کی یہ کثیر تعداد بذات خود اس فن سے شاہین صاحب کی مناسبت طبع کی دلیل ہے، اور اس بات کا واضح ثبوت بھی ہے کہ وہ رباعی گوئی پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔

سید شاہین رضا زیدی شاہین سیتھلی ہمارے زمانے کی ان مغتنم شخصیات میں ہیں جنھیں اردو فارسی زبان وادب اور مختلف علوم وفنون سے شغف کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا فن ورثے میں ملا ہے۔ یہ روایت ان کے خاندان میں زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ ان کے والد حکیم مولوی سید احمد اصغر مرحوم قلم سیتھلی فارسی زبان وادب کی اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے، اور اپنے زمانے کے معروف شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں شاہین صاحب کے برادر خورد پروفیسر عراق رضا زیدی فارسی کے قابل ذکر اسکالر ہیں اور فن عروض وفن تاریخ گوئی کے میدان میں اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہین صاحب کو شعر گوئی کے علاوہ علم عروض اور کچھ دیگر مشرقی علوم مثلاً علم جفر، علم رمل، اور علم نجوم سے بھی گہری مناسبت ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے انھیں اپنے زمانے کی چند مغتنم روزگار شخصیات میں شمار کیا ہے۔

جہاں تک ان رباعیات میں بیان کردہ موضوعات کا تعلق ہے تو یہاں خاصا تنوع دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں بڑی تعداد ان رباعیوں کی ہے جو حمد، نعت اور منقبت میں کہی گئی ہیں، اور ان میں بھی حضرت علیؓ اور اہل بیت کے مناقب سے متعلق رباعیات کی تعداد زیادہ ہے۔ ظاہر ہے، یہ ایسا موضوع ہے

جس پر ہر زمانے میں شعرا نے اپنی عقیدت اور محبت کو شعری پیرائے میں بیان کیا ہے، اور ان عظیم ہستیوں کی غیر معمولی صفات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میدان میں بسا اوقات یہی دیکھا گیا ہے کہ عقیدت و محبت کے منظوم اظہار کو ہی شعرا اصل شاعری سمجھ کر فنی تقاضوں کی پابندی پر زیادہ توجہ صرف کرنے سے گریزاں رہے ہیں۔ خیال رہے کہ یہ صورت حال ہمارے زمانے کے شعرا کے یہاں کچھ زیادہ واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس شاہین زیدی کی رباعیات ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ اس مجموعے میں مذہبی موضوع پر بھی فنی تقاضوں سے بھرپور رباعیوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ حمدیہ رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

اللہ! ''ھو اللہ احد'' تو ہی ہے
اللہ! بس اللہ صمد تو ہی ہے
تو ہی ہے ''لم یلد ولم یولد'' تو
مشکل میں جو کرتا ہے مدد تو ہی ہے

یہاں سورۂ اخلاص کی آیات کو جس خوبی کے ساتھ رباعی میں ضم کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے۔ مزید یہ کہ ردیف ''تو ہی ہے'' میں 'ہی' کا صرف خدا کی وحدانیت کو ظاہر کرنے کے لیے انتہائی مناسب ہے۔

اللہ مرا تو ہے میں بندہ تیرا
ہر لمحے مرے سر پہ ہے سایہ تیرا
جو کچھ ہوں فقط تیرے کرم ہی سے ہوں
دیتا ہے بلندی مجھے سجدہ تیرا

یہاں چوتھے مصرعے میں سجدے کا بلندی عطا کرنا اس لیے فنی لحاظ سے بہت خوب ہے کہ سجدے کا تعلق جھکنے سے یعنی پستی سے ہے، اور یہی پستی بلندی بخشنے والی ہے۔ منقبت علی مرتضیٰؓ میں کچھ رباعیاں دیکھیے:

بہلول صفت آتش آبی ہوں میں
بادی ہوں غدیر کا شرابی ہوں میں
جب قبر کی مٹی یہ کہے گی تو کون
کہہ دوں گا اکڑ کے بو ترابی ہوں میں

اس رباعی میں فنی کاریگری کے اتنے پہلو رکھے گئے ہیں کہ ان کا مفصل بیان کیا جائے تو طوالت کا سبب ہوگا۔ البتہ سامنے کی چند باتوں کی طرف توجہ دلانا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ پوری رباعی میں عناصر اربعہ یعنی آتش، آب، باد و خاک کا نام التزام کے ساتھ لایا گیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ سارے الفاظ ایک دوسرے کی مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعے کا ربط اور مناسبت ایسی غیر معمولی ہے کہ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ قبر کی مٹی کا پوچھنا کہ تو کون ہے؟ تو اس کے جواب میں خود کو بوترابی کہنا بلاغت کی انتہا ہے۔ خیال رہے کہ ابوتراب حضرت علیؓ کا لقب ہے، اور تراب کے معنی مٹی کے ہیں۔ مزید یہ کہ خود کو بوترابی کہنے میں بھی معنی کے دو پہلو ہیں؛ ایک تو یہ کہ میری نسبت مولا علیؓ سے ہے، اور دوسرے یہ کہ میں بھی مٹی والا ہوں یعنی خاک سے بنا ہوں۔ مضمون کو الگ کر کے دیکھیے تو بھی یہ رباعی فن کا نگارخانہ معلوم ہوتی ہے۔

اک بستر ہجرت پہ وصی کا سونا
اک زانوے حیدر پہ نبی کا سونا
یہ رجعت خورشید وہ خالق کی رضا
سونے پہ سہاگا ہے علی کا سونا

اس رباعی کا چوتھا مصرع خود اعلان کر رہا ہے کہ الفاظ کا غیر معمولی تخلیقی استعمال اسی کو کہتے ہیں۔ ''سونے پہ سہاگا'' کا محاورہ جس برجستگی کے ساتھ لایا گیا ہے، اور 'سونے' میں جو رعایت رکھی گئی ہے وہ داد سے مستغنی ہے۔ زبان پر حاکمانہ قدرت اور مہارت بیان کے بغیر ایسی رباعی کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ علمدار حسینؑ حضرت عباسؓ کی شان میں یہ رباعی ملاحظہ کیجیے:

عباس کا جب ذکر مدام آتا ہے
معصوم فرشتوں کا سلام آتا ہے
شدت میں بھی 'ب' دیتی ہے کچھ اتنا مٹھاس
لب چومتا ہے لب کو جو نام آتا ہے

یہاں طباعی کے ساتھ صناعی کو بروے کار لایا گیا ہے۔ چونکہ حرف 'ب' کی آواز بولنے میں اس طرح ادا ہوتی ہے کہ دونوں ہونٹ آپس میں مل جاتے ہیں، اس لیے ''عباس'' کا نام لینے میں لبوں کے ملنے کو شاعر نے ازروے استعارہ فرض کیا ہے کہ ایک لب دوسرے لب کو چوم رہا ہے۔ پھر بوسہ لینے کے اس عمل کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ حرف 'ب' کی آواز میں غضب کی حلاوت ہے۔ یعنی چومنے کا جواز حسن تعلیل سے قائم کیا گیا ہے۔

جہاں تک رباعی کے موضوعات کا تعلق ہے تو فارسی اور اردو میں کئی سو سال کی روایت کے پیش نظر ہم یہی دیکھتے ہیں کہ عام طور سے پند و نصائح،

اخلاق وتصوف، حکمت وفلسفہ وغیرہ کے علاوہ عشقیہ اور بہاریہ موضوعات پر اکثر رباعیاں کہی گئی ہیں۔ پیش نظر مجموعے میں جیسا کہ اوپر آپ نے دیکھا، خاصی بڑی تعداد ان رباعیوں کی ہے جن میں حمد ونعت ومنقبت کے ساتھ ساتھ شہدائے کربلا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان رباعیات میں شاعر کے جذبہ واحساس کی کیفیت ایسے پیرائے میں سامنے آتی ہے جس سے گہری عقیدت مندی اور محبت کی شدت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ تقریباً ہر رباعی میں یہ کیفیت فنی پیرایۂ بیان سے ہم رشتہ ہے۔ یہاں ''بہاریہ رباعیات'' کے زیر عنوان بھی شاہین صاحب نے اس فن کے قابل ذکر نمونے پیش کیے ہیں، اور اس موضوع پر خاصی کامیاب رباعیاں کہی ہیں۔ چونکہ وہ اردو فارسی کی کلاسیکی شعری روایت کا گہرا شعور رکھتے ہیں، اس لیے یہاں بھی رباعیوں میں وہ پہلوؤں بڑی خوبی کے ساتھ منعکس ہوئے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھئے:

قاتل ترے رخسار کا ہے تل قاتل
یا مخمل احمر پہ ہے اک کالا تل
صد حیف ہوئے جاتے ہیں دل کے ٹکڑے
نیزے کی انی بن گیا قاتل کا تل

آپ ملاحظہ کریں کہ معشوق کے خال رخسار کا مضمون جسے شعرا مدتوں سے باندھتے آئے ہیں، اور اس میں نہ جانے کیا کیا پہلو پیدا کیے ہیں، اسی مضمون کو درج بالا رباعی میں کس خوبی اور تازگی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ پہلے مصرعے میں قاتل اور تل کے الفاظ کو نہایت فنکاری کے ساتھ لایا گیا ہے، اور دوسرے مصرعے میں کالا تل کہہ کر رخسار کو مخمل احمر کہنا قابل داد ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ مصرع چہارم میں تل کو نیزے کی انی سے تشبیہ دینا کس قدر مناسب ہے۔ اسی مصرعے میں ایک فنکارانہ شوخی یہ بھی رکھی گئی ہے کہ مصرعے کے آخری الفاظ ''قاتل کا تل'' پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسے ''قاتل قاتل'' پڑھا جا رہا ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ التباس پوری رباعی کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔ یہ مثالیں بھی دیکھئے:

روٹھے ہوئے سرکار نظر آتے ہیں
نافہم سمجھدار نظر آتے ہیں
عشاق سے کہہ دو کہ سنبھالیں کشتی
طوفان کے آثار نظر آتے ہیں

■

آسان نہیں اپنی کہانی لکھنا
سچ کہتے ہوئے عہد جوانی لکھنا
قرطاس پہ خامے کی زباں یوں سمجھو
جس طرح سے پانی پہ ہو پانی لکھنا

اس رباعی کا چوتھا واقعی مصرع لاجواب ہے۔ پانی پر پانی لکھنے کا پیکر نہایت تازہ اور معنی خیز ہے۔ رباعی کے اس مضمون کو اکبرالہٰ آبادی نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ ایک شعر میں خوب بیان کیا ہے:

لکھو لائف مری ایام جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمھیں افتد ودانی کے سوا

خیال رہے کہ اکبر کے اس شعر میں ''افتد ودانی'' کا نہایت بلیغ فقرہ ''گلستاں'' کے باب پنجم کی ایک حکایت سے ماخوذ ہے۔

کچھ یاد نہیں مجھ کو محبت کے سوا
اب کچھ نہیں دل میں تری الفت کے سوا
جب جھانک کے آئینۂ دل میں دیکھا
آیا نہ نظر کچھ تری صورت کے سوا

■

فرقت میں تری تار بدن ہے یا بس
بے نور مرے حال پہ خود ہے نرگس
دل ہے کہ سرشام سے بجھ جاتا ہے
لو زیست کی ہے مثل چراغ مفلس

یہاں بہاریہ رباعیات کا عام رنگ معشوق کے حسن سراپا کے بیان کا مرہون منت ہے۔ کہیں کہیں شاعر کے ذاتی محسوسات وجذبات کا عکس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن ایسی زیادہ تر رباعیوں میں معشوق کے جسمانی حسن ودلکشی کی پراثر تصویر کشی کی گئی ہے۔

زیر نظر مجموعے کے آخر میں بہت سی ایسی رباعیات بھی شامل ہیں جنھیں ''سیاسی/سماجی'' کے زیر عنوان رکھا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہین زیدی کی شعر گوئی کے دائرے میں روایتی موضوعات کے شانہ بہ شانہ وہ باتیں بھی اپنی جگہ رکھتی ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کے مسائل ومصائب

سے ہے۔اس موضوع پر شاہین صاحب کے خیالات ہمارے فکر واحساس کو شدت سے متاثر کرتے ہیں،اور ہمیں دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔

تاریخ کے اوراق دکھائیں کس کو
اسلاف کے اسباق دکھائیں کس کو
آثار قدیمہ ہے محل ہم اس کے
محراب نما طاق دکھائیں کس کو

■

فتنوں میں گرفتار ہے ساری دنیا
اے دوست ہماری کہ تمھاری دنیا
آنکھوں کو نہیں دل کو بھی دیتی ہے فریب
یہ ہے نہ تمھاری نہ ہماری دنیا

■

احباب کو اب میری ضرورت نہ رہی
اب خون کے رشتوں میں حرارت نہ رہی
احباب کو جس شے کی طلب تھی شاہین
افسوس مرے پاس وہ دولت نہ رہی

■

کچھ بھی نہ مرا بگاڑ پائی دنیا
سو بار نئے رنگ میں آئی دنیا
اب اس پہ یقیں آ نہیں سکتا شاہین
دکھلائے ہزار پارسائی دنیا

موجودہ معاشرتی صورت حال کے بارے میں یہ رباعیاں شاعر کے ردعمل کا اظہار بھی ہیں،اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کا وسیلہ بھی کہ خواہ حالات کچھ بھی ہوں،حق وانصاف کی پاسداری ہمارے لیے فرض اولین ہے۔

ہمارے زمانے میں رباعی گوئی کا رجحان ایک حد وسیع ضرور ہوا ہے، اور رباعی کے کچھ مجموعے بھی منظر عام پر آئے ہیں،لیکن کم وبیش پانچ سو رباعیات کا یہ مجموعہ بلا شبہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس فن میں شاعرانہ مہارت اور خوش گوئی کے مظاہرے کی راہیں اب بھی کھلی ہوئی ہیں۔شاہین رضا زیدی جیسے اہل فن اور رباعی گو یقیناً نئی نسل کے لیے سرچشمۂ فیض کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

رباعیات

ذکی طارق،غازی آباد

آفتابِ عجب وسعتِ طوفانی میں
عالم تھا ترے کبر کی نگرانی میں
یوں ہی تو نہیں اجڑی دلوں کی بستی
نفرت نے ڈبویا ہمیں نادانی میں

■

الفاظ میں روشن کوئی قصّہ ہو جائے
دنیا سے سبھی دور اندھیرا ہو جائے
یہ عالمِ ظلمات کبھی مجھ کو سنے
تقریر کروں میں تو اجالا ہو جائے

■

ہر خواب کی تعبیر دکھا دے مجھ کو
آئینۂ تقدیر دکھا دے مجھ کو
جس شب نے کیا تھا مِے خوابوں کو تباہ
اس رات کی تصویر دکھا دے مجھ کو

■

بدتر ہوں جو تو چاہے بہتر بن جاؤں
قطرہ ہوں کرم ہو تو سمندر بن جاؤں
موقوف ہے سب تیری جہاں سازی پر
چھولے تو مجھے سنگ سے گوہر بن جاؤں

■

بے ابر ہی پلکوں پہ ہے ساون کی جھڑی
یہ اشک مسلسل ہیں کہ شعلوں کی لڑی
دیوانگیٔ عشق پہ بھاری ہے یہ شب
تقدیر کی زنجیر ہے پیروں میں پڑی

رباعیات خیام کا اجمالی جائزہ

محمد ظفر جلالپوری
(نیو کالونی، بانس منڈی، ایودھیا، یوپی)

حکیم عمر خیام (1136-1050) کا مولد نیشاپور ہے اور وہیں ان کا مدفن بھی ہے۔ وہ عہد سلاجقہ کے ایک زبردست فلسفی، ریاضی داں، منجم اور شاعر تھے۔ نظام الملک طوسی اپنی تصنیف موسوم بہ 'وصیت' میں (جو انہوں نے مستقبل کے سیاسی مدبرین کیلئے بطور یادداشت لکھی ہے) رقم طراز ہیں کہ جب میں نیشاپور میں امام موفق کے حلقہ درس میں داخل ہوا تو میرے ہم عمر دو اور طلبہ وہاں پہلے ہی سے درس لے رہے تھے۔ ایک تو عمر خیام تھے اور دوسرے حسن بن صباح۔ ان دونوں کی ذہانت وفطانت کو دیکھ کر میں نے ان سے دوستی کر لی۔ نیز ہم لوگوں کے مابین ایک قرار طے پایا کہ ہم میں سے جو بھی شخص بعد میں ثروت مند ہو جائے گا یا کوئی بڑا عہدہ حاصل کر لے گا، وہ باقی دونوں کو بھی اس میں شراکت دار بنائے گا۔ جب ہم نے اپنا درس مکمل کر لیا، تو پھر اپنے جُدا جُدا راستوں پر چلے گئے۔ وقت گزرتا رہا اور میں خراسان سے ٹرانس اوکسیانا آ گیا۔ بعد ازاں میں نے غزنی اور کابل کا بھی سفر کیا۔ اور جب میں واپس آیا تو سلطان الپ ارسلان نے مجھے اپنی سلطنت میں وزیر کے عہدے پر فائز کیا۔ ماہ وسال گزرتے گئے اور جب میرے ہم درس دوستوں کو پتا چلا کہ میں سلطنت میں وزیر بن گیا ہوں، تو وہ میرے پاس آئے اور اپنے موعودہ حصے کا تقاضا کیا۔

حسن بن صباح نے حکومت کے تحت ایک خاص عہدہ کی تمنا ظاہر کی جو انہیں میری سفارش پر سلطان کے ذریعہ عطا کیا گیا، لیکن جب خیام سے ان کی خواہش کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کے سایہ عاطفت میں ایک گوشہ مل جائے تو بہتر رہے گا تاکہ میں بیٹھ کر سائنس کے فوائد کو پوری دنیا تک پہنچا سکوں اور آپ کے لئے طویل عمر اور خوشحالی کی دعا کرتا رہوں۔ خیام کی اس درخواست پر میں نے نیشاپور کے خزانہ سے ان کے لئے 1200 مثقال زر کی پنشن باندھ دی۔ اس طرح فکر معاش سے آزاد ہو کر خیام مختلف علوم وفنون کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اپنی خداداد ذہانت اور بے پناہ صلاحیت کو بروئے کار لا کر دنیا والوں کے لئے علم وادب کا ایسا خزانہ جمع کر دیا، جس کی اہمیت وافادیت رہتی دنیا تک کم نہیں ہوگی۔

رباعیات خیام: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ خیام ایک فلسفی سائنس داں، ریاضی داں، منجم اور ساتھ ہی ایک شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کی شاعری کا کل سرمایہ ان کی رباعیات میں جو ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے رنگ میں یکتا اور اہل دل واہل خرد دونوں ہی کیلئے حرز جاں کی طرح عزیز ہیں۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی کتاب ''چہار مقالہ'' میں خیام کا ذکر ایک منجم کے طور پر کیا ہے۔ لیکن شہرزوری نے اپنے تذکرے میں خیام کے عربی کے چند اشعار درج کئے ہیں اور ساتھ ہی فارسی کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔ قفطی نے بھی اپنی تالیف تاریخ الحکماء میں خیام کے چند عربی اشعار نقل کئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام جب فلسفہ، ریاضی اور سائنس کے میدان میں اپنی مصروفیات سے فراغت پاتے، تو تفنن طبع کے طور پر رباعیات کہہ لیا کرتے تھے۔ خیام وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی رباعیات میں فلسفہ اور حکمت کے رموز بیان کئے۔ ان کی رباعیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور وہی ان کی شہرت ودوام کا باعث ہوئیں۔ ان کی رباعیات کا بیشتر حصہ فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات پر مشتمل ہے۔

خیام کی رباعیات کا کوئی قدیم نسخہ تو دستیاب نہیں ہو سکا لیکن ان کی رباعیات کے جو نسخے اس وقت یورپ اور ایشیا میں موجود ہیں ان کے مطابق ان کی رباعیوں کی تعداد 100 سے 1000 تک پہنچتی ہے۔ حالانکہ ان کی رباعیات کی مقبولیت ان کے ملک ایران ہی میں نہیں بلکہ پورے مشرق میں ہے۔ تاہم ان سے جس قدر شغف مغرب والوں نے دکھایا اور انہیں جس قدر لائق اعتنا سمجھا وہ مشرق والوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مستشرقین نے بڑی محنت، عرق ریزی، جاں کاہی اور دماغ سوزی سے ان کی رباعیوں کا ترجمہ اپنی اپنی زبانوں میں کیا۔ اور ان سے پوری دنیا کو روشناس کرایا۔ نتیجتاً یورپ اور امریکہ میں ان کے بے شمار مداح پیدا ہو گئے۔ خیام کی ان کی رباعیوں کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور ڈچ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی تفہیم وتحسین کے باب میں جس نے سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے وہ ایڈورڈ فٹز جرالڈ ہیں۔ انہوں نے خیام کی رباعیوں میں ''رباعیات آف عمر خیام'' کے نام سے کیا ہے جو 1859 میں شائع ہوئی۔ شروع شروع میں تو یہ کتاب لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کرپانے میں ناکام رہی لیکن بعد ازاں روسیٹی،

سوئن برن، ہرن جونس، ولیم مورس اور رسکن وغیرہ نے اس کی قدر و قیمت کو پہچانا ۔ چارلس ایلیٹ نارٹن نے اس کو امریکہ سے متعارف کرایا ۔ اس کتاب کے نئے نئے ایڈیشن منظر عام پر آئے اور انیسویں صدی کے آخر تک تو یہ کتاب جنون کی حد تک پسند کی جانے لگی اور اس طرح پورے عالم میں خیام کا سکہ جم گیا۔

خیام نے اپنے رباعیوں میں روایتی انداز کی شاعری نہیں کی بلکہ اشعار کی سلک میں انہوں نے اپنے اعتقادات، تجربات اور تاثرات کے گوہر پروئے ہیں ۔ رباعیات کی زبان تو بہت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے لیکن ان کے مضامین نہایت بلند اور بلیغ ہیں ۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات ایران'' میں رقم طراز ہیں کہ ''خیام کی رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم، عبارت کے لحاظ سے سادہ، لیکن معنی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ اور قابل توجہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے نہایت لطیف اور حکیمانہ خیالات کو دو بیتی کے سانچے میں ڈھال کر انہیں موثر ترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ''خیام جب اپنے علمی مطالعات میں مصروف ہوتے ہیں اور حیات و کائنات کے مقصد پر غور و فکر کرتے ہیں، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات نہایت پراسرار ہے اور انسان اپنی محدود عقل سے اس کا ادراک نہیں کرسکتا۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے؟ ان سوالات کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

انسان اس دنیا میں آیا ہے ۔ اپنی مدت پوری کرتا ہے اور پھر عدم کو سدھار جاتا ہے ۔ یہ جان پانا ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہے کہ یہ آنے جانے کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کب تک جاری رہے گا۔ نیز یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کیا ہے؟

ز اوردن من نبود گردوں راسود
وز بردن من جاہ جلالش نفزود
وز ہیچ کسے نیز دوگوشم نشود
برکیں اور دن ویردن من از بہرچہ بود

(ترجمہ: انسان مجھے اس دنیا میں لایا، لیکن اس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسی طرح آسمان مجھے اس دنیا سے لے گیا، لیکن اس سے اس کے جاہ و جلال میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ نیز میرے ان دونوں کانوں نے کسی سے نہیں سنا کہ یہ لانا اور لے جانے کس واسطے تھا)۔

بے ثباتی دنیا کا خیال خیام کے ذہن میں بڑی گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔ انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، اپنی ہمت و صلاحیت کے مطابق مختلف طرح کے کارنامے انجام دیتا ہے اور پھر لازمی طور پر اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے، اپنے اس دنیا کے دوران قیام عظیم فلسفیوں، سائنس دانوں، علما و حکما نیز شعرا و ادبا نے اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار کر اس جہان آب و گل کو حسن و دلکشی عطا کی۔ اہل جہاں کی زندگیوں کو آسان اور بہتر بنایا، یہاں تک کہ اس دنیا کا قلب ماہیت ہوگیا۔ ہماری آج کی دنیا دس ہزار سال پہلے کی دنیا سے یکسر مختلف ہے۔ ہم آج مہذب اور متمدن قوم کہلاتے ہیں۔ اس کا سہرا انسانی فطرت میں پنہاں اس جذبے کے سر جاتا ہے جو اپنے آس پاس کی دنیا کو ہر لحہ خوب سے خوب تر دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس طرح محدود معنوں میں انسان خالق کا بھی درجہ رکھتا ہے، جو موجود اشیا میں تصرف کر کے نت نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے اور بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہونے کے باوجود بھی اسے دوام نہیں حاصل ہے۔ اس کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ دنیا کیلئے ختم ہوجاتا ہے اور دنیا اس کیلئے اور ساتھ ہی اس کے کارنامے بھی اس کے لئے برباد ہوجاتے ہیں ۔ خیام کی ذیل کی رباعیاں ان کے اسی خیال کی غماز ہیں

آن قصر کہ جمشید دروجام گرفت
آہو بچہ کردشیر بہ آرام گرفت
بہرام کہ گورگر فتے ہمہ عمر
دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

ترجمہ: (جس محل میں جمشید ہمیشہ شراب پیتا تھا اس میں ہرن بچہ دینے لگے اور شیروں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ تم نے دیکھا کہ بہرام جو پوری زندگی گور (ایک جانور) کا شکار کرتا رہا، آخر میں کیسے گور (قبر) کا شکار بن گیا)۔

خیام کہ خیمہ ہائے حکمت می دوخت
درکوزہ غم فتادوناگاہ بسوخت
مقراض قضا طناب عمرش ببرید
دلال قضا برائگانش بفروخت

ترجمہ: (خیام جو کہ حکمت کا خیمہ سیتا تھا، غم کے کوزے میں گرا اور اس میں جل گیا۔ موت کی قینچی نے اس کی زندگی کی رسی کاٹ دی۔ اور دلال

قضا نے اس کو مفت بیچ دیا)۔

مسئلہ جبر واختیار زمانہ قدیم ہی سے علما وفلاسفہ کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسان کے سبھی اعمال اس کے اختیار میں ہیں اور وہ ترکیب وتدبیر کے ذریعہ اپنی زندگی کا راستہ خود متعین کرسکتا ہے۔ جب کہ دوسرے یہ مانتے ہیں کہ اس دنیا میں سبھی انسان مجبور محض ہیں اور ان کے تمام اعمال وافعال پہلے سے قضا وقدر کے ذریعہ مقرر کردہ خطوط پر ہی چلتے ہیں، جن سے سرمو بھی انحراف کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ حکیم خیام بھی جبر کے قائل تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں واقعات وحوادث کے اسیر ہیں۔ نہ ہم اپنے ارادے سے یہاں آئے ہیں اور نہ ہی اپنی مرضی سے یہاں سے جائیں گے۔ ہمارے اعمال، ہمارے ارادے ہماری خواہش سے نہیں ہوتے ہم اس کھلونے کی مانند ہیں جو بازی گر کے ہاتھوں اچھلتا کودتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ حتی کہ گناہ اور ثواب بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔ دست قدرت نے جس وقت ہمیں خلق کیا۔ اسی وقت معلوم تھا کہ ہمارے ہاتھوں سے کون کون سے اعمال سرزد ہوں گے وہ کہتے ہیں۔

از رفتہ قلم ہیچ دگرگوں نشود
وزخوردن غم بجز جگر خوں نشود
گودر ہمہ عمر خویش خوننابہ خوری
یک قطرہ ازاں کہ ہست افزوں نشود

(ترجمہ: قدرت کے قلم نے جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ کبھی بدل نہیں سکتا اور غم کھائے بغیر دل خون نہیں ہوتا تو اگر اپنی ساری عمر بھی خالص خون پئے تو بھی جتنا خون تمہارے جسم کے اندر ہے اس سے ایک قطرہ کا بھی اضافہ نہیں ہوگا)۔

یزداں چوگل وجود مامی آراست
دانست زفعل ماچہ برخواہد خواست
ہے حکمش نیست ہرگناہے کہ مراست
پس سوختن قیامت از بہرچہ خواست

ترجمہ: (خدا نے جب میرے وجود کی مٹی کو آراستہ کیا، تو وہ خوب جانتا تھا کہ مجھ سے دنیا میں کون کون سے فعل سرزد ہوں گے جو بھی گناہ میں کرتا ہوں وہ اس کے حکم سے ہوتا ہے اس لئے بروز قیامت وہ مجھے کیوں سزا دینا چاہتا ہے)۔

خیام نے شراب نوشی کے موضوع پر متعدد رباعیاں لکھی ہیں لیکن ان کی شراب بادۂ انگور نہیں بلکہ بادۂ حقیقت ہے۔ وہ شراب کے جذبۂ روحانی اور معرفت الٰہی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ساغر خیام میں بادۂ حقیقت کا جلوہ ملاحظہ فرمائیے جو لذت اس بادۂ حقیقت میں ہے وہ بادۂ انگور میں کہاں حاصل ہوسکتی ہے۔

قراں کہ مبیں کلام خوانند او را
گہ گاہ نہ بردوام خوانند اورا
درخط پیالہ ایتے روشن ہست
کاندر ہمہ جامدام خوانند اورا

ترجمہ: (قران کو عظیم کتاب کہا گیا ہے لیکن لوگ اسے صرف کبھی کبھی پڑھتے ہیں ہمیشہ نہیں جب کہ جام شراب میں ایسی آیت روشن ہے کہ پینے والے ہر جگہ اور ہر وقت اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں)۔

خیام اسی دنیا میں وہ تمام چیزیں حاصل کر لینے کے حق میں ہیں جن کا وعدہ عقبیٰ کے لئے کیا گیا ہے انہیں اس بات کا محکم یقین ہے کہ معرفت حق سے ایسا ممکن ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنت میں وہ عیش وآرام مہیا ہوگا، جس کا تصور انسان نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ سامان عیش وطرف تب حاصل ہوگا جب انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور یہ انتظار کتنا طویل ہوگا، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا لہذا انسان کو چاہئے کہ عشق حقیقی میں ڈوب کر ان لذائذ کو اسی دنیا میں حاصل کرلے کیوں کہ تھوڑا سا نقد بھی بڑے سے بڑے نسیہ (ادھار) پر قابل ترجیح ہے۔ خیام لکھتے ہیں:

گویند بہشت وحورعین خواہد بود
اں جامئے تاب وانگبیں خواہد بود
گرمامے ومعشوق گزیدیم چہ باک
چوں عاقبت کار ہمیں خواہد بود

ترجمہ: (کہتے ہیں کہ جنت میں خوبصورت حوریں ملیں گی، اور وہاں شراب اور شہد ملے گی اگر ہم نے شراب اور معشوق کو اسی دنیا میں قبول کرلیا ہے تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ کیوں کہ عاقبت کار ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں)۔

رباعیات خیام کی فنی خوبیاں بھی قابل ذکر ہیں حالانکہ اس طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ خیام کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے، لیکن

اس میں دلکشی بدرجۂ اتم موجود ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو اتنی شیریں اور دلکش زبان کا جامہ کیسے پہنایا۔اپنی زبان کو دلکش اور پرکشش بنانے کیلئے انہوں نے متعدد فنی وسائل سے کام لیا ہے جس سے فلسفہ اور حکمت جیسے موضوعات میں بھی دلکشی اور دل آویزی پیدا ہوگئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان فنی وسائل کا استعمال اظہار قابلیت کے لئے نہیں بلکہ ادائے مطلب کیلئے کیا ہے۔ذیل کی رباعی میں صنعت مبالغہ کا انداز دیکھئے۔

دارم گنہے کہ پشت ایماں شکند
بازار تمام بت پرستان شکند
بار گنہم اگر بہ میزاں سنجند
ترسم کہ بروز حشر میزاں شکند

ترجمہ:(میرے گناہ ایمان کی پشت توڑ سکتے ہیں نیز وہ تمام بت پرستوں کے بازار پر حاوی ہوسکتے ہیں۔میرے گناہوں کے بوجھ کو جس وقت میزان میں تولا جائے تو مجھے خوف ہے کہ بروز حشر کہیں میزان نہ ٹوٹ جائے)۔

صنعت تجنیس کی جلوہ نمائی ذیل کی رباعی میں ملاحظہ فرمائیں۔صنائع کا ایسا خوبصورت اور چابک دستانہ استعمال اساتذہ کی شاعری میں بھی خال خال نظر آتا ہے۔

آن قصر کہ جمشید دروجام گرفت
آہو بچہ کردوشیر بہ آرام گرفت
بہرام کہ گورمی گرفتے ہمہ عمر
دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

ترجمہ:(جس میں جمشید ہمیشہ شراب پیتا تھا اس میں ہرن بچہ دینے لگے اور شیروں نے اس پر قبضہ کرلیا۔تم نے دیکھا کہ بہرام جو پوری زندگی گور(ایک جانور) کا شکار کرتا رہا،آخر میں کیسے گور(قبر) کا شکار بن گیا)۔

یہاں خیام نے ''گور'' لفظ کو دوجگہ الگ الگ معنوں میں استعمال کرکے،نیز بہرام اور گور کو الگ الگ طرح سے ترتیب دے کر رباعی کی دل پذیری میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔

صنعت طباق کا استعمال بیان میں زور پیدا کرانے کے لئے نیز اسے زیادہ پراثر بنانے کے لئے کیا جاتا ہے۔انگریزی،فارسی اور اردو شعرا نے اس صنعت میں طرح طرح کی گلکاریاں کی ہیں۔

خیام کے کلام میں بھی جابجا صنعت طباق کا استعمال ملتا ہے۔وہ اس کو اتنے رواں اور بے ساختہ انداز میں برتتے ہیں کہ کہیں پر تکلف یا تصنع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔مثلاً

گویند کساں کہ بہشت باحورخوش است
من می گویم کہ اب انگور خوش است
ایں نقد بگیر ودست ازاں نسیہ بدار
کآواز دہل شنیدن از دور خوش است

ترجمہ:(لوگ کہتے ہیں کہ حور کے ساتھ جنت اچھی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ شراب اچھی ہے اس نقد کو حاصل کرلو اور اس ادھار کو چھوڑ دو کیوں کہ ڈھول کی آواز صرف دور سے اچھی لگتی ہے)۔

ملاحظہ فرمائیے:

خیام کی یہ رباعی دیکھیں جسمیں صنعت ترصیع نہایت بے ساختہ اور پرلطف انداز میں استعمال ہوتی ہے۔

ازمنزل کفرتابدیں یک نفس است
زعالم شک تابہ یقیں یک نفس است
این یک نفس عزیز راخوش میدار
چون حاصل عمر ماہمیں یک نفس است

علاوہ ازیں خیام نے اپنے کلام میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے کی غرض سے سیاقیۃ الاعداد تعریض،تقسیم،سوال وجواب وغیرہ جیسے صنائع کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کا کلام فصاحت وسلاست کی اعلیٰ سطح پر پہنچ گیا ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ خیام کی رباعیاں نہ صرف فکری بلکہ فنی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔آسکر وائلڈ نے اسی بنا پر رباعیات خیام کو فن کا شاہ کار کہا ہے اور ان کو شیکسپیئر کے سانٹ کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔جان رسکن نے لکھا ہے کہ ''میں نے آج تک اتنی شاندار کوئی چیز نہیں پڑھی''۔مارک ٹیون اور ٹی ایس ایلیٹ نے بھی خیام کے خیالات کی شان وعظمت کی تعریف وتحسین کی ہے۔بلاشبہ خیام کا نیر اعظم رہتی دنیا تک چمکتا رہے گا۔

☆☆☆

خواجہ الطاف حسین حالی کی رباعی گوئی

ڈاکٹر رضوان انصاری

(سدھولی، سیتاپور، یوپی۔موبائل:9918443200)

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۹۱۴۔۱۸۳۷) نے اردو شاعری کے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔مگر نظم گوئی میں خاصی شہرت حاصل کی۔مثنوی، مرثیہ بھی نظم کیں۔رباعیات بھی کہی ہیں۔مولانا حالی نے رباعی کو غزل کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ رباعی غزل کا ایک جزو ہے تو بے جا نہ ہوگا۔مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں غزل اور مثنوی پر جدا جدا بحث کی ہے۔مگر رباعی اور قطعہ کو یکسر نظر انداز کیا۔لیکن وہ اس کی عظمت کا اعتراف غزل سے کم نہیں مانتے چنانچہ مقدمہ شعروشاعری جو اردو تنقید کا صحیفۂ اوّل ہے رقمطراز ہیں:

''کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہوسکتا۔''

(مقدمہ شعروشاعری،صفحہ:300)

اور اس کے آگے تحریر کرتے ہیں:

''بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتے۔ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔''

(مقدمہ شعروشاعری،صفحہ:307)

عام طور پر رباعی کے موضوع خشک اور سنجیدہ ہوتے ہیں ان میں پند وموعظمت، مذہب واخلاق، فلسفہ وتصوف کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔اردو شعراء نے رباعی کی جانب بہت کم توجہ دی۔کبھی کبھی مذہبی خیالات، فلسفہ وتصوف پر رباعیات تحریر کر لیتے تھے۔مشاعروں کی عدم توجہی کی وجہ یہ رہی کہ اس کی چند مخصوص بحریں ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ان پابندیوں کی وجہ سے ہر شاعر کے لیے مؤثر انداز میں رباعی کہنا آسان نہ تھی۔جیسا کہ ماقبل تحریر کیا جاچکا ہے کہ رباعی ایک مشکل صنف ہے۔اس صنف میں طبع آزمائی ہر کسے باشد کا کام نہیں۔اس کو اصطلاحی، اخلاقی، مذہبی، سماجی، فلسفہ اور تصوف وغیرہ مضامین کی وجہ سے امتیازی مقام حاصل ہے۔اردو کے مرثیہ گو شعراء رباعی سے اپنے کلام کا آغاز کرتے۔اس کے بعد مرثیہ پڑھتے تھے۔ان میں میر ضمیر، میر خلیق اور میر انیس وغیرہ کی رباعیوں کو اردو کا عمدہ سرمایہ کہا جاتا ہے۔عصر گذشتہ میں میر انیس کی رباعیوں کو زبان وبیان، موضوع اور مواد کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔مولانا حالی کا ذہنی وفکری رجحان مذہبی تھا اور وہ شیخ سعدی کے بعد سب سے زیادہ میر انیس سے متاثر تھے۔وہ میر انیس کو دلّی اور لکھنؤ دونوں کی آنکھ کا تارا بھی کہتے تھے۔

مولانا حالی ایک مذہبی فرد تھے۔وہ مذہب سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔مسدس مدوجزر اسلام اس کا بیّن ثبوت ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بھی اسلام وفلسفہ اور مذہبی قرار دے رکھا تھا۔ان خیالات کو شعری جامہ عطا کرنے کے لیے آپ نے رباعی کا صنف اختیار کیا۔جس سے وہ اپنے خیالات اور مشن کی ترویج واشاعت میں بڑی خوبی کے ساتھ تعاون لیے ہیں۔ان خیالات کی نشر واشاعت کی وجہ سے مولانا حالی کو قوم نے ''سعدیِ ہند'' کا خطاب عطا کیا۔

مولانا حالی نے دیوان کے ساتھ اپنی رباعیاں بھی شائع کرائی تھیں۔اس کے بعد رباعیات حالی کے نام متعدد بار الگ سے شائع ہوئے۔تاہنوز 150 رباعیاں کلیات نظم حالی جلد اوّل مرتبہ شیخ محمد اسماعیل میں ہیں۔ان کے علاوہ 3 رباعیاں نقوش شخصیات نمبر-2، صفحہ-156 پر درج ہیں جو نواب محسن الملک کی قومی وملی خدمات کے اعتراف میں ہیں۔

اس کے علاوہ محمد رحمت متخلص رعدؔ نے بھی خواجہ حالی کی حیات میں کل 100 رباعیوں کو ان کے ترمیم کے ساتھ شائع کرایا تھا۔جس کو محمود الٰہی کے چیئرمین کے دور میں اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے پاکٹ سائز کا شائع کرایا تھا۔جس پر مقدمہ خواجہ محمد رحمت اللہ کا درج ہے۔جس کو قارئین کے لئے نذر کیا جارہا ہے۔

یہ رباعیات، دیوان حالی کے آخری جز سے نقل کر کے چھاپی جاتی ہیں جو 1093ء میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ دیوان حالی کیا اپنی نثر اور کیا اپنی نظم کے اعتبار سے تمام ملک میں تمثیل اور لاجواب کتاب ہے۔

ایک روز میرے خیال میں آیا کہ اگر رباعیات حالی (جو فی زماننا ملک کو عمر خیام کی رُباعیوں سے زیادہ مفید اور بکار آمد ہیں) دیوان حالی سے علاحدہ کر کے چھاپی جائیں تو کیا عجب ہے کہ زیادہ اشاعت پاسکیں اور اس ارادہ کی تکمیل کے لئے مجھ کو جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی خدمت میں حصول اجازت کی درخواست دینی پڑی۔ میں جناب مولانا کا نہایت شکر گذار ہوں کہ انہوں نے فوراً مجھ کو رباعیات کے چھاپنے کی بخوشی اجازت عطا فرمائی۔ ان رباعیات میں دیوان حالی کی رُباعیات سے دو تین جگہ الفاظ بدلے ہوئے ملیں گے مگر وہ الفاظ بھی مصنف ممدوح کے ہوں گے نہ کہ میرے۔

محمد رحمت اللہ رعدؔ:

محمد رحمت اللہ کی مرتبہ کردہ رباعیات حالیؔ کے مطالعہ سے ایک خاص بات واضح ہوتی ہے کہ ہر رباعی کے اوپر موضوع مختصر طور پر درج کیا گیا ہے۔

خواجہ حالیؔ کی رباعیوں کا اصل موضوع دینی و دنیوی اصلاح و ترقی ہے۔ انہوں نے جن موضوع پر رباعیاں کہی ہیں۔ وہ یوں ہیں:

مذہب و اخلاق، پند و موعظمت، فلسفہ و حکمت، تعلیم و تربیت، ادب و سیاست، ملک و ملت، کردار و عمل، تمدن و معاشرت وغیرہ۔

مولانا حالیؔ کی رباعیوں کے مطالعہ سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ان کی رباعیاں زیادہ تر توحید اور اخلاق پر مبنی ہیں۔ چونکہ وہ خود مذہبی آدمی تھے اور توحید پر ایمان کامل تھا۔ اس لیے ان کی رباعی کا اکثر و بیشتر حصہ توحید اور مذہبی ہی ہے۔ خدا کی موجودگی پر خواجہ حالیؔ یوں گویا ہیں:

طوفان میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

توحید کے بعد نعت رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں رباعیاں ملتی ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا میں تشریف لانے سے دنیا والوں کی تقدیر بدل دی۔ ان کو توحید سے روشناس کیا۔ سارے عرب کو جو صدیوں سے جنگ و جدال میں مصروف تھے ان کو شیر و شکر کر دیا۔ رباعی ملاحظہ ہو:

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمیوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلہ کو بہم تو نے کیا

ایک اور رباعی جو نعت پاک کے ضمن میں ہے۔ پیش ہے:

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے معترف

خواجہ حالیؔ کی رباعیات میں اخلاقی و اصطلاحی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے قوم کی بدحالی کو دور کرنے، ان کو محنت و مشقت، ہمت و حوصلہ کے ساتھ کام ہوتے رہنے اور اعلیٰ کردار، بلند اخلاق پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ ان کو علم و عمل کی طرف توجہ دلائی۔ ان میں انسانیت اور ہمدردی کا درس دیا۔ دنیا کو فانی اور عمل کو باقی بتایا۔ دیکھئے:

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام پڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

مولانا حالیؔ نے بعض رباعیوں کو مکالماتی انداز میں کہی ہیں وہ مسائل حیات کو مکالمہ کے انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

دولت نے کہا مجھ سے ہے عزت ہے جہاں
فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

یہ ایک مصدقہ قول ہے کہ ادب معاشرہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خواجہ حالیؔ سیاست سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ادب سے قلبی دل بستگی تھی اس لیے ان کی رباعیوں میں سیاست کا عنصر ملتا ہے۔ مثلاً آپ نے مسجد کانپور، ٹیکس یا سبب زوال سلطنت وغیرہ پر جو رباعی کہی ہے ان میں سیاسی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

ان کی رباعیوں میں تلمیح کا بھی عنصر ملتا ہے۔ ایک رباعی دیکھیے:

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے

جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلہ

خواجہ حالی علم کی اہمیت اور افضلیت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ شادی شدہ ہوکر بھی دہلی حصول علم کے لئے چلے آئے تھے اور اس وقت وہاں ان کا کوئی مددگار نہ تھا۔ اس لیے آپ علم کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک علم سرمایہ ابدی ہے۔ وہی دونوں جہاں کو آراستہ کرتا ہے۔ دونوں جہاں کی آرام و آسائش اسی کے بظل عاطفت ہے۔ اس موضوع پر ان کی متعدد رباعیاں ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

■

اے علم کلید گنج شادی تو ہے
سر چشمہ نعما و ایادی تو ہے
آسائش دوجہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

خواجہ حالی ایک جہاں دیدہ دانشور تھے۔ وہ اپنا وقت کتب کے مطالعہ میں بسر کرتے۔ انہیں وقت کی قدر و قیمت کا بخوبی علم تھا۔ وہ ہمت و استقلال، عزم و حوصلہ کے ساتھ وقت کی اہمیت پر متعدد رباعی کہے ہیں۔ ابتدائی درجہ میں وقت کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون تھا۔ جس میں بڑی اہم بات وقت پر یہ تھی کہ ''وقت کی قدر کرو۔ گیا وقت پھر پلٹ کر نہیں آتا''

وقت پر مولانا حالی کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں:

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے چارہ
ہوجائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

خواجہ حالی کی رباعیوں میں سیاست داں کا دماغ، ماہر تعلیم کا ذہن اور حکیم و فلسفی وغیرہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ آپ کی ژرف نظر نے جو کچھ دیکھا۔ ان کے شعور نے جس طرح زمانے کے حالات کو سمجھا۔ سب کا خلاصہ اور نچوڑ ان کی رباعیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی رباعیوں کی زبان و بیان سادہ اور سلیس ہے۔ غرض کہ مولانا حالی کی رباعیاں اردو میں اہمیت و افادیت کی حامل ہیں۔ جن کا مطالعہ اردو کا قاری کرتا رہے گا۔ مولانا حالی کی رباعیاں میر انیس کے بعد سب سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ رباعیاں انہیں پُروقار مقام عطا کرتی ہیں۔

☆☆☆

رباعیات

اسلم حنیف، بدایوں

پھیلی ہوئی بیٹھی ہے ہوا جھولی میں
اب کچھ نہیں خوابوں کے سوا جھولی میں
پھر بھی نہیں لٹنے کا ہمیں کچھ احساس
یہ کیسا خلا در آیا جھولی میں

■

دیوار سے تھا آئینہ کچھ چمٹا ہوا
کچھ اس کے فریم سے مرا قد کم تھا
آجاتا ترے کمرے میں میرا ثانی
اچھا ہوا عکس مرتسم ہو نہ سکا

■

موسم کے بدلنے سے لرزنے لگا دل
ماضی کی طرح سامنے ہے مستقبل
اب جھیل کو نغمے نہ سنائی دیں گے
ہونے لگے ہجرت پہ پرندے مسائل

■

گھس گھس کے جو پربت سے رائی ہوجائے
احساس کی دولت سے عاری ہو جائے
کیا اس کی شرارت کا ٹھکانہ ہوگا
جو قوم کہ مذہب سے باغی ہو جائے

■

بے گانۂ وسعت ہے منظر میرا
مایوس ہے ہر ایک شناور میرا
بڑھنے لگی شہرت تو ہوا یہ احساس
اک قطرے کی صورت ہے سمندر میرا

عبدالغفور خاں نساخؔ: بہ حیثیت رباعی گو

(دیوانِ رباعیات 'ترانۂ خامہ' کے حوالے سے)

ڈاکٹر تسلیم عارف

(اسسٹنٹ پروفیسر و کوآرڈی نیٹر، شعبۂ اردو، ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی، باراسات، کولکاتا۔ موبائل: 7003350449)

عبدالغفور خاں نساخ (۱۸۸۹۔ ۱۸۳۳) ۱۹ ویں صدی کے بنگال کی ایک نہایت محترم اور معزز ادبی شخصیت کا نام ہے۔ ان کی ادبی حیثیت شش جہاتی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، تذکرہ نگار، خودنوشت سوانح نگار، ناقد اور مترجم تھے۔ نساخ ایک انتہائی ذہین اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ پیشہ ورانہ زندگی میں ڈپٹی مجسٹریٹ اور کلکٹر کے اعلیٰ و ارفع اور مصروف ترین عہدے پر رہتے ہوئے بھی اردو شعر و ادب کے گیسو سنوارے اور کُل ۲۳ / تصنیفات و تالیفات یادگار چھوڑیں۔ حامد علی خاں، نساخ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''نساخ نے صرف ۵۵ / سال کی عمر پائی اور ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ جیسے عہدوں پر فائز ہو کر مختلف مقامات پر فرائض منصبی ادا کرتے رہے لیکن تخلیقی و تصنیفی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ وہ شعری نشستوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ انہوں نے تصنیفات و تالیفات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔''1؎

لگ بھگ 23 کتابیں نساخ نے یادگار چھوڑی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص جو اپنی عملی زندگی میں بے حد مصروف ہو، خانگی معاملات میں الگ الجھا ہو، وہ کیسے ادب لکھنے پڑھنے کے لئے اتنا وقت نکال سکتا ہے—؟ یقیناً یہ نساخ جیسے ذہین و فطین اور ادیبِ بے بدل کا ہی کمال ہو سکتا ہے۔ 'دفترِ بے مثال' نساخ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جبکہ 'اشعار نساخ'، 'شاہدِ عشرت'، 'مرغوب دل [فارسی]'، 'ارمغان'، 'کنز التواریخ'، 'مظہر معنا'، 'ترانۂ خامہ'، 'نصرۃ المسلمین'، 'ارمغانی' اور 'باغِ فکر' ان کی دیگر شعری یادگاریں ہیں۔

'ترانۂ خامہ' نساخ کی رباعیوں کا دیوان ہے، جسے بنگال کے 'پہلے' دیوانِ رباعیات ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نساخ کا یہ شعری گلدستہ صرف ۳۲ / صفحات پر مشتمل ہے جس میں رباعیوں کی کُل تعداد ۱۵۳ / ہے۔ یہ کتاب مطبع بحر العلوم (لکھنؤ) سے ۱۸۸۶ء (۱۳۰۲ھ) میں شائع ہوئی۔ مجموعہ کی ابتدا میں چار حمدیہ رباعیاں ہیں۔ بعد ازاں حضرت محمد ﷺ، حضرت امام حسن و حسین ؓ، حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمر فاروق ؓ، حضرت عثمان ؓ اور حضرت علی ؓ کی ذاتِ بابرکات کی شان میں بھی عقیدت مندانہ رباعیاں ملتی ہیں۔

نساخ کی حمدیہ رباعیاں تاثیر اور جذباتیت سے لبالب ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس دنیا کو خلق کیا اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اس جہان کو رنگ و بو بخشا۔ بندہ اپنے رب کا چوبیسوں گھنٹے بھی شکر بجا لائے تو کم ہے۔ رب کی عنایات و نوازشات کی کوئی حد نہیں، کوئی پیمانہ نہیں۔ کسی بندے نے اللہ کو نہیں دیکھا لیکن ہر مسلمان کا اس بات پر کامل ایمان و یقین ہے کہ رب ہے اور ہمارا پالن ہار وہی ہے۔ اُس کی آنکھیں نہیں، پھر بھی ہمارے اعمال وہ دیکھتا ہے، اس کے کان نہیں، پھر بھی وہ ہماری دعائیں سنتا ہے۔ اُس کی ذات اعلیٰ و یکتا ہے۔ اللہ اپنے بندے کے ہر ایک درد کی دوا ہے، مصائب اور پریشانیوں، امراض اور بلاؤں سے اپنے بندوں کو گلو خلاصی وہی دلاتا ہے۔ اس ضمن میں نساخ کی رباعیاں ملاحظہ ہوں:

بے آنکھ کے اللہ ہے تو ہی بینا
بے کان کے اللہ ہے تو ہی شنوا
فرمایا جو تو نے قل ہو اللہ احد
بے شبہہ و شک ہے ذات تیری یکتا

مخلوق پہ از حد ہیں عنایات خدا
اشیائے جہاں جملہ ہیں آیات خدا
جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب حادث ہے
نساخ نہیں قدیم جز ذات خدا

نبی اکرم حضرت محمد ﷺ دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں۔ وہ اُمت مسلمہ کی بخشش کا ذریعہ ہیں۔ حضورؐ اکرم کی ذات اور شخصیت پر ہر مسلمان کو فخر ہے۔ اُنؐ کی شان کبریائی کو کوئی بھلا کیا لفظوں میں بیان کر سکے گا، تاہم ہر شاعر کی یہ ازلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مدحتِ نبیؐ میں اشعار کہے۔ نساخ نے بھی اپنی دو رباعیوں میں رسولؐ اکرم سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار انتہائی ادب واحترام سے کیا ہے۔ شاعر نے اپنے اشعار میں خاتم الانبیاء کو اللہ کے بعد سب سے بڑے رتبے والا اور انبیاء میں اُنہیں سب سے افضل قرار دیا ہے۔ رسول اللہ کی عظمت کے حوالے سے ایک دوسری رباعی میں شاعر نے انتہائی عمدگی سے رقم کیا کہ اُسے یا پوری اُمت کو قیامت سے متوحش، پریشان اور غمگین ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر ایک لمحہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے رسول کے نام کا ورد کرتے رہیں، یعنی اُنؐ پر درود وسلام بھیجتے رہیں۔ اللہ رب العزت سارے نبیوں میں حضرت محمدؐ کو ہی سب سے زیادہ پسند فرماتے ہیں، تبھی تو کلمۂ شہادت میں اللہ کے نام کے ساتھ صرف رسول اکرم کا ہی نام آیا ہے۔ رباعیاں دیکھئے:

کیا نعت رسول ہو سکے مجھ سے ادا
رتبے میں ہیں وہ سب سے بڑے بعد خدا
کیوں ہوں نہ تمام انبیا سے افضل
اللہ نے فرمایا ہے لولاک لما

کیوں خوف قیامت سے محزون و ملول
ورد اپنے تو کر نام رسول مقبول
نساخ تو کلمۂ شہادت کو دیکھ
ہے نام خدا کے ساتھ ہی نام رسول

خلفائے راشدین اُمت مسلمہ کے لئے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خلفاء کے تدبر وتفکر، عدل و انصاف، بہتر معاشرہ کی تشکیل، معمولات زندگی اور اُصول وضوابط نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے عالم کے انسانوں اور حکمرانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ بادشاہ وقت یا حکمراں کا اپنی رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ ہونا چاہیے، نظام سلطنت کو عمدگی سے چلانے کے لئے کون کون سی حکمت عملی اپنانی چاہئے، امن وامان اور آپسی رفاقت ومحبت اور مذہبی ہم آہنگی کو کیسے فروغ دینا چاہیے، ان سارے اُمور پر ہمارے خلفائے کرام نے جو نظیر پیش کی ہے یا جو نسخے بتائے ہیں، یقیناً ان پر عمل کر کے بہتیرے حکمرانوں نے مثالی حکومتیں قائم کیں۔ کئی معتبر غیر مسلم شخصیات نے بھی خلفائے راشدین کی شخصیت کی اکثر مواقع پر مدح سرائی کی ہے، جن میں سب سے روشن مثال مہاتما گاندھی کی ہے، جنھوں نے امیر المومنین حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے حوالے سے کہا تھا کہ: ''میں رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا کیوں کہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کی مثال کے لئے ابوبکر اور عمر کے نام پیش کرتا ہوں۔ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے، پر انھوں نے فقیروں والی زندگی گزاری۔''

خلفائے عظام کے سنہرے اقوال زبان زد عام ہیں۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمارے مزاج ومنہاج اور طریق زندگی میں بڑی تبدیلیاں پیدا کرنے کی اہل ہیں۔ بالخصوص حضرت عمرؓ کے کئی اقوال کو تو ہم اپنی گفتگو کے دوران اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ امیر المومنین کی ذات بابرکات اور ان کی عظمت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ پیارے نبی نے کہا کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا، تو عمر ہوتے۔'' جبکہ حضرت علیؓ کے حوالے سے رسول اللہ نے فرمایا کہ: ''میں جس کا مولیٰ ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے۔'' نساخ اپنی رباعیوں میں ان شخصیات کے حوالے سے یوں مدح سرا ہیں:

مومن نہیں ہرگز جو ہیں اعدائے علی
مومن ہیں وہی جو ہیں احبّائے علی
حضرت نے کہا ہے جو علی مولاہ
نساخ کو دل سے ہے تولّائے علی

پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تعظیم وتکریم میں نساخ نے تین رباعیاں کہی ہیں، جن میں اُن کی شان اور بلند پایہ شخصیت اور رسول اللہ سے اُن کی عقیدت کا والہانہ اظہار ہوا ہے۔ جذبۂ عقیدت سے لبریز ان کی یہ رباعی ملاحظہ فرمائیے:

بوبکر کا رتبہ ہے جہاں میں روشن
اسلام کے دوست کفر کے تھے دشمن
ہجرت میں تھے یار غار احمد نساخ
اللہ نے قرآن میں کہا لاتحزن

خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ خلوص و وفا اور حیا کے پیکر تھے۔ ان کی نرم دلی اور بُردباری بے مثال ہے۔ حدیث مسلم سے روایت ہے کہ حضرت عثمان اس قدر شرمیلے اور معصوم تھے کہ فرشتے بھی اُن سے شرما جاتے تھے۔ نساخ نے اپنی دو بیتی میں اُن کے اسی وصف کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

بے شبہ خلیفہ سوم تھے عثمان
تھے حلم کے معدن اور حیا کے تھے کان
حضرت نے کہا ہے تستّی اے نساخؔ
شرم آتی ہے کیا کیجیے وصف ان کا بیان

نواسۂ رسول اور جگر گوشۂ بتول حضرت امام حسن و حسینؓ کی قربانیوں اور جاں فشانیوں سے کوئی بدنصیب مسلمان ہی ناواقف ہوگا۔ پرچم اسلام کی سربلندی اور آوازِ حق بلند کرنے کے لئے حضرت حسین نے اپنا سر کٹوا دیا۔ حسن و حسین اور ان کی پوری فیملی یزید ملعون کے آگے سرنگوں نہیں ہوئی۔ دراصل حسین کی ولادت سے قبل ہی ان کی والدہ فاطمۃ الزہ پر یہ آشکار ہو چکا تھا کہ ان کا لختِ جگر میدان کربلا میں جامِ شہادت نوش کرے گا۔ حضور اکرمؐ اپنے دونوں نواسوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور انہیں اپنی دو آنکھیں کہتے تھے۔ نساخ نے اپنی رباعی میں فاطمہؓ کے لعل کو 'جانِ بہشت' کہا ہے جو بالکل برحق ہے۔ رباعی دیکھئے:

حسنین ہیں ریحان گلستان بہشت
حسنین ہیں سیہ جوانان بہشت
نساخ ہیں وہ شمسۂ ایوان بہشت
زیبا ہے اگر اون کو کہوں جانِ بہشت

'ترانۂ خامہ' میں ایک رباعی شہر دہلی کے حوالے سے ملتی ہے۔ 'خود نوشت سوانح حیات نساخ' (مرتبہ: عبدالسبحان) سے پتا چلتا ہے کہ نساخ نے اپنے گلے کی ایک پرانی بیماری کا علاج کرانے کی غرض سے چار مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ یہ شہر انہیں بہت راس آیا کیونکہ یہاں ان کی ملاقات عظیم شاعر مرزا غالب سے ہوئی۔ تاریخی جامع مسجد، دِلّی کی عمارات کو دیکھ کر نساخ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ وہ نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری بھی دیتے ہیں۔ نساخ نے دہلی کے لوگوں کی خوش پوشاکی، وہاں کی زبان، آب و ہوا اور خوشگوار موسم کی بدولت دارالخلافۂ ہند کو جنت سے تشبیہ دے ڈالا ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

خوش پوش ہیں سارے مردمان دہلی
کیا شستہ و رفتہ ہے زبان دہلی
ہے رشک بہشت گلستان دہلی
بہتر ہے بہار سے خزان دہلی

نساخ کو کلکتہ سے بے پناہ الفت تھی کیونکہ ان کی ولادت یہیں ہوئی تھی۔ اس شہر میں انھوں نے اپنی عمر کا خاصا حصہ گزارا تھا۔ ان کی زندگی کے اکثر معاملات یہیں طے ہوئے تھے اور کلکتہ ہی کی سرزمین پر انھوں نے اپنی آخری سانس لی۔ ان کی نگاہ میں کلکتہ محض ایک شہر نہیں بلکہ اپنے جلو میں ایک جہان سموئے ہوئے ہے۔ اپنے شہر سے شاعر کو اس قدر عقیدت و محبت ہے کہ وہ اسے جنت سے بھی اعلیٰ و ارفع قرار دیتا ہے۔ جنت کے دل فریب نظارے اور وہاں کی حوروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین و جمیل پیکر نساخ کو کلکتہ میں نظر آتے ہیں۔ رباعی حاضر ہے:

یہ شہر نہیں ہے یک جہاں کلکتہ
ہر شہر زمیں ہے آسماں کلکتہ
جنت میں بھلا کہاں ہیں ایسی حوریں
فردوس کہاں اور کہاں کلکتہ

دوران ملازمت، نساخ کا تبادلہ مشرقی ہندوستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے چار اہم شہروں بریسال، راج شاہی، سلہٹ اور ڈھاکہ میں ہوا۔ ان شہروں میں نساخ کو مخلص دوستوں کی معیت نصیب ہوئی اور کئی سعادت مند شاگرد بھی میسر آئے۔ لیکن مذکورہ شہروں سے نساخ نے اچھی یادیں انگیز نہیں کیں۔ ان مقامات میں رہ کر انہیں بُہتیرے تلخ مشاہدات ہوئے۔ مثلاً بریسال میں اقامت کے دوران انہیں پتا چلا کہ یہاں کے لوگ دھوکہ دہی اور جعل سازی میں ماہر ہیں جبکہ راج شاہی میں انتہائی خراب موسم کا تجربہ ہوا۔ اسی طرح سلہٹ میں نساخ نے کھلے عام کچہریوں میں لوگوں کو جھوٹ بولتے سنا۔ نوست میں انہوں نے ڈھاکہ کو چغد سے بھی آگے بتایا ہے کہ یہاں عورت اور مرد فعل قبیح یعنی شراب نوشی میں ملوث تھے۔ ان شہروں میں اپنے گزارے ہوئے ایام اور تجرباتِ بد کو شاعر نے اپنی رباعیوں میں بلاکم و کاست رقم کیا ہے۔ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ہر شہر میں جو ہوتے ہیں عامی جھوٹے
جھوٹوں ہی کے ہو جاتے ہیں حامی جھوٹے
دعویٰ انہیں حق گوئی کا ہے اے نساخ
ڈھاکے میں جو خاصوں میں ہیں نامی جھوٹے

ڈھاکہ کے سوا جھوٹ کا اب دور کہاں
یہ رنگ کہاں جھوٹ کا یہ طور کہاں
مولانا و مولوی و منشی جھوٹے
کہیے تو ہے یہ بات بھلا اور کہاں

راہ محبت میں روٹھنا منانا، شکوہ شکایت عام سی بات ہے لیکن ہماری اردو شعری روایت میں اکثر شاعر یا عاشق اپنے معشوق سے شاکی نظر آتا ہے۔ کلاسیکی عہد سے لے کر عصر حاضر تک کے شعرا کے کلام میں ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ محبوب کی شبیہ ایک ظالم اور بے وفا کی ہے جبکہ عاشق کو صادق اور معصوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ محبوب اگر کسی غیر سے بات کرتا ہے یا اپنے عاشق سے ملنے سے کتراتا ہے تو عاشق کی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔ ایسے لمحات عاشق کے لئے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں اور اُس پل اُسے اپنے معشوق سے بُرا کوئی فرد نظر نہیں آتا۔

نساخ ایک صابر عاشق ہیں۔ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہے۔ دیگر عاشقوں کی طرح اُتاؤلا پن ان میں نام کو نہیں۔ وہ مہر و اُلفت کی ہر ایک آزمائش سے مردانہ وار گزرنا جانتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آخر کب تک ان کا محبوب، اُن سے مغائرت برتے گا، کب تک وہ ملنے سے کتراتا رہے گا۔ نساخ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ وہ اپنے ہم دم کے دل میں ایک نہ ایک دن اپنے لئے نرم گوشہ ضرور پیدا کر لیں گے۔ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

دیکھیں تو وہ راہ پر نہ آئیں کب تک
دیکھیں تو وہ تشریف نہ لائیں کب تک
دل دے چکے ہیں جان بھی دے دیتے ہیں
دیکھیں تو محبت آزمائیں کب تک

نساخ روایتی عاشقوں سے ذرا ہٹ کر ہیں۔ عام عاشق اپنے محبوب کی جفاؤں کو خود کے لئے باعث رحمت سمجھتا ہے۔ اپنے یار کے ظلم و ستم کو ہنس کر برداشت کر لیتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا۔ اُس کے دل میں خود پر ہونے والی ستم ظریفیوں کا بدلہ لینے کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا لیکن نساخ تو نساخ ہیں۔ اُن کی شخصیت کسی کے سامنے زیر ہونے والی نہیں، پھر وہ چاہے ان کا محبوب ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والوں میں سے ہیں۔ نساخ خود پر ہونے والے ظلم و ستم کو نہ صرف گن گن کر حافظے میں محفوظ رکھنے کے متمنی ہیں بلکہ ان کا بدلہ وہ یوں لینا چاہتے ہیں:

لکھ رکھو ذرا ظلم و ستم گن گن کر
تا بھول نہ جاؤ کہیں کم گن گن کر
آئے گی شبِ وصال تو لے لیں گے
ہر ظلم کے بدلے بوسے ہم گن گن کر

جیسا کہ ابتدا میں عرض ہوا کہ نساخ اپنی عملی زندگی میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، اس لئے عہدے کی جاہ و حشمت کے زعم کا ہلکا سا شائبہ ان کی شخصیت میں ضرور نظر آتا ہے۔ اپنی ذات سے انہیں بے انتہا محبت تھی اور خود پر بے حد رشک بھی تھا جس کا اظہار 'ترانۂ خامہ' کی چند رباعیوں میں انہوں نے کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی تعریف خود کرنا فعل قبیح ہے اور اس پر طرہ یہ کہ خود کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا تو اور بھی بھونڈی بات ہے۔ اس ضمن میں شہناز نبی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''نساخ کی طبیعت کی جولانی رباعیات میں بھی اپنا کمال دکھا جاتی ہے۔ ان کا اپنی تعریف میں رطب اللسان ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ نساخ کو اپنی کاوشوں پہ بڑا ناز تھا۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے، اس سے اہلِ علم و ادب پر اچھا اثر ڈالنے کی تمنا رکھتے تھے۔ کبھی کبھار وہ انکساری ضرور دکھاتے ہیں لیکن یہ بھی خود کو نمایاں کرنے کا ان کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔''3؎

دو رباعیاں اس ضمن میں حاضر ہیں:

ہر دائرہ اُس کے حرف کا ہالہ ہے
رنگیں ہے جو مضمون گلِ لالہ ہے
ہے شعر میں اُس کے سحر کی کیفیت
نساخؔ ہے یا ساحرِ بنگالہ ہے

■

مجھ سا کوئی سرگرمِ وفا ہووے گا
مجھ سا کوئی پامالِ جفا ہووے گا
پھرتا ہوں کفن باندھ کے سر سے نساخؔ
مجھ سا کوئی جاں سے خفا ہووے گا

نساخ کا مجموعۂ رباعیات 'ترانۂ خامہ' حجم اور ضخامت کے اعتبار سے بھلے ہی منحنی سہی لیکن اس میں مشمولہ رباعیاں بے حد عمدہ اور خوبصورت ہیں۔ ساری رباعیاں فنّی دلکشی اور رعنائی سے مملو ہیں جو اس بات کا جواز فراہم کرتی ہیں کہ نساخ رباعی کے ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی رباعیوں میں الفاظ اتنے سہل اور روزمرہ کے ہیں کہ جن کی تفہیم میں قاری کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ تشبیہات و استعارات اور علامتوں کی تلاش

نساخ کی رباعیوں میں بے سود ہے۔

ڈاکٹر محمد صدرالحق، نساخ کی رباعیوں سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''ایک بات اس مجموعۂ رباعی میں یہ ہے کہ اس کی زبان صاف ہے، تشبیہ اور استعارہ پر زور نہیں صرف کیا ہے۔ مضمون آفرینی کے لئے زمین و آسمان برابر نہیں کئے گئے ہیں بلکہ صفاِ زبان، سادگیِ کلام اور وارداتِ قلبیہ کا اظہار پایا جاتا ہے۔''4؎

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنی سرزمین کے ایک باکمال اور عبقری شاعر کی شخصیت اور اُس کی شعری خدمات سے ایک عرصے تک چشم پوشی برتتے رہے۔ نساخ شناسی کے ضمن میں ضروری ہے کہ ان کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے، ان پر سیمینار اور مذاکرے منعقد کئے جائیں نیز اُن کی ادبی جہات کے حوالے سے کتابیں منظر عام پر لائی جائیں تاکہ نسل نو بھی اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں سے کماحقہٗ واقف ہو سکے۔

مختصر یہ کہ نساخ کی شخصیت، ان کی ادبی خدمات بالخصوص اُن کی رباعی گوئی نے دنیائے اردو ادب کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ رباعی گوئی میں بھی انہوں نے اردو کی قدیم روایت کی پاسداری کی ہے۔ ابتدا حمدیہ رباعی سے کی ہے، اس کے بعد نعتیہ رباعی کو بام عروج پر پہنچایا گیا ہے۔ منقبتیہ رباعی کا بالخصوص اہتمام ہوا ہے جس کے بعد رباعیاں ترانۂ خامہ سے لبریز نظر آتی ہیں۔ نساخ نے اپنی رباعیوں میں اپنے تجربات و مشاہدات کی بھرپور عکاسی کی ہے، احساس و جذبات کی عمیق گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے، زندگی کے نشیب و فراز کو بحسن و خوبی برتا گیا ہے۔ امروز فردا کے معاملات و واقعات بطریق احسن پیش کئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہ نساخ کی رباعیوں میں اردو شاعری کے تمام محاسن اُبھرتے ہیں، جو اس بات پر دال ہیں کہ نساخ ایک بلند مرتبت رباعی گو ہیں۔

حواشی:

1- 'نساخ'، محمد حامد علی خاں، مونوگراف، 2003، ص:28
2- کلام نساخ، مرتب: ڈاکٹر شہناز نبی، 2007، ص:129
3- کلام نساخ، مرتب: ڈاکٹر شہناز نبی، 2007، ص:131
4- نساخ: حیات اور تصانیف، ڈاکٹر محمد صدرالحق، 1977، ص:217

☆☆☆

رباعیات

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی
(کولکاتا)

دریا پہ مکاں اپنا بنانے کا شوق
سرسوں کو ہتھیلی پہ جمانے کا شوق
ہاتھوں کی لکیروں سے ہوں واقف لیکن
ہے دست شناسوں کو دکھانے کا شوق

ہر عہدہ و منصب اور آداب بھی ختم
ہے زادِ سفر ختم اور اسباب بھی ختم
آئی ہے یہ شب کیسی مری آنکھوں میں
تعبیر نہیں کوئی اور خواب بھی ختم

سیکھا ہے کہاں چاک بنانے کا ہنر
آیا ہی نہیں مجھ کو جتانے کا ہنر
تپتے ہوئے صحرا میں بیتی اک عمر
آیا ہے مجھے دھول اڑانے کا ہنر

ہر رنگِ صحرائے جنوں خواب ہے بس
ہر قریۂ احساسِ جنوں خواب ہے بس
اک ہوک سی اٹھتے ہے دل میں پل پل
آنکھوں کا ہر اک فسوں خواب ہے بس

پژمردہ ہوا رنگِ چمن رقص کرو
زخمی ہوں الماسِ بدن رقص کرو
اب ظلِ الٰہی کا یہی ہے فرمان
کھولو نہ کبھی اپنے دہن رقص کرو

علامہ اقبالؔ: بحیثیت فارسی رباعی گو شاعر

ڈاکٹر زین العباء، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی، دہلی
ڈاکٹر عابد ابراہیم، شعبہ فارسی ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ (۱۹۳۸۔ ۱۸۷۷) ادبیات کے باب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ خاص کر فارسی ادبیات کی تاریخ میں ترجمانِ حقیقت، شاعر فلسفی کا نام درخشاں ستارے کی مانند ہے۔ ان شخصیتوں میں علامہ اقبالؔ کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے ملک وقوم کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور عالمی سطح پر اپنی پہچان بنانے کا جذبہ پیدا کیا۔ علامہ اقبالؔ نہ صرف شاعر، فلسفی تھے بلکہ مفکر بھی تھے۔ انہوں نے افکار عالیہ کو اپنی شاعری میں اس معیار سے بیان کیا کہ دوسری مثال ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ دشوار ہوگئی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؔ کے کلام میں ذکر وفکر کے ساتھ ساتھ خبر ونظر کا درس ملتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنا فلسفہ حیات پیش کیا۔ جس کی اثاث فلسفہ خودی ہے۔ علامہ اقبالؔ کشمیر الاصل تھے۔ وطن سیالکوٹ ہے مگر زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا۔ اس بنا پر اقبال کو لاہوری کہتے ہیں اور بعد میں لاہوری ان کی شناخت بن گئی۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت میں تذکرہ نگاروں کو آپسی اختلاف ہیں لیکن تقریباً سبھی اس بات پر متفق ہوئے ہیں کہ اقبالؔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت پر کرنل عبدالرشید منصف ''تذکرہ شعرائے پنجاب'' یوں رقمطراز ہیں:۔

''اقبالؔ در ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میلادی بمطابق ۱۲۹۴ھ در شہر سیالکوت درمیان خانوادہ متوسط الحالی بجہان آمد۔ جد اقبال محمد رفیق یکی از سکنہ قریہ لوی ھار بود بہ اتفاق سہ برادرش از کشمیر، زادگاہ اجدادی خویش مہاجرت کرد و در شہر سیالکوت اقامت گزیدہ بود۔ نور محمد پدر اقبال کہ در موقع ولادت وی در شہر سیالکوت مشغول امور بازرگانی بود۔'' (تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۵۳)

علامہ اقبال ہمارا ادبی زرخیز سرمایہ ہے۔ اقبال ہمارے ملک کا بڑا فلسفی اور بڑا صوفی شاعر گزرا ہے۔ انھوں نے غالبؔ کی طرح اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اگرچہ اقبال کی شہرت اردو شاعری سے ہوئی لیکن فارسی کلام بھی کم پایہ کا نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا کلام دو طرح کا نظر آتا ہے۔ ایک روایتی اور ایک انقلابی۔ بانگ درا کا پورا کلام موضوعاتِ تخیل اور اسلوب کے لحاظ روایتی ہے۔ البتہ بال جبریل کی نظموں سے ان کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ اقبال کی کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات کا عمدہ حصہ ان کی رباعیوں میں ملتا ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی شعری شخصیت اس قدر ہم پہلو ہے کہ اس کے بیان کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ اقبالؔ کے ہر ایک پہلو پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں ہم بے جا طوالت سے بچنے کے لیے سیدھے علامہ اقبال کی رباعی گوئی پر گفتگو کرنے کی کوشش کریں گئے۔ تاکہ جو اوصاف علامہ کے رباعیات میں موجود ہے وہ قارئین کے سامنے آئیں۔

جہاں تک علامہ کی رباعی گوئی کا سوال ہے تو معلوم ہوتا کہ رباعیات کا گوشہ ان کی دیگر شاعری سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کی رباعی دوسرے اصناف کی طرح ترکیبی نظر آتی ہے۔ اقبال کی رباعیات میں وہ سارے موضوعات موجود ہیں جو اس کی مجموعی شاعری کا خاصہ روح جان ہے۔ تواریخ کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی رباعیات کا اہم موضوع تصوف رہا ہے۔ رباعیوں کی ایک بڑی تعداد تصوف کے مضامین کی حامل ہے۔ مثلاً یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں:۔

نہ ہرکس از محبت سرمایہ دار است نہ باہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب دل لعل بدخشاں بی شرار است

(پنجاب کے اہم فارسی رباعی گو شعراء، ڈاکٹر عابد ابراہیم)

علامہ اقبالؔ کا بابِ رباعیات تصوف کے اعتبار سے رنگین نظر آتا ہے۔ ان کی رباعیات میں تصوف کی عملی شکل سامنے آتی ہے۔ اقبال کی رباعیات کا جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ رباعیات میں شاعر کی چست ساحل سے موجوں کا تماشہ کرنے والے کی نہیں بلکہ طوفان سے لبریز پیکار شناور کی ہے۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ اقبالؔ نے رباعیات کے ذریعے خودی کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ اس پہلو پر شاعر موصوف نے رباعیات کے ذریعے بہت حد تک بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عابد ابراہیم نے اپنی کتاب ''پنجاب کے اہم فارسی رباعی گو شعراء'' میں اقبال کی رباعیات پر مفصل روشنی

ڈالتے ہوئے درج ذیل چند رباعیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہیں:۔

نوای عشق را ساز است آدم
کشاید را زو خود راز است آدم
جہاں او آفرید این خوب تر ساخت
مگر با ایزد انبار است آدم

■

ہنوز اندر جہان آدم غلام است
نظامش خام و کارش نا تمام است
غلام فقر آن گیتی پناہم
کہ در درینش ملوکیت حرام است

(پنجاب کے اہم فارسی رباعی گوشعراء،ص ۳۴۸)

علامہ اقبالؔ کی رباعیات میں عشق رسول ﷺ کا رنگ تابناک ہے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ سے عشق کا اظہار ان کی مثنویات اور غزلیات میں ملتا ہے اسی انداز میں رباعیات عشقِ رسولؐ سے رنگین نظر آتے ہیں۔ ویسے تو ان کے اشعار میں رسول اکرم ﷺ سے محبت وعقیدت کا بالواسطہ اظہار ہر جگہ موجود ہے لیکن متعدد رباعیوں میں عشق رسول ﷺ نے براہ راست جلوہ نمائی کی ہے۔علامہ اقبالؔ کا یہ عشق انتہائی جذباتیت پر مبنی ہے۔ چونکہ عشق ومحبت کا تعلق جذبات سے ہی ہوتا ہے۔اس لیے علامہ اقبالؔ سعدیؔ شیرازی کے اس قول کا طابع دار نظر آتا ہے۔

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

اس سے بڑھ کر بھی رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کو اس دنیا میں مظہر خداوندی قرار دیا ہے۔اقبالؔ کہتے ہیں کہ عشق رسول ﷺ نے میرے دل میں تمام دوستوں کو در بدر کیا ہے۔

تب وتاب بتکدہ عجم نرسد بسوز وگداز من
کہ بیک نگاہ محمد عربی گرفت حجاز من
بہر دہلہیز تو از ہندوستان آوردہ ام
سجدہ شوقی کہ خون گردید در سیمائی من

اس کے علاوہ علامہ اقبالؔ نے رباعیات کے ذریعے خودی کا درس دیا ہے مقام انسان کے لیے خودی سے ملتا جلتا موضوع کلام اقبالؔ میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ موضوع علامہ اقبالؔ کے رباعیات میں منفرد مقام رکھتا ہے۔شاعر مشرق کے مطابق دنیا میں آدمی دیگر بے شمار مخلوقات کی طرح ایک مجبور جاندار ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق کے پس پشت ایک عظیم مقصد درکار ہے۔تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو ہی ذاتِ خداوندی نے اپنی متعدد صفات عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔انسان عشق الہیٰ کا مظہر ہے اور اس کائنات کی تخلیق کا موجب ہے۔مثلاً

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد
این مشت غباری را انجم بسجود آمد آں
را زکہ پوشیدہ درسینہ شی بود
از شوخی آب وگل در گفت وشنود آمد

■

بتاں تازہ تراشیدۂ دریغ ازتو
درون خویش نہ کاویدۂ دریغ ازتو
طواف کعبہ زدی گرددیر گردیدی
نگہ بجویش نہ پیچیدۂ دریغ ازتو

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،ص ۲۰۹)

علامہ اقبالؔ نے شاعری کے رموز سیکھنے کے لیے کسی کو باقاعدہ استاد نہیں بنایا البتہ یہ بھی نہیں ہے کہ اقبال نے فن شاعری خود سیکھی ،انھوں نے سبک ہندی کے ساتھ ساتھ سبک خراسانی اور سبک عراقی کو سیکھنے کے لیے کئی بڑے شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا جن میں حافظؔ شیرازی،رومیؔ،عطارؔ۔عراقیؔ،جامیؔ ،غالبؔ وغیرہ قابل ذکر ہے۔حکیم الامت علامہ اقبال کے مطابق جو انسان اپنی قدر کریں وہی خدا کو بھی پہچان سکتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی ذاتِ پاک کو احترام کر سکتا ہے۔عظمت انسان کے بارے میں علامہ کی یہ بہترین رباعی پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں:۔

جا بہ آدمی نہ رسیدی خدا چہ میجوئی
ز خود گریختہ ای آشنا چہ میجوئی
دگر بشاخ گل آویز و آب ونم درش
پریدہ رنگ زباد صبا چہ میجوئی

اقبال مختلف طریقوں سے ثابت کرتے ہیں کہ ساری کائنات ''خود'' کی مرضی کی اطاعت کرتی ہے۔وہ خود کو تباہ کرنے کی مذمت کرتے ہیں۔ان کے مطابق زندگی کا صرف اور صرف مقصد خودشناسی ہے۔اقبال ان مراحلوں کا خاکہ بناتا ہے جن سے 'خود' کو گزرنا ہوتا ہے اور آخر کار کمال کے مقام پر پہنچنے سے پہلے 'خود' کو جانے والے خدا کے نائب بننے کے قابل بناتا ہے۔اقبالؔ کی نظر میں خودی،خودی مطلق یعنی ذات خداوندی میں بھی ضم نہیں کرتی ہے۔وہ تمام صوفیہ کی طرح ذاتِ باریٰ تعالیٰ کو سمندر اور انسان کو قطرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔شاعر مشرق پروردگار کی عظمت اور کریمی کو اس رباعی میں بیان کرتے ہیں:۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیان و کہسار و راغ آیدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

دانائے علامہ اقبال نے مذہبی رباعیاں کہی ہیں ان کا خیال ہے کہ عشق کے بغیر مذہب کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور سوز وساز اس کی روح رواں ہے۔ایک مذہبی رباعی بہت صراحت کے ساتھ بیان کی تھی:۔

ز رازی حکمت قرآن بیاموز
چراغے از چراغ او بر افراز
وے این نکتہ را ازمن فراگیر
کہ نتواں زیستن بے مستی وسوز

شاعر مشرق کے یہاں کچھ خمریہ رباعیاں بھی نظر آتی ہیں ۔یہ رباعیاں مولانا رومیؒ کے خمریہ سے مختلف ہیں۔عشق حقیقی کا مئے اقبال نے ہمیشہ پینا چاہا۔وہ عمر خیام کی طرح مئے معرفت نہیں پیتے ہیں کہ بہک جائیں ان کی رباعیات میں ایک ہلکا سا سرور پایا جاتا ہے۔

تہی از ہائے وہو میخانے بودے
گل ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق حق این ہنگامہ عشق
اگر دل چون خرد فرزانہ بودے

بہرحال اقبال قوت کا شاعر ہے اور قوت سے مراد صرف مادی قوت نہیں ہے بلکہ روحانی قوت اور اخلاقی بھی ہے۔انھوں نے ہمیشہ جسمانی طاعت اور عشق واخلاقی لطیف کے امتزاج پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ان کے خیال سے جسم وروح کی ہم آہنگی سے ہی انسان عظمتِ معراج کو چھوسکتا ہے۔وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ علم شخصیت سازی،صالح معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کا وسیلہ بنے۔ بہرحال اقبال کی فنی عظمت کو بیان کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

کتابیات

(۱) پنجاب کے اہم فارسی رباعی گو شعراء،ڈاکٹر عابد ابراہیم پرہ،۲۰۲۲ء۔
(۲) تذکرہ شعراء پنجاب،کرنل عبدالرشید،اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۱ء۔
(۳) اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،ڈاکٹر عبدالشکور احسن،اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۸ء۔
(۴) پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ڈاکٹر طارق کفایت اللہ،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ ۱۹۹۳ء۔

☆☆☆

رباعیات

سلیم سرفراز
آسنسول (مغربی بنگال)

اِک پیکرِ سرسبز ادھر آیا ہے
رستے کے لیے جیسے سفر آیا ہے
مغموم پرندوں کو خبر کر دینا
لینے کے لیے ان کو شجر آیا ہے

ممکن ہو جہاں تک بھی گوارا کرنا
آساں ہے بہت ورنہ کنارا کرنا
جس وقت لگے تجھ کو تعلق اک بوجھ
ہلکا سا مجھے صرف اشارا کرنا

میں زیست کے اسباب گنوا بیٹھا ہوں
کچھ گوہرِ نایاب گنوا بیٹھا ہوں
ہنگامہءدنیا میں نہ جانے کس جا
آنکھوں سے ترے خواب گنوا بیٹھا ہوں

کیا تجھ کو زمانے میں نظر آیا ہے
وہ کون سی شے ہے جو گراں مایہ ہے
تو جس کے تعاقب میں سدا رہتا ہے
وہ اصل نہیں اس کا فقط سایہ ہے

کانٹا سا کوئی دل میں چبھا ہے اب بھی
اُس پر ہی مرا دھیان لگا ہے اب بھی
جس موڑ پہ چھوڑا تھا کبھی میں نے اس کو
اس موڑ پہ ہی کیا وہ رکا ہے اب بھی

زیب النساء زیبی کی رباعیات کا انتقادی مطالعہ

محسن اعظم محسن سلیح آبادی

(محسن اکیڈمی، اے ۳۶، اسحاق آباد، سرشاہ سلیمان روڈ، کراچی، پاکستان)

زیب النساء زیبی (پ: ۳ جولائی ۱۹۵۸) کی رباعیات پر اظہار خیال اور انتقاد سے پہلے مختصراً رباعی کے متعلق اظہار خیال ضروری ہے۔ رباعی چار مصرعوں کی ایک مختصر نظم کی صورت ہے اس کے چاروں مصاریع ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ پہلے تین مصرع وضاحتی انداز رکھتے ہیں چوتھے مصرع میں تینوں مصاریع کے اصل مفہوم کی روح سمٹ آتی ہے یعنی چوتھا مصرع تینوں مصرعوں کی جان ہوتا ہے اس کا زوردار ہونا بے حد لازمی ہے۔ رباعی میں عام طور پر فلسفیانہ وحکیمانہ اور فکر انگیز موضوعات ہوتے ہیں۔ حیات وکائنات کے اہم اور نازک مسائل اس کے بنیادی مضمون سمجھے جاتے ہیں۔

رباعی کی ساخت (بناوٹ) چار مصاریع پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلے رباعی کے چار مصرعوں میں قافیے ہوتے تھے پھر یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ صرف پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیے کی پابندی باقی رہی اب رباعی کی یہی ہیئت قائم ہوگئی ہے۔ اگر کوئی شاعر، اب بھی چاروں مصرعوں میں قافیہ لے آئے تو یہ نقص میں شمار نہیں ہے۔

رباعی اپنی ہیئت میں مردف بھی ہوتی ہے اور غیر مردف بھی۔ اس کی مثال فارسی، اردو کے تمام شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ اردو کے متقدمین متوسطین اور متاخرین شعرا نے تھوڑی بہت رباعیات ضرور کہیں ہیں۔ متاخرین کے بعد اکثر شعرا کے یہاں بھی رباعیات ملتی ہیں مگر عہد حاضر میں رباعیات بہت ہی کم شعرا کہتے ہیں۔ ماضی قریب وبعید کے جن شعراء نے سو سے زیادہ رباعیات کہی ہیں ان میں سے بہت سے شعراء شامل ہیں۔ مجھے فی الوقت جو نام یاد آرہے ہیں ان میں مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، پیارے صاحب، رشید لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، مولانا افسر صابری دہلوی، عزیز لکھنوی، امجد حیدر آبادی، سیفی خواجہ دل محمد دل، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، اقبال شوقی، فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، حیدر دہلوی، انور دہلوی، فدا خالدی، ایوب گونڈوی، صبا اکبر آبادی، صفیہ شمیم ملیح آبادی، نریش کمار شاد، اثر ضیائی، شمس الرحمن فاروقی، عنوان چشتی، صادقین، رفیع الدین راز، ذکی عثمانی، منظور حسین شور علیگ، شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی جو رباعیات ''نجوم وجواہر'' کے نام سے چھپی ہیں وہ بھی چھ سو سے زائد ہیں۔ راقم الحروف (محسن اعظم محسن ملیح آبادی) نے تقریباً ساڑھے بارہ ہزار رباعیات کہی تھیں لیکن جو حیطہ تحریر میں آگئی ہیں وہ بھی چھ ہزار سے زائد ہیں جن میں سے اکتیس سو اٹھارہ رباعیاں سنہ دو ہزار آٹھ میں چھپ چکی ہیں۔ رباعیات کے چار مجموعے ''ملہمات، مدرکات، موثرات، جمالیات'' یکجا کر کے کلیات اول کی شکل میں ''دانش وبینش'' کے نام سے ہیں۔ فی الوقت راقم الحروف کی رباعیات سے زیادہ اردو شعری ادب میں کسی کی رباعیات نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے ایک ایک عنوان پر تین تین رباعیاں کہی ہیں اور کم از کم پانچ سو موضوعات وعنوانات پر یہ رباعیات ہیں۔ ابھی حال ہی میں فراست رضوی کی رباعیات آگئی ہیں۔ مجموعہ کا نام ''درد کی قندیل'' ہے اور اس میں غالباً چار سو رباعیات ہیں۔ فراست رضوی رباعی کے اچھے اور تازہ کار شاعر ہیں۔ فنی طور پر اور زبان وبیان کے اعتبار سے بھی معتبر ہیں۔ شعریت کا جمال بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا شمار رباعی کے ثقہ شعرا میں ہوگا۔ اس بات کی شہادت نہ دینا ادبی بددیانتی ہے۔ سو میں اپنی انتقادی رائے میں کسی کی خوبی کا اظہار نہ کرنا گناہ کبیرہ کے مترادف سمجھتا ہوں۔

پاک وہند کی شاعرات میں زیب النساء زیبی سلمہا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ جو ان کی منظومات کے ضخیم کلیات سخن تمام میں شامل ہیں۔ میں ان پر انتقادی رائے لکھوں گا مگر اس سے پہلے مزید کچھ رباعی کے بارے میں اظہار خیال کروں گا تاکہ نئی نسل کو رباعی کی تاریخ اور اس کی اہمیت سے آگاہی ہو جائے۔ اردو فارسی کی تمام اصناف سخن میں رباعی اہم صنف سخن ہے۔ اختصاصی حیثیت اس لیے ہے کہ اس کی بحور (اوزان) مخصوص ہیں۔ جو بحر ہزج مثمن سے استخراج ہیں۔ اس کے دس ارکان ہوتے ہیں جن میں سے ایک رکن بحر ہزج، سالم مفاعیلن ہے۔ اس سالم رکن سے باقی نو ارکان مزاحف ہیں۔ ان مزاحف ارکان کے نام مع اسم زحاف یہ ہیں۔ مفاعلن (مقبوض) مفاعیل (مکفوف) فاعل (اشتر) مفعولن (اخرم) مفعول (اخرب) فعول (اہتم) فاع (ازل) فعل (مجبوب) فع (ابتر) ان محررہ ارکان جن میں نو ارکان تو مزاحف ہیں اور ایک سالم رکن ہے، ان دس ارکان کے

علاوہ کوئی اور رکن رباعی کی بحور میں نہیں آتا۔ یاد رہے کہ فعول، فاع، فعل، فع صرف مصرع اولیٰ مصرع دوم مصرع سوم اور مصرع چہارم کے آخری رکن ہوتے ہیں۔ یعنی یہ صرف عروض وضرب میں آتے ہیں اور کسی مقام پر نہیں آتے۔ مفاعیلن، مفاعیل، مفاعلن، اور فاعلن صرف حشو میں آتے ہیں، کسی اور جگہ نہیں آتے۔ باقی دو رکن مفعول اور مفعولن صرف صدر اور ابتدا کے علاوہ حشو میں بھی آتے ہیں۔ یاد رہے کہ عروض اور ضرب میں کبھی نہیں آتے۔ اس طرح صدر اور ابتدا کی دو حشو کی چھ اور عروض وضرب کی چار صورتیں ہیں ترتیب ارکان رباعی یہی ہے۔ ایک بیت (شعر) دو مصرعوں کا ہوتا ہے۔ مصرع اولیٰ اور مصرع دوم (اخریٰ) مصرع اول کے پہلے رکن کو صدر اور آخری رکن کو عروض کہا جاتا ہے۔ مصرع دوم پہلے رکن کو ابتدا یا مطلع اور آخری رکن کو ضرب یا عجز کہتے ہیں۔ باقی درمیان میں آنے والے ارکان حشو کہلاتے ہیں۔ یہی صورت مصرع سوم اور چہارم کی ہوتی ہے۔

رباعی کے ارکان کی نشست یعنی ہیئت ترتیبی میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس رکن کے آخر میں ''سبب'' (دو حرفی کلمہ) ہوتا ہے، اس کے بعد میں آنے والے رکن کی ابتدا بھی ''سبب'' ہی سے شروع ہونے والے رکن سے ہوتی ہے مثلاً مفعولن کے آخر میں ''سبب'' ہے۔ اس لیے اس کے بعد کے رکن مفعولن، مفعول، یا فاعلن ہی ہوں گے جس رکن کے آخر میں ''وتد'' (تین حرفی کلمہ) ہوگا۔ اس کے بعد آنے والے رکن کی ابتدا ''وتد'' ہی سے شروع ہونے والے ارکان مثلاً مفاعیلن، مفاعلن، مفاعیل سے ہوتی ہے۔ یاد رہے وتد دو قسم کے ہوتے ہیں مثلاً وتد مجموع اور وتد مفروق مگر مفروق سے کوئی رکن شروع نہیں ہوتا۔ صرف سبب خفیف ہی رباعی کے چند رکن میں آتے ہیں مثلاً مفعول، مفعولن، فاع، ''سبب ثقیل'' سے بھی کوئی رکن شروع نہیں ہوتا۔ جن ارکان کے آخر میں وتد مفروق ہوگا یعنی مفعول مفاعیل ان کے بعد جو رکن آئے گا، وہ وتد مجموع سے شروع ہونے والے ارکان مثلاً مفاعیل، مفاعلن مفاعیل ہیں۔ رباعی کے ارکان کی ترتیب کے لیے راقم الحروف (محسن اعظم محسن ملیح آبادی) کا مندرجہ ذیل شعر پیش نظر رکھا جائے تو غلطی کا امکان نہیں رہے گا:

ہو آغاز، رکن رباعی کی حد سے
سبب کا سبب سے، وتد کا وتد سے

راقم کی معلومات کے مطابق دور حاضر میں دو ہی خواتین ایسی ہیں جو دیگر اصناف سخن کے علاوہ رباعی جیسی مشکل صنف میں بھی طبع آزمائی فرماتی ہیں، ایک تو ہمشیرزاد جوش ملیح آبادی محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی (۲۰۰۸-۱۹۲۰) ہیں جو رباعیات کہتی ہیں ان کی رباعیات کافی عمدہ ہیں، فنی اعتبار سے بھی زبان وبیان کے لحاظ سے بھی دلکش و پراثر ہیں۔

دوسری خاتون زیب النساء زیبی سلمہا ہیں جنہوں نے کافی رباعیاں تخلیق کی ہیں جنہیں میں نے بالاستیعاب دیکھا ہے۔ وہ رباعیات پورے چوبیس اوزان میں ہیں یعنی اوزان اخرب اور اخرم میں طبع آزمائی کی ہے۔ مختلف موضوعات پر اچھی اچھی رباعیات کہی ہیں۔ ان میں شعری محاسن ہیں، زبان شگفتہ وشستہ ہے، سیر یع التاثیر ہیں، ابلاغ کافی آسان ہیں، حیات وکائنات کے اہم موضوعات پر ہیں۔ زیبی نے زبان وبیان پر مضبوط گرفت رکھی ہے، فنی امور میں بھی اکثر رباعیات مستند ہیں، ان کی رباعیات میں اضمحلال زبان وبیان نہیں، تعقید لفظی ومعنوی بھی نہیں، تعصیب بھی نہیں، شکست ناروا، اخلال، ثقل بیان نوالی اضافت نیز دیگر معائب سخن سے پاک ہیں۔ پاکستان کی خواتین شاعرات میں ان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے ستر اصناف شاعری میں طبع آزمائی کر کے انفرادیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے سرمایہ سخن کے دو ضخیم کلیات ہیں۔ پہلا کلیات بنام ''سخن تمام'' ہے اس میں انہوں نے تئیس مجموعہ کلام شامل کیے ہیں۔ اس کلیات میں ستر اصناف سخن پر مشتمل کلام شامل ہیں۔ اس میں نظمیں شامل ہیں۔ انہیں میں نے زبان وبیان کے اور فنی اعتبار سے بالاستیعاب دیکھا ہے۔ ان کی اس کلیات میں جو کلام منظومات کی شکل میں موجود ہے وہ کھرے سونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سو سے زیادہ رباعیات بھی ہیں۔ ان رباعیات میں ایک رباعی بطور امثلہ حاضر ہیں:

گلشن سے خزاں جائے تو آتی ہے بہار
شاخوں پہ عجب رنگ دکھاتے ہیں گلاب
دنیا کو کرامت بھی دکھاتی ہے بہار
شبنم سے بھی ہر روز نہاتے ہیں گلاب

مندرجہ بالا دونوں رباعیات میں نہایت سادگی کے ساتھ اپنے احساس کو بیان کیا ہے۔ پہلے تین مصرع حسن ادا میں برابر کے ہیں اور چوتھا مصرع ہر رباعی کے تینوں مصرعوں سے توانا ہے۔ رباعی کی بڑی خوبی میں یہ بات نہایت اہم ہے جو شاعرہ موصوف نے نظر انداز ہونے نہیں دی ہے۔ زیبی حسن مفہوم کو بیان کرنا جانتی ہیں اپنی مہارت شعری کی بنا پر شعریت کے ساتھ شعری قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ مندرجہ ذیل رباعی کو ملاحظہ فرمائیے ایک خبر کو اپنی شاعرانہ کاریگری سے انشا بنا دیا ہے۔

موجوں کا تلاطم ہو، کہ پانی کا بہاؤ
ساحل ہو سمندر کا کہ ہو اس کا کٹاؤ
کہتا ہے ذرا دھیان سے ہونا ہے سوار
اے انساں ڈبو دے نہ کہیں ہستی کی ناؤ

موجوں کا تلاطم، ساحل، سمندر، کٹاؤ یہ سب ایسی علامت ہیں جو زندگی

میں مسائل دشوار سے تعلق رکھتی ہیں ان کے پیش نظر خبردار کیا گیا ہے کہ اے انسان ہوشیار، دنیا کشتی حیات کہیں ڈبو نہ دے۔ اس پر سوار ہونے یعنی اس کو گزارنے کے لے ہوشیاری اور سمجھداری کی ضرورت ہے۔

بقول میر تقی میرؔ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

مندرجہ ذیل رباعی میں حکیمانہ نکتہ ہے زندگی گزارنے کے لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایک درس ہے۔ ایک اہم پیغام ہے نہ بیان میں ثقل نہ شعریت میں کمی۔ زیبی نے تصور ہجرت اور اس کے ظاہری و باطنی کرب کا اظہار کیا ہے۔ مصرع رواں الفاظ مترنم ہیں:

کہتا ہے مسافر سے مسافت کا غبار
دیکھا ہی نہیں آپ نے ہجرت کا غبار
کرتا ہے زمانے کی ہر اک چیز کو دھول
جب قلب میں اٹھتا ہے بغاوت کا غبار

محولہ بالا رباعی میں چوتھا مصرع اپنی معنویت کے اعتبار سے نہایت مستحکم ہے تینوں مصرعوں میں جس بات کا اظہار کی تشکیل و تکمیل کر کے صراحت کرتا ہے اچھی رباعی ہے شعریت کا حسن ماند نہیں ہے دنیا میں رہنے کے لیے بڑے ہنر اور ہوشیاری کی ضرورت ہے اس بات کو خوبصورت انداز سے شعری صورت گری کی ہے:

دنیا میں ہر اک کام کے ہوتے ہیں اصول
یہ ذہنِ کشادہ سے بھی کرنا ہیں قبول
کرنی ہے ہمیں خیر میں شر میں بھی تمیز
ادراک نہ اس کا ہوتو ہر کام فضول

محبت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور نفرت کو تاریک ضمیر سے مثال دی ہے۔ معمولی سی بات کو انداز بیان سے شعریت کے ساتھ رباعی میں ڈھال دیا ہے۔ زیبی سلیقہ بیان میں سادگی کو ترجیح دیتی ہیں تاکہ معمولی استعداد علمی رکھنے والا بھی بآسانی سمجھ لے مندرجہ ذیل رباعی دیکھئے حسن بیان سے مزین ہے۔ سریع التاثیری اور ابلاغ بلا کا ہے۔ چوتھا مصرع کرتا ہی رہوں گا میں تیرا تجھ سے سوال، کتنا پر معنی ہے۔ تینوں مصرعوں کی جان ہے اصول رباعی کی پوری پابندی کا حامل ہے۔ ایک رباعی دیکھئے:

کتنا ہے چکاچوند ترا حسن وجمال
پایا نہ اگر تجھ کو، مجھے ہوگا ملال
چاہوں گاہر اک لمحہ تجھے غیرتِ حسن
کرتا ہی رہوں گا میں ترا تجھ سے سوال

■

اب کون سنے گا، مری رودادِ سفر
انسان پہ ہوتا ہی نہیں کوئی اثر
جس شاخ پہ پنچھی کا ٹھکانہ تھا سنو!
ظالم نے وہی کاٹ دی ہے شاخِ شجر

محولہ بالا رباعیات ہی نہیں زیبی کی اکثر رباعیات میں بیان کی توانائی بھی ہے خیال کی بھی، اور سب سے بڑھ کر شعری جمال بھی کہیں ماند نظر نہیں آتا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ شاعرہ موصوف نے جس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اس کا حق ادا کیا ہے اسے ہر لحاظ سے نباہا ہے ان کی رباعیات میں زندگی بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے شعروں کا نفس ناطقہ لکنت اظہار کے نقص سے پاک ہے۔ اس اعتبار سے وہ رباعی گو بھی اچھی ہیں ان کی رباعیات میں جان ہے قاری کو اپنی طرف کھینچنے کی خوبی موجود ہے۔ دو رباعیاں اور دیکھئے:

اے کاش! نہ ٹوٹ کے بکھرا ہوتا
دھڑکن سے مرے دل کا بھی رشتہ ہوتا
میں جس کا شناسا ہوں تمنائی ہوں
ایسا مرا وہ شخص شناسا ہوتا

■

خوشبو ہے پھول میں نہ کلیوں میں مہک
غنچوں کی ہے لہک، نہ بلبل کی چہک
یارب! اس ملک کو نظر کس کی لگی
سورج میں ہے دمک نہ چندا میں چمک

مندرجہ بالا رباعی میں اس کرب اور پریشانی کی داستان چھپی ہوئی ہے جو اپنے ملک میں دہشت گردی کے سبب سے ہے۔ جب کوئی غم واندوہ دل و دماغ پر حاوی ہوتا ہے تو انسان کو کسی چیز سے دلی رغبت نہیں رہتی، ایک خوف و ہراس اس کی ذات پر محیط ہوجاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو محولہ بالا رباعی میں بیان ہوئی ہے۔

زیبی سلمہا نے اپنی رباعیوں میں بھی شاعرانہ سحر کاری دکھائی ہے۔ رباعیات کی زیادہ تعداد محاسن وروائع سے مزین ہیں۔ ان میں سادگی کا حسن موجود ہے۔ تمام سرمایہ شاعری تو بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر کا ہم پلہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا زیبی کی رباعیوں میں ایک جیسا شعری جمال ڈھونڈنا مناسب نہیں۔ مجموعی اعتبار سے رباعیاں اچھی ہیں اور حلقہ شاعرات میں ان کو انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے رباعی بھی کہی ہے اور حتی المقدور ریاضت شعری کا دخل رکھا ہے۔ وہ رباعی کہنے والے شعرا میں اچھے اندا زمیں شمار ہوں گی۔ رباعی کا مورخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

'نیرنگ رباعی': ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر مجاہدالاسلام
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ، یوپی۔ موبائل: 9628845713)

رباعی کو ایک مشکل صنف سخن مانا جاتا ہے۔ لیکن صرف رباعی ہی کیوں؟ رباعی کے ساتھ ساتھ قصیدے کو بھی تو اسی صف میں شمار کیا گیا ہے۔ ماہرین لغت نے قصیدہ کے کئی معنی لکھے ہیں، انھیں میں سے ایک معنیٰ 'مغز غلیظ اور سطبر' کے بھی ہیں۔ اس معنیٰ کا قصیدہ پر انطباق اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح 'مغز انسانی' کو جسم میں دیگر اعضاء کے مقابلے میں تفوق حاصل ہے۔ یہی صورت حال اردو کی جملہ شعری اصناف میں اپنے مضامین جلیلہ ومتینہ کی وجہ سے قصیدہ کو حاصل ہے۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ قصیدے میں غالبؔ جیسے قادرالکلام شاعر کی مرزا محمد رفیع سوداؔ کی تتبع وتقلید تو بڑی دور کی بات رہی، وہ اپنے ہی ایک ہم عصر شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ سے بھی بہت پیچھے نظر آتے ہیں اور فقط چار قصیدے لکھ کر یہ کہتے ہوئے ہاتھ کھڑے کر لیے کہ یہ صنف میری طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتی اور جو کچھ بھی میں نے اس میدان میں کہنے کی کوشش کی ہے وہ فقط اس لئے کہ لوگ مجھے 'یک فنا' نہ کہیں۔ مطلب یہ کہ لوگ یہ نہ سمجھیں میں غزل تو کہہ سکتا ہوں لیکن قصیدہ نہیں۔

اتنی لمبی تمہید کا مقصد بس یہ ثابت کرنا ہے کہ فقط رباعی ہی مشکل صنف سخن نہیں ہے بلکہ رباعی کے علاوہ قصیدہ بھی ایک مشکل وادق صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم وجدید شعراء میں چند ہی ایسے ہیں جنھوں نے کہ ان دونوں اصناف میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ صنفِ رباعی کی فنی مشکلات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی نے 'رباعیات محروم' کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''رباعی کہنا بڑا مشکل ہے، یہ وہ کمبخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی ہے جب تک کے زمانے کی سرد وگرم ہوا میں شاعر کی حساس اور مفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہے۔''

(رباعیات محروم: مصنف منشی تلک چند محروم۔ دیباچہ جوش ملیح آبادی)

اسی طرح مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی 'کلیات خواجہ عزیز لکھنوی' کے مقدمے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> ''اصناف سخن میں سب سے زیادہ مختصر رباعی ہے جو سب سے مشکل ہے۔ دیکھو صدیوں کے دوران میں صرف چار پانچ ہی استاد رباعی گزرے ہیں۔''

(کلیات خواجہ عزیز لکھنوی۔ دیباچہ از مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی)

کسی بھی تصنیف وتخلیق کا جائزہ لیتے وقت جن چند باتوں پر خاص طور سے دھیان دیا جاتا ہے، ان میں سب سے پہلی یہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں جو مواد ومٹریل استعمال ہوا ہے وہ کس مرتبے کا ہے؟ اور دوسری، جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس تصنیف کا انداز بیان یعنی اسلوب کیسا ہے۔ رباعی کی تعریف کرتے ہوئے نامور محقق وناقد شمیم احمد نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'اصناف سخن اور شعری ہیئتیں' میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اردو کی اصناف سخن میں رباعی ایک چھوٹی سی لیکن اہم صنف ہے۔ یہ عام طور پر فلسفیانہ، اخلاقی، تفکیری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پر مبنی ہوتی ہے، لیکن اس کا عام رنگ وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں Lyrical کہتے ہیں یعنی یہ خطابیہ اور اصلاحی انداز سے عموماً گریز کرتی ہے۔''

(اصناف سخن وشعری ہیئتیں: شمیم احمد۔ ص 69)

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے 'مشتے از خروارے' کے مصداق بلا کسی تشریح و تبصرے کے پہلے کچھ قدیم اور پھر دورِ متوسط کے کچھ شعراء کی رباعیاں درج کردی جائیں، تاکہ عام قارئین کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجائے کہ 'اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا'۔ اسی طرح فارسی کا مشہور محاورہ ہے 'مشک آن است کہ ببوید نہ آن کہ عطار بگوید۔ اس مقصد سے یہاں پر سب سے پہلے میر انیسؔ، امجد حیدر آبادی، اکبر الہ آبادی اور پھر جگت موہن لال رواں کی ایک ایک رباعیاں ملاحظہ کی جائیں:

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا
(میر انیس)

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی
اللہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو
رویت ممکن نہیں تو رویا ہی سہی
(امجد حیدر آبادی)

در پہ مظلوم اک پڑا روتا ہے
بچارا بلا میں مبتلا روتا ہے
کہتا ہے وہ شوخ تال سم ٹھیک نہیں
کیا اس کی سنوں کہ بے سرا روتا ہے
(اکبر الہ آبادی)

افلاس اچھا، نہ فکر دولت اچھی
جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاح نفس ناممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی
(جگت موہن لال رواں)

بعد میں جب جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، جاں نثار اختر وغیرہ نے رباعیاں کہیں تو اس میں انہوں نے تفکیری عناصر کے ساتھ ساتھ رندی، سرمستی اور عشق و عاشقی کے مضامین کا بھی اضافہ کیا۔ ان شعراء کی کچھ رباعیاں بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ کرتے چلیں:

تیری ہر ادا پہ کیوں نہ دل ہو لہلوٹ
میٹھی ہے، ترے ہات کے پتھر کی بھی چوٹ
یوں ہے، ترے لاگ میں لگاوٹ گویا
بیساکھ کی چولی میں ہے برسات کی گوٹ
(جوش ملیح آبادی)

مکھڑا دیکھیں تو ماہ پارے چھپ جائیں
خورشید کی آنکھ کے شرارے چھپ جائیں
رہ جانا وہ مسکرا کے تیرا کل رات
جیسے کچھ جھلملا کے تارے چھپ جائیں
(فراق گورکھپوری)

یہ پھول سا لہجہ، یہ رسیلی آواز
یہ تیرے تکلم کا دل آویز انداز
یہ لوچ یہ نرمی یہ گھلاوٹ یہ کشش
صدقے ترے اک لفظ پہ سو رازو نیاز
(جاں نثار اختر)

یہ تو تھیں قدماء و متوسطین کی چیدہ چیدہ کچھ رباعیاں۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کا مشہور شعر ہے:

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہوں صیاد

ڈاکٹر عبدالحق امامؔ (گورکھپور) کا شمار ہندو پاک کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ معتد بہ تعداد میں رباعیاں بھی کہی ہیں اور اس میں ایک اختصاص بھی قائم کیا ہے۔ فی الوقت میرے پیش نظر ہے ڈاکٹر عبدالحق امامؔ کی رباعیوں کا ضخیم مجموعہ 'نیرنگ رباعی' جو کم بیش 2700 رباعیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈاکٹر عبدالحق امام کا اہم کارنامہ ہی نہیں ہے بلکہ فی زمانہ ایک نظیر اور مثال کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل ان کی رباعیاں کسی خاص موضوع تک محدود نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں نیرنگی کا حامل ہے۔ جس میں حمد و نعت، منقبت و موعظت، پند و نصائح، سیاست و تاریخ اور معیشت و معاشرت سبھی کچھ شامل ہیں۔

ذیل میں کچھ رباعیاں بطور مثال پیش کی جارہی ہیں۔ دنیا سے لاتعلقی اور خدا سے عبدیت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

دنیا سے کوئی کام نہیں اب اپنا
لوگوں سے غرض کوئی نہ مطلب اپنا
اللہ کا بندہ ہوں محمد کا غلام
اسلام ہے اے امام مذہب اپنا

عبدالحق امام نے اسلام کو اپنا مذہب کہہ کر اپنی سوچ اور فکر کو واضح کیا ہے۔ یہ موضوع رباعی کا ایک روایتی موضوع ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس موضوع کو برتنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کا انفراد ظاہر ہے۔ عرفان ذات کا حصول بھی روایتی موضوعات میں شامل ہے اور تقریباً ہر رباعی گو نے عرفان کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب عبدالحق امام نے اس کو اپنے فن کا حصہ بنایا تو دیکھیے، کس طرح سے اس کا اظہار کیا:

انسان کو عرفان ملا ہے کیسا
اللہ کا وردان ملا ہے کیسا
ہر وقت عبادت میں لگا رہتا ہے
دیکھو اسے نروان ملا ہے کیسا

وردان اور نروان جیسے الفاظ کا خوبصورت استعمال ہی اس رباعی کا حسن ہے۔ انسان کو عرفان کا حصول ہوا ہے یہی اس کے لیے وردان ہے یعنی نعمت ہے۔ اور وہ نعمت کیا ہے؟ وہ نعمت یہ ہے کہ اسے محوِ عبادت رہنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ اور یہی توفیق ہی ان کی نجات کا سبب نہیں بلکہ خود نجات ہے۔ کیوں کہ جس شخص کو ہر وقت عبادت میں رہنے کی توفیق حاصل ہوگئی ہے، پھر اس کی نجات میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔ اس لیے عبدالحق امام نے اس کو نجات سے تعبیر کر دیا ہے۔ اظہار عبدیت اور عرفان ذات جیسے موضوعات کو برتنے کے ساتھ ساتھ عبدالحق امام نے حسن و عشق کے موضوعات کو بھی اپنی فنکاری میں جگہ دی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

لہراتی ہوئی چلتی ہے جب وہ آنچل
پھر دیکھ کے جاتا ہے مرا دل یہ مچل
اس طرح بنا دیتی ہے دیوانہ مجھے
جیسے کہ مری جان ہی جائے گی نکل

آنچل، مچل اور نکل کے قافیے نے رباعی میں غنائی حسن (Lyrical Beauty) کو دوبالا کر دیا ہے۔ حالانکہ محبوب کے ان متعلقات کا ذکر صدیوں سے شعراء اپنی شاعری میں کرتے آرہے ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔ لیکن یہاں عبدالحق امام کی کامیابی کی سطح دیکھنے لائق ہے اور گنگنانے کے بھی۔ محبوب کے انگ انگ کو دیکھ کر عاشق پر مدہوشی کی کیفیت طاری نہ ہو تو وہ عاشق ہی کیسا! اسی موضوع کو دیکھیے عبدالحق امام نے کس فنکاری سے اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے:

موجوں سا چھلکتا ہے اس کا ہر انگ
دریا کی طرح اس میں بھی اٹھتی ہے ترنگ
مدہوشی کا نشہ نہ رہے کیوں مجھ پر
آنکھوں میں ہے جب اس کے سراپے کی امنگ

یہاں عبدالحق امام نے مدہوشی کا سبب بیان کر کے وجہ امتیاز قائم کر لیا ہے۔ محبوب سے متاثر ہونا، ان کے حسن کی تعریف کرنا عاشق کا شیوہ ہے لیکن اگر عاشق پر اس کی وجہ واضح ہو جائے تو اس کے لیے اپنی روش پر قائم رہنا آسان ہو جاتا ہے اور پھر کسی واعظ کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو عبدالحق امام نے بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ ایک اور رباعی میں کہتے ہیں:

کیا خوب تری چال ہے کیا خوب لچک
ہے خوب نرالی ترے پائل کی کھنک
پاگل نہ بنا دے کوئی مدہوش نہ ہو
ماتھے پہ یہ ٹکلی ہے کہ جلتا دیپک

ماتھے کی ٹکلی کو جلتے دیپک سے تعبیر کرنے کی ترکیب بطور خاص توجہ اور داد کا طالب ہے۔ دیپک کا کام روشنی کرنا ہے لیکن ٹکلی سے تو روشنی نہیں پھوٹتی۔ پھر کیوں شاعر نے اس استعارے کا استعمال کیا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ عاشقوں کو ٹکلی سے روشنی نکلتی ہوئی محسوس ہو۔ لیکن عام طور سے عاشقوں کے یہاں ٹکلی کو اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بس وہ سمجھتے ہیں کہ حسن میں اضافے کا سبب ہوتا ہے اس لیے ٹکلی لگا لی جاتی ہے۔ لیکن شاعر اتنا سطحی نہیں سوچ سکتا۔ شاعر نے ٹکلی کی ابتدائی کہانی کو ذہن میں رکھ کر اسے دیپک سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جب رشیوں منیوں نے دیکھا کہ خواتین کے لیے 'تیسری آنکھ' جو بصیرت کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے، کو فعال کرانے میں کچھ زیادہ ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ حسن میں اضافے کی بھی خواہش رکھتی ہیں تو پھر رشی جس طرح اپنی پیشانی پر ایک لمبا سا ٹیکہ وضع کر کے اپنی 'تیسری آنکھ' کو فعال کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح خواتین کو ایک بنا بنایا (Ready Made) چھوٹا سا ٹیکہ 'ٹکلی' کی صورت میں دے دیا۔ اس طرح ایک چھوٹی سی ٹکلی کو اپنی پیشانی پر لگا کر خواتین

کے لیے بصیرت کے حصول کا راستہ آسان ہو گیا۔ 'تیسری آنکھ' سے ہی دراصل روشنی پھوٹتی ہے اور انسان صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ تو جب عاشق کو لگتا ہے کہ اس کا محبوب صرف ظاہری حسن سے آراستہ نہیں ہے بلکہ وہ صاحبِ بصیرت بھی ہے تو اس کے لیے اس کے دل میں عزت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی کیفیت کے اظہار کے لیے یہاں شاعر نے ماتھے کی ٹکلی کو دیپک سے تعبیر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان رباعیات میں موضوعات کی رنگارنگی، مضمون آفرینی، زبان کی سلاست اور اسلوب کی دلکشی کو کوئی بھی قاری بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ان رباعیوں میں موضوعات کی بے ہنگمی کو دیکھتے ہوئے قاری کو یہ گمان گزرتا ہے کہ جیسے کوئی شکاری مچان پر توشیر کے شکار کے لیے بیٹھا مگر اس نے کثرت شوق میں نیل گائے یا پھر جنگلی سور کا شکار بھی کر لیا۔ زیر نظر مجموعے میں اس قبیل کے اشعار بکثرت ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

موبائل کرنے سے نہیں گھبراتی
ہر ایک کو رستے میں ہے وہ دکھلاتی
دنیا کی کبھی کرتی نہیں وہ پروا
ساجن کے لیے سلفی ہے وہ کھنچواتی

■

آسان نہیں بد عنوانی کا علاج
دلی میں نہیں آپ کی چشتی کا علاج
ہر سمت ہے جب چھوت کی یہ بیماری
پھر کیسے ہو اس فرقہ پرستی کا علاج

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شاعر افکار کی بہتات کا شکار ہو گیا ہے۔ اس لیے قاری کو ان رباعیوں کے مطالعے سے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے پاس اب کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے اور وہ بڑی زور زبردستی سے اپنے دور و پاس کی 'الم غلم' اشیاء و مناظر کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ اس لیے ضبطِ تخلیق پر قدرت سے شاعر عاری نظر آرہا ہے۔

جہاں رہی ان رباعیوں میں زبان و بیان کی بات تو شاعر نے ان کو سجانے سنوارنے میں کوئی بھی کور و کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اردو کے مروجہ الفاظ و محاورات، تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ ہندی و انگریزی کے الفاظ و محاوات کا بھی استعمال کثرت سے کیا ہے، جو کہ ڈاکٹر عبدالحق امام کی قدرتِ زبان پر دلالت کرتا ہے مگر جہاں پر یہ چیزیں حد اعتدال سے بڑھ گئی ہے، وہاں رباعیاں مضحکہ خیز بن گئی ہیں۔ اس قبیل کی بھی چند مثالیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

کثرت سے نہ گرمی میں پیو آب فریج
پہنچائے گا نقصان سنو آب فریج
ہلکا پیو لیکن جو بہت ٹھنڈا ہو
بہتر ہے کہ پینے سے بچو آب فریج

■

سڑکوں پہ چلتے ہیں یہ غنڈوں کے جھنڈ
دن رات ملیں گے تمھیں شہدوں کی جھنڈ
چالاکی سے زیور کو جھپٹ لیتے ہیں
اس دیش میں ہر سمت ہیں چوروں کے جھنڈ

جہاں تک رہی ان رباعیوں میں اوزان و بحور کی بات تو شاعر نے رباعی کے متداول اوزان و بحور پر ہی اکتفا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبالؔ جیسے عبقری شاعر نے بھی اپنی نظموں و غزلوں میں متداول اوزان و بحور پر ہی تشفی کی تھی۔

زیر نظر مجموعہ 'نیرنگ رباعی کے' مطالعے کے دوران عام قاری جس بات کو شدت سے محسوس کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ کاش! ڈاکٹر عبدالحق امام کی ان رباعیوں کا ایک جامع انتخاب شائع ہوتا۔ قاری کے علم میں ہے کہ میرؔ اردو کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کے سات دیوان شائع ہوئے۔ ناقدین نے انھیں خدائے سخن اور شہنشاہ تغزل کے خطاب سے نوازا ہے۔ ان سب کے باوجود غالبؔ کے مقابلے میں میر کو نہ تو آج تک وہ مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ وہ اس طرح سے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں جس طرح کے غالبؔ۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ غالب کا منتخب کلام ہی متداول ہے۔ جب کہ میرؔ کے ساتھ ابھی بھی ایسا کچھ نہیں ہو سکا۔

میں یہی کچھ ڈاکٹر عبدالحق امامؔ کی ان کی رباعیوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ حقیقت میں وہ سبھی رطب و یابس جو شاعر اپنی طویل ریاضت کے دوران کہتا ہے، وہ سبھی کچھ شائع کرانے کے لائق نہیں ہوتا۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہمارے شاعر و ادیب غالبؔ کے اس واقعہ سے نصیحت حاصل کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں دور حاضر میں ڈاکٹر عبدالحق امام رباعی کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی رباعیوں کا ایک جامع انتخاب شائع ہو جس سے کہ جہاں ماہرین فن کو ان کی رباعیوں پر صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو، وہیں ان کو اور ان کی رباعیوں کو شہرت عام و بقائے دوام بھی حاصل ہو۔

☆☆☆

نشتر یاس یگانہ چنگیزی

ڈاکٹر امیر حمزہ

(سی آئی ای ٹی، این سی ای آر ٹی، اربندو مارگ، نئی دہلی۔ موبائل: 8877550087)

''نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی'' پر ان کا عمل تھا لیکن یگانہ نے اپنی نوا میں اکثر جگہ اتنی شدت اور تلخی پیدا کر لی ہے کہ 'ذوق نغمہ' اس کی تاب آسانی سے نہیں لا سکا۔ کیا غزل کیا رباعی، یگانہ کے تند لہجہ میں کہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ان کا اسلوب خود ان کا ہے اور اس میں ایسی انفرادیت ہے کہ یگانہ کے اکثر اشعار دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رباعی گوئی کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔''

فرمان فتح پوری (۲۰۱۳۔۱۹۲۶) کے اس اقتباس اور یاس یگانہ چنگیزی (۱۹۵۴۔۱۸۸۴) کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ناکام آرزوؤں اور ذاتی محرومیوں نے یگانہ کو تنہائی کا مریض بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی نشتر یاس سے معاشرہ میں مسلسل ہلچل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ معاشرے کی رسم پرستی، قدامت پسندی، تنگ نظری، تقلیدی روش اور تقدیر پر مکمل قناعت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جمود اور فکری بے حرکتی کو وہ طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ رباعیوں میں ان کا یہ رنگ عام طور پر نظر آتا ہے۔

یگانہ کے بیان میں جو تلخی گھلی ہوئی ہے اس کا سبب زمانے کی ناقدر شناسی کو ہی سمجھنا چاہیے، جس نے یگانہ کی چنگیزی رگ کو بہت ہی زیادہ پھڑکایا۔ لیکن ایسا ہوتا چلا گیا اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا، وہ اپنے دھن میں چلتے رہے اور زمانہ بھر سے لڑائی مول لے کر 'تنہائی' کو اپنے لیے جمع کیا جس سے اور زیادہ نشتریت آ گئی۔

ادبی دنیا میں متضاد و متنازع کا عمر بھر شکار رہنے والا مرزا افضل علی بیگ المعروف بہ واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی کی پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ میں پٹنہ کے محلہ مغلپورہ میں ہوئی۔ ان کے والد مرزا پیارے کا تعلق جاگیردار خاندان سے تھا، لیکن مرزا پیارے تک آتے آتے جاگیرداری کا سورج غروب ہو چکا تھا، البتہ اقدار و روایات باقی تھیں، تعلیم کی جانب توجہ تھی، یگانہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی، یگانہ نے، ۱۹۰۳ میں محمڈن اینگلو عربک اسکول عظیم آباد سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۰۴ میں کلکتہ پہنچے۔ یہاں وہ نواب واجد علی شاہ کے فرزند محمد مقیم کے پسران محمد یعقوب علی مرزا اور محمد یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم کے استاد مقرر ہوئے لیکن کلکتہ کا ماحول اور آب و ہوا راس نہیں آئی۔ جلد ہی پٹنہ واپس آ گئے، ۱۹۰۵ میں علاج کی غرض سے لکھنؤ کا سفر کیا، وہاں کے حسن سے ایسے مرعوب ہوئے کہ تا عمر لکھنؤ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ لکھنؤ آمد کے ۸ سال بعد ۱۹۱۳ میں حکیم مرزا محمد شفیع کی لڑکی کنیز حُسین سے شادی ہوئی۔ لکھنؤ میں اودھ اخبار کے کچھ عرصہ مدیر بھی رہے، ریلوے میں بھی ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۲۴ میں اٹاوہ چلے گئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی، وہاں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین یگانہ کے بڑے قدرداں اور مداح تھے۔ اٹاوہ رہ کر انہوں نے ایک رسالہ ''صحیفہ'' بھی جاری کیا، لیکن اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے اور ایک پریس میں کام کیا۔

۱۹۲۶ میں ''اردو مرکز'' میں کام کرنے کے لیے لاہور پہنچ گئے۔ ''اردو مرکز'' میں ملازمین کے لیے درخواست مانگی گئی تھی۔ اس بابت جن لوگوں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں ان میں سیماب اکبر آبادی، جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی بھی تھے جن کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ لاہور میں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا، حلقۂ احباب بھی وسیع ہوا، اخبارات و رسائل کے مدیران سے رشتہ بھی استوار ہوا، اہم رسائل و اخبارات میں ان کا کلام بھی شائع ہوتا رہا اور کافی شہرت بھی حاصل کی۔ شروع کے ایام میں لاہور علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں، بعد میں یگانہ علامہ اقبال کے بھی مخالف ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۸ میں عثمان آباد دکن چلے گئے اور ۱۹۳۳ تک سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز رہے، پھر لاتور تبادلہ ہو گیا وہاں ۱۹۳۷ تک قیام رہا، ۱۹۳۸ میں سَیلو میں رہے اور ۱۹۴۱ سے ۱۹۴۲ تک وہ یادگیر میں مقیم تھے۔ ۱۹۴۲ میں ۵۵ برس کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ پندرہ روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی

جس سے گزارہ بہت مشکل تھا اس لیے روزی روٹی کے لیے حیدرآباد، بمبئی اور کبھی دیگر شہروں کا رخ کیا۔ تقسیم کا سانحہ پیش آیا تو بچے پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۵۱ میں بیوی بھی پاکستان چلی گئیں تو ان سے ملنے کچھ دن بعد یگانہ بھی پہنچے، کراچی میں قیام کیا، اپنے بیٹے آغا خان سے ملنے پیشاور گئے، چھوٹے بیٹے مرزا وحید سے ملنے کول گئے وہاں سے لاہور کے راستے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تو گرفتار کر لیے گئے۔ کیوں کہ ان کے پاس صرف کراچی کا پرمٹ تھا جہاں سے وہ کھوکھرا پار کے راستے سے ہندوستان آسکتے تھے، لاہور کے راستے ممکن نہیں تھا اس لیے گرفتاری کے بعد کچھ دن قید میں گزارے، عدالت میں پیش ہوئے پھر رہائی کے بعد کراچی سے دہلی بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے۔

۱۹۵۳ میں انہوں نے کچھ قابل اعتراض رباعیاں اخبارات میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیں۔ ایک اخبار نے اس معاملے کو خوب اچھالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا گھر لوٹ لیا گیا، مکان پر قبضہ کر لیا گیا اگرچہ پولیس کی مداخلت سے ان کی جان بچ گئی لیکن اس حادثہ نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ سب پاکستان میں تھے وہ تن تنہا لکھنؤ میں تھے۔ اسی عالم تنہائی میں ۳ فروری ۱۹۵۶ کو ان کا انتقال ہوا اور وکٹوریہ گنج کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

یگانہ بیک وقت صحافی، ادیب، ناقد، عروض داں اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نشترِ یاس (حصہ اول) شعری مجموعہ اپریل ۱۹۱۴ میں لکھنؤ سے چھپا (۲) چراغِ سخن (اردو نثر/ رسالہ عروض وقوافی) ۱۹۱۵ اور ۱۹۲۱ میں لکھنؤ سے چھپی (۳) کارِ امروز (ادبی ماہانہ رسالہ) چھ شمارے شائع ہوئے۔ (۴) صحیفہ (ادبی ماہوار رسالہ) ایک شمارہ شائع ہوا۔ (۵) شہرتِ کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز (عزیز لکھنوی کی شاعری پر اعتراضات) ۱۹۲۵ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی (۶) آیاتِ وجدانی بمع محاضرات (شعری مجموعہ) پہلی بار ۱۹۲۷ میں لاہور سے، دوسری بار ۱۹۳۴ میں دہلی سے اور تیسری بار ۱۹۴۵ میں حیدرآباد سے شائع ہوا (۷) ترانہ (مجموعۂ رباعیات) ستمبر ۱۹۳۳ میں لاہور سے شائع ہوا۔ (۸) غالب شکن (مکتوبِ یگانہ بنام مسعود حسن رضوی ادیب) ۱۹۳۴ میں آگرہ سے۔ (۹) غالب شکن دو آتشہ ۱۹۳۵ میں آگرہ سے۔ (۱۰) گنجینہ (مجموعۂ غزلیات ورباعیات) ۱۹۴۷ میں لاہور سے۔ (۱۱) کلیاتِ یگانہ (مرتب بقلم خود بفرمائش علی سجاد ظہیر) ۱۹۲۶ میں۔ ان تمام کے علاوہ انھوں نے کثرت سے مضامین لکھے جن میں عروضی بحث اور غالب کی مخالفت زیادہ نظر آتی ہے۔

یگانہ اردو ادب کی دنیا میں شہرت پر فائز رہے لیکن اس کے اسباب جدا تھے، انہی کے زمانہ میں حسرت، فانی، جگر، اصغر اور فراق جدید غزل میں اپنی شناخت بنا چکے تھے لیکن جوش نظموں میں اپنا لوہا منوا رہے تھے لیکن یاس یگانہ چنگیزی سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی جدید غزل کے معمار کی فہرست میں شمار نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کی شناخت ''غالب شکن'' کے طور پر ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے جیسا مزاج پایا تھا اس اعتبار سے وہ اپنے فن پر توجہ نہ دے کر غالب شکنی پر زیادہ توجہ دی ایسے میں ظاہر ہے کہ شاعر کا فن نہیں ابھر پاتا ہے بلکہ وہ ردفن کی جانب چلا جاتا ہے۔ یہ ان کی ضد کہہ لیجیے یا کچھ اور کہ یگانہ محض لکھنؤ والوں کو کمتر ثابت کرنے کے لیے غالب کی مخالفت کرتے رہے، اس سے غالب اور نہ ہی غالب پرستوں کا کوئی نقصان نہ ہوا، لیکن اس عمل کا ردعمل ایسا ہوا کہ یگانہ خود اپنی شاعری پر ایسی توجہ نہ دے سکے جس کی وہ مستحق تھی۔

یگانہ نے اپنی شاعری کا آغاز یاس عظیم آبادی کی حیثیت سے پٹنہ میں ہی کر دیا تھا، وہاں سید علی خاں بیتاب اور شاد عظیم آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ جب لکھنؤ میں قیام کیا تو ابتدائی دور میں پیارے صاحب رشید سے اصلاحِ سخن کا سلسلہ جاری رکھا۔ یگانہ آتش سے متاثر بھی تھے اور آتش کی تقلید میں ان کا رنگ بھی اپنی غزلوں میں لانا چاہتے تھے۔ آتش کے علاوہ میر کی شاعری سے یگانہ کو خاصی موانست تھی، میر سے وہ بیحد متاثر ضرور تھے جس کا اظہار انہوں نے ترانہ کی ایک رباعی میں کیا ہے جس میں غالب کی مخالفت بھی ہے۔

یگانہ جب لکھنؤ پہنچے تو ان کے تعلقات دیگر شعرا سے کافی خوشگوار تھے، وہ سب کے ساتھ مختلف مشاعروں اور طرحی نشستوں میں شامل ہوتے تھے لیکن یہ فضا زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی اور ادبی معرکوں کا ایسا سلسلہ چل نکلا کہ یگانہ آخری سانس تک اسی میں رہے۔ لکھنؤ میں زبان دانی کا شہرہ تھا، خواص تو خواص عوام بھی اِس مرض میں مبتلا تھے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو ذرا مشکل ہی سے مستند مانتے تھے۔ یگانہ توانانیت میں مست تھے، بس

پھر اہلِ لکھنؤ سے ٹھن گئی اور ایسی ٹھنی کہ یگانہ اپنا رنگ بھول کر جوابی رنگ میں آ گئے اور کمیاں نکالنا اور اپنی برتری ثابت کرنا ان کا رنگ ہو گیا اور تخلص تبدیل کر کے 'یگانہ چنگیزی' بن گئے۔ گویا کہ مخالفین کو مرعوب کرنے کے لیے 'چنگیزیت' کا سہارا تک لے لیا۔ خیر.....!

یگانہ کی رباعی گوئی کی بات کریں تو ''ترانہ'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں ۲۰۴ رباعیاں ہیں۔ ایک قطعہ بھی ہے۔ اس کل ۲۱۰ والی چھوٹے سائز کی کتاب میں ''مغالطہ'' کے عنوان سے شروع میں چار صفحہ کا مقدمہ ہے اس کے بعد پانچویں صفحہ سے ۲۱۰ تک ہر صفحہ میں ایک ایک رباعیاں ہیں، صفحہ نمبر ۱۱۶ میں ایک قطعہ ہے اور صفحہ ۱۷۹ میں ''مزاحیہ'' کا عنوان ہے۔ بعد میں مشفق خواجہ نے جب کلیات یگانہ مرتب کیا تو اس میں سے ایک قطعہ اور دو قابل اعتراض رباعیوں کو حذف کر دیا ہے۔ مجموعۂ کلام ''گنجینہ'' میں بھی ۱۷۳ رباعیاں ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے ضمیمہ میں ان کی دیگر رباعیوں کو جمع کیا ہے جس سے کل تعداد ۴۴۱ تک پہنچتی ہے۔

جہاں تک رباعیوں کی کیفیت کی بات کی جائے تو یگانہ نے اپنی جولانی طبع کے نتیجے میں مختلف انداز میں رباعی کے میدان میں قدم رکھا۔ ان کے اندر چونکا دینے والی کیفیت زیادہ تھی۔ وہ اپنے شعری اظہار کے ذریعہ سماج اور معاشرہ حتی کہ کائنات کو بھی چونکا دینا چاہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب رباعیوں میں جوش و فراق نئے نئے موضوعات داخل کر رہے تھے وہیں یگانہ نے نئے آہنگ کے ساتھ رباعیوں کے جملہ لوازمات کو برتتے ہوئے رباعیوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔

ہندوستان میں مشاعرہ رباعی پیش کرنے کے لیے کبھی سازگار رہا ہی نہیں ہے اور نہ ہی یہاں رباعی میں سر دھنتے ہیں ایسے میں یگانہ نے مشاعروں میں اکثر و بیشتر صرف اپنی رباعیاں ہی سنائیں۔ کیونکہ جس زور بیان کے لیے وہ جانے جاتے تھے وہ ان کی غزلوں سے زیادہ رباعیوں میں پایا جاتا ہے اور رباعی کو خاصیت ''از دل خیزد بر دل ریزد'' ہے۔ ایسے میں یگانہ چاہتے تھے کہ سامعین میں میری بات گھر کر لے اس کے لیے انہوں نے رباعیوں میں نشتر لانا شروع کیا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

یگانہ کی رباعیوں میں ان کی ذات کے چھوٹے چھوٹے شذرات نظر آتے ہیں۔ جس طرح خاموش مزاجی ان کا شیوہ نہیں رہا اسی طریقے سے معاشرتی جمود کو انہوں نے رباعیوں کے ذریعہ توڑنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ معاشرہ جامد ہو جائے اور اس میں تبدیلیوں کی لہر بہت ہی آہستہ ہو تو ایسے میں معاشرہ مردہ ہونے لگتا ہے اسی لیے یگانہ نے معاشرتی جمود کو اپنے سے توڑنے کی کوشش کی جس سے وہ خود تو سنگسار ہوئے لیکن فن کو سنگسار ہونے سے بچا لیا۔

''ترانہ'' قیام دکن کے دوران منظر عام پر آتا ہے۔ ترانہ سے قبل کی اشاعتوں پر نظر ڈالیں تو سب میں یہی ملتا ہے کہ وہ غزلیں کہتے تھے رباعیات کی جانب انہوں نے دکن میں ہی توجہ کی، اس کا کیا سبب ہے خدا ہی جانے لیکن ایک مدت تک جب اہل و عیال سے دور رہنا پڑا اور مستقل گھر کی یاد آتی رہی تو اس کے بعد تو اول اول رباعی کی شکل میں قربت تلاش کی۔

وہ گھر، وہ در ، وہ آستانہ بھولا
وہ گل ، وہ چمن ، وہ آشیانہ بھولا
وہ لحن ، وہ نغمہ ، وہ ترانہ بھولا
وہ دور، وہ عہد، وہ زمانہ بھولا

اس رباعی سے مجموعہ کے نام کی جانب بھی اشارہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ رباعی کا قدیم نام ترانہ تھا جسے اس کی غنائیت کے سبب شمس قیس رازی نے ترانہ نام رکھا تھا اور اس رباعی کے تیسرے مصرع میں نغمگی کے عناصر واضح طور پر ذکر ہوئے ہیں۔ یگانہ کا میلان بھی اس جانب ہے کہ جب وہ تنہائی کا شکار ہوئے تو ذہن میں گونجنے والی آوازوں اور یادوں کو سوز کی کیفیت کے ساتھ ساز میں ڈھال کر رباعی کے پیرایہ میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رباعی کو اظہار ذات کے ساتھ تسکین ذات کا وسیلہ بنایا تھا کیونکہ ملازمت کے سلسلے میں جب دکن کا سفر کیا تو اہل و عیال کی جدائی ان پر بہت ہی زیادہ شاق گزری اس کا اظہار انہوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔

یگانہ نے جب ترانہ سے اپنی رباعی گوئی کا آغاز کیا تو اس میں وہ ہجر کے غم سے مغموم تھے تو اسے انہوں نے آسودگیٔ ذات اور اطمینان ذات کا ذریعہ بنایا، مگر رفتہ رفتہ یہ ان کے مکمل اظہار ذات کا ذریعہ بنی اور رباعی کے ہی ذریعہ حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنانا شروع کیا

ساتھ ہی انہوں نے اپنی رباعیوں میں بعض غیر سنجیدہ رویوں کو بھی جگہ دی، رباعیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور یہاں تک کہ ایک مجموعہ بن جائے، پھر ''ترانہ'' کی شکل میں وہ سامنے آیا تو انہوں نے خود ہی اپنے کلام کو ''یگانہ آرٹ'' کا نام دیا۔ ''ماہنامہ شاعر'' کے مدیر افتخار امام کے لفظوں میں:

''ترانہ یگانہ آرٹ کا ایک خوب سیرت فن پارہ ہے''

یگانہ کی جس شاعری کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں یا ان کے عہد میں ان کے جس انداز بیان کے لیے ان کی دھوم تھی وہ معرکہ آرائیوں کے زیر اثر ہی پروان چڑھی تھی۔ لیکن ان کی تمام شعری کائنات (غزل و رباعی) کو رزم آرائیوں تک محدود کر دینا یا پھر اسی تناظر میں دیکھنا یہ ان کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ یقیناً معرکہ آرائی ان کی شاعری کا نمایاں عنصر ہے لیکن سب کچھ وہی نہیں ہے بلکہ ''ترانہ'' کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں کہ یگانہ کا احساس تنہائی شعر و نغمہ میں ڈھل گیا ہے۔ ترانہ میں تنہائی یگانہ کی شعری فکر کی روح رواں ہے، ان کی رباعیوں میں دیگر عناصر کے ساتھ ان کا سناٹا نظر آتا ہے۔ نفسیاتی طور پر دیکھا جائے تو وہ اپنی معرکہ آرائیوں سے جو ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ بھی ان کی تنہائی کا مداوا کے طور پر ہی سامنے آتی ہے۔ اس تنہائی میں جب وہ محبت سے دور ہو جاتے ہیں تو حقیقی محبت کے جذبات ان کی رباعیوں میں ابھر کر سامنے آنے لگتے ہیں۔ رباعی کے مقابلے میں ان ان کی غزلوں میں محبت کا مفہوم بہت کمزور نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنؤ میں تھے اور ہمیشہ گھر والوں کے ساتھ رہے لیکن جیسے جیسے وہ گھر سے دور ہوتے گئے اور جذباتی انتشار کا شکار ہوتے گئے تو پھر محبت کے جذبہ نے ان کے اس جذباتی انتشار کی تہذیب کی، یگانہ کو اس کا ذاتی تجربہ پہلے نہیں ہوا تھا جو دکن میں آکر ہوا۔ اس سے یہ ہوا کہ یگانہ ہجر کی کیفیت سے بھی دو چار ہوئے اور غم فرقت کی انوکھی لذت سے دو چار بھی ہوئے۔ اس طرح ان کی بے چینی اور تڑپ نے رباعی کی شکل میں اپنا اظہار کیا، اس کے لیے نرمی و ملائمت اور مٹھاس ان کے اندر آئی جو ان کے اندر بالکل نئی چیز تھی۔ ترانہ کی شروع کی دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ساجن کو سکھی منالو ، پھر سو لینا
سوتی قسمت جگالو، پھر سو لینا
سوتا سنسار ، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنالو، پھر سو لینا

■

دُکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا
آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوشِ دل سے سن کر
کیا ہے کوئی درد مول لینے والا

ان دونوں رباعیوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یگانہ نے جن کیفیات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی رباعیوں میں بالکل نمایاں ہیں جبکہ ان کی غزلوں میں بہت ہی درک کے ساتھ دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہاں بھی وہ کیفیات کے اظہار کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یگانہ کیفیات کے بھی شاعر ہیں اور کیفیت کا شاعر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی جس کی تلاش میں ناقدین بھی سرگرداں رہتے ہیں۔ اس قبیل کی تین رباعیاں اور ملاحظہ ہوں:

مرمر کے مسافر سر منزل پہنچا
پہنچا تو سہی مگر بہ مشکل پہنچا
دیکھے کوئی اس درد طلب کی پرواز
دل ایک تڑپ میں تا در دل پہنچا

■

دل نشہ میں سرشار نظر آنے لگا
ویرانہ بھی گلزار نظر آنے لگا
کیا جانیے محبت نے چڑھایا کیا رنگ
عالمِ گل بے خار نظر آنے لگا

یگانہ نے اپنی شناخت لکھنؤ میں رہ کر زبان دانی کی حیثیت سے بھی بنائی تھی اس معاملہ میں وہ دیگر کے کلام میں نقص ڈھونڈا کرتے تھے اور طنزیہ اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں شعر کے مصرعوں میں محاورات اور ضرب الامثال کو پیش کرنا فن کاری کی بات تھی آج بھی ہے اور ابھی بھی رباعیوں میں محاورات کو پیش کیا جاتا ہے جس کی کئی مثالیں وقت حاضر کے رباعی گو شعرا کے یہاں مل جاتی ہیں لیکن یگانہ کو اپنے اوپر زبان و بیان کا بہت ہی زیادہ زعم تھا اسی وجہ سے وہ غالب شکن کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یگانہ نے محاورات کو کس طرح استعمال کیا ہے:

منبر پر جناب جب ریز کریں
جو بات کریں مضحکہ خیز کریں
انگور حلال اور مئے انگور حرام
گُڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز کریں

یگانہ کی رباعیوں کی کامیابی وہاں نظر آتی ہے جب وہ فلسفہ وحکمت کے تحت کائنات کی ناقابل فہم وسعت، اس کا استمرار، احساس زندگی اس کی ماہیت، زندگی کی نااعتباری کے باوجود اس کی جانب رغبت، حسن اور عالم کانَ ما یکونُ میں اس کی دھوم، زندگی میں ناکامیوں اور حسرتوں کے باوجود بے پناہ شوق کی للک، زندگی کو آرزو وتمنا کے تابع کرنے کی کوشش پر اپنی بے مثال رباعیاں پیش کرتے ہیں۔ ایسے میں وہ کائنات پر اظہار خیال کرتے ہوئے چند ایسے ایسے سوالات سامنے لاتے ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش ہمیشہ کی جاتی رہی ہے۔ اس حوالے سے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

منزل کی خبر کسے ہے، منزل کی نہ پوچھ
منجدھار میں بہتا چل ، ساحل کی نہ پوچھ
کیا جانئے کس گھاٹ لیے جاتا ہے
آنکھیں جو دکھائے دیکھ لے دل کی نہ پوچھ

صبحِ ازل شامِ ابد کچھ بھی نہیں
اک وسعت موہوم ہے حد کچھ بھی نہیں
کیا جانیے کیا ہے عالمِ کون و فساد
دعوے تو بہت کچھ ہیں سند کچھ بھی نہیں

دھارا ہے زمانے کا ، رواں بے سروپا
پھرتے ہیں زمین و آسماں ، بے سروپا
کیا جانئے کس منزل موہوم کی دھن
کھینچے لیے جاتی ہے کہاں بے سروپا

مذکورہ بالا تینوں رباعیوں کو بطور مثال دیکھیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تشکیک فلسفہ کے طور پر سرایت ہوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ یگانہ کے بارے میں ماقبل میں بھی ذکر ہوا کہ وہ روایت شکن اور جمود کے تعطل کے طور پر سامنے آتے ہیں، اسی وجہ سے یگانہ فطرت و کائنات کو اپنے علم، مشاہدے، تجربے اور وجدان کی روشنی سے ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ یگانہ نہ صوفی شاعر تھے اور نہ ہی تصوف کی جانب میلان رکھتے تھے اگرچہ وہ اپنی شاعری میں تصوف کی اصطلاحوں تک محدود رہے۔ بغور دیکھا جائے تو 'دل' ان کی شاعری کا مرکزی عنصر ہے۔ ترانہ میں تقریباً نصف رباعیاں ایسی ملتی ہیں جن میں دل مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے، شاعری میں اگر کمال حاصل کرنا ہو تو یہ عنصر بہت ہی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک عام لفظ کو وہ کتنے معانی میں استعمال کر رہا ہے۔ دل کو موضوع بنا کر کہی گئی رباعیاں بہت ہی زیادہ ہیں، جس طرح سابقہ اور لاحقہ سے معانی بدلتے ہیں اسی طرح محل استعمال سے بھی معانی بدلتے رہتے ہیں الغرض انہوں نے دل پر توجہ دی۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ دلگیر، دلسوز اور دلدار بھی تھے۔ اسی دل سے وہ مجسم اور موہوم کی بحث کی جانب بڑھتے ہیں جس سے وہ تصوف کی جانب بڑھتے ہیں مگر ان کی ذات بیچ میں حائل ہوجاتی ہے۔ یگانہ کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اندر نفیِ ذات خود کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اسی وجہ سے وہ اپنی ذات کی نفی نہیں کر پاتے تھے لہٰذا اپنے آپ کے باہر ڈھونڈنے یا پانے کے قائل ہی نہیں ہوسکے۔ اس معاملہ میں ان کو خود پسندی کا معاملہ صوفیوں کے رضا و تسلیم سے بہت ہی زیادہ مختلف ہے۔ ان کی ایک رباعی میں دیکھیں کہ یگانہ خود کو کیا دیکھتے ہیں:

مہمان ہے تو صاحب خانہ ہوں میں
آئینۂ حسنِ جاوداں ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے ، یگانہ ہوں میں

ایسی رباعیاں ان کی بہت ہیں جہاں ان کی خود پسندی اور انانیت واضح طور پر نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا تصوف کی جانب مائل نہ ہونا ان کی حد سے زیادہ انا پسندی ہے۔ تصوف ہی کیا بلکہ مطالعۂ کائنات کی بات کریں تو وہ 'حسنِ یگانہ' سے اتنے زیادہ مسحور ہوئے کہ کسی اور کی جانب انہوں نے توجہ ہی نہیں کی اور نہ ہی صوفی کی طرح اپنی ذات کی نفی کر کے حسن حقیقی کا اثبات کر سکے بلکہ وہ خود میں ہی کھوئے رہے اور یہی ان کی شاعری کا دائرہ بھی ہے۔

☆☆☆

طرفہ قریشی کی رباعیات

ڈاکٹر خواجہ غلام السّیدین ربّانی
(ٹیگور نیشنل اسکالر، ناگپور، مہاراشٹرا۔ موبائل: 7276763570)

شاعری کا فن زمانۂ قدیم سے ہی معاشرے میں وجہِ تفاخر رہا ہے۔ بعض شخصیات کا وجود ہی تاریخ میں اِس لیے محفوظ ہو گیا کہ اُنھوں نے خدمتِ شعر انجام دی۔ عبدالوحید طرفہؔ قریشی بھنڈاروی (۱۹۸۱۔ ۱۹۱۳) مرکزی ہندوستان کی ادبی تاریخ میں اپنی شاعری کی وجہ سے ہی یاد کیے جاتے رہیں گے۔ مرکزی ہندوستان کی ادبی تاریخ لکھی جائے تو طرفہؔ قریشی کے ذکر کے بغیر وہ مکمّل نہیں کہی جاسکتی۔

ناگ پور شہر، ریاستِ ناگ پور کا پایۂ تخت تھا۔ اِس وجہ سے اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران گونڈ اور بھوسلہ راجاؤں کے عہد میں یہاں عربی کے علما اور فارسی کے شعرا وانشا پرداز آکر مقیم ہوئے۔ اِن فارسی شعرا کے زیرِ سایہ اردو زبان وادب کی نشوونما بھی ہوئی۔ ناگ پور سے قریب شہر اچل پور بھی ادب کا ایک بڑا مرکز تھا، جو علاقۂ برار کا پایۂ تخت تھا۔ سیاسی حالات نے کروٹ لی تو اُتر پردیش اور برار سے نقلِ مکانی کر کے علما، اہلِ قلم، انتظامیہ کے اہم عہدہ داران اور اساتذہ ناگ پور آکر آباد ہو گئے۔ ناگ پور شہر میں میسور اور حیدرآباد سے بھی علما، شعرا اور فوجی افسران آکر آباد ہوئے تھے۔ اِسی شہر میں فصیح الملک داغؔ دہلوی کے شاگرد مولانا ناطقؔ گلاوٹھوی اور داغؔ ہی کے شاگرد علاّمہ سیمابؔ اکبرآبادی کے دو اہم تلامذہ حمید اللہ خاں آذرؔ سیمابی اور عبدالوحید طرفہؔ قریشی بھنڈاروی نے بھی بساطِ ادب بچھائی اور شعروادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اِن اساتذہ کے دم سے ناگ پور شہر میں شعروادب کا ایک صحت مند ماحول بن گیا۔

طرفہؔ قریشی ایک ایسے دبستان سے تعلق رکھتے تھے کہ جس میں تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد مصروفِ شعروسخن تھی۔ اپنے اُستاد سیمابؔ سے اُستادی کی سند حاصل کرنے کے بعد طرفہؔ نے بھی اپنا ایک حلقۂ تلامذہ بنالیا۔ مرکزی ہندوستان کے شہروں میں ناگ پور، کامٹی، بھنڈارہ، بالاگھاٹ، سیونی، بھوپال وغیرہ کے علاوہ جنوبی ہندوستان کے شہر کڑپہ کے آستانۂ امینی سے منسلک ہونے کی وجہ سے طرفہؔ قریشی کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد جنوبی ہندوستان میں پیدا ہوگئی۔ اِسی طرح اُڑیسہ میں راجگانگ پور، جھارسوگڑہ، کٹک اور اُس وقت کے بہار میں رانچی وغیرہ مقامات پر اُن کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد مصروفِ شعرگوئی رہی۔ طرفہؔ قریشی نے پیشۂ تدریس سے جڑے رہنے کے ساتھ ساتھ کچھ ادبی جریدوں کی ادارت بھی جاری رکھی جن میں الوارث بمبئی، سازِ سرمدی دہرہ دون اور ناگ پور سے شایع ہونے والے چاند، نبّا ضاور فیروز قابلِ ذکر ہیں۔

دھیرے دھیرے طرفہؔ قریشی کی ایک الگ شناخت قایم ہوگئی اُن کے شاگردوں اور مدّاحوں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا۔ طرفہؔ نے سیمابؔ اکبرابادی کے اُسلوبِ نگارش کو اپناتے ہوئے فکرانگیز مضامین اور روایت سے ذرا ہٹ کے شاعری شروع کی۔ ادبی تاریخ میں طرفہؔ قریشی کو سیماب اسکول کے ایک مستند اور منفرد استاد شاعر کی حیثیت سے ایک باوقار مقام حاصل ہے۔

عبدالوحید متخلّص بہ طرفہؔ قریشی شہر بھنڈارہ (ضلع بھنڈارہ، ریاستِ مہاراشٹر) میں ۳؍مارچ ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں اردو ہندی مخلوط پرائمری اسکول سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ دو سال تک مولانا حکیم عبدالستار ردّانی سے فارسی کا صرف ونحو اور دیگر کتابیں پڑھیں۔

طرفہؔ قریشی نے ۱۹۲۷ء سے شعر کہنے شروع کیے اور طرفہؔ تخلص اختیار کیا۔ طرفہؔ قریشی ۱۹۳۵ء میں ماہ نامہ شاعر کے مستقل خریدار ہو گئے، جو اُس وقت علاّمہ سیمابؔ اکبرابادی کی ادارت میں آگرہ سے شایع ہوتا تھا۔ ماہ نامہ شاعر میں ایک کالم 'اصلاحِ سخن' شایع ہوتا تھا جس میں سیمابؔ اپنے شاگردوں کی اصلاح فرماتے تھے۔ اِس طرح طرفہؔ ۱۹۳۹ء میں سیمابؔ کے شاگرد ہو گئے۔ مئی ۱۹۴۳ء میں طرفہؔ نے بمبئی کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں محترم استاد علاّمہ سیمابؔ اکبرابادی کی صدارت میں مشاعرہ پڑھا، اُن کے ساتھ بمبئی سے بھساول تک سفر کے دوران اُن کے فیض کیش بھی رہے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں تفویض کے عنوان سے سیمابؔ نے اپنے ایک سو دس تلامذہ کو اُستادی کے مقام سے سرفراز فرمایا تھا، اِس میں طرفہؔ قریشی کا نام نامی بھی تھا۔

طرفہؔ قریشی یکم اگست ۱۹۴۳ء کو بھنڈارہ کی سکونت کو خیرباد کہہ کر شہر ناگ پور میں آکر آباد ہو گئے اور تمام زندگی اِسی شہر کی ثقافتی زندگی کا حصّہ بن کر رہے۔ طرفہؔ قریشی کے صاحب زادے مشتاق احسن کے بقول، انجمن کی ملازمت کے اخیر سالوں میں اُنہیں اختلاجِ قلب کا عارضہ ہو گیا تھا اور اعصابی

اضمحال کی وجہ سے وہ پریشان رہا کرتے تھے۔لیکن اِس دوران اُنہوں نے شاعری بھی کی، شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں بھی کیں اور مشاعروں کے لیے اسفار بھی کیے۔شہر کڑپہ کے سالانہ نعتیہ مشاعرے کی شرکت اور صدارت عمر کے آخری دور تک قائم رہی۔جب تک صحت نے اجازت دی وہ پابندی سے دفتر ماہ نامہ فیروز بھی آتے رہے۔

طرفہ قریشی نے اپنی، پہلی تصنیف کے طور پر، ۱۹۴۶ء میں طورِ رخشاں کے عنوان سے سی پی کے منتخب شعرا کا کلام شایع کیا۔ ۱۹۵۲ء میں اپنا پہلا شعری مجموعہ پہلی کرن کے نام سے شایع کیا۔۱۹۶۹ء میں سلاموں کا ایک مجموعہ شہیدِ اکبر شایع کیا۔۱۹۷۷ء میں دوسرا شعری مجموعہ نصف النہار مہاراشٹر اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شایع کیا گیا جسے اکادمی کے انعام سے بھی سرفراز کیا گیا۔طرفہ قریشی کی نعتوں کا ایک مجموعہ فانوسِ حرم ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔۔طرفہ قریشی کی کچھ غیر مطبوعہ تصانیف اِس طرح ہیں: تیسرا شعری مجموعہ عصر العصر (یہ مجموعہ، زیرِ طبع کلیاتِ طرفہ کا حصّہ ہے)، اُن کے شاگردوں کے تعارف اور کلام پر مشتمل اُن کی ایک تالیف دبستانِ طرفہ، شاعری کا ضابطہ چراغِ عروض، دکن کے اولیا کا منظوم تذکرہ گلزارِ امینی، مشاہیر شعرا کی شاعرانہ خصوصیات پر مبنی کتاب مقالاتِ طرفہ، ادبی، فنّی اور عروضی نکات پر خطوط مکتوباتِ طرفہ۔

ادبی اداروں اور انجمنوں نے ہمیشہ طرفہ قریشی کے کلام کو سراہا اور عزّت بخشی۔ہند و پاک کے موقر رسالوں میں اُن کا کلام شایع ہوتا رہا۔ نظم، رباعی، قطعات اور غزل کے علاوہ نعت اور سلام جیسی اصناف پر اُنہیں قدرت حاصل تھی لیکن اُن کی فکر و فن کا اصل میدان تھا صنفِ غزل۔غزل کے اشعار میں اُن کی مضمون آفرینی، فن اور زبان و بیان اپنی پوری جلوہ گری کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔بزمِ غالب، کامٹی، نے اُنہیں ۱۹۷۵ء میں ضمیر الشعرا کے خطاب سے نوازا۔طرفہ قریشی آندھرا پردیش کے شہر کڑپہ کے آستانۂ مخدومؒ الٰہی سے قریبی ربط ضبط رکھتے تھے۔اُس وقت کے سجادہ نشین طرفہ قریشی کے شاگرد بھی تھے۔طرفہ قریشی نے دکن کے اولیا کا ایک منظوم تذکرہ بھی لکھا تھا، اِس لئے شاعری کے فن میں اُن کی خدمات کے پیشِ نظر طرفہ قریشی کو درگاہِ امینی کے سجّادہ نشین کی جانب سے امین الفن کے خطابِ مستطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔دنیا کے سیانوں نے کہا ہے کہ یہ عالم فانی ہے، اور جیسے کہ اِس عالمِ فانی کا قاعدہ ہے، طرفہ قریشی بھنڈاروی بھی اِس دنیا سے ۷ رجولائی ۱۹۸۱ء کو رخصت ہو گئے اور مرکزی قبرستان مومن پورہ میں آسودۂ خواب ہیں۔ابنِ طرفہ مشتاق احسنؔ، طرفہ قریشی کے شاگرد کی حیثیت سے اپنے گھر میں اِس فن کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔اُنہوں نے ایک بزمِ طرفہ کی تشکیل کی ہوئی ہے جو پچھلے ۱۸ سالوں سے متواتر جشنِ طرفہ کا اہتمام کرتی ہے۔اِس جشن میں طرفہ قریشی کی شاعری پر مقالات پیش کیے جاتے ہیں اور ایک بین ریاستی مشاعرے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔اِس تقریب میں ناگ پور کی ثقافتی زندگی کی نبض دھڑکتی ہے۔طرفہ قریشی نے نعتیں، منقبتیں، منظوم تاریخ، نظمیں، قطعات، غزلیں، تاریخی قطعات، مراثی اور رباعیات لکھی ہیں۔اس مضمون میں طرفہ قریشی کی رباعیات پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

مہاراشٹر کی فضا بیسویں صدی کے دوران عجیب و غریب تھی۔عجیب و غریب اِس لیے کہ اردو زبان کے لیے مراٹھی زبان بولنے والوں کے دل میں نفرت نہیں تھی۔مراٹھی زبان لکھنے پڑھنے والوں میں اردو غزل اور رباعی لکھنے کا بڑا شوق تھا، اُن کو اچھی طرح یہ احساس تھا کہ مراٹھی زبان کی بلاغت فارسی اور عربی کی رہینِ منت ہے۔ مادھو ترمبک جولین (ف ۱۹۳۹ء) ایک ایسے مراٹھی شاعر تھے جنہوں نے عمر خیام کی فارسی رباعیوں کا مراٹھی ترجمہ کیا۔اُن کے بعد جی۔جی۔ادھیکاری اور جے ۔کے۔اپپا دھیائے نے بھی مراٹھی میں عمر خیام کی رباعیوں کے تراجم کیے۔اِن کے علاوہ بھی کئی مراٹھی شعرا نے غزل کی صنف میں وزن، بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کے ساتھ تجربے کیے جن میں سریش بھٹ کا نام سرفہرست رہا۔اِن شعرا کے علاوہ کچھ ایسے نام بھی ہیں جنہوں نے رباعی جیسی مشکل اور تکنیکی قسم کی صنف میں طبع آزمائی کی جن میں کوی کانت، شانتا شیلکے، پرُبھل دت اور شری کرشن پوولے کے نام قابل ذکر ہیں۔مشاعروں میں غزل سنانے سے پہلے قطعات اور رباعیاں سنانے کا چلن تھا۔قوال غزل کے بیچ 'مناسبت' کے نام سے رباعیاں پڑھتے تھے جو غزل کے شعر کے مفہوم سے ہم آہنگ ہوتی تھیں اور غزل کے شعروں کی تفہیم میں مدد کرتی تھیں۔

محققین اور تنقید نگاروں نے لکھا ہے کہ طرفہ قریشی اُسلوبِ شاعری کے اعتبار سے اپنے اُستادِ محترم سیمابؔ اکبر آبادی کے پیرو تھے۔یہ بیان مکمل صحیح نہیں ہے۔طرفہ قریشی نے اپنے عہد میں ترقی پسند ادب کی

تخلیق و ترویج دیکھی اور جدید شاعری کی مقبولیت بھی۔ اُنہوں اِن دونوں راستوں پر چلنا پسند نہیں کیا لیکن اِن دونوں رجحانات کی وجہ سے اُن کی شاعری خالص روایتی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اُن کی غزلیہ شاعری میں زندگی کے تجربات کے حاصل کے طور پر زمانہ شناسی، انسان کے وجود اور اُس کی بے مائیگی، عشقِ الٰہی میں سلوک کی راہ کا ابتلا اور ذاتِ الٰہی کا عرفان دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور یہ سب اُن کے بیان اور مضمون بافی میں ایک نئے طرز میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو بات ہوئی اُن کی غزل کی لیکن جب وہ رباعی کہنے پر آئے تو اُس صنف کے تقاضے کے طور پر دنیا کی بے ثباتی اور راہِ راست کی نصیحت کو ایک بنیادی جُز کے طور پر شاملِ فکر رکھا۔ اُن کی رباعیوں میں پندارِ عشق ایک نئی شان کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے اور اکثر حُبِّ وطن بھی دکھائی پڑتا ہے۔

طرفہ قریشی کی زندگی بہت فراغت سے گزری ہو ایسا نہیں۔ غربت میں اُصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر زندگی گزارنا اپنی جگہ ایک مجاہدہ ہے۔ ایسے حالات میں احباب، اقربا اور متعلقین سے جو تکلیفیں پہنچیں اُن کا عکس اُن کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد بٹوارے کے دکھ اور اُس کے نتیجے میں نمودار ہونے والے مسائل کی جھلک بھی اُن کی رباعیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ طرفہ قریشی ایک کہنہ مشق شاعر اور مسلمہ استادِ فن تھے۔ اپنے شاگردوں کی تکنیکی اصلاحیں کیا کرتے تھے اِس لیے رباعی کے شجرۂ اخرب کے وزن، قوافی اور ردیف کی مناسبت اور رعایت کے ساتھ ساتھ اِسے محفل میں سنائے جانے کے لائق، عام فہم بنانا بھی اُن کے پیشِ نظر تھا (مشاعروں اور ادبی محفلوں میں غزل سنانے سے قبل وہ قطعات اور رباعیاں بھی سناتے تھے)۔

آیئے طرفہ قریشی کی رباعیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ طرفہ عشق میں پندار کے قایل ہیں۔ وہ درد کو امانت کے طور پر دل میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنی تباہی پر بھی مسرور ہیں۔ کہتے ہیں:

فطرت کا بدل سکتا ہے کیوں کر دستور
مختار ہے تو ہو نہیں سکتا مجبور
آباد رہے تیرے تغافل کا جہاں
اے دوست مجھے اپنی تباہی منظور

انسان کے دل کو آئینہ صفت کہا گیا ہے۔ اِس لیے یہ توقع کی جاتی ہے کہ دلوں میں کدورت نہیں ہونی چاہیے۔ طرفہ کی بھی یہی اُمید ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ جس گھر میں روشن چہرے ہوں وہاں ظلمت کا کیا کام؟ یہ رباعی دیکھیں:

نفرت کی دلوں میں یہ سکونت کیسی
آئینوں کے سینوں میں کدورت کیسی
جس گھر میں ہوں انسانوں کے روشن چہرے
اُس گھر کے دروبام پہ ظلمت کیسی

طرفہ قریشی کی رباعی کی کینواس دھیرے دھیرے وسیع ہوگئی۔ اب دیکھیں کہ اُس میں وطن کی محبت کا رنگ بھی اُبھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان کے کثیر المذہب ملک ہونے کے باوجود یہاں کثرت میں وحدت اور رواداری کی روایت کے رنگ کو ملاحظہ کیجیے۔ کہتے ہیں:

روشن ہے ہر اک گوشہ خدا خانوں کا
جمگھٹ ہے یہاں عشق کے پروانوں کا
ہر سمت اُخوت ہے رواداری
حق یہ ہے کہ یہ دیش ہے انسانوں کا

طرفہ قریشی تھے تو ناگ پور میں مقیم مگر اُن کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بیرونِ ناگپور بھی آباد تھی، خاص طور پر دکن میں۔ حیدرآباد، ویلور اور کڑپہ میں اُن کو مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیات سے بیگانے نہیں تھے۔ امجدؔ اپنی رباعیوں کے رنگ کے لیے پوری اردو دنیا میں مشہور ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، اخلاقی برائیوں پر ملامت، گناہوں سے بچنے کی تلقین، تصنع سے پرہیز، کردار کی بڑائی وغیرہ عموماً امجدؔ کی رباعیوں کے محبوب مضامین ہیں۔ اِن مضامین کو طرفہ قریشی نے بھی بہت خوبی سے باندھا ہے۔ طرفہ قریشی کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

نادان کی باتوں کو سمجھتے ہی نہیں
کم ظرفوں کی مانند گرجتے ہی نہیں
جاہل کے سوالوں کا خموشی ہے جواب
جاہل سے سمجھدار اُلجھتے ہی نہیں

■

تقلیدِ فروعات نہ ہوگی ہم سے
تاویلِ مباہات نہ ہوگی ہم سے

اللہ بچائے ہمیں اِس سے طرفہؔ
چھوٹے ہیں بڑی بات نہ ہوگی ہم سے

غزل میں تو شعرا حضرتِ شیخ کی ٹوپی اُچھالتے ہی رہتے ہیں لیکن طرفہؔ قریشی نے ایک رباعی میں شیخ صاحب کی عبادات اور معاملات میں تفاوت کو اُجاگر کیا ہے۔ وہ اِس بات پر طنز کرتے ہیں کہ شیخ صاحب احرام باندھ کر حج کر آئیں گے اور حاجی کہلائیں گے، اِدھر اُن کی پڑوس کے بھوکے غریب کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا میسر نہیں ،اُس کی ضرورت کون دیکھے گا؟ ایک رباعی میں یہ طنز دیکھیں، بڑی اور چھوٹی لنگوٹی کا مزہ لیجیے:

بھوکا ہے پڑوسی اُسے روٹی دے دے
رکھ لے بڑی اپنے لیے، چھوٹی دے دے
دے دے نئے احرام کا صدقہ اے شیخ
ننگا ہے ' پُرانی ہی لنگوٹی دے دے

طرفہؔ قریشی ہمیشہ اِس بات کے حامی رہے کہ ایک اچھے معاشرے کی تعمیر میں قربانی ضروری ہے۔ اُن کی نظر اسلام اور اُمت ابراہیمی کی تاریخ پر بھی بڑی گہری تھی۔ اسی لیے اِن دو رباعیوں میں قربانی کی عظمت کو کچھ اِس طرح بیان کرتے ہیں:

ہر سلطنت و تاج ہے قربانی میں
دام و درم و باج ہے قربانی میں
کہتا ہے زمانے سے یہ ایثارِ خلیلؑ
انسان کی معراج ہے قربانی میں

■

دنیا ابدی چیز نہیں فانی ہے
بچتی ہے جو ایثار سے دیوانی ہے
طے ہوتی نہیں منزلیں ایثار بغیر
ہر گام پہ اک سانس کی قربانی ہے

اِس مقالے کے لیے مواد اور رباعیات، حضرت طرفہؔ قریشی کے دوسرے شعری مجموعے 'نصف النہار' سے لیا گیا جو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے ۱۹۷۷ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ اب دستیاب نہیں ہے لیکن 'کلیاتِ طرفہ' میں شامل ہے۔

☆☆☆

رباعیات

محمد انور ضیا (گورکھپور)

افہام کے تفہیم کے رستے کھولو
ہے علم اجارہ تو سبھی کا دو، لو!
فرہنگ سے ہر لفظ کو پرکھو تولو
بولو تو بہت سوچ سمجھ کر بولو

■

نوبت باجے کل تک من کے انگنا
بولے کھنکے چوڑی پائل کنگنا
لیکن اب کے رِت تو ایسی آئی
دنیا بھولی سکھیاں ساون سنگنا

■

ہر چند غموں سے دل ہے پارہ پارہ
ظلم اور ستم کا بھی ہے اندھیارا
حاکم ہے داور وہ حافظ میرا
''پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا''

■

سوچیں ہم اُس نے بخشا کیا کیا ہے
شکوہ پھر موت زندگی کا کیا ہے
بندے ہیں بندوں کا اِجارہ ہی کیا
''جو کچھ ہے خدا کا ہے ہمارا کیا ہے''

■

کچھ بحث نہیں بحر کے زیر و بم سے
سب اہل ہنر مست ہیں جامِ جم سے
اوزان رباعی کے اگر ہیں چوبیس
لیکن وہ نظر آتے ہیں کچھ کم کم سے

ظہیر غازی پوری کی رباعی گوئی

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

(شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی۔ ہزاری باغ (جھارکھنڈ)۔موبائل:9771010715)

ظہیر غازی پوری (پ:۱۹۳۸) اردو کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز جدید شاعر ہیں۔ان کا عرصۂ تخلیق ایک طویل مدت کا احاطہ کرتا ہے۔اس لئے ان کی شاعری وقتی رجحانات پر حاوی اور وسیع ادبی وشعری اقدار کی ترجمان ہے۔ظہیر غازی پوری شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے سات شعری مجموعے ''تثلیث فن'' (مشترکہ مجموعۂ منظومات) ۱۹۷۲ء ''الفاظ کا سفر'' (مجموعۂ غزلیات و منظومات) ۱۹۷۶ء، ''آشوب نوا'' (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۷۸ء، ''کہرے کی دھول'' (مجموعۂ منظومات) ۱۹۸۶ء، ''موسم کی صدا'' (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۹۰ء، ''دعوت صدنشتر'' (مجموعۂ رباعیات) ۱۹۹۷ء، ''لفظوں کے پرند'' (مجموعۂ منظومات، تثلیثات و ماہیے) ۱۹۹۸ء اور نثر میں چار تنقیدی و تحقیقی کتابیں ''مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو'' ۲۰۰۳ء، ''اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ'' ۲۰۰۵ء، ''جھارکھنڈ اور بہار کے اہم اہل قلم'' ۲۰۰۹ء اور ''غزل اور فن غزل'' ۲۰۱۶ء منظر عام پر آچکی ہیں۔

ظہیر غازی پوری بنیادی طور پر ایک خوش فکر شاعر ہیں۔معاصر شعراء میں وہ اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ان کے شعری لہجہ میں کلاسیکی دروبست اور جدید احساس فکر کی لطیف آمیزش ہے۔ان کی شاعری دوسرے جدید شعراء سے اس طرح مختلف ہے کہ انہوں نے عمیق، دقیق اور گہرے فلسفیانہ نظریات کے مقابلے میں عام زندگی کے تجربوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ان کی شاعری فیشن زدہ جدیدیت کی زائدہ نہیں ہے۔ان کی علمی بساط وسیع وعریض ہے۔مطالعے کی وسعت نے ان کی سوچ کی لہروں کو مرتعش اور تازہ کار رکھا ہے۔اس لئے انہوں نے روایت کے اس سوتے سے رشتہ قائم رکھا جہاں سے جدیدیت کا خوش ذائقہ پانی والا صاف وشفّاف چشمہ ابلتا ہے۔ان کے یہاں فکر وجذبے کی وہ سچائی ہے جو شعری عوامل کے لئے لازمی ہے۔

اردو کے دیدہ ور اور بالیدہ نظر نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ظہیر غازی پوری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعر تو بہت سارے لوگ کہتے ہیں یعنی ہر عہد میں ہر جگہ شعراء کی ایک فوج ہوتی ہے مگر ان میں جینوئن شاعر کوئی کوئی ہوتا ہے اور ظہیر غازی پوری ایسے ہی شعراء میں ہیں۔ پروفیسر نارنگ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ظہیر غازی پوری کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔انہوں نے اپنی آواز اور لہجے کو پانے کے لئے ہمیشہ جوکھم اٹھایا اور اپنی راہ بھیڑ کے دوسرے لوگوں سے الگ ہٹ کر بنائی ہے۔ جوکھم اٹھانے والا شاعر تخلیقی عمل کے معاملے میں کھرا، سچا اور ایماندار ہوتا ہے۔وہ قارئین، ناظرین اور سامعین کو متوجہ کرنے یا رجھانے کے لئے خواہ مخواہ کی لفظی کرتب بازیاں نہیں دکھاتا۔شوشے اور شگوفے نہیں چھوڑتا بلکہ نہایت ہی سنجیدگی سے اپنے تخلیقی کارنامے انجام دیتا ہے، جن میں انسانی اقدار، سماجی مسائل، ملکی حالات اور معاشرے کے آشوب کی صحیح اور سچی تصویر کشی ہوتی ہے۔ظہیر غازی پوری کی شاعری ان کی عمدہ عکاسی کرتی ہے۔ان کی زبان پر ابہام واحمال کا غلبہ نہیں بلکہ یہ سہل ہے۔لیکن انہوں نے زبان کے استعمال میں نئے پن اور عمومی نہج سے ہٹ کر لفظیات کو اہمیت دی ہے، اس سے ان کی شاعری میں دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔ان کے شعری پیکروں میں حوصلہ مندی اور تخلیقی توانائی کے ساتھ انگنت رنگوں کی جھلک نمایاں ہے۔

مجھے فی الوقت ان کی جملہ شاعری پر گفتگو نہیں کرنی ہے بلکہ ان کی رباعی گوئی کا محاکمہ مقصود ہے۔ظہیر غازی پوری نے رباعیاں بھی خوب کہی ہیں۔ان کی رباعیات میں مضامین کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ حسن خیال اور حسن زبان کا پرتو ملتا ہے۔رباعی اپنے مخصوص اوزان، ہیئت کی پابندی اور الفاظ کے بامعنی استعمال کے سبب ایک مشکل ترین صنف سخن تسلیم کی جاتی ہے۔گویا رباعی کا فن بے حد متوجہ کن، وجد آفریں اور شعور آگہانہ کا مقتضی ہے۔ان ہی چیزوں سے ہر اچھی رباعی میں معنی ومطالب کی فنکارانہ عکاسی ہوتی ہے۔ظہیر غازی پوری کا بھی خیال ہے کہ:

وجدان کا ثمرہ ہے رباعی کا فن
جذبے کا احاطہ ہے رباعی کا فن
لفظوں کا قبیلہ بھی اگر ساتھ چلے
معنی کا ذخیرہ ہے رباعی کا فن

صنفی اعتبار سے رباعی حسن و جمال کا مرقع ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ زندگی کی کشاکش اور پر بہار واقعات سے مزیّن ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کو دو بیتی یا ترانہ بھی کہتے ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے رباعی کی اصل حیثیت مختصر ترین افسانے یا مختصر ترین نظم کی سی ہے، جس میں زندگی کا کوئی ایک آسان یا پیچیدہ، سادہ یا خوش رنگ عکس مکمل طور پر ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

اردو اور فارسی کے سب ہی مشہور شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں مگر رباعی نے چند ہی ناموں کو اپنے مخصوص بت خانے کا آذر بنا کر اپنی ذاتی تاریخ سے روشناس کرایا۔ ابوسعید، ابوالخیر، عمر خیام، سرمد اور ابوالوفا فارسی کے وہ شاعر ہیں جن کی تمام عظمتیں اور ساری شہرتیں رباعی سے مخصوص ہیں۔ اردو میں بہت کم ایسے شاعر ہیں جو رباعی کے خاص حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔

ظہیر غازی پوری نے غزل، نظم، دوہا، ہائکو، غزل نما کے علاوہ رباعی کو بھی اپنا خاص فن بنایا ہے۔ انہوں نے کثرت سے نہ صرف رباعیات کہے ہیں بلکہ رباعی کے فن اور اردو میں رباعی گوئی کے ارتقائی سفر اور بعض رباعی نگاروں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ظہیر غازی پوری کی رباعیوں کا ایک مجموعہ ''دعوت صد نشتر'' شائع ہوا تھا۔ یہ ان کی دو سو براسی (۲۸۲) رباعیوں کا ایک دلکش مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر گیان چند جین کے نام معنون کیا گیا ہے اور انتساب کے صفحہ پر ہی غالبؔ کی یہ رباعی درج ہے:

اے کثرت فہم بے شمار اندیشہ
ہے اصل خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوت صد نشتر
یک وہم و عبادت ہزار اندیشہ

اس کتاب کا نام بھی اسی رباعی سے مستعار ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا ایک مضمون بہ عنوان ''نئے افکار کے شاعر: ظہیر غازی پوری'' بھی شامل ہے۔ گرد و پوش پر ڈاکٹر جگن ناتھ آزادؔ، ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اور ناوکؔ حمزہ پوری کی آراء درج ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ظہیر غازی پوری کی شخصیت اور شاعری بالخصوص فن رباعی اور ان کی رباعی نگاری کو تازہ اور تخلیقیت سے پر باور کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''ظہیر غازی پوری مبارک باد کے لائق ہیں کہ انہوں نے بھی اپنی فکر فرمائی کے لئے رباعی کے فارم کو اختیار کیا اور نئے افکار و خیالات کو اس خاص صنف شعر میں پیش کرنے کے بہت سے اچھے نمونے اپنی تخلیقات میں ادبی تحفے کے طور پر ارباب فن کو نذر کئے۔''

(''دعوت صد نشتر'' از: ظہیر غازی پوری، ص: ۷-۸)

ظہیر غازی پوری کی نظموں اور غزلوں کی مانند، ان کی رباعیات میں بھی شعریت، غنائیت، لطافت، تخلیقیت، ندرت، معنویت اور فکری عوامل کی نادرہ کاری اعلیٰ وارفع سطح پر ملتی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں فنکارانہ شعور کی بلوغت اور جمالیاتی تجربوں کی عکس تابی محسوس ہوتی ہے۔ ظہیر کی رباعیوں میں لفظ اور زبان دونوں متحرک، زندہ اور فعال نظر آتے ہیں۔ وہ لفظ کو تخلیقی لوازم سے آراستہ کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اسے استعارے، پیکر اور علامت کے طور پر برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیات میں بھی شاعری کو ساحری بنانے کی کیفیت ملتی ہے۔ ان میں موضوعات کا تنوع، تازگی اور عہد حاضر کے نت نئے تجربات و انکشافات کا پرتو ملتا ہے۔ انہوں نے ہستی، دنیا، وطن، غربت، یکجہتی، انسانیت، فطرت، قدرت، قلم، کاغذ، کتاب، سورج، شام، صبح، رات، چاند اور صحرا جیسے موضوعات پر عمدہ رباعیاں کہی ہیں جن میں ان کے نگاہ کی تیزی، تجربوں کا ہنر، مشاہدوں کا تنوع، محسوسات کی تپش، جذبات کی شدّت، تخیّل کی بلند پروازی، شوق و جستجو، تصوّر کی آنچ اور حقیقت افروزی معاصرین کے مقابل قدرے تیز نظر آتی ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ظہیر غازی پوری نے رباعی نگاری پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اسے ایک نیا اسلوب، نیا آہنگ اور نیا لب ولہجہ عطا کیا ہے اور ان کا یہی نیا رنگ و انداز نیز اظہار بیان انہیں دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

'لا' میں بھی چمکتا ہے اسی کا جلوہ
'کُن' میں بھی دمکتا ہے اسی کا جلوہ
آنکھوں میں مقید جو کبھی نہ ہو سکا
ہر شئے میں چمکتا ہے اسی کا جلوہ

آواز ہے، دستک ہے، صدا ہے دنیا
سرشاریٔ احساسِ نوا ہے دنیا

نزدیک سے دیکھا تو یہ احساس ہوا
اک قید میں جینے کی سزا ہے دنیا

■

اخبار کی سرخی کی طرح ہے دنیا
بیکس کی تسلّی کی طرح ہے دنیا
ڈھیلی کبھی ہوتی ہے کبھی کستی ہے
اللہ کی رسّی کی طرح ہے دنیا

منقولہ رباعیات میں شاعر نے جس وجدانی کیفیت، جذبہ و احساس اور الفاظ و تراکیب سے اشعار وضع کر کے شاعرانہ حسن پیدا کیا ہے، وہ دیدنی ہے۔ ظہیر غازی پوری کی یہ معنی خیز رباعیات ان کی فنّی مہارت اور قدرت کلام پر دال ہیں۔ انہوں نے تقریباً زندگی کے تمام رخ و جہت پر جامع اور کامیاب رباعیاں تخلیق کر کے اپنے فکر و فن اور مشّاقی و مہارت کا عمدہ ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ظہیر غازی پوری نے رباعی جیسی سخت اور سنگلاخ زمین میں رنگ برنگے پھول کھلائے ہیں، جس کی خوشبو سے قاری کا دل و دماغ معطّر ہوتا ہے۔ وہ وقت کے ہم نوا بھی ہیں اور حقیقت نگار بھی۔ اسی لئے ہم رشتہ ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بصیرت کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ اس میں وسعت اور کشادگی کے عناصر موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں حیات و کائنات کے اسرار و رموز، انسان کے وجود اور اس کے مسائل، زندگی کی ہماہمیوں اور پیچیدگیوں، وطن کی محبت، اس کی صبح و شام، تہذیب و تمدن اور اس کے باسیوں کے حال احوال، ارباب سیاست کی چالبازیوں اور مکّاریوں، انسان کی بداعمالیوں، مفاد پرستیوں، زہر افشانیوں، مذہبی جنون، فرقہ واریت، مسلکی و طبقاتی جھگڑوں اور فکر و فن سے متعلقہ موضوعات کو فنکاری و صنّاعی کے ساتھ روشن کیا ہے اور جا بجا جہد مسلسل، زندگی کی اخلاقی قدروں اور اصلاحی و تعمیری پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

ظہیر غازی پوری کی رباعیاں اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے نہ صرف قاری کے دامن دل کو کھینچتی ہیں بلکہ انہیں بلا تامل اردو کے معروف رباعی گو شعراء کی صف میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ظہیر غازی پوری کی رباعیاں بھی ان کی فنی، لسانی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی تجربوں اور فنکارانہ صلاحیتوں کی عمدہ غمازی کرتی ہیں اور انہیں ایک عمدہ اور منفرد رباعی گو شاعر کا درجہ دلاتی ہیں۔

☆☆☆

رباعیات

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی
(دربھنگہ، بہار)

مت پوچھ کہ زندگی میں پایا کیا ہے
کیا غم کہ چھٹکے اس سے کھویا کیا ہے
مت جھیل یہ الجھنیں نہ یہ بار اٹھا سچ
پوچھ تو زندگی میں رکھا کیا ہے

■

ہر شمع کی تشہیر سحر ہونے تک
ہر قطرے کی تقدیر گہر ہر ہونے تک
کب کس نے چنیں خاک سے مسلی کلیاں
آہیں رہیں معدوم اثر ہونے تک

■

ہر نخل نے درد ناتوانی جھیلا
ہر غنچہ نے زخم گلفشانی جھیلا
ہم نے جھیلی حیات کی مدت
خالق نے سرور لن ترانی جھیلا

■

ہستی کے مسافرو یہ عجلت کیسی
کیسی یہ دوا دوش یہ شدت کیسی
رفتار سے زندگی اور انجام سکوت
پل بھر میں تمام ہو یہ مہلت کیسی

■

ماضی کا عذاب ڈھوتے جانا
ہر آج کو کل میں کھوتے جانا
جی لو جو ملی ہیں چند گھڑیاں فرحت
ایسا نہ ہو کل کو روتے جانا

ناوک حمزہ پوری کی رباعیات

ڈاکٹر عرفانہ بیگم

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، کے وی آر گورنمنٹ کالج آٹونومس، کرنول، آندھرا پردیش۔ موبائل:9966458939)

دنیائے اُردو ادب میں چند ہی ایسے ادیب و شاعر گذرے ہیں جو اپنے قلم کی جولانی اور تخلیقی دانشوری کی بدولت اپنی شخصیت اور انفرادیت کو منواتے ہوئے اپنا نام صفِ اول میں درج کروانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ ان کا نامِ نامی ادبی دنیا میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ناوک حمزہ پوری کا شمار بھی ایسے ہی متوازن سلجھے ہوئے باوقار ادیبوں میں کیا جاتا ہے کیونکہ آپ ایک صاحبِ طرز محقق و نقاد، ذمہ دار معلم اور ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے معاصرین کو آگاہ کرتے ہیں۔ موصوف نے نظم و نثر میں ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں ادبی، درسی و مذہبی کتابیں اور تراجم بھی ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی تصانیف بھی شامل ہیں۔

سیّد غلام السّیدین ادبی دنیا میں ناوکؔ حمزہ پوری کے قلمی نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ۲۱/اپریل ۱۹۳۳ء کو حمزہ پور ضلع گیا بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام سیّد غلام رسول تھا اور وہ قوسؔ حمزہ پوری تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم والدین سے حاصل کرنے کے بعد میٹرک شیر گھاٹی حمزہ پور سے مکمل کیا۔ انٹرمیڈیٹ گیا کالج، بی۔اے رانچی یونیورسٹی اور ایم۔اے مگدھ یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اس کے علاوہ بھاگل پور یونیورسٹی سے ڈپلوما ان ایجوکیشن بھی مکمل کیا۔ ناوکؔ صاحب نے مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمات بحسن و خوبی انجام دیتے ہوئے صدر مدرس کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء میں وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد قوسؔ کے علاوہ کسی اور کے آگے زانوئے تلمّذ تہ نہیں کیا۔ ناوک صاحب کا حلقہ تلامذہ کافی وسیع ہے۔ ملک اور بیرون ملک سینکڑوں شعراء نے ان سے فیض حاصل کیا اور کر رہے ہیں۔

ناوکؔ صاحب کے چند مشہور و معروف تصانیف کے نام یہ ہیں۔

۱۔ آثار آثار ۱۹۸۴ء	۲۔ دشنامے چند ۱۹۸۴ء
۳۔ جڑیں ۲۰۰۶ء	۴۔ کیریر گائیڈنس ۲۰۰۱ء
۵۔ حضرتِ قوس اور غزل	۶۔ محسنِ انسانیت
۷۔ مصحفِ تاریخ ۲۰۰۸ء	۸۔ نوائے امروز ۱۹۹۶ء
۹۔ ہزار رنگ ۲۰۱۳ء	۱۰۔ رباعی (تعریف و تکنیک) ۲۰۰۷ء
۱۱۔ رخسارِ شیر گھاٹی ۲۰۰۷ء	۱۲۔ زاویہ نظر ۲۰۰۹ء
۱۳۔ سمتِ سفر ۱۹۸۵ء	۱۴۔ قرطاسِ عظیم
۱۵۔ قوس حمزہ پوری	۱۶۔ افق زاد
۱۷۔ قرینۂ غزل	۱۸۔ قوسِ قزح
۱۹۔ اندازِ بیان	۲۰۔ شرارِ سخن
۲۱۔ نوائے امروز	۲۲۔ تفہیمِ رباعی

ناوکؔ صاحب کا ادبی سفر کم وبیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انشائیے، افسانے، ناول، کالم نگاری، اور تحقیقی وتنقیدی مضامین سے قطع نظر انھوں نے حمد ونعت، مناقب، نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعات اور دوہے بھی کہے ہیں لیکن صنف رباعی ان کا خاص میدان ہے۔ وہ موجودہ دور کے سب سے قادرالکلام اور باکمال رباعی گو شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں رنگارنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے رباعی نہ لکھی ہو۔ وہ ایک مذہبی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ رباعی کا فن انھیں اپنے والدِ محترم سے ورثہ میں ملا ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ ناوکؔ صاحب کی رباعیات کے موضوعات پر اسلامی اقدار، عقائد وافکار کا غلبہ نظر آتا ہے۔ گیان چند جین نے جب ان کی رباعی گوئی پر مضمون لکھا تو اس کا عنوان ''شاعرِ اسلام'' رکھا اور انھیں ایک راسخ العقیدہ اور صادق الایمان مسلمان قرار دیا۔

ناوکؔ صاحب کے شعری مزاج کی تشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما ہیں ۔ ان کی شاعری میں اسلامی اقدار اسلامی احکام و افکار شرعی عقائد اخلاق وتصوف خصوصاً حمد ونعت اور منقبتی رباعیاں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وعظ ونصیحت اور پند و اخلاق اور دنیا کی ناپائیداری کے موضوع پر انھوں نے بہت زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔

الفاظ ہیں مشک زار تعریفِ خدا
اشعار ہیں عطر بار توصیفِ خدا
ہر صفحہ ہے تفصیل خدا کی قندیل
ہے ہر ورق آبشار تعریفِ خدا

■

ہے ذکر بلند آپؐ کا اونچا ہے نام
اے ختمِ رسل، ہادیٔ دینِ اسلام
ہر چندبشر بقول قرآں ہیں آپ
کیا عقلِ بشر سمجھے محمدؐ کا مقام

ناوکؔ صاحب کے دیوان رباعیات میں سماجی، تہذیبی، سیاسی اور عصری زندگی کے مسائل ومعمولات کی بھی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔

شکوہ ہے کہ اولاد ہوئی ہے خود سر
ماں کا ہے لحاظ کچھ نہ ہے پاسِ پدر
اولاد کی ہے اس میں خطا کیا ناوکؔ
پیدا ہوئی ٹیوب سے پلی بوتل پر

■

سورج سے نہ مانگ چاند ستاروں سے نہ مانگ
شعلوں سے نہ مانگ کچھ شراروں سے نہ مانگ
ہے قاضیٔ حاجات بس اللہ کی ذات
مردوں سے طلب نہ کر مزاروں سے نہ مانگ

ناوکؔ حمزہ پوری کو فنِ تاریخ گوئی پر بھی عبور حاصل ہے۔ جہاں انہوں نے اپنے بعض بزرگوں، دوستوں، شاعروں اور ادیبوں کی تعریف میں رباعیاں لکھی ہیں۔ وہیں بعض اہلِ علم دوستوں کی تاریخی رباعیات بھی کہی ہیں۔

جہاں تک ناوکؔ حمزہ پوری کی رباعیات کا تعلق ہے اس صنف میں ان کے چار مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔

(۱) اندازِ بیان (۲) شرارِ سخن (۳) نوائے امروز اور (۴) تفہیمِ رباعی

اس کے علاوہ رباعیات کا ایک دیوان ''ہزار رنگ'' بھی ۲۰۰۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جو ۱۹۲ صفحات پر محیط ہے جس میں ۱۱۰۴ رباعیاں موجود ہیں۔ ناوکؔ صاحب کے دیوان رباعی ''ہزار رنگ'' کی ایک خصوصیت یہ ہیکہ اس میں کسی کا پیشِ لفظ، مقدمہ یا تاثرات نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ شاعر نے بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے لیکن جب ''ہزار رنگ'' کی اوراق گردانی سے بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ دیوانِ رباعیات ہے یا رباعیات کا مجموعہ ہے۔ لیکن جب آگے کی ردیفوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ردیف وار مرتبہ دیوان رباعی ہے۔ اس بات پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ شاعر نے حروفِ تہجی سے شروع ہونی والی تمام رباعیات کو عنوانات سے ضرور مزّین کیا ہے۔

اس دیوان کا تعارف کرواتے ہوئے تابش مہدی نے لکھا تھا کہ'' ہزار رنگ'' ناوک صاحب کی ۱۱۰۴ رباعیوں کا دلکش وبصیرت افروز انتخاب ہے۔ میری ناقص اور محدود معلومات کے مطابق کم از کم ہندوستان میں اتنی بڑی تعداد میں اس ترتیب کے ساتھ رباعیات کا کوئی مجموعہ اب تک دستیاب نہیں۔''

پروفیسر محمد علی اثر رقم طراز ہیں۔

”جہاں تک مطبوعہ رباعیات کے دواوین کا تعلق ہے راقم
کے خیال میں ”ہزار رنگ“ اردو کا سب سے ضخیم مطبوعہ دیوان ہے۔“

رباعی (تعریف وتکنیک) ۲۰۰۷ء میں ناوکؔ صاحب نے رباعی کے فن، رباعی کے قواعد وضوابط اور رباعی کے عروض پر مع امثال تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جو نوآموز لوگوں کو رباعی کے فن سے واقف کروانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ناوکؔ صاحب اپنی رباعیوں کے ذریعہ ان اخلاقی روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں لوگ نئی روشنیوں کی چمک دمک میں بھولتے جارہے ہیں وہ عالمِ انسانیت کو ذہنی اور مادی کشمکش اور مہلک مرض سے بھی نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناوکؔ صاحب آج کے معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ وہ پریشان حال اور مجبور لوگوں کی پشت پناہی کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہیکہ ان کا اندازِ بیان سادہ وسلیس اور عام فہم ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آپ کی رباعیات سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اس طرز کی چند ایک رباعیات ملاحظہ ہوں:

احساس کو لفظوں میں پرونے کا فن
قطرے کا درخوش آب ہونے کا فن
کہتے ہیں رباعی جسے وہ ہے ناوکؔ
کوزے کو سمندر میں سمونے کا فن

■

جب بولو تو بولو ایسے کلمات
مرغوب ہوں لوگوں کو جو مثل نبات
آجائے کسی کے شیشۂ دل میں بال
منہ سے نہ نکالو ایسی کوئی بات

بحر حال رباعیاتِ ناوک حمزہ پوری جو مذہبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی اُمور کی مصوری کی عکاس ہیں اردو شعر وادب میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اردو رباعی کے صنف میں ایک نئے رنگ و آہنگ کی راہ میں گامزن نظر آتی ہیں۔ ان رباعیوں کو پڑھنے کے بعد ہر ادب کے قاری کے ذہن میں یہ احساس اُبھرتا ہے کہ وہ اردو رُباعی جو فارسی کی راہ پر گامزن چلی آرہی تھی اس کو ناوک صاحبؔ نے اپنے فکر اور گرد وپیش کے تہذیبی رجحانات سے مزّین کیا ہے۔

☆☆☆

رباعیات

اعجاز مانپوری
(مانپور، گیا، بہار)

سرکار گل و خار بدل دیتے ہیں
گفتار سے تلوار بدل دیتے ہیں
صحرا کو چمن زار بنانے والے
سورج کی بھی رفتار بدل دیتے ہیں

■

آؤ کہ اندھیروں میں اجالا کر لیں
جو کام ادھورا ہے وہ پورا کر لیں
کیا جانے کہ کب آئے بلاوا اس کا
ہے وقت غنیمت چلو سجدہ کر لیں

■

ہیرا نہ جواہر نہ ہی پتھر سمجھا
ہر پھول کو گلشن کا مقدر سمجھا
آپس میں نہ تفریق ہو اس کی خاطر
آنکھوں نے مری سب کو برابر سمجھا

■

صحرا کو سمندر کی روانی لکھوں
ہر قطرہ ٔ زہراب کو پانی لکھوں
پہلے میں رگ جاں کو نچوڑوں اعجاز
پھر مقصد ہستی کی کہانی لکھوں

رباعیات سیّد عابد علی وجدی الحسینی: ایک مطالعہ

ڈاکٹر اعظم

(ہائی ٹیک سیٹی، گاندھی نگر، بھوپال۔ موبائل: 9827531331)

بھوپال ویسے تو عمومی طور سے شہر غزل کے نام سے منسوب و مشہور ہے مگر ایسا نہیں کہ دیگر اصناف سخن سے عاری ہو۔ صنف شاعری میں گو کہ غزلیہ شاعری کو فوقیت رہی ہے مگر رباعیات کہنے کی مستحکم روایت بھی ملتی ہے۔ اردو شاعری میں بہت ہی کم شعراء صنف رباعی میں طبع آزمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے اس پر غور کیا تو اپنے طور پر کچھ وجوہ تلاش کر پایا۔ مثلاً ایک تو یہی کہ عموماً لوگ خود کو الہامی شاعر کہتے ہیں اور موزونی طبع کو ہی شعر کہنے کا وسیلہ مانتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ رباعی کے اوزان ہمارے یہاں کی لحنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے گنگنا کر شعر کہنے والے اس سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کہ کوئی خاص ترنّم ہاتھ نہیں آتا جیسا کہ غزل کی بہت سی مترنم بحروں میں ہوتا ہے۔ دوسری وجہ خاص موضوعات اور اس کی ہیئت ہے اس لئے اکثر شعرا اسے مشکل صنف مان کر نہ صرف خود خوفزدہ رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ڈراتے رہتے ہیں۔ ورنہ تو ہر صنف کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور پابندیاں ہوتی ہیں۔ یہ صورتحال آج کی نہیں ہے بلکہ ابتدا سے ہی ہمارے بزرگوں نے اس صنف میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اسے سامنے رکھیں اور سید عابد علی وجدی الحسینی (۱۹۹۰-۱۹۱۸) کے سرمایے پر غور کریں تو حیرت ہوتی ہے ان کی قادر الکلامی پر۔ جو انھیں ایک استاذ رباعی گو شاعر ٹھہرانے کے لئے کافی ہیں۔ حالانکہ محمد قلی قطب شاہ نے محض 39، درد نے تیس، میر نے سوسوا سو، داغ نے تو اس طرف رخ ہی نہیں کیا، اسی طرح شاد عظیم آبادی نے 95، فانی بدایونی نے دوسو کے قریب، مگر حسرت، جگر، اصغر کترا کے گزر گئے۔ البتہ انیس نے تقریباً ساڑھے پانچ سو اور دبیر نے 200 سے زیادہ رباعیات کہی ہیں۔ امجد حیدر آبادی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے دیگر شعرا کی طرح محض ذائقہ بدلنے کی غرض سے رباعیات نہیں کہی بلکہ ان کی شناخت ہی رباعی کے حوالے سے ہے۔ فراق نے بھی اس سلسلے میں ایک الگ طرح ڈالی۔ جوش نے بھی ولولہ انگیز رباعیوں سے بہت متاثر کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے قابل فخر شعرا نے جس قدر دوسری اصناف شعر میں وافر مقدار میں طبع آزمائی کی ہے، اس کے مقابلے میں رباعی میں قلت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں وجدی الحسینی کی رباعیوں کے سرمایے پر ہم بجا طور پر نازاں ہوسکتے ہیں۔ ان کے دیمک زدہ مخطوطے کے مطابق انھوں نے کم و بیش چار سو کی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں جسے "گل و ثمر" کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے ان کی بہت سی رباعیوں کو بغور پڑھا اور بار بار پڑھا۔ تو اس نتیجے پر پہنچا کہ بیشتر ضروری مضامین ان کی رباعیوں میں آگئے ہیں جو صنف رباعی کے لیے لازمی مانے جاتے ہیں۔ مثلاً حمد و نعت، متصوفانہ خیالات، معارف و حقائق، موعظت، حکمت و فلسفہ، زندگی کے روزمرّہ مسائل، جیسا بویا جائے گا ویسا ہی کاٹا جائے گا، جدائی کا غم، کائنات کی کارسازی، اخلاقی پہلو، صبر و قناعت، بہار کی منظر کشی، ظلم اور ظالم کا انجام، غفلت اور کوتاہی کا انجام، خود آگہی اور اعتراف و کم مائیگی وغیرہ وغیرہ۔ موضوعات گو کہ بہت نہیں ہیں مگر ایسی شخصیت سے جیسے خیالات کی توقع کی جاسکتی ہے وہ سب ہیں۔ مبتذل اور رکیک خیالات کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی۔ بظاہر سادہ رباعیات ہیں مگر بباطن کان معنی ہیں۔ ان کی رباعیاں خارجی حالات، داخلی جذبات، جمالیاتی احساسات، اصلاحی، اخلاقی، تبلیغی، حمدیہ موضوعات اور انسانی رجحانات کو پیش کرنے کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔

شاعر فطرت شناس ہوتا ہے، وہ قدرتی مناظر کے توسط سے باری تعالی کی نہ صرف تعریف و توصیف کرتا ہے بلکہ اسی بہانے اپنی طرف سے عقیدت کے پھول بھی پیش کرتا ہے۔ جنگلات اور وہاں کا ماحول، وہاں کی خامشی، وہاں کی ویرانی، وہاں کی ہولناکی وغیرہ کو پیش کرتا ہے تو دل میں جذبات مچلنے لگتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے وجدی صاحب نے کیا خوب انداز اختیار کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب بھی انہیں کی ساتھ وہیں ہیں:

جنگل میں شب تار کی دہشت کا سماں
سناٹے کے عالم سے دل و جاں لرزاں
اٹھتی ہیں صدا یں جو بیاباں سے کبھی
محسوس یہ ہوتا ہے نکل جائے گی جاں

ہے کتنی دل آویز یہ جنگل کی فضا
تھم تھم کے عجب شان سے چلتی ہے ہوا
چھایا ہے ہر اک سمت سکوں کا عالم
دل یاد الٰہی سے ہوا نغمہ سرا

اپنے گناہوں کا اعتراف، گناہ گار ہونے کی شرمندگی کا اظہار تقریباً ہر شاعر کرتا ہے، اچھا برا، عذاب ثواب، جرم سزا، ایسا کرو ایسا نہیں، یہ نیک کام ہے یہ بدکاری ہے۔ بچپن سے ان سب پر اتنا سنتے آئے ہیں کہ ہر قدم پر الجھ جاتے ہیں۔ یہ غلط تو نہیں۔ یہ حرام کاری تو نہیں۔ یہ گناہ تو نہیں اور اپنی معصوم لغزشوں پر بھی خود کو مجرم سمجھ لیتے ہیں۔ اور تلافی میں خدا کے سامنے اعتراف کر کے جی ہلکا کرتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ وجدی صاحب کی کئی رباعیاں اس حالت کی غماز ہیں:

یہ زندگی غفلت سے ہوئی ہے برباد
ہے نفس اگر صید تو شیطان صیّاد
شہوات کے پنجے سے رہائی دے دے
اے میرے خدا تجھ سے ہے میری فریاد

اے خالق کل دونوں جہاں کے داتا
شرمندہ گناہوں سے ہے تیرا بندا
ہاں! سایہ رحمت میں جگہ دے مجھ کو
اس بندہ مسکیں پر عنایت فرما

مجرم ہوں خطا کار و پشیماں ہوں میں
سر تا بہ پا پیکر عصیاں ہوں میں
اقرار جہالت کا ہے ہر دم مجھ کو
تو واقف ہر جرم ہے ناداں ہوں میں
(دوسرے مصرع میں تنافر لفظی نے مزہ ذرا کرکرا کر دیا)

گناہ کا اعتراف اور پھر دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تاکہ رب کریم کی رحمت کو جوش آ جائے۔ ویسے بھی وجدی صاحب مذہبی رہنما تھے۔ مذہب ان میں اور وہ مذہب میں پیوست ہو چکے تھے، اس لئے اس کے قہر سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ دست دعا اٹھائے رکھنا، سجدے کرتے رہنا، گڑگڑاتے رہنا، اشک ندامت بہاتے رہنا، اور اس سے معافی، نعمت، آگہی، سکوں، خوشی مانگتے رہنا، بہرحال ہر قسم کے احساسات کی ترجمانی رباعیات میں کی گئی ہے۔ اپنے ماضی اور اپنی اہمیت کا اندازہ وہ ایسے لگاتے ہیں:

ہیں میری زباں حمد الٰہی کے لیے
اللہ کی عظمت کی گواہی کے لیے
سر پر ہے میرے تاج خلافت تاباں
ہے میرا تن خلعت شاہی کے لئے

ایک رباعی میں دیکھیے وہ کس قدر خوبصورتی کے ساتھ اللہ پاک سے ایک عظیم فریاد کرتے ہیں:

مالک مجھے تو ذوق محبت دے دے
شوق مئے عرفان حقیقت دے دے
ہر شے میں نظر آئے تجلی تیری
اے خالق کل چشم بصیرت دے دے

موسم، صبح، شام، رات کی منظر کشی وہ اس انداز میں کرتے ہیں کہ انھیں شاعر فطرت کہا جا سکتا ہے:

پیدا ہے شب تار میں یا رقص شرر
گردوں پر چمکنے لگے یا لعل و گہر
یا سینہ ظلمت سے شعاعیں پھوٹیں
یا چرخ پر تاباں ہوئے ماہ و اختر

سورج کی شعاعوں سے دمکنا سیکھو
راتوں میں ستاروں سے چمکنا سیکھو
ہے زندگی گرمی نفس سے قائم
اس آگ کے شعلوں سے بھڑکنا سیکھو

شاعر ایک گداز دل کا مالک ہوتا ہے۔ جذبہ عشق سے سرشار ہوتا ہے اور رومانیت کا پیروکار بھی ہوتا ہے۔ وجدی صاحب کی رباعیات محض خشک موضوعات پر ہی مبنی نہیں ہیں بلکہ معاملہ بندی اور تغافل شعاری پر افسردہ بھی ہوتی ہے۔

"چراغ مردہ" کی ترکیب کے برمحل استعمال نے مضمون میں بلا کی کشش لا دی ہے۔ اس سے زبان پر وجدی صاحب کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں ان کی ایک دعائیہ رباعی پیش کر کے اپنی بات سمیٹ رہا ہوں، ورنہ ان جیسے شاعر پر صرف رباعی کی ضمن میں ہی پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے جب کہ وہ نثر و نظم کی کئی اصناف میں قابل قدر سرمایہ چھوڑ کر گئے ہیں۔

☆☆☆

دکن میں رباعی کی شمع - شاہ حسین نہری

ڈاکٹر ابو اسامہ (ابن آدم)
(مالیگاؤں، مہاراشٹر۔ موبائل:8788182676)

بے شک رباعی کے اوزان پر تخیل وطبع کو مائل کرنا ہر کس وناکس کے اختیار میں نہیں۔ یہ فن محض اختیار وصلاحیت اور قوتِ بیان کا ہی نہیں بلکہ دردمندی، وسیع القلبی، بسیط نظری اور ایک عمر کے تجربے کا بھی متقاضی ہے۔ رباعی کے مزاج میں ابتدا ہی سے شوخی، عقیدت، تصوّف، اخلاقیات اور بے ثباتی کا کرب شامل رہے ہیں۔ ان جذبات کے شائستہ اظہار ولطیف بیان کے لیے نہایت صبر وتحمل اور عمیق سنجیدگی درکار ہے۔ مشہور ہے کہ قلی قطب شاہ کی عشقیہ رباعیات اس کی پُرتعیّش زندگی اور مزاج کی حقیقی عکاس ہیں۔ سراجؔ کی تصوّفانہ رباعیات اس کے عشقِ حقیقی کو درشاتی ہیں نیز وؔلی کی رباعیاں اس کے خیالی محبوب کے حسن وسراپا کی تصویر ہیں۔ ان تین شعرا کے بعد دکن میں رباعی گوئی کا سلسلہ موقوف رہا۔

عرصۂ دراز کے بعد شاہ حسین نہری (پ:۱۹۴۱) کو یہ فن ودیعت ہوا۔ ورثے میں ملی دینداری اور حق پرستی نے ان کی طبیعت میں شائستگی، سنجیدگی اور حکمت بھر دی۔ ذوقِ مطالعہ اور شوقِ تحصیلِ علم نے انھیں فکرِ جہاں اور کارخانۂ حیات کی سرگرمیوں سے روشناس کیا۔ حوادثِ روز وشب نے غمِ زیست اور کربِ ذات ان پر منوّر کیے اور علمی پختگی کو قوتِ گویائی ملی تو دلی کیفیات بے ساختہ رباعی بن گئیں۔

طعنہ زن ہیں ہم پر بیتی صدیاں　　کیوں نیک طریقوں پر حاوی بدیاں
کیوں اب طاری ہوتا جاتا ہے جمود　　کیا خشک ہوئیں قلب و نظر کی ندیاں

وہ سماج اور معاشرے کے کرب کو خوب جانتے ہیں۔ انھیں اپنے اطراف واکناف میں خوف سے لرزتے اور دھڑکتے دلوں کا بھی احساس ہے۔ اقدار کی پامالی، تہذیب کے تنزل اور علمی بحران سے وہ باخبر ہیں۔ انسانی ضروریات، تقاضے اور اس کی مجبوریاں اور محرومیاں ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہیں۔ تیز رفتار عہد میں بھی منزل کے متمنی رینگتے اور گھسٹتے جسموں کا انھیں خیال رہا ہے۔

چھِدرا چھِدرا سایہ، زخمی ہے چھاؤں　　چلتے چلتے چھلنی چھلنی ہیں پاؤں
ہے حدّ نظر تک رستہ ہی رستہ　　جانے نہ مسافر جانا ہے کس گاؤں

بے شک دُنیا غم واندوہ سے بھری پڑی ہے۔ کسے تاب ہے کہ سسکتی اور تڑپتی زندگی پر فقط طائرانہ نظر ہی ڈال دے! دلوں میں تاریکی گھر کر گئی ہے۔ کسے جرأت کہ چراغِ اُمید جلائے۔ بعض یہ کرب برداشت نہیں کر پاتے اور کارِ جہاں سے دستبردار ہو کر جوگ لے لیتے ہیں مگر نہیں شاہؔ صاحب ان سے نظریں نہیں پھیرتے۔ وہ ناگفتہ بہ حالات میں بھی صبر واستقلال اور حسنِ عمل کو بروئے کار لانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

دُنیا سے اے شاہؔ! نہ ہرگز تُو بھاگ　　دُنیا یہ تجھی سے ہے، نہ لینا بیراگ
دُنیا ہے آخرت کی کھیتی ، لیکن　　ہے حسنِ عمل اس کی سرسبزی لاگ

نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے اور رگوں میں لہو گرمانے اور فکروں میں جوش وولولہ بھرنے کے لیے وہ کہتے ہیں؛

کب ساحل پر ڈرے نظر آتے ہیں　　موّاج سمندر سے ہے اپنا رشتہ
ہم کاٹ کے ہر ایک بھنور جاتے ہیں　　کچھ لوگ کنارے ہی پہ اتراتے ہیں

قضا، فنا اور بے ثباتی سے روگردانی ممکن نہیں۔ مگر انسان دُنیاوی خواہشات اور لذّات میں غرق ہو کر اس اٹل حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے۔ بعض شعرا اس پر کفِ افسوس ملتے ہیں تو بعض تاب نہ لا کر نوحہ خوانی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ شاہ حسین نہری حقیقت آشنا ہیں، اور 'کُلُّ نَفسٍ ذَائِقَۃُ المَوت' کے فرمان پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

مرنے کا انتظار ہر آن کرو
بس، بانگِ قضا ہی پہ سداکان دھرو
اکثر بھولے رہتے ہو، خود میں مگن
جیناہے یہی، شاہؔ ! کہ یاں آن مرو

اُنھیں درک ہے کہ حیاتِ انسانی قدرت کی محتاج ہے۔حتیٰ کہ مزاج وطبیعت پر بھی قدرت وموسم کے اچھے اور بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ قحط سالی میں وہ،آسمان تکتی آنکھوں کی حسرت کو بھی جانتے ہیں۔

تالابوں ، کنووں میں کا پانی خشک
اِک ہُو کا عالم ہرسُو، دھرتی خشک
بارش اب کے برس جو کم برسی
اتنے برسے، ہوئے ہیں آنسو بھی خشک

عشق کے بغیر دل کا تصوّر محال ہوتاہےاور شاعری ،دل کی ترجمان۔ظاہر ہے کہ پھر یہ ترجمانی 'عشق' نہ ہوتو کیا ہو۔اُردو رباعی میں اظہارِعشق اور بیانِ وارداتِ قلب کی روایت،محمد قلی قطب شاہ سے رائج ہے۔اس روایت کی پاسداری شاہؔ صاحب نے بھی بڑے سلیقے سے اور برجستگی کے ساتھ کی ہے۔

تعریف سنی توکیا ہی اترائے
پھر پھول کِھلے باتوں کے، اِٹھلائے
قابو نہ رہا دل پر تو آخرکار
نزدیک،جھجک، سنبھل ، مٹکتے آئے

ہے چمپئی سانولی سلونی صورت
سانچے میں ڈھلی ہوئی تیری مورت
تعدیل وتناسب کی، اے تجسیمِ جمیل
تسکین کی ہستی ہے تری ہی صورت

ہے سانولی رنگت میں گلابی کچھ پُٹ
مہندی کے گل بوٹے گویا ہتھ چھُٹ
افشاں بھری مانگ انجمی ہے جھُرمُٹ
جلبابی جلوے، دُزدیدہ لکھ لُٹ

وہ حسن ہی کیا جسے آنکھوں نے نہیں دیکھا!وہ جسم ہی کیا جو بے روح ہو۔شاہؔ صاحب کا عشق، ہوائی اورمحبوب، خیالی نہیں بلکہ جیتا جاگتا پیکراور پختہ حقیقت ہے۔اُنھوں نے اپنی زوجہ سے محبّت کی جیسا کہ حق ہے۔اپنی مرحوم بیوی 'گلبدن کی یاد میں' بے قرار ہوکر اُنھوں نے بہت ساری رباعیاں کہی ہیں۔یہ رباعیاں مرحومہ کے تئیں، ان کی دیرینہ محبّت کا اقراراور نیازمندی کی دلیل ہیں۔

باتیں کرتے منہ سے جھڑتے تھے پھول
جاتاوہ گلبدن مسرّت سے پھول
اب بسترپر ہے بے بس اِک خاموشی
ہے گلبدنی کہاں، کہاں لب کے پھول

رخصت وہ گلبدن ہوئی آخرکو
ہے ربط مگر جیسے کہ ٹوٹاہی نہ ہو
یہ بیٹا، بیٹیاں ہیں روپ اُس کا ،شاہؔ
اب دیکھ جیو، ان کو جی بھر دیکھو

اشکوں کے وسیلے سےدکھ بولیں نین
اس طرح سے آتاہے دل کو کچھ چین
تصویر اس گلبدن کی بنتی ، مٹتی
اشکوں میں لیے بیٹھے ہیں یہ شاہؔ حسین

الغرض فی زمانہ دکن میں رباعی کی ایک شمع، بنام،شاہ حسین نہری ،روشن ومنور ہے۔اہلِ دکن اور اہل فن کو چاہیے کہ اس شمع کی اہمیت کو سمجھیں ، اس سے فیض یاب ہوں، اس کی پذیرائی اور قدر کریں جیسا کہ حق ہے۔

☆☆☆

رباعیات روشن: ایک اجمالی جائزہ

ڈاکٹر غلام حسین
(صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ مادھو کالج، اُجین (ایم پی)۔ موبائل:9893853183)

کلاسیکی اردو اصناف شاعری میں رباعی ایک ممتاز معتبر، موقر اور مشکل صنف مسلم ہے۔ بقول ناوک حمزہ پوری:

''جملہ اصناف سخن میں سب سے ارفع و اعلیٰ مقام رباعی کا ہے۔ سخن طرازی اگر دولہن ہے تو رباعی گوئی اس کی عصمت ہے، آبرو ہے، اس کا زیور ہے، اس کی مانگ کا ٹیکہ ہے اس کا منگل سوتر ہے۔ سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ دلکش اور سب سے زیادہ مقدس۔''

(رباعیات روشن ص12)

یوں تو اردو شاعری میں رباعی کی روایت ابتدائی دور سے ہی ملتی ہے۔ سر برآوردہ شعراء نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا منوانے اور بطور استناد اس صنف میں لازمی طور پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جس طرح غزل میں میرؔ و غالبؔ قصیدہ میں سوداؔ و ذوقؔ مثنوی میں میر حسنؔ و دیا شنکر نسیم اور مرثیہ میں انیسؔ و دبیرؔ کی طرح اردو رباعی گوئی میں کوئی اختصاصی نام نہیں ملتا۔

فی زمانہ اردو شعر و ادب کے لئے فالِ نیک ہے کہ سوامی شیا مانند سرسوتی روشنؔ (پیدائش: ۲۶/ نومبر ۱۹۲۰ بمقام پشاور، وفات: ۲۵/ مارچ ۲۰۱۴ بمقام دہلی) برگزیدہ اور صوفی منش رباعی گو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ نامور محقق گیان چند جین کے مطابق اردو اور ہندی میں تقریباً چار ہزار رباعیاں ان کا تخلیقی سرمایہ ہیں۔ ''رباعیات روشن'' ان کی منتخب رباعیات کا مجموعہ ہے۔

مبدائے فیض نے انھیں یہ صلاحیت چشمہ رواں اور بادصرصر کی طرح ودیعت کی ہے۔ ان کی خلاقانہ طبع کے مدنظر اس قول کی تائید ہو جاتی ہے کہ "شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے'' رباعی ان کی سرشت میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ وہ مجسمۂ رباعی ہو گئے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی گفتگو رباعی کے فارم میں کرتے تھے۔ رباعی گوئی کی ریاضت میں وہ جس انداز سے اپنا خون جگر صرف کر رہے تھے انھیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ ؎

ایک ایک خدو خال ابھارا ہم نے
پیکر میں تقدس کے اتارا ہم نے
کہتے ہیں جسے فن رباعی روشن
اس فن رباعی کو نکھارا ہم نے

شاعری بنی نوع انسان کی خدمت کا بے لوث اور قلندرانہ مشغلہ ہے۔ اس مشغلہ کا سلسلہ مدت مدید سے صوفیائے کرام، سادھوؤں اور سنتوں کی عنایت سے جاری و ساری ہے۔ سوامی جی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے توسل سے سماجی کجی کو راستی پر لانے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔ بے شک ان کی رباعیات سماجی اصلاحات کی حامل ہیں۔ اسی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اردو اکادمی دہلی نے اس اہم کتاب کی اشاعت میں مالی معاونت کی ہے۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر گیان چند جین، جناب ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر صادق، رئیس بریلوی اور ڈاکٹر مرزا حسن ناصر جیسے نامور علماء و فضلاء نے سوامی جی کی رباعی گوئی کو سراہا ہے۔

سوامی جی کی متصوفیانہ رباعیاں قابل احترام ہیں۔ وہ سرمدی معرفت کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں جہاں ۔ ؎

من تو شدم، تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

وہ راہِ سلوک کی اس منزل پہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے ان کی یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

یہ سچ ہے میں اپنے میں تجھے پاتا ہوں
اب خود کو بھی میں تو ہی نظر آتا ہوں
دیکھے تو کوئی فکر تجسس کا کرم
میں میں نہ رہا تو ہی ہوا جاتا ہوں

وہ راہ معرفت میں وحدۃ الوجود میں یقین رکھتے ہیں اور ہر ذرے میں وہ اپنے معبود کا دیدار کرتے ہیں ۔اس کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنی رباعیات میں کیا ہے۔ ؎

دینا کے ہراک گوشہ میں مستور ہے تو
ہم کیسے کہیں ہم سے کبھی دور ہے تو
ایک لفظ میں تعریف یہی ہے تیری
روشن ہیں سبھی جس سے وہی نور ہے تو

ان کی زندگی عبادت اور ریاضت سے عبارت ہے ۔ان کا دل صنم آشنا ہے اوران کے جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں ۔اس لیے وہ زیارت گاہوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔ان کی رباعیوں میں وحدہ لاشریک کی صدا اس طرح گونجتی ہے۔ ؎

یہ سچ ہے وہی ایک ہے میرا محمود
اور اس کے سوا کوئی کہاں معبود
میں اور کسی کو بھی کروں کیوں سجدہ
کیا اس کے سوا کوئی اور ہے مسجود

وہ خالق کائنات کی ہر شے سے محبت کرتے ہیں۔اس عمل کو وہ خدا کی عبادت سمجھتے ہیں۔اس لئے وہ فرماتے ہیں۔ ؎

کیوں اس کی ہو مخلوق سے نفرت مجھ کو
تخلیق سے اس کی ہے محبت مجھ کو
تم چاہے جسے سمجھو عبادت
لگتی ہے محبت ہی عبادت مجھ کو

وہ ''رضائے مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' پر کاربند ہیں۔وہ غم وابتلا سے دل برداشتہ نہیں ہوتے بلکہ آلام روزگار کو عطائے الٰہی سمجھ کر اسے خوشگوار بنا لیتے ہیں۔

سر آنکھوں پر جو کچھ بھی ترے در سے ملا
درکار کہاں ہم کو عبادت کا صلا
عشرت تو ہمیں بخش کہ عسرت یارب
بے لوث محبت میں بھلا کیسا گلا

ان کی عبادت سود وزیاں سے مبّرا ہے۔وہ دنیاوی جاہ وحشمت اور شان وشوکت کو فر ومایہ سمجھتے ہیں۔فقط معبود حقیقی کی نگاہ التفات ان کی حاصل زندگی ہے۔شیوۂ طریقت کی ایک رباعی ملاحظہ کیجئے۔ ؎

مانگے تھے ہیرے موتی نیلم کب
مٹّی کے ڈھیلے ہیں یہ سب کے سب
مٹی کے کھلونوں سے نہ بہلا ہم کو
ہم تجھ سے تجھے مانگ رہے ہیں یارب

سوامی جی کی رباعیات پیار ومحبت کی بحر بیکراں ہیں۔اس کیمیائے دل سے انھوں نے انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی ہے۔سچ پوچھیے تو ان کے نزدیک محبت ہی عبادت ہے۔اسے انھوں نے مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

پوجا سے کہاں کم ہے محبت کی ڈگر
جھکتا ہے محبت ہی کے در پہ یہ سر
مذہب میں ا لجھتے ہیں ،الجھنے والے
ہم جیتے ہیں الفت کے پجاری بن کر

سوامی جی الفت کو سب سے بڑی دولت قرار دیتے ہیں اور وہ ہر دل کو اس کی ضرورت ٹھیک اسی طرح محسوس کراتے ہیں جس طرح پیڑ پودوں کو پانی کی ہوتی ہے۔موجودہ دور میں نفرت کا طوفان بپا ہے جس کی وجہ سے وہ ملول خاطر ہیں۔وہ اپنے دلی کیفیات کو رباعی کے سانچے میں اس طرح ڈھالتے ہیں۔

نفرت کی ہوا دیش میں اب چلتی ہے
رہ رہ کے محبت کی کمی کھلتی ہے
پڑتی ہے نظر دیش کے حالات پر جب
دل ایسے جلے جیسے چِتا جلتی ہے

وہ ملک وقوم کی فلاح وبہبود کے لیے تاحیات سرگرم عمل رہے۔ان کی رباعیات، امن چین اور بھائی چارگی کا سرچشمہ ہیں۔اس پرآشوب دور میں ملک کی خیر سگالی کے لئے وہ اس طرح کی خوشگوار فضا کی تمنا کرتے ہیں۔ ؎

ہم بات کریں پیار کی خوشحالی کی
گلزار محبت کے حسیں مالی کی
کیا بات ہے روشن ؔ جو کبھی ایسا ہو
دن عید کا ہو رات ہو دیوالی کی

وہ تخریبی عناصر کی مذمت کرتے ہیں اور انسانیت کے راستے پر چلنے

کی تلقین کرتے ہیں نفرت اور تشدد کی آگ بھڑکانے والوں کو مقدس مذہبی کتابوں کے حوالے سے درس انسانیت اس پیرائے میں دیتے ہیں۔ ؎

وید کا فرمان سمجھنا سیکھو
قرآن کا اعلان سمجھنا سیکھو
مذہب کے لئے خون بہانے والو!
انسان کو انسان سمجھنا سیکھو

موجودہ منافرت کی صورت حال سے وہ وقتی طور پر رنجیدہ خاطر تو ہوتے ہیں لیکن اپنے ملک کی رواداری اور پیار ومحبت کی روایت کے پاسدار رہے ہیں۔ اس لئے وہ اس اعتماد کے ساتھ کشت الفت کی آبیاری میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ ؎

نفرت کو الفت کا شوالا دے گا
پاکیزہ محبت کا مقالا دے گا
جس دیس میں روشن ہیں کبیر و فرید
وہ دیس زمانے کو اجالا دے گا

بے شک ''رباعیات روشن'' محبت کی روشنی سے منور ہے اور اس کا لب لباب یہی ہے۔ ؎

ان کا جوفرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

سوامی منش سوامی جی نے مذہب کے عرفان اور تجربات کی آگہی سے جو اسرار حیات منکشف کئے ہیں ان کی کارزار حیات میں افادیت ہے۔ ان کے نزدیک نفرت، کدورت اور ہوس انسان کے تئیں بڑے دشمن ہیں۔ اگر انسان ان پر قابو پالے تو اس کی زندگی آلام روزگار سے پاک ہوجائے۔ وہ سفر حیات میں دشوار گزار منازل کے طلب گار ہیں۔ آلام کو وہ آزار سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کے بھرم کو اس فلسفیانہ انداز سے وا کرتے ہیں کہ فنا وبقا کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ وہ پروانے اور باد صبا کے فلسفۂ حیات کی توضیح کرتے ہیں۔

پروانے ہیں لیتے یہ جینے کا مزا
یہ شمع پہ جل کر بھی تو روشن ہوا
اس سے بڑھ کر نہ کوئی سمجھا ہے
کیا راز بقا اور ہے کیا راز فنا

■

ہے سمجھو چیز ہے کیا باد صبا
دیتی ہے حقیقت کا پتہ موج وفا
ہے تو قدرت کے اشاروں کو سمجھ
ہر موج بقا دیتی ہے پیغام فنا

ان کی رباعیاں موج حوادث سے ہنسنے کھیلنے کا ہنر سکھلاتی ہیں اور ظلمات مصیبت میں شمع بن کر رہبری کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں محنت پیہم، حوصلہ اور ہمت کو مہمیز کرتی ہیں۔ اس سلسلے کی چند سبق آموز رباعیاں ملاحظہ کیجئے۔

عمل دیتی ہے جیون کی غزل
کھلتے ہیں عمل ہی سے امیدوں کے کنول
عمل کے بنا کچھ بھی کہاں ہے ممکن
میدان بقا میں تو ضروری ہے عمل

سوامی جی مست قلندر ہیں لیکن تارک الدنیا نہیں۔ وہ گوشہ نشینی کی زندگی نہیں گزارتے بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں اور خود کفیل زندگی گزارتے ہیں۔ اگر دنیا میں وہ کچھ ترک کرتے ہیں تو ہوس، کدورت اور نفرت کو اور یہی پیغام بنی نوع انسان کو بھی دیتے ہیں۔

کب کس نے کہا جینے کی صورت چھوڑو
کہتا ہے تمہیں کون ضرورت چھوڑو
ایک ایک پیغمبر نے یہ فرمایا ہے
چھوڑو تو ہوس اور کدورت چھوڑو

سوامی جی کا دل حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ وطن کو گلزار اور گلناز بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے وطن میں محبت کا جادو جگا کر نفرت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی ہر شے سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اس جذبہ کی توقع ہر بشر سے کرتے ہیں۔ ؎

ہم جیتے ہیں جس دیس کے افلاک تلے
ہم گھٹنوں کے بل جس کی زمیں پر ہیں چلے
اس دیس کو ہر چیز سے بڑھ کر مانیں
بھاشا ہو کہ صوبہ ہو کہ مذہب ہو بھلے

''رباعیات روشن''، محض گفتار نہیں بلکہ سوامی جی کے کردار کا پرتو ہے جو پچاسی سالہ سن رسیدہ مرتاض کی ریاضت اور تپ سے منور ہے۔ فی الحقیقت سوامی جی کی رباعیاں عارفانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ جیسے موضوعات جلیلہ اور منقح مسائل پر مبنی ہیں جن میں سرشاری اور بودگی بدرجہ اتم ہے۔ ''رباعیات روشن'' وید، اپنیشد، گیتا، رامائن اور قرآن کریم کا مجموعہ ہے جس میں انسانیت کی سچی روح جلوہ گر ہے۔ یہ اُردو رباعی اور ہندی مکتک کے فن سے آراستہ ہے۔ اس نفرت گہ دنیا میں محبت اور انسانیت سے لبریز ''رباعیات روشن'' وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆☆☆

رباعیات فراق: ایک مطالعہ

ڈاکٹر معراج الدین خاں
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، کسان پی جی کالج، بہرائچ، یوپی)

اردو کے شعری سرمایہ میں ہندوستانی تمدن کا رنگ بہت گہرا ہے جس کی ابتدا اردو زبان کی ابتدا سے ہی ہوتی ہے، امیر خسرو جس کی روشن مثال ہیں یہ روایت آج بھی اردو شعروادب کے مزاج میں رچی بسی ہے اس حوالے سے فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ـ۱۹۸۲) کی شاعری کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے فراق کی شاعری عشقیہ شاعری ہے عشق کے ذریعہ ہی فراق کو اپنے اور اس بیکراں کائنات کے درمیان رشتے کا عرفان ہوتا ہے بعض حضرات ان کے عشق کو صوفیانہ اندازِ فکر سے منسلک کر کے بھی دیکھتے ہیں اور ان کے کلام میں وحدت الوجود کا ایک رنگ بھی دریافت کرتے ہیں مگر دراصل ایسا ہے نہیں فراق کی شاعری کے اصل رنگ اور اس کے سرچشمے کا سراغ قدیم ہندوستانی فلسفے اور سنسکرت جمالیات میں ہی مل سکتا ہے۔

فراق پر ہندوستانی فلسفہ اس کے قدیم ترین ادب فنون لطیفہ عہد مغلیہ کی بہترین شاعری ہندوستانی سنگیت اور ہندوستانی طرز معاشرت کا گہرا اثر تھا نیز فارسی اور اردو شاعری کی شاہ کار نظم ونثر کے ادب فلسفہ اشتراکیت کی قدیم وجدید فکریات اور عالمی تاریخ کے وسیع مطالعے نے فراق کے دل ودماغ کو بہت متاثر کیا اس ذہنی اور فکری وسعت نگاہی کے ساتھ فراق گورکھپوری نے شاعری کی اور اس کی عمارت انسان دوستی کے گہرے احساس پر استوار کی قدیم ہندوستانی فلسفے میں ایسے اشارے بکثرت پائے جاتے ہیں جہاں عورت کے جسم کو حقیقت مطلق تک پہنچنے کا اور مکتی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ مانا گیا ہے یہاں تک کہ ارتھووید جو رگوید، سام وید اور یجروید کے بعد چوتھا وار آخری وید ہے جس میں جیوتش، تنتر منتر کے ساتھ ساتھ کام شاستر کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ واتسائن کے مشہور گرنتھ، کام سوتر، کا ماخذ بھی ارتھ وید ہی مانا جاتا ہے ہندومت میں ویسے بھی عورت کے جسم کا بھوگ کبھی شجر ممنوعہ نہیں رہا۔ بلکہ اس کے چار پرماتھوں میں سے ایک مانا گیا ہے یعنی دھرم، ارتھ کام اور موکش سانکھ کا پُرش اور پراکرتی کا فلسفہ بھی بڑے لطیف پیرائے میں اسی امر کی نشاندہی کرتا ہے چاروا کیہ کا فلسفہ تو پوری طرح سے مادی ہے اور جسم سے شروع ہو کر جسم پر ہی ختم ہو جاتا ہے اور روح یا آتما کے وجود کو یکسر رد کر دیتا ہے اس قدیم ہندوستانی فلسفے کا سلسلہ جدید زمانے کے ہندو فلسفی آچاریہ رجنیش تک چلا آیا ہے سنسکرت شاعری کا خمیر اس ہندوستانی فلسفے اور تہذیب سے تیار ہوا ہے اس لئے سنسکرت شاعری میں سنجوگ یعنی وصل اور ویوگ یعنی ہجر دونوں شرنگار کا ہی روپ ہیں فراق کے یہاں عشق اپنے معروف معنوں سے جداگانہ مفہوم کا حامل ہے جس سے نہ صرف نسل انسانی قائم ہے بلکہ اس سے تہذیبی سوتے بھی پھوٹتے ہیں۔ بقول فراق:

''عشقیہ شاعری کے لئے صرف عاشق کا ہونا اور شاعر ہونا کافی نہیں نہ محض نیکی اور نرم دلی کافی ہے صرف جذباتیت اور مقبولیت ہی کافی نہیں داخلی اور خارجی مشاہدہ بھی کافی نہیں ان اوصاف کے علاوہ عظیم عشقیہ شاعری کے لئے ضروری ہے کہ شاعری کا احساس اور عرفان داخلی اور خارجی دلچسپیاں وسیع ہوں ان کی شخصیت ایک وسیع زندگی کا احاطہ کرتی ہو، اس کا دل ودماغ بھی وسیع ہو یعنی ایسا دل ودماغ جسے کلچر نے رچایا بسایا ہوا''۔

فراق اردو ادب کے پہلے شاعر ہیں جن کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا فراق کی شاعری ایک وسیع دریا ہے کیوں کہ اس میں کئی فکری اور تہذیبی روایت دھاروں کی طرح کئی سمتوں سے آکر ملتی ہے شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شرائط کے بل بوتے مادی یا روحانی کسی بھی فکر کو ایک کرشمہ بنا سکتی ہے فراق کے یہاں یہی کرشمہ ہوا ہے عورت کے جسم کو انہوں نے اپنی رباعیوں میں جس انوکھے پن کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے ایک ایک اعلیٰ شاعری کا نمونہ سامنے آیا مگر یہ جسم ایک خالص ہندوستانی عورت کے جسم، اس کے اسرار، اس کی رنگینی اور اس کے حسن اور ادا کو پہلے اس طرح کبھی اردو شاعری میں نہیں برتا گیا۔ اردو کی کلاسیکی غزل میں عورت کے جسم کو تو طرح طرح کی تشبیہات سے نوازا گیا اور اعضاء کا بیان بھی نقل کیا گیا ہے مگر فراق کی رباعیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں عورت ایک خالص ہندوستانی عورت ہے کوئی خالی محبوب نہیں، فراق کی رباعیاں عورت کے جسم کا جشن ہیں اور مرد اس ازلی پیاس کا اعلان نامہ ہیں، جس کے ذریعے یہ کائنات ابھی تک جاری وساری ہے۔

کیا فراق کو ہوس پرست قرار دیا جا سکتا ہے یقیناً اگر شاعری بالذات کوئی شئے نہیں ہے تو فراق ہوس پرست ہی کہے جائیں گے۔

مگر جب ہم ایک مخصوص کلچر، مخصوص مذہب اور مسلک کے حوالے سے ایسی شاعری کا تجزیہ کریں گے تو اس ہوس پرستی میں پوشیدہ ایک قدیم اخلاقیات کی آواز کو بھی صاف صاف سن لیں گے۔ اگر بھوک کو ایک تپسیا مان لیا جائے تو فراق کی یہ رباعیاں اس تپسیا کی ایک بازگشت ہیں:

پہلو کی وہ کہکشاں، تبسموں کا اُبھار
ہر عضو کی نرم لو میں مدھم جھنکار
ہنگام وصل پینگ لیتا ہوا جسم
سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

■

وہ جھلملائے ستارے ترے پسینے کے
جبین شام جوانی تھی جگمگاتی ہوئی
وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دم صبح
وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی

فراق کی رباعیوں میں اور کہیں کہیں غزلوں میں بھی اور شاعری میں پہلی بار عورت کا ملکہ ایک زندہ جوان عورت کا ٹھوس جسم نظر آیا ہے فراق حسن فطرت کے شیدائی تھے وہ خوبصورت قدرتی مناظر سے محظوظ ہوتے اور ان کے نظاروں میں کھو جاتے تھے انگریزی میں رومانی شاعروں اور بالخصوص ورُسورتھ سے اثر پذیری نے مظاہر فطرت سے وابستگی کو تقویت بخشی تھی فراق کے کلام میں ایسی رباعیاں خاص تعداد میں موجود ہیں جس میں انہوں نے موسموں کی دلفریبی کی طرف اشارہ کئے ہیں۔

جب چاند نے امرت کی گگر چھلکائی
جب ہم گرنے سرد ہوا سنکائی
لرزش تنِ نازک میں ہوئی رات گئے
یا چاندنی پڑتے ہی لتا لہرائی

■

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب آنے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

■

تاروں بھری رات نرم فطرت ہے سجی
ہے شوخ نگاہ میں بھی ایسی نرمی
یہ چندر کرن میں سات رنگوں کی جھلک
گاتی ہوئی اپسرا گگن سے اتری

فراق کے کلام میں ان کو رباعیوں کی انفرادیت کے رنگ کو جمالیاتی تہذیبی اور جنسی عناصر نے چوکھا کر دیا ہے فراق کی رباعیوں میں نیا انداز، نیا مزاج، نئے تیور اور نئی لفظیات قاری کی توجہ اسیر کر لیتی ہے ۔1946ء میں ''روپ'' کی اشاعت عمل میں آئی تو اردو داں حلقے میں اس کے دو متضاد ردعمل نظر آئے کچھ ادب شناسوں نے اس کی بڑی ستائش کی اور اسے اردو شاعری میں ایک خوشگوار اور انوکھا اضافہ قرار دیا اور بعض افراد کی نظریں فراق کے جنسی پہلو پر مرکوز ہوگئیں اور ان رباعیوں کو انہوں نے عریاں اور مبتذل قرار دیا۔ ''روپ'' کی رباعیاں حسن وعشق کی باہمی ربط کے گوناگوں پہلوؤں کیفیات ومشاہدات اور بشری تجربات کا نچوڑ ہیں۔ فراق کی غزلوں اور ان کو رباعیات میں یہ تصور کہیں جنسی شاعری کے روپ میں نظر آتا ہے تو کہیں محبوب کے اعضاء کی مرقع کشی کی صورت میں۔ فراق اردو کے وہ منفرد شاعر ہیں جنہوں نے اپنی رباعیوں کو ''سنگار رس'' کی رباعیوں سے تعبیر کیا ہے فراق نے اپنی رباعیوں میں جس حسن کو مختلف زاویوں سے دیکھا اس کی اداؤں کی دلنشینی کو محسوس کی اور اسے لفظوں میں سمو دیا ہے۔ رباعی میں محبوب کے حسن کی تصویر میں پیش کرنے میں فراق کو کمال حاصل ہے۔

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم
ہو رقص میں جیسے رنگ وبوکا عالم
جگمگ جگمگ ہے سنسانِ ارم
یا قوس وقزح لچک رہی ہے پیہم

■

ہے لوچ بلوریں کہ پیکر کا رچاؤ
مئے خانے کو نیند آئے وہ آنکھوں کا جھکاؤ
جس طرح کمانوں میں پڑ جائے جاں
دیکھے کوئی پنڈل کا گداز اور تناؤ

■

مکھڑا دیکھیں تو ماہ پارے چھپ جائیں
خورشید کی آنکھوں کے شرارے چھپ جائیں
رہ جاناوہ مسکرا کے تیرا کل رات
جیسے کچھ جھلملاکے تارے چھپ جائیں

فراق کے کلام میں ایسی رباعیاں خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں شوخی و بے باکی نے عریانیت کی سرحدوں کو چھولیا ہے کلام فراق پر:

اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں جسمانیت زیادہ ہے ایسے نقادوں کے پیش نظر فراق کی غزلوں کے علاوہ ان کی وہ رباعیاں بھی ہیں جن میں محبوب کے قرب کی برہنہ تصویریں متین، گفتہ اور شائستہ قارئین کو گراں گزرتی ہیں جعفر علی خاں اثر نے فراق کے کلام میں عریانیت اور سوقیت پر کڑی تنقید کی ہے اپنی تصنیف ''چھان بین'' کے مضمون ''روپ''، ''میری نظر میں''، جعفر علی خاں اثر نے فراق کی رباعیوں کے ابتذال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فراق کا منشاء کوک شاستر تصنیف کرنا تھا قانونی شکنجے سے بچنے کیلئے رباعیوں کا روپ دے دیا''

جعفر علی خاں اثر روپ میری نظر میں مضمون مشمولہ چھان بین ص ۲۱۷

کلام فراق کی اس خصوصیت یعنی حد سے بڑھی ہوئی بے باکی اور عریانی سے جگن ناتھ آزاد بھی خوش نہیں ان کا خیال ہے کہ 'ہندو تہذیب' مسجل روپ، دیپ مالا، مدبھرے سینے، کمر کا کٹاؤ، چندر کرن اور کام دیو کی کہانی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اپنی وسعتوں میں سمیٹے ہوئے ہے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''یہی اس تہذیب کا طول وعرض ہے اور یہی اس کا ماحصل ہے تو عالمی تہذیب کے پیمانے سے یہ ایک معمولی اور غیر اہم تہذیب ہے اس سے تو میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ساری ہندو تہذیب شرم گاہ اس کے شاعری کے علاوہ نہیں کچھ بھی نہیں دے گی۔ لیکن یہ حقیقت یہی ہے۔''

جگن ناتھ آزاد کچھ فراق کے بارے میں (مضمون) مشمولہ فراق گورکھپوری، انجمن ترقی اردو ص ۱۹۔

فراق کی رباعیوں کے مجموعے ''روپ'' مین ان کی تین سو اکیاون (۳۵۱) رباعیاں موجود ہیں موضوع کے اعتبار سے انہیں دو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے وہ رباعیاں ہیں محبوب کے لب ورخسار اور اس کے خدوخال کی کیف آگئیں تصویریں ہیں اور دوسری قسم کی رباعیاں وہ ہیں جن میں ہندوستانی زندگی اور ہندوستانی طرز معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پنگھٹ پر لڑکیوں کی گگریاں، معصوم لڑکیوں کا کھیتوں میں دوڑنا، اشنان کے بعد لباس کو الگنی پر پھیلانا، بیٹی کے سسرال جانے کا منظر، بابل کے گیتوں کا سوز وساز، پریمیکا اپنے پریمی کا انتظار کرنا اور چوکے کی سہانی آگ میں گھڑے کا دمکنا وغیرہ۔ ہندوستانی معاشرت کے ایسے خاکے ہیں جن میں فراق کے تخیل ان کے رچے ہوئے جمالیاتی شعور اور ان کے تیکھے راز ابلاغ نے جان ڈال دی ہے چند رباعیاں جو مذکورہ بالا موضوعات کو نشان دہی کرتی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

پنگھٹ پہ گگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
پانی ہچکولے لے کر بھرتا ہے ترنگ
کاندھوں پہ سروں پر دونوں ہاتھوں میں کلس
مدانگھڑیاں ہیں سینوں میں بھرپور امنگ

فراق کی رباعیوں میں ایک نئے مزاج اور نئی لے کی موسیقیت سما گئی ہے ان میں ہندوستانی روح جاری وساری نظر آتی ہے۔ جمیل جالبی اس خیال سے اختلاف کرتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ فراق نے ایک نیا کلچر سمونے کی کوشش کی ہے:

''فراق نے اپنی رباعیوں میں ایک کلچر سمونے کی کوشش کی ہے اس نے ہندو کلچر کو ان شعاعوں کو اپنی رباعیوں میں سمو کر شاعری میں جگہ دی ہے جو عالمگیر قدروں کی حامل ہیں اس نے اساطیر کو رباعیوں میں سمو کر شاعری میں اسلامی کلچر کے ساتھ ساتھ ہندو کلچر کو بھی رچایا ہے۔''

(جمیل جالبی۔ فراق کی رباعیاں (مضمون) شرر شاہ کار فراق نمبر ص ۲۶۶)

دراصل فراق کو ہندوستان کی روایات اور اس کے قدیم ادب اور فلسفے سے جذباتی وابستگی تھی وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کی روح اگر اردو شاعری میں سرایت کرسکتی ہے تو اس کی شاعری میں ایک معصومیت کائنات وحیات کی ہم آہنگ ایک طہارت آجائے گی جن سے ایسے سنسار سنگیت پھوٹ نکلیں جو سورگ سنگیت کو بھی مات کردیں۔''

(ڈاکٹر فخر الکریم فراق کی رباعیوں میں جمالیاتی اور تہذیبی عناصر (مضمون) مشمولہ فراق گورکھپوری فن اور شناخت، مرتبین علی احمد فاطمی، رفیع احمد انصاری ص ۲۱)

ہندی میں نائکہ بھید ایک منفرد رنگ کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں جنسی تجربات اور عورت کی نفسیات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد فراق کی رباعیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مجھے اس بات کو فراخ دلی سے اعتراف ہے کہ ہندو تہذیب کا ایک پہلو یعنی ادب کو جمالیات سے رباعی کے پردے میں فراق کے یہاں ایک بھرپور جھلک دکھائی ہے۔''

(جگن ناتھ آزاد فراق کے بارے میں مضمون انجمن ترقی اردو ص ۴۸)

روپ میں شامل اپنی رباعیوں کو فراق نے سنگھار رس کی رباعیاں کہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فراق سے پہلے ہندوستان کے کسی شاعر نے اس قسم کی ٹھوس اور شرنگار رس سے بھری شاعری نہ کی ہو یا ہندوستانی عورت کا یہ روپ نہ پیش کیا ہو۔ سنسکرت میں یہ ایک روایت غور طلب ہے کہ سنسکرت ہندوؤں کی مذہبی زبان بھی ہے اور دہلی میں ملک محمد جائسی نے پدماوتی کے اعضاء کا بے حد کھل کر بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پدماوت سے فراق بے حد متاثر تھے اور ان کی رباعیات کا موازنہ اگر جائسی کی پدماوت سے کیا جائے تو بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر خالد جاوید اپنے مضمون میں فراق کی رباعیوں سے متعلق فرماتے ہیں:

''فراق کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس سے بھرپور ایک گھریلو ہندوستانی عورت کا جیتا جاگتا روپ پیش کیا ہے۔ سیتا کی پاکیزگی، رادھا اور کرشن کی بنسی، کام دیو، رتی، شیو کی جٹائیں، گنگا کا اترنا، ارجن کا تیر وغیرہ وہ قدیم ہندوستانی مہمات ہیں جن کا استعمال فراق نے رباعیوں میں بڑی خوبی اور فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ کیا وہ خود ''روپ'' کو گوکل نگری کی راس لیلا بھی کہتے ہیں۔''

(خالد جاوید رباعیات فراق اور ہندوستانی عورت مشمولہ ماہنامہ آج کل اپریل ۲۰۰۷ ص ۱۷)

فراق نے اپنی رباعیوں میں اس تہذیب کو پیش کیا جو بقول مجیب رضوی ''جس زمانے میں کعبے کا نور اور بت خانے کی جیوتی ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی تھیں اور جسے ہم گنگا جمنی تہذیب بھی کہتے ہیں''۔

☆☆☆

رباعیات

فیضی سمبلپوری

تہذیب وتمدن کی ثقافت کی زباں
شائستگی وخلق ومروت کی زباں
دیتی ہے زمانے کو اخوت کا پیام
اردو ہے حقیقت میں محبت کی زباں

■

اپنوں کی یا غیروں کی یہ محتاج کہاں
بل بوتے پہ ہے اپنے ہی اک زندہ زباں
ارباب سیاست کا کرم ہے کیا شے
اردو کی بلندی کا تو قائل ہے جہاں

■

شیرینی الفاظ وفسونِ آہنگ
ہے شعبدہ ساز کہ لہجے کی ترنگ
اردو ادب آئینۂ جذباتِ لطیف
غزلوں کا ہے عالم کہ بہشت صدرنگ

■

نغموں کا ترانوں کا خزانہ اردو
الفت کا ،محبت کا فسانہ اردو
انسانی مساوات واخوت کی نقیب
ہے نسخہ تسخیر زمانہ اردو

■

نہروں کی روانی ہے کہ جھرنوں کی ترنگ
ہر لے پہ محل اٹھتی ہے سینے میں امنگ
الفاظ ومعانی کی ہم آہنگی سے
بے مثل ہے اردو کی سلاست کا یہ رنگ

اجتبیٰ رضوی: مفکر رباعی گو

پروفیسر رئیس انور
(شعبۂ اردو، ایل، این، متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ)

اردو شاعری کی تاریخ میں عمر خیامؔ کی طرح کوئی بڑا شاعر نہیں ملتا جس کی شناخت یا شہرت صرف رباعیوں کی بنا پر ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اردو کے اکثر بڑے شاعروں نے رباعی کی فنی اہمیت تسلیم کی ہے۔ اور ضمناً ہی سہی، اس ہیئت میں اپنی تخلیقی شخصیت کے بعض نادر و نایاب نقوش ابھارے ہیں جو عام طور پر فکری اعتبار سے مختلف النوع اور غیر منضبط ہیں۔ فکری ربط و تسلسل بہت کم، شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں یگانہ، جوش، فراق، جمیل مظہری، شاہدی، اجتبیٰ رضوی وغیرہ نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ رباعی گوئی پر خاص توجہ کی۔ حسن اتفاق ہے کہ ان شاعروں کی رباعیوں میں فکری پرچھائیاں جابہ جا نظر آتی ہیں۔ اگر ان بکھری پرچھائیوں کو سمیٹا جائے تو فکری نظام یا نظریۂ حیات کے دائروں اور ارتقائی لکیروں کی تلاش دشوار نہیں۔

اجتبیٰ رضوی (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۹۱ء) کی رباعیوں میں کلاسیکی شاعری کا عمدہ عکس موجود ہے۔ روایتی موضوعات ہنرمندی اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔ الفاظ و تراکیب اور تلازمات و اصطلاحات کلاسیکی ہیں۔ لیکن ان کے انتخاب و استعمال سے تخلیق کاری و فنی اٹھان کا اندازہ ہوتا ہے۔

خوابیدہ گناہوں کو جھنجھوڑو رندو
تقویٰ کے تکلفات چھوڑو رندو
مسجد مندر برس رہا ہے بادل
میخانے کے در کا قفل توڑو رندو

عشق کلاسیکی اردو شاعری کا اہم ترین موضوع ہے۔ رضوی نے بھی اس موضوع کو خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے لیکن غالباً مدرکات حیات اور فلسفیانہ مزاج انہیں زیادہ مہلت نہیں دیتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے پاس واردات عشق میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔

وہ دن ہی بدل گئے وہ راتیں بدلیں
وہ حسرت و آرزو کی گھاتیں بدلیں
اب ہم ہیں اور ایک اور عالم اے دوست
دل کیا بدلا تمام باتیں بدلیں

اجتبیٰ رضوی ایک تعلیم یافتہ اور خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس تہذیب اور نظام معاشرت کے علمبردار تھے جہاں تغیر و تبدل کا تصور بھی روح فرسا تھا۔ لیکن جب سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ سماجی نظام بدلا تو وہ نئے سماجی تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔ بے بسی کے عالم میں ذہنی کرب اور روحانی اضطراب میں مبتلا رہے۔

آسودگیاں بکھر رہی ہیں یارب
آرزدگیاں ابھر رہی ہیں یارب
ہر سانس ہے احساس کے سینے میں گرہ
کیا زندگیاں گزر رہی ہیں یارب

رضویؔ ہم عصر سیاسی تحریکوں اور نظریاتی گروہ بندیوں سے بالکل الگ رہے، یوں تو انہوں نے مولانا آزاد، گاندھی اور نہرو جیسی سیاسی شخصیتوں پر نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کی نوعیت سراسر تہنیتی ہے۔ صنف غزل و رباعی میں اشارے کنائے کی پوری گنجائش ہے۔ بعض اشعار اور رباعیوں سے گمان ہوتا ہے

کہ عملی طور پر علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ درج ذیل رباعی اسی خصوصیت کی حامل ہے:

یہ دکھ، یہ درد، یہ مصیبت، یہ گناہ
یہ قسمتِ نسل آدم گم شدہ را
رہبر جو ملے وہ بن کے انجم چمکے
اور رہ گئی انسان کی تقدیر سیاہ

ایک طرف زمانہ ساز اور موقع پرست شخصیتوں کا یہ رنگ انہیں مایوس کرتا ہے اور دوسری طرف پے در پے ذاتی حادثات یاس پسندی کی انتہاؤں پر پہنچاتے ہیں:

بے ضابطہ سی ایک نوا بھی سن لے
بے قاعدہ سی ایک دعا بھی سن لے
تکبیر حرم سنی، سنا نغمۂ دیر
ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا بھی سن لے

رضوی کی زندگی میں یہی وہ موڑ ہے جہاں سے وہ فکری راہ پر گامزن ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں اندر کی طرف کھلتی چلی جاتی ہیں اور ''خودی'' بیدار ہوتی ہے:

بے گانہ بھی سن لے آشنا بھی سن لے
اس طرح نہ رو کہ دوسرا بھی سن لے
فریاد نہ کر 'خودی' کو رسوا کرکے
حاصل نہیں کچھ اگر خدا بھی سن لے

وہ اپنے آپ میں گم ہونے لگتے ہیں۔ کبھی عقل کے سہارے عرفان ذات کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی عشق کے سہارے علم کی پیاس بڑھنے لگتی ہے۔ بے چینی کے عالم میں ذہنی نا آسودگی کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ منفی انداز سے خود احتسابی کرتے ہیں:

بدتر ہونا بھی اس سے بہتر ہوتا
دل کاش نہ ہوتا کوئی پتھر ہوتا
جب علم پہ دسترس نہیں ہے یارب
تو جہل پہ صبر میسر ہوتا

منزل مقصود دور ہے اور راستہ کٹھن اور پر پیچ، رضویؔ حقیقت کی آگاہی کے لیے کوشاں ہی نہیں مضطرب ہیں:

یہ عقل وجنوں کا چاک دامن سل جائے
فطرت کا یہ نیم باز غنچہ کھل جائے
کھل جائے یہ عقدۂ طلسم ارژنگ
آنکھوں کو نظر، نظر کو ناخن مل جائے

یہ اضطراب کی پہلی منزل ہے جہاں تمنائیں اور آرزوئیں جنم لے رہی ہیں۔ علوم کے ذخیرے ناکافی معلوم ہو رہے ہیں نکتہ سنجی اور تفکر کی لَے اتنی تیز ہے کہ کسی طرح کی رکاوٹ کی متحمل نہیں ہے۔

بے تابیٔ فطرت کو بڑھا دے ساقی
سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دے ساقی
خس خانۂ اعتقاد وخرمن گہہ عقل
ان دونوں میں آج آگ لگا دے ساقی

ہر فرد کا ایک ماضی ہے جس کے ساتھ وہ حال میں آیا ہے اور اس سے نجات ایک حد تک ناممکن ہے۔ شاعری کا ماضی بھی اس کے ساتھ ہے لہٰذا وہ اسے بھی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اضطرابی کیفیت کی انتہا ہے کہ وہ بڑے گمبھیر اور تلخ انداز سے ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

ماضی میں حال کو سموتے جانا
سرمایۂ ممکنات کھوتے جانا
ہستی کے مسافر وہ! یہ کیسا دستور
ساحل پہ اتر کے ناؤ ڈھوتے جانا

یہ مادی علم کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔ رضویؔ کے ہم عصر شاہدی نے بھی مادی نظریے سے حد درجہ مرعوب ہو کر کہا تھا:

برہم ہیں قدامتیں تو ہونے بھی دے
سوتی ہیں جہالتیں تو سونے بھی دے
اے مہر مبیں صبح تو ہنستا جا
روتی ہیں روایتیں تو رونے بھی دے

لیکن رضویؔ کی طرح رضویؔ کے یہاں بھی اختلالِ ذہن اور انتشار خیال کے ایسے نمونے بہت کم ہیں۔ لہٰذا انہیں عارضی ذہنی لہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل رضویؔ ایک مفکر شاعر ہیں۔ وہ انسان، زندگی، کائنات اور خالقِ حقیقی کا عرفان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی دانشوروں کے بعض نظریات میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ نظریۂ ارتقاء ان کے ذہن کو ایک نیا رخ دیتا ہے اور تشکیکی عنصر غالب آتا ہے۔ تو وہ مخلوقات کی تکمیل سے مطمئن نہیں ہوتے۔

جو ہر قوت سے، جوہروں سے ذرات
ذروں سے یہ سیال، جماد اور نبات
حیوان اور اس کے آگے انسان اور بس
کیا ٹوٹ گئے صانع تقدیر کے ہات؟

وہ موجودات اور مخلوقات کے ساتھ ساتھ زندگی کی حرکت اور تدریجی ارتقاء کے بھی قائل ہیں۔

کیوں کر موجوں کے دل سے ذوق رم جائے
بجلی کس طرح برف بن کر جم جائے
وارفتۂ ارتقاء ہے جو سیل نمود
ہم اس سے کہیں کہ ہم تک آکر تھم جائے

مغربی دانشوری کا سب سے اہم منفی پہلو یہ ہے کہ اس سے انسانی ذہن وفکر متشکک ہوگیا ہے استفہام کا ایک لامتناہی سلسلہ بن گیا ہے۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کی تفتیش اور تحلیل میں اچھے اچھوں کے حواس گم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں مادی علوم سے تسکین نہیں ملتی تو روحانی ریاضت کی غرض سے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا کر رہبانیت اختیار کرتے ہیں۔ دھیان گیان سے مرحلۂ شوق طے ہوتا ہے اور عرفان وادراک کی کرن پھوٹتی ہے۔

رفتار سے رہگزر ہوئی ہے پیدا
تاب وتب سے سحر ہوئی ہے پیدا
کیا کیا ارمان دید تڑپا رضویؔ
تب جا کے کہیں نظر ہوئی ہے پیدا

زبردست روحانی ریاضت کا ثمر ہے کہ آنکھوں کا پردہ کسی قدر اٹھا۔ روح ومادہ کا متوازن آہنگ سامنے آیا۔ اندر سے علم وآگہی کی شعاع ریزی ہوئی۔ خارجی کائنات کے سارے جلوے اور سارے علوم بے معنی وبے رنگ ہوگئے۔

آنکھیں جب کھل گئیں تو بجھیں اک سمت
اک سمت مشاہدہ ودلیلیں اک سمت
ہم ہنستے ہیں قیل وقال سن کر رضویؔ
سب فلسفہ ایک سمت آنکھیں اک سمت

نظر پیدا ہونے اور آنکھیں کھل جانے کے بعد رضویؔ عرصہ تک عالم حیرت میں غرق رہتے ہیں:

موسیٰ کی نظر تھی جس نے ہیبت دیکھی
عیسیٰ کی نگاہ جس نے رحمت دیکھی
آنکھیں جو کھلیں تو ہم نے اے طور وگلیل
حیرت دیکھی بس ایک حیرت دیکھی

تحصیل علم کے اس مرحلے میں رضویؔ نے تصوف سے بھی روشنی لی ہے۔ علم معرفت ہی کے ذریعہ ان پر منکشف ہوا ہے کہ خالق ومخلوق کا رشتہ کیا ہے۔ اور خود، اور خدا کے درمیان کا فاصلہ کیسے طے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا وہ فنا کی حقیقت آشکار کرتے ہیں۔

ہر شمع کو گل تابہ سحر ہوجانا
ہر قصر کو اک روز کھنڈر ہوجانا
ہر کنگرۂ سر بہ فلک کی تقدیر
ہے سنگِ سر راہ گذر ہوجانا

حقیقت تک رسائی کے بعد رضویؔ کیف وسرشاری کے دور سے گزرتے ہیں اور اقبال کے انداز میں شوخ کلامی پر آمادہ ہوتے ہیں:

چل سرحد تکمیل سے نقصان کو دیکھ
رحمن ذرا اتر کے شیطان کو دیکھ
عصیاں کے بھنور میں کھے کے طنزیہ کی ناؤ
ممکن ہو تو چل اور اپنے انسان کو دیکھ

اقبالؔ نے ان کے مشہور ہم عصر جمیل مظہری کو بھی متاثر کیا ہے۔ جمیلؔ بھی اسی طنطنہ سے فریاد کرتے ہیں:

میں یہ نہیں کہتا کہ سویرا کردے
دوکام میں ایک کام میرا کردے
یا روشنی تیز کر کہ کچھ دیکھ سکیں
یا اور بھی گھنگھور اندھیرا کردے

رضویؔ کی رباعیوں میں فکری ارتقاء کا یہ آخری مرحلہ ہے اور شاید تلاش حقیقت اور انکشاف صداقت کی آخری منزل بھی۔

اجتبیٰ رضوی کی رباعیاں ان کی زندگی کے تمام نشیب وفراز، نقش ونگار اور رنگ وبو سے مملو ہیں۔ ان میں ذاتی وکائناتی تجربے اور مشاہدے ہیں۔ علوم کا عکس اور فنون کا رس ہے۔ اس کی کوئی مخصوص فکری یا نظریاتی ساخت نہیں ہے۔ لیکن مختلف النوع افکار کے رد وقبول کی ایک ایسی ترتیب وتسلسل ہے جس سے اس میں توانائی وتابانی آئی ہے۔ یہ تخلیقی شخصیت، کائنات، زمانہ، سماج اور ادب سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہے۔ اور دامن شعر پر متنوع، رنگا رنگ اور سدا بہار گل بوٹے ٹانک دیتی ہے۔ اردو رباعی گوئی کی تاریخ میں فکری ارتقاء اور شعری روایت کی پاسداری کی ایسی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اس تناظر میں اجتبیٰ رضوی کی رباعیوں کی اہمیت ووقعت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

محبوب رباعیات: ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر یاسر عباس
(شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

رباعی گوئی وہ مشکل امر ہے جس میں بڑے بڑے شعراء ہاتھ آزماتے ہوئے کتراتے ہیں۔ رباعی گوئی کے لیے علم عروض سے صرف واقفیت کافی نہیں بلکہ مہارت درکار ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں رباعی کی ابتدا رودکی سمرقندی سے ہونے کے باوجود اکثر شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ رباعی میں جو ایک ہی مضمون کی قید ہے اس سے شاعر بندھ جاتا ہے لہذا ایک نومشق شاعر کے لیے اس راہ دشوار پر گام برداری کرنا سہل نہیں ہے۔ اسی لیے رباعی گو شعراء کم نظر آتے ہیں اور اگر رباعی کہتے بھی ہیں تو بس چند اوزان میں، تمام اوزان رباعی پر طبع آزمائی کرنا امر محال ہے۔ میر ضمیرؔ، میر انیسؔ، جوشؔ و فراقؔ و مرزا دبیرؔ وغیرہ نے خوب رباعیاں کہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ و دبیرؔ کی رباعیات کا باقاعدہ الگ مجموعہ شائع کیا ہے۔ جس میں مرزا دبیرؔ کی رباعیات کی تعداد ۱۳۳۹ بیان کی ہے۔ جن میں سے ۳۵ رباعیات فارسی میں ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے اپنی شہرت کے مطابق اپنی رباعیات کا موضوع فضائل و مصائب اہلبیت قرار دیا ہے۔ میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کا شیوہ تھا کہ زینت منبر ہو کر مرثیے سے پہلے سامعین کی توجہ مرکوز کرنے کے لیے رباعی یا سلام پیش کرتے تھے۔ اس تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ چونکہ ماہر فن تھے اور خدا کی خاص عطا ان کے شامل حال تھی ان کے لیے رباعی کہنا کوئی مشکل امر نہیں تھا اسی طرح محبوب حیدر محبوبؔ سیتھلی پر خدا کی نظر عنایت ہے تبھی تو ہزاروں رباعیات نظم فرما چکے ہیں جس میں سے تقریباً ۵۰۰ رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

محبوب حیدر محبوبؔ کی پیدائش ۱۹۳۷ء میں قصبہ سیتھل، بریلی کے محلہ تاروالان کے آبائی مکان میں ہوئی۔ تقریباً ۹ سال چھ ماہ کی عمر میں والد سید مبارک حسین ابن احسان کا انتقال ہو گیا۔ مالی حالت ناسازگار ہونے کی بنا پر انٹرمیڈیٹ سے آگے تعلیمی سلسلہ نہیں بڑھ پایا۔ کچھ دن چکبندی کے محکمے میں ٹریننگ کی، بعد میں روڈویز میں سروس کی اور ۱۹۹۵ء میں T.I. کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اولاد میں دو لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں جن کا تذکرہ خود ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے:

جہان گلشن محبوبؔ کے خوش رنگ پھولوں کو
تلمذؔ، مشتہرؔ، آسائشؔ و معروفؔ کہتے ہیں
اسی گلشن کی عظمت کا سبب ہیں دو حسیں کلیاں
کہ جن کو مرسلہؔ، تمثیلؔ سب موصوف کہتے ہیں

محبوبؔ سیتھلی کے نانا سید ذوالفقار حسنین اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ خالہ زاد بھائی حکیم سید احمد اصغر قلمؔ زیدی سے شاعری میں اصلاح لی۔ لیکن یہ شفیق استاد بھی ۴۴ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے۔ استاد کے نام پر قصبہ سیتھل میں ''ادارۂ بوستان قلمؔ'' کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے میں ۵۰ سے زائد شعراء ہیں جو باقاعدہ محبوبؔ سیتھلی اور پروفیسر عراق رضا زیدی سے اصلاح حاصل کر کے فن شاعری کے رموز سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔

محبوبؔ سیتھلی نے تمام اصناف سخن میں حمد، نعت، قصیدہ، منقبت، سلام، نوحہ، ترجیع بند، غزل اور رباعی پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قناعت و گوشہ نشینی نے شہرت کی تمنا سے باز رکھا لہذا کسی کاغذ پر شعر لکھے اور رکھ دیے لیکن شاگردوں کی فرمائش کے بعد ڈائری میں نقل کرنا شروع کیا۔ غزلیات کے ایک مشاعرے میں جب محبوب حیدر نے اپنی غزل پیش کی تو اوم پرکاش اگروال زارؔ علامی نے کہا تھا:

''لگتا ہے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے اساتذہ نے اپنی فکر اور زبان کا سنگم محبوب صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔ جن کے کلام میں دونوں دبستانوں کی خوبیاں اور فکر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایک مدت کے بعد کسی شاعر نے ہمیں متاثر کیا ہے''۔

سیتھل کے ادبی ماحول میں رباعی گوئی کا فن خوب پروان چڑھا، رباعی گوئی کا آغاز کب ہوا یہ بات تو ہنوز پردۂ خفا میں ہے البتہ جن قدیم شعرا کی رباعیات منظر عام پر آئی ہیں ان میں سید محمد حسین سحرؔ اور ان کے بیٹے علی افضلؔ اور اصغر حسین تمرؔ سیتھلی ہیں جن کا تعلق دربار حیدرآباد اور پٹیالہ سے بھی رہا ہے۔ حمید حسین حمیدؔ نے تاریخ گوئی کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی موزوں کی ہیں لیکن تمرؔ سیتھلی کے بعد جس شاعر کی رباعیات عالمی پیمانے پر سراہی گئیں وہ احمد اصغر قلمؔ سیتھلی مرحوم تھے جن کی اردو رباعیات کا انگریزی ترجمہ مغربی دنیا میں خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ محبوبؔ سیتھلی کی شاعرانہ مشق اس درجہ ہو چکی ہے کہ شعر موزوں کرنا بہت آسان ہو گیا ہے فن عروض پر اپنی مہارت کے حوالے سے ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

اب صنف رباعی ہو کہ ہو صنف غزل
ہے سامنے بس بحر ہزج بحر رمل
الجھاتے ہیں جب ذہن کو بحروں کے زحاف
کرتا ہوں تب ارکان سے میں جنگ و جدل ۳؎

فارسی رباعیات کا خاص موضوع تصوف وعرفان، اخلاق، بے ثباتی دنیا وغیرہ ہیں اور اردو رباعیات کے مضامین میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی موجوع شامل ہیں۔ صوفیانہ مضامین میں خدا، اس کے بندوں سے محبت، اتحاد و یکجہتی شامل ہیں۔ حب الوطنی کا اظہار بھی شاعرانہ افکار کا ایک اہم حصہ ہے۔ محبوبؔ سیتھلی نے حمد باری تعالی میں جب نوک قلم کو جنبش دی ہے تو اس انداز سے کہ اپنے ایمان کا اعلان بھی کر دیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

ایثار و قناعت کا مزہ چکھا ہے
اس پھل کا مزہ اور سرور اچھا ہے
تجھ پر بھی ہے ایمان نبیؐ پر بھی یقین
وعدہ مرے معبود ترا سچا ہے ۴؎

ایک اور مقام پر حمد باری کرتے ہوئے اوصاف الٰہی کو خوبصورت اور آسان پیرایے میں نظم کیا ہے اور اپنے عرفان و ایمان کو بھی واضح کر دیا ہے محبوبؔ سیتھلی کے مطابق کائنات کے ذرے ذرے میں خدا کی قدرت جلوہ نما ہے جدھر دیکھئے ادھر قدرت خدا کے نظارے موجود ہیں جس دل میں عشق الٰہی سما جائے پھر وہاں نور کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ کہتے ہیں ؎

ہر شئ میں تری بو ہے تری جلوت ہے
نعمت جسے کہتے ہیں تری رحمت ہے
اس دل میں تجلی کے سوا کیا ہوگا
جس دل میں تری یاد تری چاہت ہے ۵؎

جب مدح اہلبیتؑ میں قلم کو جنبش دی تو اس انداز سے کہ ایک طویل تقریر کا ماحصل رباعی میں سمو دیا۔ مقصد امام حسینؑ کو آسان لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کبھی ظلم کے آگے نہ جھکو ہمت سے کام لو۔ حدیث ثقلین کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے قرآن وعترت کی ہم آہنگی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ قرآن کو عترت اور عترت رسول کو قرآن کا ساتھ اس قدر مرغوب ہے کہ نواسہ رسول سر اور تن میں جدائی کے بعد بھی نوک نیزہ سے قرآن کی تلاوت فرماتا رہا ؎

ہمت کا سبق سب کو پڑھایا شہ نے
کیا چیز شجاعت ہے بتایا شہ نے
سر تن سے جدا ہو گیا لیکن محبوبؔ
نیزے پہ بھی قرآن سنایا شہ نے ۶؎

محبوبؔ سیتھلی نے اپنی رباعیات میں قرآنی مفاہیم کو بھی بہت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ آیۂ وسیلہ "یاایھا الذین اٰمنوا وابتغوا الیہ الوسیلہ" کی آسان تفسیر اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے جس طرح بغیر کشتی کے دریا پار کرنا بغیر زاد راہ کے راستہ عبور کرنا ناممکن ہے ٹھیک اسی طرح بغیر وسیلے کے خدا تک رسائی ناممکن ہے ؎

کب کوئی ہوا پار سفینے کے بغیر
مشکل ہے سفر راہی کا توشے کے بغیر
قرآن بالاعلان یہی کہتا ہے
اللہ نہیں ملتا وسیلے کے بغیر ۷؎

عمر خیام کی مانند دنیا کی محبت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے حیات وموت کے فلسفے کو نہایت سلیس زبان میں بیان کیا ہے یعنی دنیا سے جب انسان جاتا ہے تو خالی ہاتھ جاتا ہے اب چاہے وہ زندگی میں بادشاہ تھا یا فقیر ؎

کیا لیکر آیا تھا کیا سات گیا
لیکر ارمانوں کی بارات گیا
اس دنیا سے سلطاں یا کوئی فقیر
جانے والا بس خالی ہات گیا ۸؎

محبوب سیتھلی نے مفاہیم قرآنی کو بھی نہایت سہل الفاظ میں موزوں کیا ہے اور آیات کے عربی جملوں کے بجائے اس کا خوبصورت ترجمہ بہت سادگی سے نظم کیا ہے۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت'' ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اسی مفہوم کو رباعی میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

احباب سے کچھ دن کی فقط یاری ہے
منزل کی طرف سب کا سفر جاری ہے
جانا ہے عدم سب کو ہی آگے پیچھے
گر آج نہ موت آئی تو کل باری ہے ۹؎

محبوب سیتھلی جب پند و نصائح کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں بھی انسان کو انسان بننے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں اس لیے کہ آدمی ہونا اور ہے انسان ہونا اور ہے ؎

بننا ہے تو تم عشق کا عنوان بنو
تم پیار بنو پیار کا ارمان بنو
کرنا ہے زمانے میں جو شہرت حاصل
ہر رنگ میں انسان کی پہچان بنو ۱۰؎

اور صرف انسانیت کا درس نہیں دے رہے ہیں بلکہ انسان کو اس کی ہمت و جرأت سے کام لینے کی بات کر رہے ہیں کیونکہ اگر ہمت ہے تو سب کچھ ہے اگر فرہاد نے محبت میں کوہ کنی کی تو اس میں اس کی ہمت کارفرما ہے۔ اگر ہمت نہ ہو تو دل کے ارمان زندان دل کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں ؎

افسانہ حقیقت میں بدل جاتا ہے
جادو یہ محبت میں بھی چل جاتا ہے
ہے چیز بڑی ہمت و کوشش یارو
ہمت ہو تو ہر حادثہ ٹل جاتا ہے ۱۱؎

جسم انسانی عناصر اربعہ سے مرتب ہے آگ، پانی، مٹی، ہوا۔ ان عناصر کو خالق حقیقی نے اس خوبصورتی سے مرکب کیا ہے کہ سب مساوی مقدار ہیں ان میں ذرا سی بھی کمی بیشی ہو تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ چکبست برج نرائن کا بہت معروف شعر ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

خورشید رضوی نے بھی اس سلسلے میں کہا ہے ؎

موت کی ایک علامت ہے اگر دیکھا جائے
روح کا چار عناصر پہ سواری کرنا

اسی مفہوم کو محبوب سیتھلی اپنے انداز میں کہتے ہیں ؎

اجزائے عناصر سے ہے تخلیق حیات
روشن کبھی دن ان سے کبھی ہوتی ہے رات
پانی و ہوا روشنی مٹی ہیں سب
ان سب کے بکھر جانے کا ہے نام ممات ۱۲؎

ہم آخر میں ان کی ایک رباعی پر مقالہ ختم کرتے ہیں جس میں محبوب سیتھلی اپنی شہرت و مقبولیت کو اپنے فن کا مرہون منت مانتے ہیں۔ موصوف اپنے فن میں سرشار ہیں اپنے افکار میں غرق ہیں جیسے چاند ستارے اپنی روشنی سے دنیا کو روشن کرتے ہیں ویسے ہی محبوب بھی اپنی شاعرانہ تخلیقات سے دنیائے ادب کو روشن کر رہے ہیں ؎

میں مست ہوں سرشار ہوں اپنے فن میں
گرویدۂ افکار ہوں اپنے فن میں
محبوبؔ میں ان چاند ستاروں کی طرح
روشن ہوں ضیابار ہوں اپنے فن میں ۱۳؎

منابع:

۱۔ محبوب رباعیات،، مرتب: پروفیسر عراق رضا زیدی ص ۱۹، ادارہ بوستان قلم، سیتھل بریلی، جون ۲۰۱۷ء
۲۔ محبوب رباعیات، ص ۱۳
۳۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۴۔ ایضاً، ص ۶۸
۵۔ ایضاً، ص ۱۲۴
۶۔ ایضاً، ص ۷۰
۷۔ ایضاً، ص ۷۲
۸۔ ایضاً، ص ۲۰۴
۹۔ ایضاً، ص ۱۶۴
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۱
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۰
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۹۲

☆☆☆

رباب رشیدی کی رباعی گوئی

محمد عشرت صغیر

(محلہ باڑوزئی اوّل، شاہجہاں پور، یوپی۔ موبائل: 9648906342)

سلمان احمد المتخلص ومعروف بہ رباب رشیدی (۱۹۴۰ء- ۲۰۲۳ء) نے اپنی عمر کے ۸۴ سال گزارتے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہونے سے قبل اپنی رباعیات کے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل مجموعے کو ''رباعیات'' کے عنوان سے شائع کرایا۔ (سال ۲۰۲۰ء میں رباب رشیدی صاحب کی غزلیات، نعت اور رباعیات پر مبنی تین الگ الگ مجموعے ایک مساوی ضخامت کے ساتھ شایع ہوکر منظر عام پر آئے تھے۔) رباب رشیدی مرحوم کا تعلق بنیادی طور پر ضلع شاہجہاں پور کے تاریخی قصبے اور تحصیل پوواياں سے تھا۔ ان کی اوایلی پرورش و پرداخت شاہجہاں پور کی ادبی فضا میں ہوئی۔ عنفوان شباب سے ہی شعر وسخن کے وابستہ ہوئے اور استاذ الاساتذہ رشید رامپوری کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ رباب رشیدی جہاں ایک طرف شاعری کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے تھے، وہیں اپنی زندگی کو بھی اللہ رب العزت کی عبادت اور اس کے محبوب سرور کائنات حضور اکرم ﷺ سے والہانہ عقیدت کا مرکز بنالیا تھا۔ ان کی نعت گوئی اس عقیدت کی بیّن دلیل ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف شاعری ہے بلکہ دبستان دہلی، رامپور اور لکھنؤ کی مشترکہ طور پر نمائندگی بھی کرتی ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے ایک کتاب ''رباب رشیدی ایک سخنور پیارا سا'' کے عنوان سے مرتب کی تھی اس میں رباب رشیدی کے فن اور شخصیت پر ناقدان ادب نے اس حوالے سے خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے تاہم پھر بھی تشنگی محسوس کی جارہی ہے۔ رباب رشیدی کے فن شعر گوئی کے ایک ایک پہلو پر تفصیل سے بحث ہونی چاہئے خواہ وہ ان کی غزل گوئی کا رمزیہ پہلو ہو، ان کا شعور نعت گوئی ہو یا پھر فن رباعی گوئی میں ان کی بے کراں استعداد کا حوالہ ہو۔

رباعی گوئی رباب رشیدی کے جہان شاعری میں ابتدا سے ہی در آئی۔ وہ ان شاعروں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں جن کے شانوں پر بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائلی دو دہوں میں اردو رباعی گوئی کی ذمہ داریاں تھیں۔ رباب رشیدی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام ابر سفید (۱۹۸۵ء) میں ہی نعت، غزل اور رباعی کو جگہ دی تھی۔ رباعی سے ایک غیر معمولی لگاؤ کی بنا پر انھوں نے اس مجموعے کے دیباچے کو رباعی کا منظوم جامہ پہنایا۔ اپنی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو نہایت مشاقی سے بالترتیب رباعیات میں ڈھالتے ہوئے وہ اپنے قاری سے ہم کلام ہوئے۔ قابل غور ہے کہ اس منظوم دیباچے کی ابتدا پہلے رباعی کے مطلع سے کی ہے بعد میں وہی رباعی مکمل طور پر رقم ہوئی ہے۔ یعنی دیباچے کی دوسری رباعی واقع ہوئی ہے ؎

ہے ذہن میں گذرے ہوئے برسوں کا حساب
جب پھول مہکتے ہیں مہکتی ہے کتاب

اپنی اس بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک اور رباعی کے ذریعہ اپنے ماضی کے نہاں خانوں میں چراغ روشن کرتے ہوئے رباب رشیدی کچھ یوں گویا ہوئے ہیں ؎

کتنے ہی طرب خانوں سے ہو آیا ہوں
آتے ہوئے کچھ پھول اٹھا لایا ہوں
ویسے تو کڑی دھوپ میں تپنے والا
ٹوٹی ہوئی دیوار کا اک سایہ ہوں

اس کے فوراً بعد رباب صاحب نے دیباچے کے ابتدائی مطلع کو رباعی بناتے ہوئے بات کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے ؎

ہے ذہن میں گذرے ہوئے برسوں کا حساب
جب پھول مہکتے ہیں مہکتی ہے کتاب
لفظوں کا سہارا لیے یادیں اکثر
کرتی ہیں دل کو مسکرا کر آداب

مذکورہ دیباچے میں اٹھارہ رباعیات موجود ہیں اس کے بعد نعت،غزل، چند قطعات (ضمنی طور پر) اور باضابطہ صفحہ ۲۰۱ تا ۲۵۹ رباعیات کی ایک وافر تعداد موجود ہے۔اس تعارف سے یہی ثابت کرنا ہے کہ صنف رباعی رباب رشیدی کے یہاں اسی عزت وتکریم سے شامل ہوئی ہے جس کی وہ متقاضی ہے۔محض استادی کے مظاہرے کے لیے انھوں نے اس صنف کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اس کی خاموش آبیاری میں وہ ہمیشہ منہمک رہے۔''ابر سفید'' کے بعد حمد ونعت پر مشتمل ان کے مقبول عام شعری مجموعے''الف میم'' (۲۰۰۱ء، ۲۰۰۵ء طباعت ثانی) ''آنسو بولتے ہیں'' (۲۰۱۲ء) بھی منظر عام پر آئے جن میں حمدیہ اور نعتیہ رباعیات بھی موجود ہیں۔عمر کے آخری پڑاؤ تک آتے آتے رباب رشیدی نے اپنی تمام رباعیات کا احاطہ کرتے ہوئے انھیں الگ کتابی شکل میں شائع کر اردو ادب کے دامن میں اچھی رباعیات ڈال دیں۔ان میں کچھ ان کے سابقہ مجموعہ ہائے کلام سے ماخوذ ہیں اور کچھ تازہ وارد مجموعہ ہیں۔رباعی گوئی سے متعلق رباب رشیدی کا اعتراف دیکھئے۔

''ابر سفید میرا پہلا مجموعہ ۱۹۸۴ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔جس میں غزلوں کے ساتھ رباعیات بھی تھیں۔دیباچہ رباعیوں پر مشتمل تھا۔خلاف توقع جہاں جہاں اردو بستیاں قائم ہیں ابر سفید کو بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ایک طرح یہ ادبی پڑاؤ حوصلہ افزا رہا۔ساکھ جو پہلے سے قائم تھی اضافے کا سبب بنی۔پھر وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کچھ پتا نہیں چلا۔حمد ونعت کے کئی مجموعے ضرور منظر عام پر آئے مگر رباعی جو آغاز سخن سے ہی غیر محسوس طریقے سے مجھ سے وابستہ رہی وہ بے التفاتی کی نظر ہوتی رہی۔کئی اہم حضرات نے توجہ دلائی بھی مگر طبیعت میں بے ترتیبی کے سبب وہ کام ٹلتا رہا۔یہاں تک سال گذشتہ ممتاز ناقد وشاعر ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ اگر اس سال بھی آپ کا تغافل برقرار رہا تو آئندہ اشاعت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ان کی محبت رنگ لا کر رہی اور جیسے تیسے ادھر ادھر سے رباعیاں جمع کر کے بغیر کسی نظام وانتخاب رباعیات کے نام سے پیش کر رہا ہوں۔صنف رباعی کی اہمیت کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں کہنا ہے،ہاں یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں میں نے کسی تقلید وتائید میں اس صنف کو نہیں برتا بلکہ یہ از خود میرے مزاج کا پرتو بن گئی۔'' (رباعیات،صفحہ ۴،سن اشاعت ۲۰۲۰ء)

رباب رشیدی کی رباعیات کو مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔پہلے حصے میں ان کی حمدیہ اور نعتیہ رباعیوں کو مشترکہ طور پر رکھنا بہتر ہوگا۔دوسرا حصہ اخلاقی اقدار کے مضامین سے مملو رباعیات کا ہے۔تیسرے حصے میں رباب رشیدی کی ان رباعیات کو جگہ دی جائے گی جو اپنے مضامین میں غزل سے ملتی جلتی ہیں۔رباعیات کے اوزان وآہنگ پر ہمارا کوئی بحث ومباحثہ نہیں۔موضوع کے اعتبار سے محض اخلاقی ،فلسفیانہ اور انتہائی سنجیدہ مضامین کو ہی رباعی پر تھوپنا ایک قسم کی دست درازی ہے۔ایک اچھی شاعری کے جتنے بھی لوازم ہیں ان کو رباعی پر اور زیادہ چھان پھٹک کر عائد کر دینا ادبی شدت پسندی ہے۔حمدیہ اور نعتیہ رباعیات کی ضمن میں جب ہم رباب رشیدی کے اثاثۂ شعری پر نگاہ کرتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ انھوں نے حمدیہ اور نعتیہ کلام کا خاص اہتمام رکھا ہے۔حمد اور نعت کا موضوع رباعی کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اس کا مجموعی تاثر اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔وہاں پر رباعی کے لیے تجویز کی گئی تمام شرائط پوری اترتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔یعنی عروضی اعتبار سے اگر ہم کسی شعر پارے کو رباعی کہیں اور پھر اس کا موضوع حمد ونعت جیسا بلیغ ہو تو رباعی کی تقدیس میں اضافہ ہی ہوگا۔حمدیہ رباعیات میں رباب رشیدی نے تصوفانہ اور عارفانہ انداز گفتگو سے یکسر اجتناب کیا ہے۔خود سپردگی کے جذبے سے سرشار حمدیہ رباعیات میں رباب رشیدی نے اپنا انداز تخاطب کہیں بھی بے تکلف نہیں ہونے دیا ہے۔مثالیں دیکھیں۔

چشمے کرم و فضل کے جاری بھی کرے
سوکھی ہوئی فصلوں کی آبیاری بھی کرے
غم بخشے کسی لمحے مشیت کے تحت
پھر دوسرے لمحے غمگساری بھی کرے

■

اک نام ہی بس افضل و اعلی یعنی
ہر سمت اسی کا بول بالا یعنی
محبوب بھی مطلوب بھی مقصود بھی وہ
میرے لیے اللہ تعالی یعنی

■

یہ ذہن عطا آپ کی میرے مولیٰ
اور فکر رسا بخش دی کتنی اولیٰ
پیشانی میں لرز رہے ہیں سجدے
ہونٹوں پہ سبحان ربّی الاعلیٰ

رباب رشیدی نے اسی قبیل کی متعدد حمدیہ اور نعتیہ رباعیات میں اپنے پاک جذبوں اور عقیدتوں کا اظہار کیا ہے۔ سیرت نبی ؐ کا ایک ایک پہلو ان کے مطالعے میں موجود تھا۔ اس لیے رباب رشیدی کے حمدیہ اور نعتیہ کلام کا جائزہ لیتے وقت اگر ایک باب صرف رباعیات کا باندھا جائے تو اس کی تفصیل کے لیے اوراق کے اوراق درکار ہیں۔ انھوں نے نعتیہ رباعیات میں فن نعت گوئی کے تمام حفظ و مراتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدم بڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جب بھی رستے میں پیچ و خم آتے ہیں
اور دل میں کہاں کہاں کے غم کے آتے ہیں
ایسے میں مرے پیشِ نظر آقا ؐ کے
لَو دیتے ہوئے نقشِ قدم آتے ہیں

غور کیجیے صرف تیسرے مصرعے نے اس رباعی کو نعت کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ یہاں تیسرا اور چوتھا مصرعہ آپس میں زیادہ مربوط ہیں ۔مجموعی تاثر کو پیدا کرنے میں پہلے اور دوسرے مصرعے کا کمال دیکھتے ہی بنتا ہے۔ رباب رشیدی نے اپنی نعتیہ رباعیات کو اکثر اسی نظام پر تخلیق کیا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''الف میم'' میں ۲۵ نعتیہ رباعیات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ایک رباعی میں رباب رشیدی کے قلبی جذبات کی پاکیزگی کو ملاحظہ فرمائیے ؎

یٰسین و طٰہٰ مرے سرکار ؐ کا نام
امّی لقب و ہادیِ دینِ اسلام
ہیں ساری وضاحتیں اشاروں ہی میں
نبیوں کے امام قاب قوسین مقام

رباعی میں فلسفیانہ عقائد کو جامعیت کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے مگر فلسفے کو ہر قاری کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آنکھ کھولنے والے واقعات، غور وخوض کی دعوت دیتے مناظر طبیعی، زندگی کے پیچیدہ مراحل، حیات وممات کے سربستہ رازوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی گسترش، ان تمام عناصر پر فلسفیانہ نظریات کی اساس ہوا کرتی ہے۔ رباعی کے دو اشعار کے درمیان جو وحدت تاثر قائم ہوتا ہے اس کی بنا پر فلسفیانہ مضامین کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور یہاں رباعی فلسفیانہ مضامین کو بیان کرنے میں دیگر تمام اصناف سخن پر سبقت لے جاتی ہے۔ رباب رشیدی کے یہاں فلسفیانہ عقائد قالب رباعی میں نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی رباعیات کو فلسفے کا رنگ دیتے ہوئے بے جا درس دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مبلغ وقت کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے بلکہ اپنے مشاہدے کو بیان کرتے ہوئے کئی طرح کے اشارے چھوڑتے چلتے ہیں۔ گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ؎

عاقل کوئی اپنے کو بھی کب جانتا ہے
در اصل مسبب ہی سبب جانتا ہے
آغاز حیات اور انجام حیات
ہم کچھ نہیں جانتے وہ سب جانتا ہے

زندگی انسانی ادراک کو دھوکے میں رکھتی ہے۔ ایک بحر بے کراں جس میں بڑے بڑے مفکر وقت کے ہاتھ شَل ہو جاتے ہیں، رباب رشیدی اس حقیقت کا اعتراف یوں کرے ہیں ؎

احساس روشنی میں ڈوبے ابھرے
دریائے آگہی میں ڈوبے ابھرے
ہم ایسے شناور تھے کہاں کے لیکن
افکار زندگی میں ڈوبے ابھرے

مشاہدے اور تجربوں کی بنا پر زندگی کی پہیلیاں سلجھانے میں نہ آئیں تو انسان یہی کہہ سکتا ہے ؎

اڑتی ہوئی تتلیوں میں الجھے بھی ہیں
ویران حویلیوں میں الجھے بھی ہیں
آسان اشاروں کو نہ سلجھا پائے
ہم ایسے پہیلیوں میں الجھے بھی ہیں

رباب رشیدی کے یہاں زندگی اخلاقی اقدار کی سالمیت کے ساتھ ایک مسلسل سفر کے مانند ہے، جس کا اختتام ایک پرسکون موت کے ساتھ ہوتا ہے جس میں ہنگامہ نہ ہو، لوگ ایسی زندگی اور موت دونوں پر رشک کرتے نظر آئیں۔ یہی ایک مثالی زندگی ہے جس میں موت جس لمحے انسان کو اپنی آغوش میں لے تو احساس محرومی نہ ہو۔ اس فلسفے کو انھوں نے اپنی رباعیات میں بھی نہایت شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

دیکھو تو ہیں سرگرمیٔ تعمیر حیات
سوچو تو یہی شاہد تعمیر حیات
جذبوں نے ہمیں جوڑ کے یوں رکھا ہے
بنتی ہی جلی جاتی ہے زنجیر حیات

مثالی حیات کے ساتھ ساتھ مثالی موت انسان کے لیے ہر مذہب ومکتب فکر کا حصہ رہی ہے۔ رباب رشیدی نے اس فلسفے کو اپنی رباعیات کا موضوع بناتے ہوئے آسان لب ولہجے میں ہی بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دیتے ہوئے پیغام صبا جائیں گے
اسرار زندگی اسی سے پائیں گے
جب اگلی رتیں آئیں گی پر کھولے ہوئے
ہم لوگ نئی نسل کو یاد آئیں گے

مگر زندگی اپنے رنگوں کا انتخاب خود کرتی ہے، کوئی انسان اس دنیا میں رہ کر اپنی زندگی اکیلے جی ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ اور زندگیاں بھی وابستہ ہیں۔ جو انسان کے جذبات، خیالات اور اعمال کو متاثر کرتی ہیں۔ ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جن سے ایک دردمند قلب تڑپ اٹھتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی احساس محرومی کا دامن گیر ہو جانا ایک طبیعی عمل ہے۔

ہر پھر کے وہی بات چلی آتی ہے
افسردہ طبیعت کو بنا جاتی ہے
عالم جو مرے دل کا کوئی کیا جانے
رشتوں کا سلسلہ ہی جذباتی ہے

دوسروں کے غم سے بوجھل ہو جانا ایک دردمند انسان کی علامت ہے۔ مقصد حیات کا بڑا مقصد دردمندی ہے۔ اگر انسان دردمندی کا عرفان نہیں رکھتا تو اس کا وجود لایعنی ہے۔ مگر جو باخبر ہیں وہ اس گمرہی میں نہیں پڑتے، رباب رشیدی نے اس فلسفے کو سمجھنے میں دیر نہیں کی انھوں نے اپنی زندگی میں اسے اتارا بھی اور دوسروں کو اس جانب متوجہ بھی کیا۔

معلوم ہے کیسے با خبر جیتے ہیں
اہلِ نظر و اہلِ ہنر جیتے ہیں
کڑھتے رہتے ہیں دوسروں کے غم میں
جیتے ہیں تو با دیدہ تر جیتے ہیں

قلب تپاں کا حصول آسان کہاں اور جس کو حاصل ہو جائے اسے حیات کا مقصد اصلی مل جاتا ہے۔ یہی سوز جاوداں کائنات کے سربستہ رازوں کو سمجھنے کے لیے بھی ایک ضروری شے ہے۔ رباب رشیدی نے اس نعمت کو رشک کی نگاہ سے دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں۔

یہ ذوق عمل سب کو کہاں ملتا ہے
ہاں ان کو جنھیں قلب تپاں ملتا ہے
ویسے تو بہت لوگ طلب کرتے ہیں
قسمت سے سوزِ جاوداں ملتا ہے

رباب رشیدی کی رباعی گوئی میں تیسرا اور اہم حصہ ان کی رباعیات کا وہ جمالیاتی پہلو ہے جس میں انھوں نے رباعی کی بنی بنائی موضوعاتی نہج سے انحراف کیا ہے اور رباعیات میں غزل کی شائستگی بھر دی ہے۔ اس راہ کے وہ اکیلے مجتہد نہیں مگر ان کی فکر میں جس طرح کا رچاؤ نظر آتا ہے اس کی بنا پر ہم انھیں اس درجے میں بھی ممتاز پاتے ہیں۔ ان کی رباعیات مزاج غزل سے جس طرح ہم آہنگ ہو کر نکھری ہیں اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ پاکیزگی خیال کا دامن داغدار نہیں ہونے دیتے اور اپنے جذبات کی گرمی بھی قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ان کا فن رباعی کے ساتھ ساتھ فن شاعری پر استادانہ عبور ہے۔ جہاں جہاں رباب رشیدی نے اپنی رباعیات میں شان تغزل کو سمویا ہے، وہاں وہاں الفاظ کے تجمل کو مزید رونق عطا کر دی ہے۔ محاکاتی انداز کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں جس میں جذبات کی طہارت الفاظ میں ڈھلتے ہوئے لہجے کو متین تر بناتی چلی گئی ہے۔

ہونٹوں پہ زندگی کا رقص پیہم
پیکر میں سموئے ہوئے ہنستے موسم
جب چھائے تو احساس پہ چھا جاتا ہے
صہبائے جمال کا برستا موسم

محبوب کے حسن و جمال کا بیان کرتے ہوئے رباب رشیدی کے محتاط لہجے کی شائستگی دیکھتے ہی بنتی ہے۔

وہ سانولا شاداب گلابی چہرہ
وہ شرم کی اوٹ میں حجابی چہرہ
تفسیر حیات کی سناتا رہتا
آنکھوں آنکھوں میں وہ کتابی چہرہ

ان کی طبیعت میں یہ احتیاط کیوں ہے اس کی وضاحت میں ایک رباعی کو نظم کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے۔

لمحے غم جاناں کے دلآویز بھی تھے
افسردہ خرامی کو وہ مہمیز بھی تھے
لیکن اس وضع پر نکھرتے کب تک
ہم اپنے لڑکپن سے کم آمیز بھی تھے

رباب رشیدی نے اپنی تغزلانہ رباعیات میں اسرار کے پہلو کو غالب

رکھا ہے۔ وہاں استعارے اپنی ممکنہ وسعت تک فراخ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک رباعی میں اس کی مثال پیش ہے ملاحظہ کیجئے ؎

کیا کیا نہ خیال اپنے گماں میں آئے
امیدیں لیے دیار جاں میں آئے
محور سے کبھی رابطہ کٹنے نہ دیا
کتنے ہی موڑ درمیاں میں آئے

رباب رشیدی نے اپنی رباعیات میں اپنے کچھ خاص محبوب مضامین پر اپنی توجہ کو اوّل تا آخر مرکوز رکھا ہے۔ مشترکہ تہذیبی اقدار کی نمائندگی، ان کے فروغ کی سبیل اور ان کی پامالی پر اشک ریزاں ہونے کے ساتھ ساتھ ان اقدار کی بازیابی کے لیے تلاش وجستجو جیسی فکر بلیغ رباب رشیدی کی شاعری کا جزو اعظم ہے مگر رباعیات میں اس فکر کا تاثر زیادہ گہرائی لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے تہذیبی وجدان میں سبھی کی شمولیت چاہتے ہیں ؎

دنیا سے نرالی ہے ہماری تہذیب
بیشک ہے ہمیں جان سے پیاری تہذیب
جو شخص چلا غیر سمجھ کر خود کو
تم بھی تو ہمارے ہو پکاری تہذیب

ہم زیستی مسالمت آمیز رباب رشیدی جیسا حساس شاعر کس آسانی سے دے سکتا ہے اس کی مثال یہ رباعی ہے ؎

جو بات ہے کہنے کی وہ کہنا ہے ہمیں
ایسے کہا ں جذبات میں بہنا ہے ہمیں
لمحوں کا نہیں مسئلہ ہے صدیوں کا
آپس میں مل جل کے رہنا ہے ہمیں

سب کو ساتھ لے کر چلنے کی تحریک رباب رشیدی نے ایک رباعی میں جس استعاراتی انداز میں بیان کی ہے وہ دبطور خاص چاہتا ہے ؎

مضامین کے تنوع کے بعد زبان کی سنجیدگی، متانت اور شگفتگی رباب رشیدی کی رباعیات کو انفرادیت اور ممتازیت عطا کرنے والے عناصر ہیں۔ رباب رشیدی نے اپنے شاعری کو بہت حد تک میانہ روی کے دائرے میں رکھا ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں جذبات کے حفظ ومراتب بھی دھیان میں رکھتے ہیں۔ سنجیدہ جذبات کی ادائیگی کے لیے الفاظ کے تجمل وشکوہ کو برقرار رکھنا بھی ایک استادی ہے۔ اس شعور فن کا سب سے بڑا سبب رباب کا عمیق مطالعہ بھی ہے۔ ان کے مطالعے میں اساتذۂ فن کے شاہکار نمونے رہے اور اس مطالعے سے حاصل ادراک سے انھوں نے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ اپنی رباعی میں کہتے ہیں ؎

معلوم نہیں جن کو فصاحت کیا ہے
اسلوب بیاں لفظوں کی طاقت کیا ہے
وہ پڑھ کے انیس لکھنوی کو دیکھیں
سمجھیں گے کہ اظہار کی قدرت کی کیا ہے

ایک جگہ دشت سخن کی مشکلات اور دشواریوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

اظہار کے ہونٹوں پہ فغاں رکھ دی ہے
تقدیر سرِ آبِ رواں رکھ دی ہے
آسان نہیں دشتِ سخن میں چلنا
اب ہم نے بھی کانٹوں پہ زباں رکھ دی ہے

مشق سخن میں ایک شاعر شب و روز کا شمار نہیں رکھ پاتا۔ جس وقت الہام شعر کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے مشاہدات وتجربات شعر میں ڈھلتے ہوئے معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ اس ضمن میں رباب رشیدی کا اعتراف قابل قدر ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

موتی شب تار میں پروئے جاگے
الفاظ میں مفہوم سموئے جاگے
القصہ یہ فصل لہلہائی ہے اب
ہم یوں ہی تمام عمر سوئے جاگے

کبھی میر نے کہا تھا ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

رباب رشیدی نے اپنے ذوق شاعری کو فن شیشہ گری سے تعبیر کرتے ہوئے اتمام حجت کی سبیل پیدا کردی ہے ؎

انفاس میں محتاط روی رکھتے ہیں
احساس میں اک شرط کڑی رکھتے ہیں
آتا ہے کمالِ فن تو ریاضت ہی سے
ہم ذوقِ فن شیشہ گری رکھتے ہیں

رباب رشیدی کے اس دعوے میں سچائی کا ہر پہلو غالب ہے۔ رباعی گوئی کے تناظر میں ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کمال فن کے متعدد نمونے ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرے، جن پر ان کی استادی کو تسلیم کرنے میں تردد کی گنجائش نہیں۔ ہاں رباب اپنے مزاج میں ایک قسم کی بے ترتیبی کا شکار رہے۔ اسی بے ترتیبی کی وجہ سے ان کی رباعیات کے (واحد اور

آخری) مجموعے میں گنی چنی جگہ پر نظر ثانی کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ رباعی جیسی بظاہر معصوم مگر شریر صنف نے رباب رشیدی سے بھی چھل کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کی روح کو آج بھی ان کی ایک رباعی میں ایک ''رک'' کے اضافے نے کئی بار خجل کیا ہے۔ مگر تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپسی کا کوئی راستہ نہیں رکھتا۔ رباب رشیدی کے شعری سرمائے سے دو ایک جگہ رباعی کا داؤ ان پر بھاری پڑ گیا۔ صفحہ نمبر ۱۸۰ پر پہلی رباعی کے مطلع کا اولیٰ ہے ؎

یاروں کے پتے دشمنوں سے پائے

اس مصرعے میں رباعی کا وزن ساکت ہے۔ تقطیع سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں جہاں ''فع'' ہونا چاہئے وہ موجود نہیں۔ مندرجہ پورے مصرعے کا وزن مفعول مفاعیل مفاعیلن تک ہی ہے ؎

''یاروں کے پتے دشمنوں سے پائے''
تحفے بھی بہت ہم وطنوں سے پائے
اس سلسلۂ شوقِ طلب کے باوصف
کتنے ہی سراغ الجھنوں سے پائے

یہاں مصرعِ اولیٰ میں ایک لفظ ''بھی'' کے اضافے سے کام بن جائے گا۔ مصرع یوں ہوگا ؎

یاروں کے پتے بھی دشمنوں سے پائے

اب آپ کہہ سکتے ہیں اس میں سہوِ کتابت کا دخل ہے۔ چلئے ایک مثال اور نظر سے گزری اس پر بھی غور کر لیتے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۸۶ پر مطلع کا اولیٰ شاعر کی بے توجہی کا شکار ہوا کیوں کہ اس میں قافیہ موجود نہیں۔ مصرع یوں ہے ؎

کچھ یوں ہی نہیں فضا میں سناّٹا بھی

اس رباعی کے دیگر مصارع سے قافیہ اور ردیف کا اندازہ ہو جائے گا ؎

کچھ یوں ہی نہیں فضا میں سناّٹا بھی
''شامل ہے ادھر کا سناّٹا بھی''
سچ تو ہے یہی ہلاک کرنے کو مجھے
قاتل ہے مری نظر کا سناّٹا بھی

معلوم یہ ہوا کہ رباعی کا پہلا مصرع متوقع قافیہ اور ردیف سے عاری ہو گیا۔ یہ بے خیالی کے زمرے میں چلا جائے گا، اور اس کے لیے ہم شاعر سے شکایت کر سکتے ہیں کہ آپ نے نظر ثانی نہیں کی۔ مگر قوسین میں لکھے گئے مطلع کے ثانی مصرعے میں ہمیں عروضی سقم بہ آسانی نظر آ جائے گا۔ یہ مصرع رباعی کے وزن سے ساکت رہ گیا۔ تقطیع سے صاف ظاہر ہے کہ اس مصرعے کے آخری رکن کے بغیر ہی بات مکمل ہو رہی ہے۔ اس مصرعے کا وزن ''مفعول مفاعلن مفعولن'' ہے۔ مفاعلن کے بعد مفعولن کا آنا اصول سے انحراف ہے وہیں دوسری طرف آخری رکن کا نہ ہونا رباعی کے وزن کی بنیادی شرائط پر کھرا نہیں اترتا۔ سہوِ کتابت کے امکان پر کہہ سکتے ہیں شاعر نے مصرع یوں کہا ہو ؎

شامل ہے اِدھر ادھر کا سناّٹا بھی
جو تحریف کا شکار ہو کر رہ گیا

صفحہ ۲۱۸ پر دوسری رباعی کے آخری مصرعے میں سہوِ کتابت کے امکان کا کوئی اصول منطبق نہیں۔ مصرع اپنے آپ میں مکمل اور رباعی کے عروضی نظام سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو، ہمیں بہت سخت گیری سے کام نہیں بس انسانی لغزش ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مصرع یوں ہے ؎

ہم نے نہ کبھی بات چشمِ تر کی سمجھی

یہاں لفظ ''چشم'' پر ہی رباعی کا وزن ٹوٹ گیا، اور تو اور یہ مصرع کسی بھی وزن میں نہیں رہا۔

صفحہ نمبر ۲۲۰ پر دوسری رباعی کا تیسرا مصرع جہاں تک ہمارے علم کی بات ہے ناموزوں سا ہے۔ اہل نقد کے لیے اس کی نشاندہی کرتے چلیں باقی فیصلہ عروض داں حضرات کے ذمے چھوڑتے ہیں۔

وہ آئے بھی تو کیا اور نہ آئے بھی تو کیا

رباب رشیدی نے اپنی رباعی گوئی سے جو مقام حاصل کیا ہے، اس کے اعتراف میں ایسی رباعیات کی تعداد ابہت زیادہ ہے جن میں کمال فن کے حیرت انگیز نمونے موجود ہیں۔ اس اعتبار سے جن مقامات پر خامیوں کی نشاندہی ہوئی ہے وہ نہایت کم یا یوں کہئے نا کے برابر ہیں۔

اس مطالعے کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رباب رشیدی کی رباعیات سنگ میل کی حیثیت سے اردو شعری ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھیں الفاظ اور اس کی بندشوں میں احساس و جذبات کی فراوانی کو قید کرنے میں استادانہ مہارات حاصل ہے۔ وہ متعدد جگہوں پر اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت سے حیران کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تجربات و مشاہدات کے نچوڑ کو داخلی اور خارجی جذبات کے اشتراک سے خوبصورت بناتے ہوئے اعلیٰ درجے کی رباعیاں خلق کی ہیں۔

☆☆☆

ترقی پسند رباعی گو: پرویز شاہدی

محمد منظر حسین

(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا۔ موبائل: 9883874711)

مغربی بنگال کو بہت ساری چیزوں میں اولیت حاصل ہے۔ اردو کے علاوہ اور کئی زبانوں میں صحافت کی ابتدا اسی سرزمین سے ہوئی ہے۔ جدید اردو نثر کی ابتدا شہر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہوتی ہے۔ نواب واجد علی شاہ نے مٹیا برج کو لکھنو ثانی بنایا۔ براعظم ایشیا میں سب سے پہلے ادب کا نوبل انعام رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کی تخلیق ''گیتانجلی'' پر دیا گیا۔ جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہاں کے شاعر و ادیب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہیں لوگوں میں اردو شاعر و ادیب بھی شامل تھے۔ یہاں اردو کے کئی بڑے شاعر و ادیب ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے۔ انہیں میں ایک اہم نام پرویز شاہدی (۱۹۶۸۔۱۹۱۰) کا بھی ہے، جنہوں نے مغربی بنگال میں ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پرویز شاہدی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے، جو اردو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ لیکن اردو ادب میں انہیں صنف شاعری میں جو شہرت ملی، اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ انہوں نے روایت کے مطابق اپنی ادبی زندگی کا آغاز صرف آٹھ برس کی عمر میں غزل سے کیا لیکن زمانے اور حالات کو دیکھتے ہوئے نظم گوئی کی جانب بھی توجہ دینا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظم نگاری کی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔ انہوں نے اردو شاعری کو کئی شاہ کار نظمیں جیسے بے چہرگی، شیروانی، بنت ہمالہ، ساز مستقبل، انتظار، تلچھٹ، تثلیث حیات، رقص حیات وغیرہ دیے۔ اردو شاعری کی ایک اہم صنف جس کی جانب پرویز نے خاص توجہ دی، وہ رباعی کا فن ہے۔ ان کے کل دو مجموعۂ کلام 'رقص حیات' اور 'تثلیث حیات' ہیں۔ ان میں صرف 'رقص حیات' میں ہی رباعیات شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں رباعیوں کی کل تعداد ۴۱ رہیں۔ ۲۰۱۰ء میں 'رباعیاتِ پرویز شاہدی' کے عنوان سے ان کی تمام رباعیوں کو یکجا کر کے کتابی شکل دی گئی۔ اس کتاب میں کل ۱۹۴ رباعیات شامل ہیں جبکہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام میں کوئی رباعی شامل نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ ہم پرویز شاہدی کی رباعی گوئی کا جائزہ لیں، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صنف رباعی پر گفتگو کی جائے۔

اردو شاعری میں صنف رباعی کو ایک خاص اہمیت و مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے آغاز کے تعلق سے مختلف رائیں پائی جاتی ہیں لیکن اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ رباعی کا موجد اعلیٰ ابوالحسن رودکی ہے۔ رباعی ایک ایسی صنف شاعری ہے، جس میں غزل اور نظم دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رباعی عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ رباع سے مشتق ہے، جس کے معنی چار کے ہیں۔ چوں کہ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں، اس لیے رباعی کہلاتی ہیں۔ اصطلاحاً رباعی ایسی مختصر نظم کو کہتے ہیں جو کل چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور اس کے لیے مخصوص اوزان مقرر ہیں۔

بنگال میں پرویز شاہدی کی حیثیت ترقی پسند کے روح رواں کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ مغربی بنگال میں پرویز شاہدی کو ترقی پسند تحریک کا امام کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے پیش نظر جلا بخشی۔ پرویز شاہدی کے شعری سرمایے میں رباعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب انہیں اپنے فن میں پختگی حاصل ہوگئی تو انہوں نے اکثر مشاعروں میں اپنے کلام کی شروعات نہ صرف رباعی سے کی بلکہ اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

پرویز شاہدی کی رباعیوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتدا میں اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے رباعیوں کی شروعات روایتی موضوعات، جیسے تصوف، حکمت، شراب، بدمستی وغیرہ سے ہی کیا۔ بعد میں حالات کے مطابق موضوعات میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی رباعیوں میں ہر طرح کے موضوعات پائے جانے لگے۔ مثال کے طور پر درج ذیل رباعیات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے:

آباد ہے جلوۂ شراب آنکھوں میں
ضو بار ہے صبح کا شباب آنکھوں میں
ہیں بادۂ شب گیر کی بوندیں آفت
رقصاں ہیں ہزاروں آفتاب آنکھوں میں

لا جلد شراب سرخ و روشن ساقی
مہماں ہے وہ گھڑی کا ساون ساقی
مئے خانے میں کون عرش سے جھانکے گا
بادل کی پڑی ہوئی ہے چلمن ساقی

پرویز شاہدی کے فن میں جب پختگی آ گئی تو وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے موضوعات میں بھی تبدیلی پیدا کی۔نت نئے موضوعات کو اپنی رباعیوں میں جگہ دینے لگے۔ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی نے ان کی رباعیوں میں ترقی پسندانہ موضوعات کو جگہ دیا،جس کی مثالیں ان کی رباعیوں میں جابجا نظر آتی ہیں:

سہمے سہمے دلوں میں ہمت جاگی
غیرت نے جھنجھوڑا تو مشقت جاگی
محکومی کی نیند کا شکنجہ ٹوٹا
وہ دیکھو پھٹی پو ، وہ بغاوت جاگی

■

طوفان میں کسی کا آسرا بے معنی
ہر چیز یہاں اپنے سوا بے معنی
آغوش طلاطم میں ہے کشتی رقصاں
ایسے میں خیال نا خدا بے معنی

مذکورہ رباعیات کے مطالعہ سے پرویز شاہدی کا باغیانہ تیور صاف طور پر عیاں ہوتا ہے۔انہوں نے ترقی پسند نظریہ کو ملحوظ نظر رکھ کر یہ رباعیاں کہی ہیں۔وہ غریب،مزدور اور ناتواں لوگوں کو مخاطب کر کے للکارتے ہیں کہ کسی مصیبت کا سامنا تمہیں خود کرنا ہے۔کسی ناخدا کا انتظار کرنا لاحاصل ہے کیوں کہ طوفاں میں پھنسی ہوئی کشتی کو ساحل سمندر تک لے جانا خود تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور تم تبھی کامیاب و کامران ہو سکتے ہو،جب تم دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کے بازوؤں پر بھروسہ کرنے لگو گے۔جس دن تمہیں اپنے بازوؤں کی قوت کا علم ہو جائے گا،اسی دن تمہارے دل سے خوف ختم ہو جائے گا اور تمہارے اندر ہمت پیدا ہو جائے گی اور تم ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دو گے اور یہی تمہاری کامیابی و کامرانی ہوگی۔ترقی پسند تحریک کی حمایت میں کہی گئی ان کی درج ذیل رباعیوں کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

صحراؤں کی بات زاروں میں کہی
روداد حیات استعاروں میں کہی
حیرت ہے زمانے کو آخر کیوں کر
پرویز نے داستان اشاروں میں کہی

■

بارش میں کب آگ سر اٹھا سکتی ہے
کب موت حیات کو دبا سکتی ہے
اے امن کے گیتوں کی گھٹاؤ ! برسو
بارود کا کیا ہے بھیگ جا سکتی ہے

پرویز شاہدی نے اپنے رباعی میں سیاسی موضوعات کو بہت ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔وہ ملک کے ٹھیکیداروں کو اپنی رباعیوں میں للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کا کہنا کہ آج سارا عالم نئے نظام کی تلاش میں ہے اور تم وہی پرانی اور بیکار روایتوں کو لیے پھر رہے ہو۔پرانی اور فرسودہ روایتوں کو چھوڑ کے آگے بڑھنے کی کوشش کرو کیوں کہ آج تمام چیزوں میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں،اس لیے اگر تم ترقی کے خواہش مند ہو تو نئی چیزوں کی تلاش و جستجو کرو ورنہ روایتوں کے ساتھ تم زمانے سے پچھڑ جاؤ گے:

بے ہودہ قدامتیں لیے بیٹھے ہو
فرسودہ شریعتیں لیے بیٹھے ہو
ہے آج نئے نظام عالم کی تلاش
تم کل کی روایتیں لیے بیٹھے ہو

طنز و مزاح کا عنصر تمام شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔یہ ایک ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ تخلیق کار بڑی سی بڑی باتیں مزاح کی روشنی میں بہ آسانی کہہ دیتا ہے اور یہ خصوصیات پرویز شاہدی کی رباعیوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں طنز و ظرافت کی چاشنی پیدا کر کے اسے خصوصیت کا حامل بنا دیا ہے۔اس تعلق سے درج ذیل رباعیوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

محروم نہ کمزوری کے مارے رہ جائیں
ہنگام شباب بے سہارے رہ جائیں
امریکہ کے سانڈ بن گئے گھر داماد

بھارت کے نہ سب بیل کنوارے رہ جائیں

صنعت اوّل ہے اور صنعت آخر
دولت اوّل ہے اور دولت آخر
بولے وہ چھٹائی کر کے مزدوروں کی
محنت اوّل ہے اور محنت آخر

پرویز شاہدی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ضرور تھا لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے فن کو کسی نظریے کا غلام بننے نہیں دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی تخلیقات میں فنی خوبیوں کو اولیت دیا اور نظریہ کو ثانوی درجہ۔ ان کی ہمیشہ یہی سوچ رہی کہ کسی نظریے کا پابند ہونا الگ چیز ہے اور شعر و ادب الگ چیز ۔انہوں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ ان کی تخلیق پہلے تخلیق رہے، پھر بعد میں کسی نظریے کا پابند اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیق سے تخلیقیت کہیں بھی معدوم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے اور ان کی اسی کوشش نے فن کو ہمیشہ پروپگنڈہ بننے سے بچائے رکھا۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح شعر و ادب کو زندگی کی بہتری اور تعمیر نو کا بہترین ترجمان بنا دیا۔ جس سماج میں عوام کا سامراجی نظام، جاگیردارانہ نظام اور سماج کی گروہ بندی سے استحصال ہو رہا تھا، اس سماج کے خلاف پرویز شاہدی عملی اور تخلیقی سطح پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ کریں:

بلبل کی زباں تک جلا ڈالی ہے
مسموم ہوائے گل بنا ڈالی ہے
ان آگ کے تاجروں نے
گلشن میں بھی بارود بچھا ڈالی ہے

زنجیر کا لوہا بھی پگھل جائے گا
شمشیر ہی کے سانچے میں ڈھل جائے گا
شعلے دل باغی کے بڑے سرکش ہیں
جو سامنے آئے گا وہ جل جائے گا

پرویز شاہدی اپنی رباعیوں میں ہمیشہ آسان، سلیس اور عام فہم اسلوب کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی رباعیوں میں ضرورت کے مطابق انگریزی اور ہندی کے الفاظ کا استعمال اس ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوتا۔ فارسی ترکیبوں کے استعمال بھی ان کے یہاں جا بجا ملتے ہیں۔ وہ تشبیہات، استعارات، محاورات، اصطلاحات وغیرہ کا استعمال اس فنکاری سے کرتے ہیں کہ قاری کو گراں بھی نہیں گزرتا اور معنی کی ترسیل بھی ہو جاتی ہی:

میں منکر اسلاف نہیں ہوں یارو!
کچھ حاسد اوصاف نہیں ہوں یارو!
ہر شعر میں بھرتا ہوں مگر وقت کی آگ
شاعر ہوں ، باف نہیں ہوں یارو!

لذت میں خودی کی کھو گیا ہے
دور دور خدا سے ہو گیا ہے زاہد
سنتا نہیں اب شکستہ مسجد کی صدا
سجدے میں کچھ ایسا سو گیا ہے زاہد

رباعی کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ کہ تخلیق کار اس میں فکر و فلسفہ کو پیش کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے فکر و فلسفہ کو پیش کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ قاری رباعی کی شعری اظہار کے پیشکش میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر پیش کیے گئے فکر و فلسفہ کو بہ آسانی قبول کر لیتا ہے۔ اس ہنر سے پرویز خوب اچھی طرح سے واقف تھے۔ وہ بعض دفعہ اپنے ترقی پسندانہ خیالات کو فلسفہ اور اصطلاحات کے ذریعہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ و فکر بھی فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی اس خصوصیات کو پرویز کی درج ذیل رباعیوں کے ذریعہ بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے:

کچھ نکتہ راز کیف و کم مجھ سے سن
کچھ فلسفۂ نشاط و غم مجھ سے سن
مجبور سکوت میں رہا ہوں برسوں
دولت کی حکایت ستم مجھ سے سن

باہر نہ کبھی آگ کو جانے دوں گا
شعلے کو کبھی سر نہ اٹھانے دوں گا
پھنک جائے تو پھنک جائے مرا دل لیکن
دامن پہ ترے آنچ نہ آنے دوں گا

پرویز شاہدی کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ایک ایسے رباعی گو ہیں، جن کی رباعیوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو رباعی میں ہونی چاہئے۔ انہوں نے ہر قسم کی رباعیاں کہیں اور اس میں مختلف موضوعات کو بھی اپنایا۔ رباعی کے موضوعات کو وسعت دینے میں پرویز شاہدی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعے کلاسیکی اور جدید روایت کے درمیان ایک نیا آہنگ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علیم اللہ حالی کے خیالات سے اتفاق کرنا ہمارے لیے اس لیے ناگزیر ہے کہ انہوں نے پرویز شاہدی کی رباعی کے سلسلے میں جس طرح کی رائے قائم کی ہے، اس سے ہمیں پرویز شاہدی کی رباعی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

''صنف رباعی کی تاثیر تو اس کے چوتھے مصرعے سے ظاہر یا مکمل ہوتی ہے لیکن اس صنف کا لطف اظہار یہ ہونا چاہئے کہ اس کا ہر مصرعہ زینہ بہ زینہ اس کی تکمیل کی طرف لے جائے، یعنی یہ کہ کوئی مصرعہ صرف قافیہ پیمائی کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے خیال میں تسلسل پیدا ہوجائے۔ پرویز شاہدی کی رباعیوں میں یہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی رباعیاں صرف کیف وسرور پیدا نہیں کرتیں بلکہ شاعر کے پسندیدہ موضوع کو مضبوط اور دلکش انداز میں پیش کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ انہوں نے رندی وسرمستی کے سلسلے میں روایتی طور پر بیان ہونے والے الفاظ واشارات سے ایک نیا کام لینے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یوں پرویز شاہدی کی رباعیوں سے خود اس کی صنف کے موضوعی امکانات میں زبردست وسعت پیدا ہوگئی ہے۔''

(پرویز شاہدی، علیم اللہ حالی، ص: ۵۴)

☆☆☆

رباعیات

فہیم بسمل، شاہ جہاں پور
8707771203

سورج سے کہو حجرے کے باہر نکلے
لپٹا ہے جو کہرے میں وہ منظر نکلے
شب بھر تو رہا چاروں طرف سنّاٹا
دن نکلے تو راہی چلیں رہبر نکلے

ہم عزم کے سانچے میں جو ڈھل جائیں گے
محرومی کی بانہوں سے نکل جائیں گے
گلرنگ اُمیدوں کا چمن مہکے گا
اک روز یہ حالات بدل جائیں گے

دیکھا نہ کسی کا کبھی ایسا لہجہ
اس پیکرِ خوبی کا ہے جیسا لہجہ
واقف ہے وہ تہذیب محبت سے خوب
کڑوا نہیں ہوتا کبھی اس کا لہجہ

جن کے سبھی منظر تھے سہانے والے
کچھ ایسے تھے دن رات پرانے والے
بہتر ہے یہی، کوئی نہ پوچھے مجھ سے
دن کیسے ہیں موجودہ زمانے والے

اُمید کی شمعوں کو جلانے آؤ
تم رسمِ وفا یوں بھی نبھانے آؤ
دیرینہ محبت کا تقاضا ہے یہی
روٹھا ہوں اگر میں تو منانے آؤ

رباعیاتی نظم: مامون ایمن کا ایک منفرد تجربہ

نذرانہ بی بی
(قرطبہ یونیورسٹی، ڈیرہ اسمٰعیل خان کیمپس، خیبر پختون خواہ، پاکستان)

رباعی ہیئت میں چھوٹی مگر ہر بڑے سے بڑے خیال کو خود میں سمو لینے والی صنف ہے۔ فارسی شاعری میں خیام اور حافظ نے رباعی کو غزل سے بڑا بنایا، اردو میں گو کئی شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی مگر اوڑھنا بچھونا کسی نے نہیں بنایا۔ مامون ایمنؔ (پ: ۱۹۴۱) وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس صنفِ سخن کو ہر ہر پہلو سے اردو ادب کے لیے ذریعہ فخر بنایا۔ یوں تو وہ غزل کے بھی شاعر ہیں مگر حقیقت یہ ہے وہ غزل کے امین تو رباعی کے شاہ سوار ہیں۔ میرؔ کے تقریباً تین صدی بعد اردو رباعی کو ''میرؔ ثانی'' میسر آیا ہے۔ اقبالؔ اور حالیؔ کے ایک طویل مدت بعد اس صنف کو ایک منفرد، پُرگو اور قادر الکلام تخلیق کار ملا ہے جو عروض پر دسترس کے باعث اس مشکل صنف کو مجرد انداز میں نہ صرف بڑھا رہا ہے بلکہ دوڑا رہا ہے۔ صرف صنفِ رباعی کے لیے اپنے آپ کو مختص کر لینے والے مامون ایمنؔ ''بابائے رباعیات'' کے لقب سے شہرت یافتہ ہیں اور شدت سے خواہش مند ہیں کہ وہ اسی میں پہچان بنائیں۔

مامون ایمنؔ نے صنفِ رباعی میں مختلف نوعیت کے تجربات کیے جن میں رباعیاتی نظم یا مسلسل رباعی اور سہہ مصرعی رباعیاتی نظم بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اس نئے شعری تجربے سے یقیناً رباعی کے گلشن میں نئے پھول کھلیں گے۔ ان کی کتاب ''زِنداں'' اسی تجربے کی تجسیم ہے۔ اپنے اچھوتے انداز کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

شیشہ میں اتارا ہے پری کو میں نے
تعبیر کیا خواب گری کو میں نے
بخشا ہے رباعی کو اچھوتا انداز
امریکا میں آشفتہ سری کو میں نے(۱)

اُن کے نزدیک رباعی اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ان کی پرسکون سمندر جیسی شخصیت کی تہوں میں تخلیقی کشف لاوے کی طرح پھوٹتا رہتا ہے۔ ان کا ذہن اس لاوے کا مرکز ہے اور پھوٹنے کے بعد ایک دھارا ہے جس میں تسلسل بھی ہے اور گرمی بھی۔ دل و دماغ میں کسی انتشار کو جگہ دینے کے بجائے اپنے ہر احساس کو اسی لاوے کے مرکز سے رباعی کی شکل میں نکالتے ہیں اور پھر نظم کی طرح تسلسل سے اس کو اُسی دھار پر ڈال کر پے در پے ایک ہی خیال کی حامل رباعی در رباعی کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس صنف پر اس قدر منفرد کام ملتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ رباعیاتی نظمیں، موضوعاتی رباعی، سہہ مصرعی رباعی، مستزاد رباعی، اضافت، عطف، جزوی قوافی اور تقابل ردیفین سے مبرا رباعی ایمنؔ ہی کی خصوصیت ہے۔

یہ ''بسیار گو''، ''بدیہہ گو''، اور ''خوش گو'' شاعرِ رباعی بدیس میں انجمن آرائی سے احباب کی اور اپنی تنہائی کا مداوا، ادب کی خدمت اور اردو سے محبت کا اظہار بیک وقت کرتے ہیں۔ اپنی بسیار گوئی اور بدیہہ گوئی کے باوجود ایمنؔ صاحب تکرار کے قائل نہیں سو اُن کے ہاں بوقلمونی قابلِ رشک حد تک ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت کہی گئی رباعیات بالواسطہ یا بلاواسطہ طرزِ نگارش اور معنوی تہہ داریوں کی حامل ہیں۔

حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، ہجرت، تنہائی، سکون، جبر و قدر، امید، قدرتی مناظر کی تصویر کشی اور سماجی مسائل کا بیان، غرض ہر طرح کا رنگ ان کی رباعی کی دھنک میں موجود ہے اور ان تمام رنگوں میں متانت اور سرمستی پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ شاعری کو روح کی کھڑکی کہا جاتا ہے، ایمنؔ صاحب نے اپنی روح کو ایسی کئی کھڑکیاں میسر کی ہیں کہ وہ اَسّی برس سے زائد جسمانی عمر کے ساتھ بھی ''سدا بہار نوجوان'' ہیں۔ معرفت، سحر بیانی، اثر آفرینیٔ معانی اور فن کاری، متغزل اور مترنم الفاظ اور ان تمام پر مستزاد عروض دان ہونا ان کے ہر لفظ میں تہہ در تہہ ایک جہانِ معانی آباد کرتا ہے۔ ان کا لفظ لفظ درست تلفظ کی بناء پر ان کی گفتگو کو شیریں اور پُراثر بناتا ہے۔

مامون ایمنؔ کی لفظیات ان کے عمیق اور متنوع مطالعے اور مشاہدے کی غماز ہیں۔ مطالعہ، مشاہدہ، ژرف بینی اور دُروں بینی ان کی شخصیت اور مزاج میں ایک منطقی ٹھہراو، توازن اور سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔ وہ جو کام کر رہے ہیں اس کو اپنی ذاتی نمائش اور صلے کی تمنا سے بالاتر ہو کر فقط اردو ادب کی ترویج اور ابلاغ کے لیے کر رہے ہیں۔

ہستی کی زمیں ہے یہ زَماں ہے ہم کو
خوشیوں کی اَدا ہے یہ فغاں ہے ہم کو
کیا کہیے کہ سانسوں میں بسی ہے اُردو
اُردو ہی زمانے کی زباں ہے ہم کو(۲)

■

بہتان کے تیروں سے نہ چھیدے ہم کو
دنیا سے کہو اب نہ رَگیدے ہم کو
چاندی، نہ ہمیں چاہیے سونا، ایمنؔ
اردو ہمیں دولت ہے وہ دے دے ہم کو(۳)

■

ہجرت میں ، ہر اِک سانس نے مارا ہم کو
جھونکا بھی بنا موت کا دھارا ہم کو
ٹوٹے تھے جہاں آسرے سارے، ایمنؔ
اُردو نے دیا بڑھ کے سہارا ہم کو(۴)

رباعی شاعری کی سب سے مشکل صنف اور سب سے کٹر صورت کہی جاتی ہے۔ بقول جوشؔ اس کے سیکھنے کو چالیس سال کی ریاضت درکار ہے مگر مامون ایمنؔ کے ہاں صورتِ حال یکسر مختلف ہے۔۔۔۔ کہ وہ شاید چالیس سال سے رباعی ہی کہتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں تشبیہات حسین ہیں اور استعارے بے مثل۔ مظاہرِ فطرت جیسا کہ چاند، سورج، زمیں، آسمان، رات، دن، پھول، خوشبو، اوس، سایہ، نور، پنچھی اور جگنو کا ذکر بڑے جاندار انداز میں ملتا ہے۔ ان کے ہاں جو احساس بھی بیان ہوا مکمل معنویت کے ساتھ ہوا ہے مگر ہجرت کا احساس، ترکِ وطن کا دکھ، پردیس کی تنہائی، بھیڑ میں اکیلا پن ان کے لفظوں سے جب چھلکتا ہے تو قاری ان کے کرب کو پوری شدت سے محسوس کر سکتا ہے۔ ان کی رباعی میں احساس اور اظہار دونوں ہیں، قلبی واردات و کیفیات، نفسیاتی تفکر، اخلاقی پند و نصائح اور رومانیت ملتی ہے۔ غرض مامون ایمنؔ کی رباعی میں ہر نقش کندہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رباعی میں ہر خاکہ بیان ہو سکتا ہے، ہر سچ کہا جا سکتا ہے۔

ہر خاکہ میں ہر بات بُنی جاتی ہے
ہر ایک تعارف میں سُنی جائے گی
بے ساختہ ہوتا ہے رباعی کا سفر
سچ کے لئے ہر راہ چُنی جائے گی(۵)

■

ابلاغ سے اظہار کی باتیں کر لیں
جذبات سے افکار کی باتیں کر لیں
ایمنؔ سے سنیں کوئی رباعی تہہ دار
انکار سے اقرار کی باتیں سن لیں(۶)

مامون ایمنؔ اللہ کی ذات سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور اس محبت کا بہت رواں اظہار ان کی رباعی میں نظر آتا ہے۔ یہاں ایک چیز جو بہت خوب صورت احساس قاری کے اندر جگاتی ہے، وہ یہ ہے کہ مامون ایمنؔ جس طرح رب کی یکتائی کو تسلیم کرتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے پیار کرتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی ذات اور اپنے کام سے بھی پیار کرتے ہیں۔۔۔ اپنے جذبات اور احساسات سے، ان کے اظہار کے انداز سے اور اپنی انفرادیت سے۔ ایمنؔ صاحب پہلے سے موجود پگڈنڈیوں پر نہیں چلتے بلکہ اپنے لیے خود راستے تلاشتے اور تراشتے ہیں۔ ایک حمدیہ رباعی میں ان کی سوچ کا عکس ملاحظہ کیجیے:

تنہائی میں یکتائی جو دیکھی ہم نے
محفل میں بھی یکتائی تراشی ہم نے
یک تائی کی تاویل ہے رب کی ہستی
سو دہر میں یکتائی ہے کھوجی ہم نے(۷)

■

وہ خیر، وہی شر کی خبر دیتا ہے
وہ شام نئی، روز سحر دیتا ہے
دیتا ہے بہاراں بھی، خزاں بھی ہم کو
وہ دل کے لیے ہم کو نظر دیتا ہے(۸)

مامون ایمنؔ کی زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے مگر وہ ''جوانِ رعنا'' کبھی اس چیز سے گھبرائے نہیں بلکہ ہر دم تر و تازہ رہ کر نئی راہیں تلاش کرتے رہے۔ اللہ نے جو کچھ ان کو عطا فرمایا، وہ نہ صرف اس پر قانع ہیں بلکہ شکر گزار بھی ہیں۔ ان کے لیے قدرت کے ہر نظارے میں امید کی نئی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

ہنسنا ہو تو ہر پھول کو اپنا لیجے
رونا ہو تو ہر ایک سمندر پیچے
بھولے سے بھی ماضی کو نہ دیجے آواز
چلیے تو نہ رکنے کا ارادہ کیجے(۹)

امید کی زنجیر کو ہستی جانا
نومید کی تصویر کو ہستی جانا
کرنوں، کبھی سایوں کو شناسا کہہ کر
انجان سی تحریر کو ہستی جانا(۱۰)

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے پاس ہر چیز کامل یا پسندیدہ نہیں ہوتی مگر ایمنؔ اپنی تقدیر کو برضا و رغبت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر رنگ اور ہر پہلو کو مثبت انداز میں دیکھتے ہیں اور شکایت کرنے کے بجائے اپنے اور سب کے لیے راستے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

لمحات کو ،تقدیر کے جھونکے کہتے
جھونکوں کو، تمنّاوں کے سپنے کہتے
سپنوں کو، ہر اک آس کا قصّہ کہہ کر
ہم دہر سے کہتے، کبھی خود سے کہتے(۱۱)

شبنم سے سلگتا ہوا شعلہ دیکھا
آنکھوں نے عجب آج کرشمہ دیکھا
اک آس نے، اک فرد کو اپنا کہہ کر
دوری میں بھی، قربت ہی کا جلوہ دیکھا(۱۲)

مامون ایمنؔ کے ہاں بہترین تشبیہات و استعارات ہیں جن کی گہرائی اور خوب صورتی کو چند صفحات میں بیان کرنا ممکن نہیں۔۔۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے پاکستان میں لڑکپن گزارا اور امریکا میں عمر بھر کے لیے مقیم ہوئے مگر ان مصنوعی فضاؤں میں مدتوں رہنے کے باوجود وہ اپنے لہو میں دوڑتا قدرتی نظاروں سے بھرپور ماحول والا بچپن اور لڑکپن فراموش نہیں کر پائے۔ ان کے ہاں مٹی، پانی، پرندے، بادل، ہوا، خلا، کرن، سایہ، شبنم، شعلہ، آگ، بستی، جنگل، دیوار، دریچہ، شہر، بازار، بہار، خزاں، پت جھڑ، خوشبو، پنچھی، جھونکا، آنگن، در، سورج، چاند، ستارے، صحرا جیسے خوب صورت لفظ بولتے ہیں۔۔۔ پھر چاہے وہ ہجرت کے کرب کے بیان کے لیے ہوں یا تنہائی کے درد کے اظہار کے لیے، وطن سے دوری کا دکھ کہنا ہو یا مصنوعی اور مصروف زندگی کی بے رنگ کیفیت کہنی ہو:

امید کی زنجیر ہلانا کیا ہو
آئینہ کو حیرت سے ملانا کیا ہو
ماحول جو ہے حبس کی زد میں پیہم
خوشبو سے دریچہ کو کھلانا کیا ہو(۱۳)

دیوار پہ پنچھی ہے ، نہ جھونکا در میں
اس ملک میں آنگن نہیں ہوتا گھر میں
پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہجرت اچھی
سودا ہے عجب چور کا سب کے سر میں(۱۴)

در اپنا دیا ،دہر میں بے گھر رکھا
گیتی میں سدا گیتی سے باہر رکھا
ہر بزم میں رونق ہمیں اللہ نے دی
لیکن ہمیں تنہائی کا محور رکھا(۱۵)

پردیس میں رہنا اور اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی کوشش کرتے رہنا آسان کام نہیں۔ مامون ایمنؔ کے ہاں پردیس جانے والوں کے اجتماعی اور انفرادی مسائل کا ادراک اور احساس پوری شدّت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ہجرت کر کے گیا ہے یا خوابوں کا پیچھا کرتے ہوئے، اسے مجبوری نے وطن کی مٹی کی خوشبو تیاگنے پر قائل کیا یا آسائشوں کی خواہشوں نے، وہ سر اٹھا کر ایک معزز شہری کے طور پر رہ رہا ہے یا ''تیسرے درجے کا شہری'' بن کر۔۔۔ نقل مکانی اور ہجرت کے فرق کو خود کو بتانے اور چھپانے کی دوہری اذیت کا شکار ہر پردیسی ان کی رباعی کے آئینے میں نظر آتا ہے:

آنکھوں میں بسی خواب کی عادت ہے یہ؟
شہرت ہے کہ رسوائی کی عزت ہے یہ؟
گھر بار تجا خود ہی جو گھر کی خاطر
یہ نقل مکانی ہے کہ ہجرت ہے یہ؟(۱۶)

''نائن ون ون'' کے عنوان سے پردیسیوں کے دل کی کرچیاں ملاحظہ ہوں:

انجان سی اک دھن میں رہا کرتے تھے
پردیس کو ہم دیس کہا کرتے تھے
ٹھوکر جو لگی وقت کی ہم نے جانا
اک زخم تھا سینے میں سہا کرتے تھے(۱۷)

وطن سے دور وطن کی محبت کی شدّت ہی کچھ الگ ہوتی ہے۔ تنہائی سے تنہا لڑنا اور وطن کی محبت کا دم بھرنا جوکھم کا کام ہے۔ ایمنؔ صاحب ''نیویورک شہر'' میں لکھتے ہیں:

احساس ہے تنہائی کا خوگر اس جا
ہر جذب ہے تنہائی کا پیکر اس جا
تنہائی کا یک شور بپا ہے اس میں
ہر سانس ہے تنہائی کا محور اس جا(۱۸)

ہر سانس کی تنہائی کی اذیت سہتے رہنے کے ساتھ ساتھ اس اذیت کو بھی تصوّر کرتے رہنا کہ سانس کی ڈوری ٹوٹنے کے بعد بھی پردیس کی تنہائی اور اسی کی مٹی اوڑھنی ہوگی کس قدر کرب ناک ہے۔

راحت نئے انداز کی پائے گا جسم
پیغام نیا وقت کا لائے گا جسم
مر جائیں گے ہم دیس سے باہر، ایمنؔ
پردیس کی مٹی سے نہائے گا جسم(۱۹)

ایمنؔ صاحب صرف شاعر، نقاد اور استاد ہی نہیں بہت اچھے ماہرِ نفسیات بھی ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب جس قدر وسیع ہے اسی قدر انہیں انسانوں کو پرکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔ ان کے ہاں واردات و کیفیاتِ قلبی کے بیان کے ساتھ نفسیاتی تفکر کا عنصر بھی ملتا ہے۔

چلنے کے عمل کو تو سفر کہتے ہیں
رکنے کا عمل ہو، تو مفر کہتے ہیں
جس شخص نے خودہاری ہو جاں کی بازی
دنیا میں اسے لوگ ظفر کہتے ہیں(۲۰)

■

مرجھائے، تو دوبارہ وہ کھلتا کب ہے
پھٹ جائے گریباں تو سلتا کب ہے
یہ راز نہیں، صاف حقیقت ہے، دل
مل کر کسی انجان سے ملتا کب ہے(۲۱)

■

خاموش تغیر کا تماشا دیکھیں
خاموش تبدل کا نظارا دیکھیں
مقصود ہو جب زیست کی مدت کا راز
دیوار پہ سایہ کا سراپا دیکھیں(۲۲)

■

آنکھوں سے لہو ٹپکے، زمانہ دیکھے
دل ضبط کا رنگین بہانہ دیکھے
ایک غیر کہے شوق سے اپنا ہم کو
دنیا یہ حقیقت کا فسانہ دیکھے(۲۳)

■

غیروں کی صفوں میں ہوئے شامل اپنے
اعداء نے نقابوں میں چھپائے چہرے
دستور نیا آیا ہے گل شن میں کیا
کانٹوں سے نہیں، پھول سے دامن الجھے(۲۴)

■

خوابوں ہی کی تعبیریں ہیں، عنواں آنکھیں
تعبیروں کی زنجیریں ہیں، امکاں آنکھیں
شرمائیں کبھی دہر میں پھولوں کو بھی
پتھر کو بھی کر دیں کبھی شاداں آنکھیں(۲۵)

■

اپنوں نے کہا ،قرب کی باتیں کیسی
غیروں نے کہا ،کرنا نہ باتیں ایسی
جھونکے نے سنا اور کہا یہ ہنس کر
اے کاش،ہو دونوں کی ایسی تیسی(۲۶)

رباعی کہنا آسان نہیں یہ بات متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہے مگر اس صنف میں نت نئے تجربے کرنا بڑی جی داری کی بات ہے۔ ایمنؔ صاحب کے ہاں طویل رباعیاتی نظمیں اس ''جی داری'' کا واضح ثبوت ہیں۔ ''آنکھیں'' موضوع کرتے ہوئے انہوں نے دو حصوں پر مشتمل رباعیاتی نظم کہی۔ حصہ اوّل میں پینتیس رباعیات کہیں اور اسی موضوع پر دوسرے حصے میں ''آنکھیں'' ردیف کرتے ہوئے چھبیس رباعیات کہیں۔ اسی طرح ''اردو'' پر انہوں نے اکتیس رباعیات کہیں۔ یہاں قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اِن رباعیات کو پڑھتے ہوئے قاری ایک سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر رباعی پہلی رباعی سے زیادہ مسرت بخش اور شاندار ہے۔

سہہ مصرعی نظم رباعی کی صنف میں ان کا ایک اور شاندار تجربہ ہے۔ قادر الکلامی اور نت نئے مضامین ان کی رباعی کو جدّت اور انفرادیت بخشتے ہیں۔

رسوائی کا اک بار ہے شہرت، ایمنؔ
نکلو تو سہی خول کی پہنائی سے
مانگو ہو جو اک جال سے، عزت ، ایمنؔ(۲۷)

■

برسات کی رم جھم میں بھی سوکھا صحرا
کہتا ہے زمانے سے کہانی اپنی
خود اپنی تمازت سے ہی بہکا صحرا(۲۸)

■

دلدل کو نہ ہم نے کبھی دلدل جانا
اک زعم تھا دانائی کا ہم کو ہر پل
بھولے سے بھی خود کو نہیں پاگل جانا(۲۹)

معلوم ہے کس در پہ ہیں ایمنؔ صاحب
یاں دھوپ نہ سایہ کی تمنّا کیجے
امریکا میں ہوتا نہیں آنگن صاحب(۳۰)

دل کو چھو لینے والے افکار و الفاظ سے ایمنؔ صاحب نے عالمی سطح پر رباعی گوئی میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ ان کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے لیے بھی باعثِ فخر ہے۔ اپنے جداگانہ اسلوب کے حوالے سے خود مامون ایمنؔ صاحب فرماتے ہیں:

فرسودہ خیالات ، نہ کہنہ منظر
اشعار کے دل میں نہیں کوئی اخگر
اک عطف نہیں کوئی اضافت بھی نہیں
ایمنؔ کا یہ اسلوب نیا ہے یک سر(۳۱)

فن کے لئے اسلوب چنا ہے دل دار
تخلیق کے درجے کو بنایا ہے معیار
اے کاش کہے دنیا کھلے دل سے یہی
''ایمن ہے رباعی میں بلا کا فنکار''(۳۲)

اس آخری مصرعے پر ہی ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ ''ایمن ہے رباعی میں بلا کا فنکار''۔ یقیناً ایمن کی رباعیاں اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مامون ایمنؔ، زندان، مثال پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۵
۲۔ ایضاً، ص ۱۰۷، ۳۔ ایضاً، ص ۱۱۰، ۴۔ ایضاً، ص ۱۰۹
۵۔ ایضاً، ص ۶۲، ۶۔ ایضاً، ص ۶۵، ۷۔ ایضاً، ص ۶۹
۸۔ ایضاً، ۹۔ ایضاً، ص ۲۷۲، ۱۰۔ ایضاً، ص ۲۵۶
۱۱۔ ایضاً، ۵، ۱۲۔ ایضاً، ۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵۸، ۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۵
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۱، ۱۶۔ ایضاً، ص ۲۸۷، ۱۷۔ ایضاً، ص ۲۸۸
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۸۹۔ ۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۵، ۲۰۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۲۱۔ ایضاً، ص ۲۴۱، ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۵، ۲۳۔ ایضاً، ۲۴۔ ایضاً، ص ۲۹۴
۲۵۔ ایضاً، ص ۹۸، ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲، ۲۷۔ ایضاً، ۲۸۔ ایضاً
۲۹۔ یضاً، ص ۳۱۰، ۳۰۔ ایضاً، ۳۱۔ ایضاً، ص ۶۵، ۳۲۔ ایضاً، ص ۶۶

☆☆☆

رباعیات

ساجد عارفی خیرآبادی، شاہ جہاں پور
9369095249

اس ذات سے سب نور کے ہالے مانگیں
مخصوص کرم مانگنے والے مانگیں
اس نور کی تعریف ہو کس سے ساجدؔ
خورشید و قمر جس سے اُجالے مانگیں

مزدور کے تم کام کی قیمت دے دو
مقصد ہے یہی اس کی مسّرت دے دو
اللہ کے محبوبؐ کا ہے یہ فرمان
سوکھے نہ پسینہ اُسے اجرت دے دو

بہتا ہوا ماتھے کا پسینہ دیکھو
تم جو ن کا یہ سخت مہینہ دیکھو
لُو دھوپ میں دیوار اُٹھاتا معمار
اینٹوں کے لگانے کا قرینہ دیکھو

ہو جائے اگر کام میں مشکل حائل
تدبیر سے وہ دور بھگائے مشکل
معمار کا یہ کام ہے کتنا باریک
ساہُل وہ لیے ہاتھ میں دیکھے لیول

موجود جو ہے عیب دکھا دیتا ہے
کردار سے نطفے کا پتا دیتا ہے
مُحسن پہ ہی وہ وار کرے ہے بڑھ کر
کم ظرف جو ہوتا ہے دغا دیتا ہے

صادقین: نام ایک، کام انیک

ڈاکٹر سنجے مصرا شوقؔ
(ڈائریکٹر، نسیم اختر صدیقی اکادمی، لکھنؤ۔ موبائل: 7905471168)

آج کا دور کم وقت میں زیادہ شہرت و دولت اور عزت کے حصول کا ہے۔ ٹھہر کر چلنا، سوچ سمجھ کر بات کرنا اور فکر و فن کے گہرے نقوش ثبت کرنا، قصّۂ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں! پھر بھلا شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی رائے پر کون کان دھرے کہ ''رباعی چالیس برس میں قابو میں آتی ہے''۔ ہمارے نوجوان عورت اور غزل کے اردگرد رہ کر ہی عمر عزیز تمام کرتے ہیں۔ جوان کمزور اصناف کو قابو نہ کر سکے بھلا وہ رباعی پر کیسے قابو کرے گا۔ مگر وہ جو مشکل پسند اور اردو کی طرح سخت جان ہوتے ہیں، وہ نہ صرف رباعی پر قابو بلکہ سخت راہوں پر چلنے اور کامیابی کے ساتھ گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ صادقین (۱۹۸۷-۱۹۳۰) ایسے ہی تھے۔ وہ نہ صرف رباعی پر قادر تھے بلکہ تمام عمر مختلف جہات میں پیہم سفر کرتے رہے۔ ان کا قلم رکا نہ ہی دماغ کی زرخیزی اور توانائی میں کمی آئی، بلکہ عمر کے ساتھ پختگی میں اضافہ ہوتا رہا۔

دنیا حیران ہے کہ ایک شخص بیک وقت خطاط ہے، نقاش ہے، مصور ہے، مدبر ہے، مفکر ہے اور اپنی نوعیت کا اچھوتا آرٹسٹ ہے۔ وہ ہر فن مولا ہے۔ وہ قدرت کی صناعی، اس کے جلوے، حسین شاہکار، خوبصورت اور لاثانی مناظر، آسمان کی گردش، زمین کی وسعت کو کبھی قلم اور کبھی برش کے ذریعہ اس طرح اور ایسے پیش کرتا ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھیں پلک جھپکانے کے فطری عمل کو بھول جاتی ہیں اور ہر نظر سراپا داد بن جاتی ہے۔ ایسی نادرالمثال شخصیت کی خدمات، صفات اور کمالات کو کسی ایک مضمون میں سمیٹنا تقریباً ناممکن ہے اور یہاں یہ مقصود بھی نہیں۔ اس مضمون میں صادقین کی رباعیات اور سمت و رفتار کا مختصراً جائزہ پیش کرنا ہے۔ ''رباعیاتِ صادقین نقاش'' کے نام سے صادقین کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ جن میں سے پہلا مجموعہ ۱۹۷۰ میں آیا۔ اسی مجموعے کا ۱۹۷۱ میں طبعِ مکرر عمل میں آیا۔ ۱۹۰ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی رباعیات کو دس عناوین کے تحت پیش کیا گیا۔ عناوین بھی کافی دلچسپ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ کوچۂ خیام میں ایک بھولا بھٹکا مسافر
۲۔ تعلقاتِ نقش و نقاش
۳۔ بیچ چوراہے پر ننگا ناچ
۴۔ آئینۂ حمام
۵۔ جہدِ حیات
۶۔ مقتل نامہ
۷۔ مشاہدات
۸۔ جمالیاتی معاملات
۹۔ متفرقات
۱۰۔ نجد کی طرف مجنوں کی واپسی

مدینۂ سخن سے تعلق رکھنے والے صادقین کو مست قلندر کہیں یا دوسرے آداب والقاب سے نوازیں، فنکار کو ان سب سے کیا لینا دینا۔ وہ اظہارِ حقیقت یوں کرتا ہے ؎

پہلے میں رہا کرتا تھا ایوانوں میں
پھیلے ہوئے الوان کے میدانوں میں
اب ان سے نکل کر میں نہ جانے اے دل
کیوں قید ہوں الفاظ کے تہہ خانوں میں

اور کہیں فنکار کا قلم یوں فکر کے موتی سینۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے ؎

اک بار میں ساحری بھی کرکے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کرکے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کرکے دیکھوں

تخلیق کے کرب، اس کی اذیت کو ایک فنکار ہی سمجھ سکتا ہے یا وہ سمجھے جس نے حضرت انسان کو خلق کیا ؎

آغاز کہ انجام جہاں سے پوچھو
یہ قصّہ کہیں سے، درمیاں سے پوچھو
تخلیق کے کرب کی جو شدت ہم پر
گزری ہے وہ اللہ میاں سے پوچھو

فنکار کا یہ اعتراف مبنی برحقیقت لگتا ہے ؎

تخلیق کا دیکھا نہ ظہورا اب تک
اک نقش بھی ہو سکا نہ پورا اب تک
ہاں وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور میرا ہے ہر کام ادھورا اب تک

ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کی جستجو ہی فنکار کو متحرک رکھتی ہے۔ نئی راہوں کی تلاش میں سرگرداں رکھ کر ہمیشہ کچھ نیا، کچھ مختلف اور اچھوتا کرنے کی ترغیب وتحریک بخشتی ہے، جو نہ صرف فنکار کے لئے سودمند ہوتی ہے بلکہ ملک وقوم، سماج، بالخصوص ادب کے سرمائے میں خاطر خواہ اضافے کا باعث بنتی ہے۔ صادقین نے ایک لمحہ تھکے بغیر پوری توانائی سے چہار سمت اپنی فکر کے جلوے بکھیرے۔ انھوں نے روایت کے احترام کے ساتھ تلاش وتحقیق کے مستحسن عمل کو جاری رکھا۔ نئے نئے موضوعات تلاش کئے، محبت کی شکر پھانکی، تلخیوں کے گھونٹ پئے، تخلیق کا کرب جھیلا، محفل یاراں میں بیٹھے، کوچۂ جاناں کے چکر لگائے، جوانی کی راتوں میں نوشتۂ محبت لکھا، ویرانۂ نجد سے مثل مجنوں گزرے، مصائب ومشکلات کے صحراء کا طویل سفر کیا اور اپنی تازہ کاری سے رباعی کے گلدان کو خوشنما پھولوں سے مزین کردیا۔ مثلاً ؎

نقاش نے کھینچی ہے سنبھل کر تصویر
اک پُل پہ خیالات کے چل کر تصویر
قرطاس پہ مستانہ خرامی کرکے
آئی ہے در دل سے نکل کر تصویر

■

شعلہ کسے کہتے ہیں چھلاوہ کیا ہے
ہم یوں ہی چلے جائیں بلاوا کیا ہے
ہاں مسلک زندگی ہمارا اے دوست
اک حسن پرستی کے علاوہ کیا ہے

■

کرتے ہوئے کچھ غور نہیں لکھ سکتے
کھاتوں میں بہر طور نہیں لکھ سکتے
مکتوب محبت کے علاوہ یعنی
عاشق جو ہیں کچھ اور نہیں لکھ سکتے

■

پھر مجھ میں نہ تھی ضبط کی طاقت تڑپا
جب موڑ پہ پہنچا تو بہ شدت تڑپا
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر دو گام
اک ماہیٔ بے آب کی صورت تڑپا

ایسی روانی، ایسی فصاحت وبلاغت وبرجستگی بڑے بڑوں کو نصیب نہیں ہے۔ پھر جس شائستگی وشرافت اور نفاست کی ایک فنکار میں ضرورت ہے وہ صادقین کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

صادقین کی رباعیاں کسی کا قصیدہ نہیں ہیں۔ بغض وعناد اور فسق وفجور کی آلائش سے پاک ہیں۔ دردمندی اور دلسوزی کے جذبات عیاں ہیں۔ واعظ خشک یا زاہد ریاکار والی روش سے عمداً اجتناب ہے۔ اس لئے ان کی بیشتر رباعیات فن کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور قاری کو بتدریج اپنے شکنجے میں لیتی جاتی ہیں۔ نتیجتاً پڑھنے والا داد دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

صادقین اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور جداگانہ انداز واطوار سے ہمیشہ مرکز نگاہ رہے۔ ان کی متضاد صلاحیتوں اور خدمات کا تقاضا ہے کہ ان پر لکھا جائے اور مختلف حوالوں سے مختلف جرائد میں پیہم لکھا جائے، تاکہ نئی نسل ایک عظیم فنکار کی فنکارانہ خدمات سے کماحقہٗ واقف ہوسکے۔

صادقین کی حیثیت جہاں ادب کے مختلف حوالوں سے مستحکم ہے وہیں رباعیات کی دنیا میں انھیں فراموش کرکے آگے بڑھنا، کم ازکم اہل علم ودانش کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ادبی نشیمن کے مدیر اعلی جناب سلیم احمد صاحب نے رباعیات نمبر کا ذکر کیا تو بے ساختہ صادقین کا نام اور کارنامے نوک قلم پر آگئے۔ وقت کا دامن تنگ ہے اور نمبر بھی تیار ہے، اس لئے اختصار سے کام چلا رہا ہوں۔ امید ہے ''رباعیات نمبر'' کی کامیابی کے بعد صادقین کی فکر، فن اور شخصیت پر نمبر کا اعلان ہوگا جو بہت سودمند اور مفید ہوگا۔

☆☆☆

فضاؔ ابن فیضی کی رباعی گوئی

ڈاکٹر صوفیہ محمود
(اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ) قاضی نذرل یونیورسٹی، آسنسول، مغربی بنگال)

فضاؔ ابن فیضی (۲۰۰۹ ۔ ۱۹۲۳) کا اصل نام فیض الحسن تھا۔ ان کی پیدائش سرزمین اعظم گڈھ کے قصبہ مئو ناتھ بھنجن (جو اب علاحدہ ضلع بن چکا ہے) کے ایک تعلیم یافتہ خانوادے میں ہوئی تھی۔ فضا کے جداعلیٰ مولانا ابوالمعالی محمد علی فیضی اپنے دور کے معروف عالم دین تھے۔ ان ہی کی طرف نسبت کر کے فضا نے اپنے نام کے ساتھ فیضی کا لاحقہ لگایا۔ خاندانی روایات کے مطابق فضا ابن فیضی نے عربی، فارسی اور علوم دینی کی تعلیم کے بعد مئو کے معروف دینی ادارہ جامعہ عالیہ عربیہ میں درس نظامی میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۲ء میں فراغت حاصل کی۔

ضلع اعظم گڈھ زمانۂ قدیم سے ہی اپنی گوناگوں خصوصیات و روایات اور تصورات و انقلابات کی وجہ سے ممتاز رہا ہے۔ اعظم گڈھ نے اردو ادب کے مختلف شاخوں میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں وہ اہل علم سے اوجھل نہیں ہیں۔ ضلع اعظم گڈھ نے اردو ادب کے بے شمار چاند ستاروں کو جنم دیا ہے جن میں علامہ شبلی نعمانیؔ، اقبال سہیل اعظمیؔ، کیفی اعظمیؔ، مولانا عبدالسلام ندویؔ، خلیل الرحمن اعظمیؔ، عزیز الرحمن اعظمیؔ، معین الدین، حنیف اعظمیؔ، ڈاکٹر خلیل اعظمیؔ، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمیؔ، بسمل اعظمیؔ، مولانا حمید الدین فراہیؔ اور فیض الحسن فضاؔ ابن فیضی وغیرہ کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

فضاؔ ابن فیضی نے مدرسہ عالیہ اور مدرسہ فیض عام میں مولانا محمد سلیمان، مولانا محمد احمد، مولانا عبداللہ شائق اور مولانا عبدالرحمن جیسے مشہور علماء سے ادب، فقہ، اصول، تفسیر، حدیث، بلاغت اور عروض وغیرہ کی معاری کتابیں پڑھیں گرچہ فضا کی رسمی تعلیم بس اتنی ہی ہے۔ فضا ابن فیضی پرائیویٹ طور پر انگریزی سیکھنے کی طرف مائل ہوئے تھے لیکن روزی روٹی کے مسائل کے سبب اسے ترک کر کے تجارت سے منسلک ہو گئے۔

فضاؔ ابن فیضی اردو کے ان باکمال فنکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے شاعری بالخصوص غزل کی زلفیں سنوارنے میں اپنی عمر صرف کر دی۔ فضاؔ کی شاعری اپنے وقت کی حقیقی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے دلی کیفیات و مشاہدات کو شعری پیکر میں بخوبی برتا ہے۔ ان کے اظہار کے پیرایے میں بے تکلفی کے عناصر جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ نظم، غزل، حمد، نعت اور رباعی جیسے اصنافِ شعر میں انھوں نے خوب خوب دادِ سخن دیا ہے۔ فضا ابن فیضی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے کی لیکن رباعی گوئی میں بھی انھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اپنی رباعیوں میں انہوں نے ایک ایسی کیفیت پیدا کی کہ ان کا نام اردو رباعی کے ساتھ جڑ گیا۔ ان کی رباعیاں پوری اردو دنیا تک پہنچیں۔ فضاؔ ابن فیضی کی تخلیقات ان کے معاصرین سے بہت ہی مختلف قسم کی ہے۔ فضا نے خود کو کسی نظریے یا کسی تحریک میں محدود کر کے نہیں رکھا بلکہ ایک آزاد تخلیقی ذہن کی آبیاری کے راستے پر خود کو ڈالے رکھا۔ گویا وہ افکار کی سطح پر شبلی، حالی اور اقبال جیسی فکر کے پروردہ تھے۔ اسی لیے ان کے کلام میں ایک پختہ کلاسیکی شعور کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی گہری بصیرت بھی موجود ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''سفینۂ زرِ گل'' ہے جس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ان کی رباعیوں کی تعداد تقریباً نوے (۹۰) ہیں۔ اس عہد میں بہت سے نوجوان اور باکمال شاعر رباعیاں لکھ رہے تھے لیکن فضاؔ کا مزاج اور موضوع ان سے جداگانہ تھا اور اسی مناسبت سے وہ اپنے عہد کے منفرد غزل گو اور رباعی گو شاعر کہلائے۔ فضاؔ کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے جن کی تفصیل یوں ہیں:

۱۔ سفینۂ زرِ گل (غزلیں و رباعیاں)، ۱۹۷۳ء
۲۔ شعلۂ نیم سوز (نظمیں)۔ ۱۹۷۸ء
۳۔ دریچۂ سیم سمن (غزلیں)، ۱۹۸۹ء
۴۔ سرِ شاخ طوبیٰ (حمد و نعت اور نظمیں)، ۱۹۹۰ء
۵۔ پسِ دیوارِ حرف (غزلیں) ۱۹۹۱ء
۶۔ سبزۂ معنی بیگانہ (غزلیں)، ۱۹۹۶ء
۷۔ غزال مشک گزیدہ (رباعیات کا مجموعہ جو ہنوز منتظر اشاعت ہے)

'سفینہ زرِگل' میں فضاؔ ابن فیضی نے جن رباعیوں کو شامل کیا ہے، ان کا اختصاص یہ ہے کہ رباعی کا موضوع بھی درج کر دیا ہے جس میں تنوع جھلکتا ہے اور بے شمار موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ انھوں نے انسانی زندگی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات، درد وغم ،خوشیاں وغیرہ کے علاوہ سماج کے مسائل کو بھی رباعیوں کا موضوع بنا کر اپنی انفرادیت قائم کر لی ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے اپنی رباعیوں میں سیاست کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ ظالم و جابر حکمران کی طرف سے عوام الناس پر کیے جانے والے مظالم کو بھی اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے بے باک ہو کر لکھا ہے اور وہی لکھا ہے جو آج کل ہمارے معاشرے میں پنپتا نظر آ رہا ہے۔ ان کی بیشتر رباعیاں قوم کی اصلاح کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی رباعیوں سے اصلاحی فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

فضاؔ ابن فیضی کا نام رباعی گوئی میں اس لیے بھی اہم ہے کہ دور حاضر کے شعراء میں انھوں نے اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اہل علم کو متاثر کیا ہے۔ وہ ایک خوش گو، خوش فکر اور قادرالکلام رباعی گو شاعر ہیں۔ خدا کی طرف سے انھیں وسیع ذہن ملا ہے جس میں بلا کی آمد ہے۔ اپنی ذہانت اور اپج سے انھوں نے اپنی رباعیوں میں ایک نوع کی تازگی پیدا کی ہے۔ ان کی شعری ابعاد سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں طرح کی شاعری کے اثرات تو قبول کرتے رہے ہیں لیکن نہ ہی قدیم کے پروردہ تھے اور نہ ہی جدید کے مقلد بلکہ انہوں نے ذاتی جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے اپنے جمالیاتی احساس اور ادبی روایت کے پیش نظر اپنی شعریات وضع کرنے کی سعی کی ہے۔ فضاؔ ابن فیضی کی غزل گوئی کے متعلق ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں:

''ان کی غزل میں جو خلوص فن، عصر حاضر کی آگہی اور انفرادی تجربہ ہے اس لئے ان کی تخلیقات کو عصری ادب میں ایک امتیازی حیثیت عطا کر دی ہے۔''

(سفینہ زرگل، فضاؔ ابن فیضی، ص۔ ۱۱)

فضاؔ ابن فیضی کی غزل گوئی سے متاثر ہو کر شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''فضا کی غزل دروں بینی اور بیروں بینی یعنی ذات و کائنات کے بلیغ اظہار کا ایک خوش گوار امتزاج ہے۔''

(سفینہ زرگل، فضاؔ ابن فیضی، ص۔ ۱۳)

اسی ذات و کائنات کے بلیغ اظہار کا اثر فضاؔ ابن فیضی کی رباعیوں میں بھی موضوعات کے تنوع کے روپ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ زندگی کے اخلاقی پہلوؤں، زمانے کے جبر وکرب، فساد وتشدد، معاشرے کی بے راہ روی کو فضاؔ نے بڑی خوبصورتی سے اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں انسانی زندگی کے اہم گوشوں کو نہایت سادگی اور چابک دستی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ بات سننے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

فضاؔ ایک حساس دل شاعر تھے اور اپنے عہد کی ناگفتہ بہ صورتحال سے شاکی بھی رہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعے اخلاقیات کی تعلیم دی اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کو بھی پیش کیا۔ ان کے یہاں اخلاقیات، روحانیات اور پند ونصائح پر مبنی رباعیات بکثرت ملتے ہیں۔ وہ وسیع المشرب تھے اور دردمندی کوٹ کوٹ کر ان میں بھری ہوئی تھی۔ اس لیے انسان کے دکھ درد کو سمجھتے تھے۔ افلاس، مجبوری اور بے کسی سے وہ خود گزر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعی میں یہ تمام عناصر عروج پر نظر آتے ہیں۔ کسی کا دل توڑنا ان کے نزدیک گناہ عظیم تھا۔ وہ کہتے ہیں:۔

دل نرم ،خیالات بڑے نازک ہیں
انسانوں کے جذبات بڑے نازک ہیں
راہوں سے گزر جاؤں صبا کے مانند
اس دور کے حالات بڑے نازک ہیں

(سفینہ زرگل، فضاؔ ابن فیضی، ص۔ ۲۳۱)

فضاؔ ابن فیضی کی رباعیاں مقصدی رباعیاں ہیں۔ انہوں نے رباعیوں کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کو سیرت واخلاق کی تعلیم دے کر ان کی کردار سازی کی کوشش کی ہے۔ وہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے قائل نہیں تھے اور دوسروں کو بھی اسی کا درس دیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مدح سرائی کر کے انعام واکرام پانے کی لالچ سے کبھی شاعری نہیں کی۔ انھیں یقین تھا کہ دینے والا تو پروردگار ہے اس لیے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا زیب نہیں۔ وہ اشرف المخلوقات کو خدا سے رجوع ہونے کا مشورہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی خودی کو بلند کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کئی رباعیوں میں اس خیال کو پیش کیا ہے۔ رباعی 'لہو ترنگ' میں نہایت سادگی سے تلقین کرتے ہے۔ ملاحظہ فرمائیں فضاؔ کی وہ رباعی:۔

کانٹا ہوں مگر رنگ اور بُو رکھتا ہوں
پیاسا ہوں مگر جوشِ سبو رکھتا ہوں
شاداب نہیں گو مگر مرا پیکر،لیکن
نبضوں میں بہاروں کا لہو رکھتا ہوں

(سفینہ زرگل،فضاؔ ابن فیضی،ص۔۲۲۳)

فضاؔ ابن فیضی کی رباعیوں میں زندگی کے تلخ حقائق بھی ملتے ہیں ۔زندگی کے مسائل پر انہوں نے کئی رباعیاں لکھی ہیں۔زندگی محض تلخی کا نام نہیں ہے بلکہ ہنسی اور مسرت کا بھی نام ہے۔جو شخص اپنی پریشانیوں پر روتا دھوتا ہے، وہ اپنی زندگی سے کبھی بھی لطف نہیں اٹھا سکتا۔اصل انسان وہی ہے جو غموں میں بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔وہ کہتے ہیں:۔

سناٹے میں آواز کا رس گھول کے دیکھ
لب بستہ خموشی کی گرہ کھول کے دیکھ
شاید کوئی پا جائے تری روح کا درد
طوطی کی طرح تو بھی ذرا بول کے دیکھ

(سفینہ زرگل،فضاؔ ابن فیضی،ص۔۲۴۳)

ملاحظہ کیا جا سکتا ہے فضاؔ ابن فیضی کی رباعیوں کا ایک انداز یہ بھی ہے جب شاعر پیغامبر اور محتسب کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔وہ اپنے تجربے کی آنچ پر تپے ہوئے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور کبھی کبھی کسی بات پر انتباہ بھی کرتا ہے۔اگر چہ فضاؔ کا یہ انداز نہیں ہے پھر بھی انہوں نے کہیں کہیں جس فکر و بصیرت کا اظہار کیا ہے وہ کوئی دوسرے رباعی گو کے یہاں ناپید ہے۔

فضاؔ ابن فیضی کی رباعیات میں کائنات و آفاقی عناصر موجود ہیں۔ان کی رباعیات کا لب ولہجہ بھی بالکل طنزیہ ہے مگر اس طنز کی کڑواہٹ میں خلوص کی مٹھاس بھی موجود ہے۔فضاؔ نے کچھ ذاتی رباعیات بھی کہی ہیں۔ان رباعیات سے ان کے ذاتی نظریات،شخصی تعلقات اور خانگی واقعات پر روشنی پڑتی ہیں۔ان کی رباعیاں ہمیں ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔ان کی کچھ رباعیات ایسی ہیں جن میں انھوں نے زمانے کی ناقدری کی شکایت کی ہے۔ان کی رباعی 'شاعر فردا' ملاحظہ فرمائیں:۔

آہنگ جنوں ساز ہوں، مجھ کو نہ سنو
فردا کا سر آغاز ہوں مجھ کو نہ سنو
راس آئے تمھیں 'ذوقِ نوائے امروز'
میں درد کی آواز ہوں مجھ کو نہ سنو

(سفینہ زرگل،فضاؔ ابن فیضی،ص۔۲۴۹)

اسلوب بیان کی سادگی اور سلاست سے آراستہ فضاؔ کی رباعیاں ان کے سچے خلوص اور دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ان کی رباعیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نازک مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہوئے ساری انسانیت کے لیے صحیح راہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ وہ وہی کہتے ہے جس پر وہ خود پورا یقین رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فضاؔ کی آواز میں تاثیر ہے اور یہی تاثیر ان کو ایک عظیم رباعی گو بناتی ہے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی رباعی کا ذکر آئے گا فضا ابن فیضیؔ کا نام ضرور شامل رہے گا۔

کتابیات:

۱۔سفینہ زرگل،فضاؔ ابن فیضی،دانش کدہ پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن، ۱۹۷۳ء
۲۔شعلۂ نیم سوز (نظمیں)،فضاؔ ابن فیضی،،فیضی پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن،۱۹۷۸ء
۳۔دریچۂ سیم سمن (غزلیں)،فضاؔ ابن فیضی،فیضی پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن،۱۹۸۹ء
۴۔سرِ شاخ طوبیٰ (حمد ونعت اور نظمیں)،فضاؔ ابن فیضی،ادارۃ البحوث الاسلامیہ،جامعہ سلفیہ بنارس،۱۹۹۰ء
۵۔پسِ دیوارِ حرف (غزلیں)،فضاؔ ابن فیضی،فیضی پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن،۱۹۹۱ء
۶۔سبزۂ معنی بیگانہ (غزلیں)،فضاؔ ابن فیضی،مجمع البحوث العلمیۃ الاسلامیہ،نئی دہلی،۱۹۹۴ء
۷۔کلیات فضاؔ ابن فیضی،محمد جابر زماں،مکتبہ نعیمیہ،مئوناتھ بھنجن،۲۰۱۱ء

☆☆☆

طٰہٰ کبھی یٰسین کے پیکر میں ہے
روشن کبھی معراج کے منظر میں ہے
اللہ کے محبوب کی ایسی ہی شان
انّا اعطیناک الکوثر میں ہے

اللہ رے یہ جوش ذرا ہوش میں آ
اتنا نہ ہو مدہوش ذرا ہوش میں آ
گردش میں نہ آجائیں کہیں ارض وسما
اے رند بلا نوش ذرا ہوش میں آ

شکیل گیاوی
کھدرالکھنؤ

رباعیاتِ شوقؔ نیموی: ایک جائزہ

طفیل احمد مصباحی

(سبحان پور کٹوریہ، ضلع بانکا، بہار۔ موبائل:8416960925)

ہندوستان کے علمی وادبی مراکز میں ایک اہم اور معتبر نام "عظیم آباد" کا بھی ہے، جس کو ایک مستقل دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معزز اور سرکردہ اراکین میں بیدلؔ، شادؔ، جوشؔ، راسخؔ، عشقؔ، حسرتؔ، سہیلؔ، ثاقبؔ، افضلؔ، بسملؔ، رمزؔ، واقفؔ، بیخودؔ، فلسفیؔ، حمیدؔ، بگٹٹ، شمسؔ، مظہرؔ، ضمیرؔ، سحرؔ، ہمدمؔ، نشاطؔ، جمیلؔ، شہباز وغیرہم کے نام شامل ہیں۔ شعر وسخن کے علاوہ تحقیق وتنقید اور افسانہ وناول نگاری کے میدان میں بھی فرزندانِ بہار نے قابل رشک ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالمغنی اور اختر اورینوی، اردو تحقیق وتنقید کے "عناصرِ اربعہ" کہے جاتے ہیں۔ ماہرِ لسانیات، رئیس المحدثین حضرت علامہ ظہیر احسن شوقؔ نیموی (وفات: نومبر ۱۹۰۴ء) اسی شہرِ عظیم آباد کے ایک نامور سپوت تھے۔ علم وفضل، عقل ودانائی، شعور وآگہی اور ذہانت وطباعی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کی ذات میں اسلامیات، لسانیات اور ادبیات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ آپ اپنے وقت کے زبردست عالمِ دین، علومِ حدیث کے ناقد محدث، ماہرِ لسانیات، قادرالکلام شاعر اور اردو زبان وادب کے مایۂ ناز ادیب ومحقق تھے۔ آپ کی بلند پایہ ادبی تصانیف "سرمۂ تحقیق"، "ازاحۃ الاغلاط" اور "رسالہ اصلاح وایضاح" آپ کی تحقیقی وتنقیدی عظمت کو اجاگر کرتی ہیں۔ "دیوانِ شوقؔ"، "مثنوی سوز وگداز" اور "نغمۂ راز" آپ کی شعری یادگار ہیں۔ بعض الفاظ کی تحقیق وتنقیح کے معاملے میں جلالؔ لکھنوی کے ساتھ ادبی مناظرہ اور آپ کی فتح آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ زبیرؔ دہلوی (بہادر شاہ ظفر کے پوتے)، ضیاؔ عظیم آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے رجالِ علم وادب نے اپنے کلام کی اصلاح لی ہے اور آپ کی شاگردی اختیار کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان ملاحظہ کریں :

> ''اس وقت جیسی طبیعت اور معاملات تھے، اس کے لحاظ سے ان حالات کا زیادہ اثر پڑا اور شوقؔ نیموی کی شاعرانہ واقفیت دل پر نقش ہوگئی۔ علی الخصوص یہ کہ شعر گوئی کے ساتھ قواعد واصول اور زبان کے مباحث پر ان کو ایسا اچھا عبور ہے کہ ایک پوربی دیہاتی ہوکر جلالؔ لکھنوی مرحوم جیسے صاحبِ دعویٰ کو شکستِ فاش دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ان سے خط وکتابت کی اور اصلاح لینا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت جی لگا کر اصلاح دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کے ساتھ ایک ایک صفحے کے فوائد بھی، جن کا کچھ تعلق اشعارِ زیرِ اصلاح سے ہوتا تھا، لکھتے تھے۔''

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: ۲۴۲، ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

علامہ شوقؔ نیموی "نیمیؔ" کے رہنے والے تھے جو عظیم آباد (موجودہ پٹنہ) کے قرب وجوار کا ایک معروف مقام ہے۔ شوقؔ کی بدولت اس گمنام خطے کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ غازی پور اور لکھنؤ وغیرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پوری زندگی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ میں گذاری۔ شعر وادب اور لسانیات کے علاوہ مختلف دینی وفقہی موضوعات پر آپ کی تقریباً ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔ علمِ حدیث میں آپ کا پایہ کافی بلند تھا۔ "آثار السنن" آپ کی گراں قدر تصنیف ہے، جس سے آپ کا محدثانہ کمال ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا انظر شاہ کشمیری اور انور شاہ کشمیری نے آپ کی حدیث دانی کا اعتراف کیا ہے اور آپ کے "حدیثی افادات" سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انور شاہ کشمیری نے آپ کی شان میں ایک عربی قصیدہ بھی لکھا ہے، جو "آثار السنن" کے آخر میں مطبوع ہے۔ چار اشعار نموناً پیش کرتا ہوں :

وحید العصر ، محسود الندید
سدید القول فی حسن الصفاء
رفیع القدر ، ذو القدر الرفیع
باعلال الروایۃ و انتقاء
ظھیر الحق مولانا" الظھیر "
اضاء الارض فی نور اھتداء
مصابیح الھدیٰ مشکوٰۃ ھدیٰ
و مرقاۃ المعالی و السناء

مذکورہ بالا تمہیدی کلمات سے ظاہر ہو گیا کہ علامہ شوقؔ نیموی کتنے بڑے عالم ومحدث، ادیب وشاعر اور اردو زبان وادب کے ناقد ومحقق تھے۔ شاعری، ان کے فضل وکمال کا ایک روشن پہلو ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی، تخیل کی بلند پروازی، معنوی تہہ داری اور زبان و بیان کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ شاعری کی تمام مروجہ اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن غزلؔ، قصیدہؔ، مثنویؔ اور رباعیؔ میں استادانہ ملکہ حاصل تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ان کی "قطعات ورباعیات نگاری" بھی خاصے کی چیز ہے۔ "دیوانِ شوقؔ" میں غزلیات وقصائد اور قطعات و رباعیات کے بیش قیمت نمونے موجود ہیں۔ علامہ موصوف کو اپنے شاعرانہ کمال پر ناز تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنی مثنوی وقصیدہ و رباعیات میں مختلف مقامات پر کیا ہے۔ نواب منگرول شیخ حسین کی مدح میں کہے گئے قصیدے کا یہ ابتدائی بند دیکھیں:

مجھ کو خلاّقِ معانی نے دیا ہے وہ کمال
نکلے جو بات مرے منہ سے وہ ہو سحر حلال
عرش پرواز ہے شہبازِ تفکر میرا
لا مکاں دم میں پہنچتا ہے مرا مرغِ خیال

■

مو شگافی جو دکھاتا ہے مرا شانۂ فکر
کھینچتا ہے کمرِ یار کے بھی بال کی کھال
زلفِ جاناں کے جو مضموں سے الجھ جاتا ہوں
ختم ہوتا ہی نہیں سلسلۂ حسنِ مقال

"رباعی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، چار مصرعوں پر مشتمل وہ صنفِ سخن ہے جس میں کسی بھی خیال کو ربط وتسلسل اور تدریجی ارتقا کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ۲۴ / اوزان مخصوص ہیں۔ آج کل رباعی اور قطعہ کو آپس میں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ دونوں میں مختلف اعتبار سے فرق ہے، جو فن کی کتابوں میں مرقوم ہے۔ علامہ شوقؔ نیموی کو غزل وقصیدہ اور مثنوی کی طرح "رباعی گوئی" میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی رباعیات مذہب واخلاق اور عشق کے موضوعات پر مشتمل ہیں، جن میں ادب کا جمال، فن کا کمال، زورِ بیان، لسانی حسن، فکر وخیال کی بلندی، سادگی وصفائی اور چاشنی وبرجستگی پائی جاتی ہے۔ ان کی "رباعی گوئی" کے حوالے سے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں :

''ابتدائی زمانے میں گرچہ اردو شعرا کی پوری توجہ غزلؔ، مثنویؔ اور قصیدہؔ کی طرف مرکوز تھی۔ تاہم رباعی کہنے کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔ اس کا باقاعدہ آغاز میر تقی میرؔ کے عہد سے ہوتا ہے۔ امیرؔ، منیرؔ اور جلالؔ کے یہاں باضابطہ طور پر رباعیاں ملتی ہیں، جو زیادہ تر عشقیہ مضامین پر مبنی ہیں۔ تسلیمؔ نے جو رباعیاں کہی ہیں، وہ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ علامہ شوقؔ نیموی نے بھی رباعیاں کہی ہیں، جن سے ان کی قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی رباعیات عشقیہ، مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مبنی ہیں.....دیوانِ شوقؔ میں ان کی رباعیاں مذکور ہیں۔ ان میں زورِ بیان، سادگی، مضمون آفرینی اور دلکشی پورے طور پر پائی جاتی ہے۔''

(علامہ شوق نیموی: حیات وخدمات، ص:۶۰، ناشر: مجلسِ علمی، لال باغ، پٹنہ)

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، علامہ شوقؔ نیموی کو رباعی گوئی میں کمال حاصل تھا۔ وہ کسی بھی مفہوم اور مرکزی خیال کو چار مصرعوں میں بڑی سلاست ونفاست کے ساتھ ادا کر دیتے تھے۔ شاعری میں "تاریخ گوئی" کا چلن عام ہے۔ شعرائے اردو نے بالعموم تاریخِ ولادت ووفات بہ شکلِ "رباعی" کہی ہے۔ مرزا غالبؔ نے ایک فارسی رباعی میں اپنی تاریخِ ولادت "شورشِ شوق" اور لفظ "غریب" سے نکالی ہے۔ غرض کہ شعرائے اردو نے کثرت سے مادہ ہائے تاریخ نظم کیے ہیں۔

غالبؔ چوں ز ناسازی فرجام نصیب
ہمہ بیمِ عدو دارد ، ہم ذوقِ حبیب
اریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس
ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظ " غریب "

شوقؔ نیموی نے ایک رباعی میں اپنے نام، تخلص، کنیت اور اپنے وطنِ مالوف "نیمی" کو بڑی خوب صورتی اور فنکاری کے ساتھ بیان کیا ہے اور اپنی تاریخِ ولادت ۱۲۷۸ء "ظہیر الاسلام" سے نکالی ہے :

شوقؔ است تخلصم ، ظہیر احسن نام
قریۂ دل نواز نیمیؔ است مقام
شد از پئے کنیم " ابو الخیر" الہام
تاریخِ تولدم "ظہیر الاسلام" (۱۲۷۸ ھ)

شوقؔ نیموی کی مختلف رباعیوں میں مذہب و اخلاق کی بیش قیمت اور حیات بخش تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ ذیل کی چند رباعیاں دیکھیں۔ وہ قومِ مسلم کو جھنجھوڑتے ہوئے خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب سونے کا وقت نہیں۔ خوابِ گراں سے اٹھو، گردشِ ایام نے تمہارا کام تمام کر دیا ہے۔ اسلام اب برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ مسلمان کے قول و عمل سے اسلام ظاہر نہیں ہوتا۔ دوسری رباعی میں مذہبِ اسلام کے ذمہ دار طبقہ سے خطاب ہے۔ شاعر کشتیِ ملت کے کھیون ہاروں سے اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اسلام کے بیڑے کو غرق ہونے سے بچا لو۔ قومِ مسلم کے روحانی و اخلاقی امراض میں سے "منافقت" اور "غفلت و تساہل" بھی ہے۔ ان امراض نے آج قومِ مسلم کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ غفلت، سستی، تن آسانی، عشرت پسندی، ظاہر میں کچھ، باطن میں کچھ۔ دل میں یادِ بتاں اور زبان پر کلمۂ اسلام کا ذکر۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے شوقؔ نیموی نے بڑی اچھی رباعی نظم کی ہے :

اس گردشِ چرخ نے کیا کام تمام
غفلت میں پڑی رہتی ہے قوم اپنی مدام
اے خوابِ گراں کے سونے والے اٹھو
اب نام کو رہ گیا ہے باقی اسلام

■

افسوس وہ اسلام کی حالت نہ رہی
وہ شکل ، وہ رنگ ، وہ صورت نہ رہی
غفلت کے مرض سے دل ہو گئے کمزور
اسلام کے کچھ کام کی ہمت نہ رہی

غمِ عاشقی میں کُڑھنے اور آہیں بھرنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ عشق کا مرحلہ بڑا دشوار اور جاں گداز ہوتا ہے۔ کبھی عالمِ وحشت میں اپنا سر پٹک پٹک کر پھوڑا جاتا ہے اور کبھی واعظ و ناصح کی سخت کلامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشق وہ بھاری پتھر ہے، جو اٹھائے نہیں اٹھتا۔ بالآخر عاشقِ دل فگار اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتا ہے اور بارِ غمِ عشق کو اٹھانے کی ہمت و جرأت نہیں کرتا۔ عشق و وارفتگی کی اس لطیف کیفیت کو جنابِ شوقؔ یوں بیان کرتے ہیں :

وحشت نے پٹک پٹک کے سر پھوڑ دیا
ناصح نے سخت کہہ کے دل توڑ دیا
آخر نہ اٹھا بتوں کا بارِ غمِ عشق
بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑ دیا

آہ و فغاں اور گریہ و نالہ عشق کے لوازمات میں سے ہیں۔ قلب میں اضطراب و التہاب، لبوں پر آہِ سرد، چہرے پر زرد نشان اور دل میں درد۔ یہ ہے عاشقِ صادق کا کُل سرمایۂ حیات اور عشقِ جاں سوز کی پہچان۔ چوٹ کھائے بغیر شاعر کیسا اور دردِ دل کے بغیر شاعری کیسی؟ اسی لیے جنابِ شوقؔ فرماتے ہیں :

عاشق وہی جس کے لبوں پر ہو دمِ سرد
ہے عشق اسی کو جس کا چہرہ ہو زرد
شاعر وہی جس نے چوٹ بھی کھائی ہو
ہے شعر اسی کا جس کے دل میں ہو درد

الفاظ کی اثر آفرینی، کلمات و فقرات کی دل آویزی اور قوتِ گویائی کا اعجاز مسلم ہے، جس کی تائید حدیث پاک "ان من البیان لسحرا" سے بھی ہوتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات اپنے اندر بڑی تاثیر رکھتی ہے۔ یہ وہ آنچ ہے جو پتھر دل انسان کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ بعض اشعار حکمت سے پُر اور سوز و گداز سے لبریز ہوتے ہیں جو شمشیرِ بُرّاں کا کام کرتے ہیں اور پتھروں میں بھی شگاف ڈال دیتے ہیں۔ شوقؔ نیموی کہتے ہیں کہ میرے اشعار کو بے جان نہ سمجھو۔ یہ میرے دل کے پُر درد نالے اور قلبِ مضطر کے شرارے ہیں۔ ان کے اندر وہ تاثیر ہے کہ پتھر کے دل میں بھی راستہ بنا لیتے ہیں۔ میری قوتِ گویائی کے اعجاز سے بت بھی سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اشعار مرے نہیں ، یہ ہیں نالہ و آہ
پتھر کے دل میں کرتے ہیں یہ راہ
اے شوقؔ یہ اعجاز ہے گویائی کا
بول اٹھتے ہیں بت بھی سبحان اللہ

"شاعرانہ تعلّی" ایک خاص شعری اسلوب ہے، اس کو غرور و تکبر یا شاعر کی انانیت سے موسوم کرنا حماقت ہے۔ شوقؔ نیموی کی متعدد رباعیاں

اس وصف سے متصف ہیں ۔ اگر شاعر و فنکار واقعی عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہو تو "شاعرانہ تعلّی" اس کو زیب دیتی ہے ۔ والیِ رام پور نواب کلب علی خان، داغؔ دہلوی، حسرتؔ عظیم آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ہستیوں نے شوقؔ نیموی کی شاعرانہ عظمت و مہارت کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا شوقؔ کے کلام میں "شاعرانہ تعلّی" کا پایا جانا کوئی امرِ معیوب نہیں ہے۔

جب طبعِ رسا کسی کی ڈٹ جائے گی
منکر کی فکرِ سست ہٹ جائے گی
شمشیرِ سخن سے اہلِ جوہر کی
اے شوقؔ عدو کی ناک کٹ جائے گی

■

منکر ہے کہاں ذرا اب آ کر دیکھے
میدانِ کلام کا دلاور دیکھے
"باری اب شوقؔ نیموی" کی آئی
اس پوربی شاعر کا بھی جوہر دیکھے

پہلی رباعی کے آخری مصرعے میں محاورہ "ناک کٹنا" بھی خوب ہے اور شاعر کی قادر الکلامی پر دال ہے ۔ شوقؔ کے ساتھ "نیموی" کا اضافہ اور "پوربی شاعر" کا بھی جواب نہیں ہے۔

یہ دنیا نکتہ چینوں سے بھری پڑی ہے ۔ شوقؔ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ لوگ ان کے بعض کلام و اشعار پر "شاعرانہ تعلّی" کا لیبل چسپاں کریں گے، اس لیے تحدیثِ نعمت کے طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ الحمدللہ! مروجہ علوم و فنون پر مجھے دسترس حاصل ہے ۔ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے، وہ "شاعرانہ تعلّی" نہیں، بلکہ حقیقت کی ترجمانی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ علامہ نیموی صرف اسلامی علوم اور درسِ نظامی کے ہی دقّاق عالم نہیں تھے ۔ بلکہ لسانیات و ادبیات کے بھی ایک مسلم الثبوت محقق و ناقد تھے ۔ لسانیات، عروض، املا، علم بیان و معانی و بدیع اور شعر و ادب کے اصول و مبادی پر ان کو گہری بصیرت اور اجتہادی مقام حاصل تھا ۔ چنانچہ شوقؔ نیموی کی شعری مہارت و ادبی حذاقت کے حوالے سے جناب محفوظ الحق واصلؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں :

''علامۂ زمن، محققِ کامل الفن جناب مولانا ابوالخیر محمد ظہیر احسن صاحب شوقؔ نیموی عظیم آبادی کی ذاتِ با برکات بھی ایک آئینۂ قدرتِ الٰہی ہے کہ جس علم کی طرف نظر اٹھائی دریا بہا دیا اور جس فن کی جانب توجہ کی ڈنکا بجا دیا ۔ خصوصاً شعر و سخن میں وہ رتبۂ خدا داد پایا ہے کہ اساتذۂ لکھنؤ و دہلی تک آپ کو مانتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ..... المختصر حضرت شوقؔ نیموی کا کمال و مہارتِ فن مسلم الثبوت ہے۔''

(دیباچہ مثنوی سوز و گداز، ص: 1، مطبوعہ: نظامی پریس، پٹنہ)

شوقؔ نیموی کو شاعری میں جناب شمشادؔ لکھنوی و تسلیمؔ لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ۔ ان دونوں بزرگ استاذ کو اپنے اس ہونہار اور لائق و فائق شاگرد پر ناز تھا ۔ اسی نسبتِ تلمذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

کس فن میں نہیں دخلِ کامل مجھ کو
ہیں جتنے علوم سب ہیں حاصل مجھ کو
پھر بھی نہ کبھی تعلّیاں کیں اے شوقؔ !
صد شکر دیا خدا نے وہ دل مجھ کو

■

شمشادؔ نے دی ہے ارجمندی مجھ کو
گلزارِ سخن میں سر بلندی مجھ کو
تسلیمؔ کے فیض سے جھکا ہے سرِ عجز
بھاتی نہیں کچھ بھی خود پسندی مجھ کو

"مان نہ مان میں تیرا مہمان" اردو کی مشہور کہاوت ہے ۔ اس کو شعر کی لڑی میں جس مہارت کے ساتھ پرو یا گیا ہے، وہ جناب شوقؔ جیسے کہنہ مشق اور دیدہ ور شاعر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

اس کعبۂ دل میں جو خدا کا ہے مکان
افسوس کہ رہتا ہے بتوں کا ارمان
اے شوقؔ جو کچھ کہیے تو بول اٹھتا ہے
تو" مان نہ مان میں ہوں تیرا مہمان "

شوقؔ کی بعض رباعی میں بڑی بے تکلفی، برجستگی اور "سہلِ ممتنع" کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر کی صورت میں کوئی نثری ٹکڑا قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے ارتجالاً موزوں ہو گیا ہو۔ مثلاً:

کس سوچ میں ہیں آپ یہ کیا حال ہے آج
کیا کشورِ دل کیا کسی نے تاراج
آثارِ ملال ہیں جبیں سے ظاہر
اے حضرتِ شوقؔ کہیے کیسا ہے مزاج

ان کے علاوہ شوقؔ کی اور بھی رباعیاں ہیں، جن سے ان کی شاعرانہ عظمت اور "فنِ رباعی گوئی" میں ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ "رباعی گو شعرا" میں علامہ ظہیر احسن شوقؔ نیموی کا نام بھی فخریہ طور پر لیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

کوثر صدیقی کی رباعیات پر ایک نظر

(مجموعہ ''فانوس'' کے حوالے سے)

ڈاکٹر یاسمین اختر (بھاگلپور)

کوثر صدیقی ایک شاعر ہی نہیں کامیاب مضمون نگار اور باصلاحیت مدیر بھی ہیں۔ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔موصوف نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ،سب کی سب مقبول ومعروف ہوئی ہیں۔''فانوس'' ان کی پانچویں کتاب ہے جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد''قندیل''۲۰۱۶ء میں منظرعام پر آئی۔ یہ بھی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔''فانوس'' روشن شمع کی مانند ہے جس کو پڑھنے سے بہت ساری باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ پوری کتاب خوبصورت رباعیات سے بھری پڑی ہے۔شاعر موصوف نے تمام رباعیات کو محنت ولگن سے لکھ کر اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔رباعیات کی زبان اتنی آسان ہے کہ عام قاری بھی اس کا مفہوم بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔بعض رباعیات ایسی ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہیں۔

شاعر موصوف نے غزل گوئی اور نظم نگاری کے ساتھ ساتھ رباعیات میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔اُنہوں نے دوہے بھی لکھے ہیں۔اپنی رباعیات کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

> ''رب العزت کا کرم ہے کہ دیگر شعری اصناف کے مقابلے میں مجھے رباعی گوئی میں زیادہ کامیابی ملی۔دس بارہ سال میں دو ہزار سے زیادہ رباعیاں نوکِ قلم پر چکی ہیں۔(فانوس:ص۱۰)

فانوس جدید دور کی ایک اہم کتاب ہے۔اس کتاب میں ۲۱۲/رباعیات ہیں۔ ان رباعیات کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر موصوف اُردو زبان کے رباعی گو شعرا میں سے ایک ہیں۔اُنہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

> اس مجموعے میں جیسی بھی رباعیاں ہیں ، اُردو دنیا کی نذر ہیں۔میں غالبؔ نہیں ہوں جنہیں نہ ستائش کی تمنا تھی ، نہ صلے کی پروا۔جیسا کہ عرض کیا میں ایک عام انسان ہوں۔صلہ و ستائش نہ سہی اعتراف کی تمنا ضرور ہے۔(فانوس:ص۱۰)

موصوف نے اپنا کلام دعا سے شروع کیا ہے۔اس کے بعد قرآن کریم،سورۂ یٰسین اور اُردو زبان کو موضوع بنایا گیا ہے۔موضوع کی مناسبت سے حمد باری تعالیٰ اور نعت شریف کو بھی جگہ ملنی چاہئے تھی مگر پہلی رباعی میں شاعر نے بڑے سیدھے سادے انداز میں اللہ سے فریاد کی ہے۔عام انسان بھی ہاتھ اُٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگتا ہے۔لیکن ان کے کہنے کا انداز شاعرانہ نہیں ہوتا۔جیسا کہ اُنہوں نے کہا ہے ؎

کرتا ہوں ترے نام سے آغاز سفر
یارب تو ہی سالار ہے تو ہی رہبر
تیری ہی بنائی ہوئی رہ پر چل کر
ہو ختم مسافت مری تیرے در پر

ایک جگہ شاعر نے اس حقیقت سے بھی روشناس کرایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔اگر ہم اللہ کے بندے سے کچھ مانگتے ہیں تو یہ ہماری بے وقوفی ہے۔ بندہ کچھ دیتا نہیں ہے۔ہمدردی جتا کر میری بات سنتا ہے اور پیٹھ پیچھے میرا مذاق اُڑاتا ہے۔اگر کوئی کسی کی مدد کرتا بھی ہے تو اس میں اللہ کی مرضی شامل ہوتی ہے ؎

یارب ہمیں ایمان کی دولت سے نواز
کر دونوں جہانوں میں ہمیں سرفراز
اغیار سے ہم کرتے نہیں کوئی سوال
کرتے ہیں ترے سامنے ہی ہاتھ دراز

اِس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے، جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے۔ کسی کی مرضی سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ کسی کو شہرت دیتا ہے۔ کسی کو ذلیل وخوار کرتا ہے تو کسی کو مالا مال کرتا ہے ؎

قدرت کی عنایت کی جہاں ہو برسات
انسان کی بجز قطرہ نہیں کچھ اوقات
گلزار جہاں میں یہ خدا کا ہے کرم
کی ہم کو عطا اس نے بلا کی سوغات

اپنے رب سے مانگنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ کہتے ہیں اللہ نے چند فرشتوں کو سجدے میں گرے رہنے کا حکم دیا ہے اور وہ فرشتے اللہ کی خوشنودی کے لئے تا قیامت سجدے میں ہی رہیں گے۔ شاعر کو بھی اللہ کی خوشنودی چاہئے۔ وہ وہی عزت وہی رتبہ پانا چاہتے ہیں جو اللہ نے ملائکہ کے حصّے میں رکھا ہے۔

رباعی کی خوبصورتی آخری مصرع پر ٹکی ہوتی ہے۔ یوں تو دوسرے مصرع میں ہی موضوع کا احساس ہوجاتا ہے لیکن چوتھا مصرع رباعی کی جان ہوتا ہے۔ ہر چند کہ شاعر موصوف نے اپنی رباعی کے آخری مصرع کو پُرزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ؎

پتھر کے جگر میں بھی شرر ہوتا ہے
ناچیز صدف میں بھی گہر ہوتا ہے
قدرت کی ہر اک شے میں دھڑکتا ہے دل
ہر پیڑ کو ارمان ثمر ہوتا ہے

قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس کتاب کو اللہ نے سرکارِ دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ یوں تو اور بھی آسمانی کتابیں ہیں، لیکن قرآن آخری کتاب ہے۔ قرآن پڑھنا او پڑھانا مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے۔ اس بارے میں شاعر کیا کہتے ہیں ان ہی کی زبانی سنئے ؎

قرآن ہے اللہ کی حکمت کی کتاب
دنیا کے لئے ہے ہدایت کی کتاب
قانون الٰہی ہے زمانے کے لئے
مومن کے لئے ہے یہ شریعت کی کتاب

یٰسین قرآن کا ایک مختصر سا سورہ ہے۔ اس سورہ کو قرآن کا دل قرار دیا گیا ہے۔ اس سورہ کی بڑی فضیلت واہمیت ہے۔ بقول شاعر ؎

یٰسین جو پڑھتا ہے رہے گا وہ شاد
یٰسین کے قاری کی برآئے گی مراد
یٰسین کے قاری سے خدا رہتا ہے خوش
دنیا ہو کہ عقبیٰ وہ رہے گا آباد

سورہ رحمن بھی قرآن پاک کی ایک سورہ ہے۔ یہ سورہ قرآن کے ستائیسویں پارہ میں ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ انسان اور جن سے مخاطب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ۳۱ بار اپنی نعمتوں کا احساس دلایا ہے (اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) ؎

ہے زینت ِ قرآن جو سورہ رحمن
اللہ تعالیٰ کا ہے اس میں فرمان
انصاف کی انسان کو ہدایت بخشی
دنیا کے لئے وضع کی اس نے میزان

خدا نے زمین وآسمان کو ترازو کے دو پلڑوں کی طرح قائم رکھا ہے۔ جس طرح زمین وآسمان ایک جگہ پر قائم ہوئے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہئے ؎

ہمواری ٔ میزان ہے ثبوت ایمان
ہے عدل و صداقت کی علامت میزان
میزان کے پلّو کو برابر رکھئے
میزان ہے انصاف و عدالت کی جان

ایمان کا مطلب ہے دل سے یقین کرنا۔ جس نے اللہ پر، اللہ کے نبیؐ پر، اللہ کی کتاب پر اور اچھے بُرے تقدیر پر ایمان لایا وہی جنت کا حق دار بنے گا ؎

ایمان کی توفیق دے اللہ میاں
ہر شخص کا ایمان پہ ہو پختہ ایماں
کونین کی دولت کی اگر ہے خواہش
ایمان کو زندہ رکھے دل میں انساں

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد دوسرے کوئی نبی نہیں آئیں گے۔ ہم سب رسولؐ کی امّت ہیں۔ بقول شاعر ؎

پیدا کیا اللہ نے انساں ہمیں
صد شکر بنایا نہیں حیواں ہمیں

ہم کو شرف اُمت احمد بخشا
انسان کا درجہ ہے قرآن ہمیں

ایک جگہ شاعر نے حسن واخلاق کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ؎

روشن کرو دنیا میں محبت کے چراغ
گل کردو روشنیاں ہیں محبت کے چراغ
انسان کا درجہ ہے ملک سے بھی بلند
بجھنے نہ دو انسان کو حرمت کے چراغ

اِنسان کو چاہئے کہ ہمیشہ میٹھی بولی بولے۔کوئی ضروری نہیں کہ سامنے والا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں تا کہ سامنے والے کا دل پگھل جائے۔

کانٹوں کو بھی آنکھوں میں بٹھالیتے ہیں
دشمن کو بھی سینے سے لگالیتے ہیں
دل جن کا کشادہ ہے زباں ہے شیریں
اغیار کو بھی اپنا بنا لیتے ہیں

پیارے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میرے سب سے قریب وہ لوگ ہوں گے جو لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں گے۔ نیز ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم بڑوں کی عزت کریں۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آئیں۔مثال ملاحظہ ہو ؎

جڑتے ہیں فقط پیار سے ٹوٹے رشتے
نفرت سے مسائل نہیں حل ہوسکتے
پانی ہی بجھاتا ہے فقط بھڑکی آگ
شعلوں سے کبھی بجھتے نہیں ہیں شعلے

کہا جاتا ہے کہ رباعی کی ترتیب اور اس کا بیان سنجیدہ ہونا چاہئے۔ شاعر موصوف کی رباعیات میں ہمیں ہرجگہ سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔دوسری اصناف سخن کی طرح رباعیات بھی بہت پہلے سے ہی کہی جارہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قدیم زمانے میں رباعیات صرف ضمنی طور پر لکھی جاتی تھیں۔ابتدائی دَور میں جو رباعیات لکھی جاتی تھیں ان کے لئے نہ کسی خاص موضوع کا انتخاب کیا جاتا تھا اور نہ ہی رباعیات کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے رباعیات کی طرف لوگ متوجہ ہونے لگے۔ جیسے جیسے اس صنف کی طرف شعرائے کرام نے دلچسپی لینا شروع کی ویسے ویسے موضوعات بھی سامنے آنے گے۔صدیقی صاحب نے اپنی رباعیات میں موضوع کی مناسبت کا بھرپور خیال رکھا ہے ؎

دنیا بنے انسان کے لئے جائے اماں
دنیا میں کہیں بھی نہ ہو خون انساں
محفوظ ہو ہر شخص کی حرمت کو شر
انسان کو اب کوئی نہ سمجھے حیواں

ماں کو دُنیا کی سب سے بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والے، ماں کو اونچا درجہ دیتے ہیں۔قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارکہ ہے: اللہ تعالیٰ نے ماں کی نافرمانی کرنے اور تکلیف دینے کو حرام قرار دیا ہے۔شاعر موصوف نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہے ماں کی اطاعت ہی اطاعت سچی
ہے ماں کی اطاعت کے لئے حکم نبیؐ
آتا ہے مجھے جب بھی عبادت کا خیال
لگ جاتا ہوں خدمت میں اپنی ماں کی

انیسؔ اور دبیرؔ اُردو ادب کے مشہور ومعروف شاعر تھے۔ دونوں مرثیہ گوشعرا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان دونوں شعرا نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ان کا خاص مقصد تھا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ان کی مجلس میں جب لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا تو سامعین کا دھیان اپنی طرف کھینچنے کے لئے وہ رباعیاں پڑھتے تھے۔ جہاں تک صدیقی صاحب کی رباعیوں کا سوال ہے تو انہوں نے اس لئے رباعیاں نہیں لکھیں کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں بلکہ ان کی رباعیاں اِس قدر اثر انگیز ہوتی ہیں کہ قارئین خود بخود مائل ہوجاتے ہیں ؎

دروازے سے پہچان مٹادی جائے
دیوار سے تصویر ہٹا دی جائے
یادوں کے پلندے جو رکھے ہیں گھر میں
آگ ان میں خموشی سے لگا دی جائے

■

پھولوں کو سر شاخ ہنسایا ہم نے
اُمید کے غنچوں کو کھلایا ہم نے

ہم بادِ بہاری کا ہیں جھونکا کوثرؔ
ماحول میں خوشبو کو سجایا ہم نے

حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی کے یہاں اخلاقی رباعیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شاعر نے بھی خوبصورت الفاظ کو رباعیوں کے سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ؎

الفاظ سے اُلفت کے گہر برساؤ
تہذیب کے پھولوں سے فضا مہکاؤ
جینے کا سلیقہ تو گلوں سے سیکھو
ہر حال میں کانٹوں سے نبھائے جاؤ

■

کہسار کے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
پتھر سے شرارے بھی نکل سکتے ہیں
ہر لمحے سے پیدا وہ ہزاروں لمحے
تاریخ کے رُخ کو جو بدل سکتے ہیں

اُردو زبان ہندوستان کی نئی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی مٹی سے نکلی اور یہیں پل بڑھ کر جوان ہوئی۔ ہندی زبان بھی ہندوستان کی ہی پیداوار ہے۔ اس لئے اُردو ہندی کو دوسگی بہنیں قرار دیا گیا ہے۔ اُردو زبان مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ شاعر موصوف نے کہا ہے کہ ؎

تہذیب و تمدن کی علامت ہے یہ
اجداد کی زرّیں وراثت ہے یہ
سنگم ہے محبت کے یہ دریاؤں کا
اک مشترکہ زندہ روایت ہے یہ

اِس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کی تمام زبانوں سے اچھے الفاظ چُن کر بنی ہے۔ افسوس اس بات کا کہ اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ زبان کی چمک پھیکی پڑنے کا احساس شاعر موصوف کو بھی ہے تبھی تو اُنہوں نے کہا ہے

ہے مادرِ تہذیب و تمدن یہ زبان
تہذیب و ادب ہے جہاں اُردو ہے وہاں
اُردو کو رکھیں زندہ نہیں تو کوثرؔ
تہذیب سے ہوجائے گا محروم جہاں

شاعر موصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے موضوع کی مناسبت کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ اُنہوں نے جن موضوعات کو سامنے لایا ہے وہ بالکل نئی نرالی کیفیت عطا کرتی ہے۔ موصوف جس موضوع کو رباعی کے سانچے میں ڈھالتے ہیں پوری بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

کوثرؔ صاحب نے رباعی گو شعرا کے خیالات کا بھی خیال رکھا ہے۔ حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی اخلاقی رباعیات لکھتے تھے۔ کوثر صدیقی نے بھی اخلاقی اقدار کو اپنی رباعیات میں جگہ دی ہے ؎

ہر شخص سے ہر شخص محبت سے ملے
تہذیب ادب اور متانت سے ملے
انسان ملے جب بھی کسی انسان سے
لازم ہے کہ تہذیب و شرافت سے ملے

موت زندگی کا سب سے خوبصورت انعام ہے۔ زندگی موت پہ ٹکی ہے۔ اگر ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہوتی تو شائد زندگی میں وہ لذّت نہیں ہوتی۔ زندگی اور موت کے بیچ کتنے فاصلے ہیں، اس کا خلاصہ میر تقی میرؔ نے کچھ اس طرح کیا ؎

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کے تبسم کیا

صدیقی صاحب نے زندگی اور موت کے بیچ کے فاصلے کا نقشہ یوں کھینچا ہے

گلشن میں مہکنے کا ملا کچھ نہ صلہ
سر پر بھی پڑا پھول تو مٹی میں ملا
معلوم تھا انجام تبسم گل کو
بے خوف سر شاخ مگر خوب کھلا

البتہ اس رباعی میں سے بیچ کے دونوں مصرعے نکال بھی دیئے جائیں تو معنی و مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا جبکہ رباعی کے چاروں مصرعے مرکب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ آخری مصرعہ میں پوری بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ شاعر موصوف کا کمال دیکھئے کہ آخر کے دونوں مصرعے کو نکال دیا جائے تو بھی اس کا مطلب آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ کی آخری رباعی میں شاعر نے کہا ہے ؎

فانوس رباعی میرا روشن رکھنا
آباد یہ تخلیق کا گلشن رکھنا
مرجھائیں نہ یارب مرے خوابوں کے گلاب
مہکا گلِ تعبیر سے آنگن رکھنا

اِس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعر موصوف اپنے کلام کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوتے ہیں اور اس کی چٹک و مہک ماحول کو معطر کردیتی ہے۔ اسی طرح ''فانوس'' کی رباعیاں قارئین کرام کے دلوں کو مہکاتی رہیں گی۔

☆☆☆

اشراق حمزہ پوری کی رباعی گوئی
(''دائرہ'' کے تناظر میں)

تنویر اختر رومانی (جمشید پور)

اشراقؔ حمزہ پوری جواں سال شاعر ہیں۔ یہی نہیں، ان کی شاعری میں بھی جواں سالی نظر آرہی ہے۔ یہ اسی حمزہ پور کے شاعر ہیں جہاں قوسؔ حمزہ پوری اور ناوک حمزہ پوری جیسے نابغۂ روزگار شعرا کا مسکن رہا ہے۔ بلکہ یہ بات کہنا اقرب الی الحقیقت ہے کہ اشراقؔ، حضرت قوس حمزہ پوری کے نسبی اور ادبی خانوادے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت ناوک حمزہ پوری سے انہیں شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ ان دونوں کی ادبی صحبت سے اشراق خوب فیضیاب ہوئے ہوں گے۔ ان کے شعری مجموعے ''دائرہ'' کی خوش نصیبی ہے کہ اس کا مقدمہ حضرت ناوک حمزہ پوری نے ہی قلمبند کیا ہے۔

''دائرہ'' اشراق حمزہ پوری کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ اس دائرے میں صنف شاعری کے کئی انواع واقسام جمع کر دئے گئے ہیں۔ مثنوی اور کہہ مکرنی کے سوا تقریباً سبھی شعری اقسام میں اس جواں سال شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور خوب کی ہے۔ حمد، نعت، پابند نظمیں، آزاد نظمیں، قطعات، رباعیات، ماہیے، دوہے، ترائیلے، غزلیں وغیرہ۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد رباعیات کی ہے۔ اس مجموعے میں کل سو رباعیات شامل ہیں۔

شعری ذوق رکھنے والے اور صنف شاعری سے شغف رکھنے والے فاضل قارئین اس امر سے ضرور واقف ہوں گے ہوں کہ شاعری میں رباعی گوئی ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اس کے لئے بحرِ ہزج کی مختص چوبیس بحور واوزان ہیں۔ ان بحور کے سوا کسی بھی بحر کو شاعری کی دوسری اقسام میں استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن رباعی میں نہیں۔ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے (آخری) مصرعوں کو ہر حال میں ہم قافیہ ہونے کا التزام کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ صنف شاعری کی کوئی اور قسم ہوسکتی ہے، رباعی نہیں۔ رباعی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کے چاروں مصرعے ایک ہی بحر میں بھی ہوسکتے ہیں اور چار مختلف بحروں میں بھی۔

یوں تو ہر شاعر دو چار، دس بیس رباعیاں تو لکھ ہی لیتا ہے۔ لیکن کثیر تعداد میں رباعیاں لکھنے کی مثال خال خال ہے۔ بعض شعرا کے تو خالص رباعیات کے مجموعے منظر عام آچکے ہیں لیکن ان کی بھی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ خالص رباعیات کے چند معروف مجموعے یہ ہیں: رباعیاتِ میر انیس، رباعیات (تلوک چند محروم) ، رباعیاتِ امجد (مولوی سید احمد حسین امجدؔ)، رباعیاتِ اکبر (اکبر الہ آبادی)، رباعیاتِ اسماعیل (اسماعیل میرٹھی)، روپ (فراق گورکھپوری)، رباعیاں (ظفر کمالی)، شہابِ سخن (سید شاہ طلحہ رضوی برق)، نکاتِ اربع (نادم بلخی)، خزینۂ رباعیات (شفق عماد پوری)، چہار آئینہ (علقمہ شبلی)، ورق ورق شمیم (شمیم انجم) چہار عالم (معراج احمد معراج)، باغِ صنوبر (عاصم شہنواز شبلی) وغیرہ۔ خود اشراق کے استاذ حضرت سید غلام السیدین ناوک حمزہ پوری کا ایک مجموعہ ''ہزار رنگ'' ہے، جس میں ایک ہزار رباعیاں شامل ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔ ناوک حمزہ پوری نے اپنی حیات کا غالب حصہ نہ صرف رباعیاں لکھنے میں صرف کیا ہے بلکہ فن رباعی پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔

شاید یہی سبب ہے کہ اشراق حمزہ پوری نے ناوک حمزہ پوری کی وراثت کا تحفظ کرتے ہوئے اس فن میں زیادہ محنت کی ہے۔ اشراق لائقِ تحسین ہیں کہ اتنی کثیر تعداد میں رباعیات لکھ ڈالیں۔ نیز ایک خاص الخاص بات یہ ہے کہ ان سو میں سے چھ رباعیات ایسی ہیں جن میں موصوف نے ۲۴ر کے ۲۴ر بحروں کا استعمال کیا ہے۔ یعنی ہر مصرعے میں ایک بحر۔ ہے نہ قابلِ تعریف؟

حمزہ پور، رباعیات اور اشراق حمزہ پوری کے تعلق سے حضرت ناوک حمزہ پوری نے ''تقدیم'' میں ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ میری نظر میں تو یہ صرف اس لیے بھی وقیع ہے کہ شیر گھاٹی میں جسے پروفیسر حسین الحق نے دبستان عظیم آباد کا ایک ذیلی مرکز قرار دیا تھا بلکہ غالباً اشراقؔ حمزہ پوری کے بعد ان اصناف کے جاننے والے بھی شیر گھاٹی میں عنقا ہوجائیں گے۔ تو سوال کھڑا ہوتا ہے کہ اشراق حمزہ پوری کو یہ بصیرت کہاں سے حاصل ہوئی۔ کہنا نہ ہوگا کہ آپ یعنی اشراق حمزہ پوری جو حضرت علامہ قوس حمزہ پوریؒ کے نواسا ہیں یہ پہلی بڑی خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے حمزہ پور ان کا وطن ہے اور حمزہ پور کے سادات کو حضرت قرینؔ شیر گھاٹوی نے اپنی

تصنیفِ لطیف میں شیر گھاٹی کے اشراف کا استاد کہا ہے۔ چنانچہ یہ بات بلکہ خصوصیت آج تک برقرار ہے کہ حمزہ پور کے بیشتر حضرات فطری طور پر موزونیٔ طبع کی دولت سے مالا مال ہوئے ہیں۔ یوں تو اشراق حمزہ پوری کو بھی فطری طور پر یہ دولت حاصل ہوئی ہے ورنہ رباعیات کا مشکل فن جس کا جنازہ ترقی پسندی کی تحریکات نے نکال دیا تھا گو دوبارہ پوری شان کے ساتھ پوری اردو دنیا میں وقار کے ساتھ زندہ کرنے کا سہرا حمزہ پور کے سر ہے۔''

(ناوک حمزہ پوری: ۲۷؍اگست ۲۰۱۵)

یوں تو اشراق حمزہ پوری کے شعری مجموعے ''دائرہ'' میں قارئین کی کشش کے لئے کئی نظمیں اور غزلیں ہیں لیکن زیادہ پُرکشش رباعیات ہیں۔ اس لئے میں نے جائزے کے لئے ان کی رباعیات کا انتخاب کیا ہے۔

اشراق کی ان رباعیات میں معاشرتِ انسانی سے انسلاک رکھنے والے کئی موضوعات اور مضامین کا التزام کیا گیا ہے۔ ان میں کئی رباعیات حمدیہ اور نعتیہ ہیں، جن سے، ان کے حبِ الٰہی اور حبِ رسول کا اندازہ ہوتا ہے۔ بقیہ رباعیات میں نیک اور سچا مسلمان، دنیا، اردو، جہیز، ساون، حوصلہ مندی، اندھی عقیدت، رضائے الٰہی، زر پرستی، دوستی، دشمنی، شعر و ادب میں مردہ پرستی، کفر و شرک پر وار، قناعت کا سبق، تقدیر پر توکل، اتحادِ ملت، عصری چشمک، گندی سیاست، نفاق، خوفِ خدا، اقربا پروری، ڈھونگی پیر، تکبر، برادر واد، بدعقیدگی، مزار پرستی، اندھ بھکتی وغیرہ کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ چند ایک رباعیات اپنے اندر جمالیات کا بھی لمس رکھتی ہیں۔

آج ہم نے اردو کو سیاست زدہ کر دیا ہے جس کے سبب اس زبان کا بڑا زیاں ہو رہا ہے۔ اس کی طرف اشراق نے بڑی دردمندی سے اشارہ کیا ہے۔ جہیز کے حریصوں پر بھی زبردست وار کیا ہے۔ فی الوقت وطنِ عزیز میں ایک طبقے کی اندھ بھکتی کیا گل کھلا رہی ہے، اس سے ملک کا ہر فرد بشر اچھی طرح واقف ہے۔ اندھ بھکتی سے ملک اور اہلِ ملک کے نقصانات کی طرف شاعر نے کھل کر اشارہ کیا ہے۔ ایسے میں نئی نسل کو انھوں نے حوصلہ مندی کا سبق دیا ہے۔ انھوں نے رباعیات میں کئی نصیحتیں بھی کی ہیں، زر پرستی پر بھی وار کیا ہے۔ مردہ پرستی اور پیر پرستی پر نہ صرف وار کیا ہے بلکہ جاہل پیروں کے ڈھونگ کو بھی واشگاف کیا ہے۔ کفر و شرک سے بچنے کی جہاں تلقین کی ہے وہیں صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی دعا بھی کی ہے اور رضائے الٰہی نیز تقدیر پر توکل کا بھی سبق دیا ہے۔ جہاں انھوں نے گندی سیاست کو نشان زد کیا ہے وہیں مکر و فریب، حرص و ہوس، نفاق، اقربا پروری، شعرا و ادبا کی عصری چشمک پر بھی کاری ضرب لگانے کی سعی فرمائی ہے۔

ان رباعیات کی ایک اور بھی خوبی ہے کہ ان میں سادہ، عام فہم اور سلیس الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ادق الفاظ نیز عربی اور فارسی زدہ اضافت و تراکیب سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔

غرض ان رباعیات کے بین السطور میں ہم اشراق کو ایک حوصلہ مند، دردمند، نرم دل، نرم خو، صالح، نیک طینت، خدا پرست، انسانیت نواز شخص کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بانگی کے طور پر مٹھی بھر رباعیات پیش کر رہا ہوں۔ آپ بھی ان کی قرأت کریں اور محسوس کریں کہ میں نے ان رباعیات کے تعلق سے جو دعوے کیے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں۔

بگڑی ہوئی صورت کو بنا لیتا ہے
اللہ کی نظروں میں وہ جا لیتا ہے
اک قطرہ جو گرتا ہے ندامت کا کبھی
اللہ کی رحمت کو مزا لیتا ہے

■

ایک شوخ گلاب کی کلی ہے اردو
آغوشِ بہار میں پلی ہے اردو
خود اپنی حفاظت کا کیا نظم اس نے
لشکر کو لیے ساتھ چلی ہے اردو

■

ہر بات کو ایمان کا درجہ دیں گے
شیطان کو انسان کا درجہ دیں گے
مجبور تو ہیں مگر اتنا بھی نہیں
گوبر کو بھی بھگوان کا درجہ دیں گے

دعا گو ہوں کہ اشراق حمزہ پوری ایسی ہی مزید رباعیات کی تخلیق کریں اور امکان میں ہو تو اپنے استاذی محترم کی طرح خالص رباعیات کا ایک مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ کریں۔

☆☆☆

رباعیاتِ فریدؔ کی فکری و معنوی جہت

ارشاد آفاقی

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، اجس، کشمیر-193502، موبائل:7780911279)

اردو ادب کی تاریخ میں رباعی گوئی کا ذخیرہ اگرچہ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ وہ اس لیے کہ اس صنف کی فنی و تکنیکی مشکل پسندی ہونے کے باعث بہت کم شعراء نے اس کو منہ لگایا اور بعض نے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے کچھ رباعیاں کہی۔ کیونکہ یہ صنف نظر کی وسعت، تخیل کی بلندی، شعور کی پختگی، شاعرانہ وجدان، حکیمانہ بصیرت، عمیق مطالعہ، وسیع مشاہدہ، زبان و بیان پر قدرت، شعری اسالیب سے آگہی، عروض سے واقفیت اور فنی ارتکاز کی متقاضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر عہد میں اس صنف پر طبع آزمائی ہونے کے باوجود اس کا تخلیقی تسلسل کبھی باقاعدگی سے قائم نہیں رہا۔ اس میں وحدتِ فکر، تسلسلِ خیال، قافیہ و ردیف کی پابندی اور چاروں مصرعوں کا مربوط ہونے کے علاوہ چوتھے مصرعہ کا قائم بذات ہونا از حد ضروری ہے۔ رباعی گوئی احترام اور اہتمام کا فن ہے اور شاعر کی قادرالکلامی اور زبان و بیان پر اس کی دسترس کا امتحان چاہتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں رباعی چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا ہنر اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔

اردو رباعی گوئی کے سنگلاخ میدان میں نئے انداز اور نئے شیوہ گفتار سے جس شاعر نے اپنے فکر و فن، تخیل و تخلیق اور اظہارِ ذات کے پھول کھلائے ہیں۔ وہ بلاشبہ دبستانِ جموں و کشمیر کے جوان مرگ شاعر ڈاکٹر فریدؔ پربتی (۱۴/ اگست ۱۹۶۱ء۔ ۱۴/ دسمبر ۲۰۱۱ء) ہیں۔ فریدؔ پربتی کا شمار ریاست کے ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے ان نمایندہ شعراء میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیت اور تخلیقی قوت سے اردو شاعری میں ناقابلِ فراموش اضافے کیے۔ کیونکہ ان کے اب تک آٹھ شعری مجموعے ''ابرِ تر'' (۱۹۸۷ء)، ''آبِ نیسان'' (۱۹۹۲ء)، ''اثبات'' (۱۹۹۸ء)، ''فرید نامہ'' (رباعیاں) (۲۰۰۳ء) ''گفتگو چاند سے'' (۲۰۰۵ء) ''ہزار امکان'' (۲۰۰۶ء)، ''خبرِ تحیر'' (رباعیاں) (۲۰۰۷ء)، ''ہجومِ آئینہ'' (۲۰۱۰ء) اور کلیات۔ ''ہزار امکان'' (۲۰۱۱ء) منظرِ عام پر آکر قارئین و ناقدین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اگرچہ فریدؔ پربتی نے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا، لیکن تنقید و تحقیق میں بھی انہوں نے ''شہ زور کاشمیری۔ حیات و فن (۱۹۹۲ء)'' ''انتقاد و اصلاح'' (۲۰۰۵ء)، ''مقدمہ صنفِ رباعی'' (۲۰۰۷ء) اور ''تنقیدِ رباعی'' (۲۰۱۱) لکھ کر اپنا لوہا منوایا ہے، اور درس و تدریس کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے جو رہتی دنیا تک یاد رہے گے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

> ''فریدؔ پربتی کے اندر، نظم و نثر کی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ یہ بات قابل قدر ہے کی فریدؔ مشکل اصناف اور علمی و ادبی مشاغل سے گہرا شغف رکھتے ہیں''۔[۱]

ان کے ادبی ذخیرے پر نظر ڈالتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ فرید پربتی نے اپنی مختصر زندگی میں اردو ادب کو کمیت و کیفیت یعنی ہر دو اعتبار سے اضافہ کیا۔ ان کے مرنے سے عموماً اردو ادب میں اور خصوصاً ریاست کے ادبی منظر نامے میں جو خلا پیدا ہوا، اس کا پُر کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، محقق، دانشور، مدرس اور منتظم تھے، گویا وہ اپنی ذات میں ایک دبستان یا انجمن سے کم نہ تھے۔ یہاں پر اُن کے کس کس پہلو اور گوشے کو اجاگر کیا جائے، اسکے لیے تو باقاعدہ ایک اکیڈمی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں صرف ان کی رباعی گوئی کے متعلق گفتگو کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ تاکہ ان کے فن و فکر کا ایک پہلو منور ہو جائیں۔

رباعی کے بارے میں عام خیال ہے کہ اسے صرف حکمت و موعظمت اور اخلاقی اور صوفیانہ مضامین تک محدود رکھا گیا، بعد کے مقتدر شعراء انیسؔ، دبیرؔ، جوشؔ، امجدؔ، فراقؔ، رواںؔ، صادقینؔ، یگانہؔ، محرومؔ اور حالیؔ وغیرہ نے نہ صرف اس کلیے کو توڑنے کی کامیاب سعی کی ہے بلکہ انھوں نے رباعی کو معاملاتِ خلوت سے جلوت، جمالیات سے جدلیات، عاشقانہ جذبات سے صوفیانہ خیالات، رثائیت سے مابعد الطبعیات، مذہب سے سیاست وغیرہ موضوعات سے آشنا کیا ہے۔ ان قادرالکلام رباعی گو شعراء کے ساتھ ساتھ فریدؔ پربتی کی مساعی جمیلہ کا بھی براہِ راست عمل دخل ہے۔ کیونکہ ان کی رباعیاں

بھی متنوع فنی وفکری، معنوی وموضوعی جہت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو نہ کسی صنف میں قید رکھا اور نہ کسی موضوع میں، بلکہ ان کے یہاں رنگارنگ موضوعات ملتے ہیں۔ بقول انکے ''میں نے صنفِ رباعی کو ان موضوعات سے باہر نکالنے کی کوشش کی ہے جن کی وجہ سے یہ صنف کافی محدود ہوکر رہ گئی تھی''۔ ۲؎

فریدؔ پربتی رباعیوں میں ہی نہیں بلکہ ان کی پوری شاعری میں حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ اشعار وافر تعداد میں ملتے ہیں۔ یوں حمد اور نعت روایتی اصناف ہیں۔ مگر فریدؔ پربتی کے غیر روایتی اسلوب نے ان کو چار چاند لگا دیا ہے اور قارئیں کے دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی ان کا انفراد اور امتیاز ہے۔

فریدؔ پربتی مکمل طور روایت پرست شاعر ہیں نہ روایت سے باغی، بلکہ ان کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے۔ جو شعری روایت سے واقفیت بھی رکھتے ہیں اور کلاسیکی شاعری سے حسبِ ضرورت استفادہ بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت سے بھی رباعی جیسی مختصر اور مشکل صنف میں جوہر دکھلائے۔ ''فرید نامہ'' میں انہوں نے حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ رباعیوں کے علاوہ ''ابتدائیہ'' ''شہر آشوب'' اور ''سرمد کے مزار پر'' کے عنواں سے بھی رباعیاں کہی۔ یہ طریق کار روایت سے انحراف جدت وندرت کا مظہر ہے۔ درج ذیل رباعیات میرے دعویٰ کی دلیل ہے۔

ابتدائیہ شہر آشوب

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
بڑھتا ہے اب احساسِ زیاں روز بروز
میں حُسن ہوں اور حُسن کی جاگیر سے ہوں
جلتا ہے اِک آسودہ مکاں روز بروز

■

کہتے ہیں مجھے یُوسفِ ثانی اے دوست
بدلا ہے چمن، بدلا ہے گلچیں کا مزاج
کنعاں سے نہیں، وادی کشمیر سے ہوں
وابوں کا یاں اُڑتا ہے دھواں روز بروز

سرمدؔ کے مزار پر

اے شاہِ جنوں، تیرے عرفاں کو سلام
اے چاک جگر، اُس تنِ عریاں کو سلام
حشمت کا طلب گار نہ تھا جاہ پسند
غارت گریِ عیش وساماں کو سلام

فریدؔ پربتی کی رباعیوں میں اظہارِ ذات بھی ہے اور اظہارِ کائنات بھی، زمانے کی شکایت بھی ہے اور اپنے حسن وجمال کا اعتراف بھی۔ ابتدائیہ کے تحت فریدؔ پربتی نے اپنے حسن وجمال اور روشن چہرے کا اظہار بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے آپ کو یوسفِ ثانی دُہرایا ہے۔ اس کو اگر شاعرانہ تعلّی بھی ماں لیا جائے تو بھی فریدؔ پربتی کو یہ تعلّی زیب دیتی ہے۔ اگرچہ فریدؔ پربتی یوسفِ ثانی نہیں ہے لیکن وہ یوسفِ کشمیر ضرور ہے۔ کیونکہ وہ قدوقامت میں واقعی پربت اور خدوخال میں فرید تھے۔ دوسری رباعی میں موجودہ دور کے دردوکرب کو اور آخری رباعی کا تعلق شہنشاہ رباعی جناب شیخ سرمدؔ کے ساتھ ہے۔ فریدؔ پربتی نہ صرف سرمدؔ کے قائل ہیں بلکہ عملی طور پر اپنی فنکارانہ صلاحیت اور شاعرانہ بصیرت سے سرمدؔ کو دلفریب انداز میں خراجِ تحسین اور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بقول حقانی القاسمیؔ:

''سرمدؔ کے مزار پر'' فریدؔ پربتی کی بہت ہی پُراثر تخلیق ہے۔
اس میں شاعر نہیں بلکہ ایک صوفی کا دل دھڑک رہا ہے''۳؎

فریدؔ پربتی رَوشِ عام پر چلنے سے گریز کرتے اور پیش رواؤں کی تقلید سے پرہیز۔ انہوں نے اپنی ایک علاحدہ راہ اختیار کی، جس کے ڈانڈے ایک طرف کلاسیکی دبستان سے ملتے ہیں اور دوسری جانب جدید شعری روایت سے۔ اِس لیے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری میں قدیم وجدید کا ایک حسین وجمیل امتزاج ملتا ہے۔ جس سے وہ ایک منفرد لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

''فریدؔ پربتی کی شاعری اظہارِ ذات کی شاعری ہے۔
اُن کی غزلیں اور رباعیاں اپنے مخصوص لہجے اور منفرد
اسلوب کی وجہ سے دور سے پہچانی جاسکتی ہیں فرید پربتیؔ کا
تعلق اگرچہ جدید ترنسل سے ہے مگر اُن کو اردو کی کلاسیکی
شاعری کا عرفان حاصل ہے۔ جسکی وجہ سے اُن کی
شاعری میں قدیم وجدید کا ایک خوبصورت امتزاج پیدا
ہوگیا ہے''۴؎

فریدؔ پربتی ہر صنفِ سخن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں مگر رباعی گوئی سے ان کو ایک خاص لگاؤ اور اُنس تھا۔ کیونکہ انھوں نے ابتداء ہی سے کچھ رباعیاں کہی، جو ان کے ابتدائی شعری مجموعوں میں شامل ہے مگر آگے چل کر خالص رباعیوں پر مشتمل دو مجموعے ''فرید نامہ'' اور ''خبرِ تحیر'' منظرِ عام پر لاکر یہ

ثابت کیا کہ جو رباعیاں انھوں نے ابتداء میں کہی وہ ضمناً یا منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں کہی بلکہ اس قاتل صفت صنف کو بطور خاص اپنانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اردو رباعی گوئی کے ایک اہم ستون تصور کیے جاتے ہیں۔ اس دعوے کا ثبوت یہی کافی ہے کہ ملک کے مشاہیر ادب نے ان کی رباعی گوئی کا دل کھول کر استحسان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی رباعیوں میں منفرد لب ولہجہ، رنگ وڈھنگ، مزاج ومنہاج اور شعری اسلوب وشعری لفظات کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی، معنوی گیرائی اور فنی لوازم کی پوری پابندی نظر آتی ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ:

''فریدؔ پربتی کے اظہار میں ایک بے تکلفی کا جو احساس ملتا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی اُن کے مزاج کو راس آئی ہے اور وہ اس سنگ صفت صنف کو پگھلانے اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں''۵؎

فریدؔ پربتی نے شعر وفن کے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی کمٹ مینٹ (Commintment) نہیں کی۔ کیونکہ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مکمل طور روایت کا پرستار نہ جدیدیت کا قلم کار، کسی مذہب کا پیروکار نہ کسی مسلک کا دلدار، کسی رجحان کا قائل نہ کسی تحریک سے مائل، کسی ازم کا عاشق نہ کسی نظریہ کا مشتاق، کسی قوم کا پابست نہ کسی سرحد کا پابند۔ بلکہ خالص فنکار اور تخلیق کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود کو کسی ایک موضوع یا کیفیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ حیات وکائنات کو جس رنگ وروپ میں دیکھا، پرکھا، سمجھا اور محسوس کیا۔ اسی انداز میں انھیں شعری قالب میں ڈھالا۔ گویا انھوں نے اپنا کلیجہ کاغذ پر رکھا دیا۔ اسی لیے ان کی یہ صدائیں مٹھی بھر خوشحال افراد کے دل بہلانے کا ذریعہ نہیں بنی، بلکہ سینکڑوں مجروح دلوں کی ندا بن گئی ہے۔ مثلاً

بے رنگ ہے رنگوں کی کماں میرے لئے
ہر حال میں پیچھے ہی رہے جاتے ہیں
پیدا بھی یہاں پر ہے نہاں میرے لئے
جذبات میں لیکن نہ بہے جاتے ہیں

■

وہ پھول ہوں جس کا نہیں کوئی موسم
اِک وہ کہ نہیں پھول گوارا ان کو
یکساں ہے بہار اور خزاں میرے لئے
اک ہم ہیں کہ خنجر بھی سہے جاتے ہیں

فریدؔ پربتی سدا نئے نئے اور تازہ موضوعات کی تلاش میں رہتے تھے اور انھیں اپنے منفرد وممتاز شعری رویہ سے نظم کرتے ہیں۔ خود ان کا دعویٰ ہے

بازار کے معیار کو اب تول ذرا
خاموش ہے کیوں بول ذرا بول ذرا
تا زہ ہیں مضامین، نئی طرزِ ادا
اے فکرِ رسا بندِ قبا کھول ذرا

اس دعوے کے باوجود بھی اگر فریدؔ پربتی نے روایتی موضوع مثلاً حسن وعشق، دنیا کی بے ثباتی، زمانے کے گلے وشکوے اور پند ونصائح کو منہ لگایا، تب بھی وہ اپنے دلربا انداز اور منفرد رنگ وآہنگ سے ان کو جاذبِ نظر اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ درج ذیل رباعیات ملاحظہ ہوں:

دل میں لئے اک چاہ میں واپس آیا
اب کوئی بہانہ نہیں رونے کے لئے
کھینچوں گا فقط آہ میں واپس آیا
آنکھوں میں رہا نہ اشک دھونے کے لئے

■

اب چھوڑ دیا مرنا کس پر میں نے
سب خواب تو آشوب زمانہ نے لئے
اے زیست تری راہ میں واپس آیا
اب پاس مرے کچھ نہیں کھونے کے لئے

بہرحال فریدؔ پربتی کی رباعیوں کے موضوعات دوسرے شعراء کی طرح متعین ومخصوص نہیں۔ ہر قسم کے مضمون کو ادا کیا گیا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں تقریباً سات سو سے زاید رباعیاں ہونگی۔ کسی میں حمد ہے تو کسی میں نعت، کسی میں مناجات ہے تو کسی میں شاعرانہ تعلّی، کسی بھی اخلاقی قدروں کی ترجمانی ہے تو کسی میں اصلاحی مقصد، کسی میں مذہبی عقائد ہے تو کسی میں عاشقانہ جذبات کسی میں عصری مسائل ہے تو کسی میں شہر آشوب، کسی میں صوفیانہ خیالات ہے تو کسی میں ہجر ووصال کی حکایات کسی میں مناظر فطرت کی منظر کشی ہے تو کسی میں تجربات کی دلچسپی، کسی میں حیات کا درد وغم اور کسی میں کائنات کا کرب واحساس۔ غرض ان کی رباعیوں میں موضوعات کی رنگا رنگی اور بوقلمونی شاعرانہ بلندی، فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کا اچھا برتاؤ ملتا ہے۔ جو ان کا خاصہ ہے اور ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ بقول محمد ارشد

''فریدؔ پربتی کی رباعیاں بھی متنوع اور ہمہ جہت موضوعات کی حامل ہیں۔ انہوں نے اسے کسی خاص موضوع سے مختص نہیں کیا، بلکہ اسے گوناگوں موضوعات کے لیے

استعمال کیا ہے۔انہوں نے حمدیہ رباعیاں بھی کہیں ہیں صوفیانہ اوراخلاقی موضوعات پربھی اظہارخیال کیا ہے۔حسن عشق کے موضوعات کوبھی برتا ہے اس کے علاوہ ان کی رباعیوں میں عصری اورتازہ حسیت کاعنصربھی نظرآتا ہے'' ۶؎

فریدؔ پربتی نے دنیوی رشتوں کونا پائیدار کہہ کران سے ناطہ نہیں توڑااور نہ دنیااوراسکی حقیقت کوفانی جتا کراس سے بےزاروبےنیاز ہوئے۔ بلکہ وہ زندگی بسر کرتے تھے چاہےغم ہو یا خوشی، تلخی ہو یاتندی، دراصل وہ صوفی تھےان کوخداورسولؐ پریقین محکم ہےاور یہ بھی جانتے تھے کہ دنیاامیدوبیم پرقائم ودائم ہے۔اس لیے وہ دنیوی زندگی کوسنوارنے اورنکھارنے کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھی فکرکرتے نظرآتے ہیں۔مثلاً

اتمام توقع ہے فقط خودکامی
رشتوں کی ہے نوعیت یاں ہنگامی
بیٹھے ہیں تعدی پہ کرباندھ کے سب
نے دوست زمانہ ہے نہ دنیا حامی

فریدؔ پربتی کی رباعیاں جہاں ان گنت دُکھی انسانوں کی آواز ہے، جو شخص مسائل، حالات کی تلخی اورانسانی اقدارکی شکست وریخت سے چکناچور ہوتے ہیں وہاں اسے سورج کی کرنوں کی طرح امن وامان، سماج کی تبدیلی اورحالات کے بدلاؤ کی امید ہے۔اوروہ اس بات کےمنتظرہے جب چار سمت تاریکی ختم ہوجائے گی،ظلمت مٹ جائے گی، اندھیرادورہوجائے گا۔ خوشحالی، امن وامان کادورپھرآجائے گا۔ملاحظ ہورباعی ؎

دنیا نئے سانچے میں ڈھل جائے گی
ہاں فطرت آدم سنبھل جائے گی
حالات بدل جائیں گے پھر اس کے بعد
اس ظلم کی بنیاد بھی بدل جائے گی

جہاں فریدؔ پربتی کی متنوع رباعیوں کو باعتبارموضوع کئی خانوں میں رکھا جاسکتا ہے۔وہاں ان کی رباعیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا سیدھادل میں اترنے والا رلبرباانداز بیان ہے۔وہ اپنی رباعیوں میں موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا فنکارانہ استعمال کرتے ہیں۔جس کی بدولت ان کے کلام میں دلکشی ودلنشی کے ساتھ ساتھ معنوی تہہ داری بھی پیدا ہوتی ہے۔حالانکہ وہ الفاظ برتنے کا گر،صنعات کے استعمال کا ہنراور دوسرے شعری حربوں سے واقف ہیں۔مگرانھوں نے ہمیشہ عام فہم الفاظ کو ترجیح دے کرشعرمیں شعریت پیدا کرکے ناقدین وقارئیں سے دادِتحسین کے جواہروصول کیے۔ان کی رباعیوں میں جو بےساختگی اور روانی پائی جاتی ہےاس کے ڈانڈے بغیرکسی زورزبردستی کے سہل ممتنع سے مل جاتے ہیں۔ان کے یہاں زبان وبیان اوراسلوب کاوہ حسن پایا جاتا ہے جورباعی کے مزاج ومنہاج کے لئے موزون ومناسب ہے۔مثلاً

آئے گا فلک پروہ ستارا واپس
یہ چیز ہے کیا آئے گا سارا واپس
افسوس اس اک بات کا ہے دنیا میں
آنا نہ مجھی کو ہے دوبا را واپس

فریدؔ پربتی کی رباعیاں چاندکی اُن پرنورکرنوں کی طرح ہیں جن سے روح وجسم دونوں کوآرام اورسکون پہنچتا ہے۔ان کی رباعیاں فکروفن، معنی وموضوع، اسلوب اورانداز بیان ہراعتبارسےمنفردوممتاز ہے۔مگرعلی الرغم اس کےعلی احمد جلیلی، روف خیرؔاورحمادانجم نے ان کی بعض ابتدائی رباعیوں کوفنی وتکنیکی (وزن۔قافیہ۔تذکروتانیث) اعتبار سے ناقص قرار دیا۔مگر فریدؔ پربتی کو زبان وبیان اورعروض وآہنگ پرعبور حاصل تھا۔ وہ فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔اورانھوں نےفن رباعی پرایک مکمل کتاب بعنوان''مقدمہ صنفِ رباعی''تسویدکرکے رباعی کے ناقدین میں بھی اپنانام درج کروایا۔پھروہ ان نقائص کے شکارکیوں ہوئے۔شائدوہ شعرمیں وزن وقافیہ کے بجائے خیال وجذبہ کوترجیح دیتے تھے۔بقول ان کے

''اگرچہ میں زبان اورعروض کے بنیادی نکات سے حتی الوسع واقفیت رکھتا ہوں۔مگرمیں نے اپنی عروض دانی کواپنی شاعری پرحاوی ہونےنہیں دیا۔ بلکہ بسا اوقات کسی سقم سے واقفیت رکھنے کے باوجود اُسکو ویسے ہی رہنے دیا۔ کیونکہ میرے نزدیک شعریت ہی شاعری کی اصل روح ہےاورلفظی وفنی دروبست ثانوی حیثیت رکھتی ہے'' ۷؎

فریدؔ پربتی کے علاوہ اردو کے مقتدرناقدین نے بھی ان کی عرض دانی، رباعی کےاوران پران کی گرفت اورفنی باریکیوں سےان کی واقفیت کااعتراف کیا ہے۔دورِحاضرکے مایہ نازنقاداورماہرعروض شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں

''فریدؔ پربتی کی رباعیوں میں گہرائی بھی ہےاورگیرائی بھی، بلکہ انھوں نے رباعی کے تقریباً تمام اوزان میں رباعیاں کہی ہیں'' ۸؎

وہاب اشرفی جیسے بلند پایہ نقادبھی رقمطراز ہیں:

''رباعی گوئی ایک خاص فنی صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے۔عروضی اورمعنوی دونوں ہی سطحوں سے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ فریدؔ پربتی ان دونوں حیثیتوں سےGenuine نظرآتے ہیں''۔۹؎

اگروہ اپنی شاعرانہ قوت کا خوداعتراف نہیں کرتے تھے۔تب بھی ان

کی مختصر ادبی زندگی (ابرتر 1987ء سے لیکر ہجوم آئینہ 2010 تک) اس بات کی گواہ ہے کہ اس نے یقیناً مختصر مدت میں جو ادبی سفر طے کیا ہے۔ وہ کسی صاحبِ ذی علم وذی شعور سے پنہاں نہیں ہے۔ فریدؔ پربتی پر ہی کیا موقوف، لیکن اب اردو کے بڑے بڑے دانشوروں اور ادیبوں نے بھی ان کی ادبی خدمات کی عظمت واہمیت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ بقول پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی:

> ''فریدؔ پربتی اردو ادب کے اُن پرستاروں میں سے ہیں جنہوں نے بیک وقت شعر ونثر دونوں میں اپنی جولاءِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہماری ادبی روایت میں Versatility کی مثال زیادہ نہیں ملتی۔ فریدؔ پربتی کو پڑھ کر خلیل الرحمن اعظمی صاحب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ جنہوں نے بیک وقت ایک بہت اچھے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی۔ خلیل صاحب کے ساتھ فریدؔ کا ذکر یوں بھی مناسب لگتا ہے کہ دونوں نے غزل سے نسبتاً زیادہ سروکار رکھا ہے لیکن نظم بھی کہی ہے اور نثری مضامین کی حد تک صرف ادبی تنقید لکھی ہے۔ فریدؔ نے رباعیات بھی لکھیں جس کے فنی وتخلیقی تقاضے مشکل سمجھے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ فریدؔ پربتی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ جزوقتی ادیب یا شاعر نہیں بلکہ مسلسل اور لگاتار وہ پورے انہماک اور تندہی کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ اپنے اس سنجیدہ اور کسی قدر ہمہ جہت ادبی شغف کے اعتبار سے سرزمین کشمیر میں یقیناً وہ اس روایت کے امین اور پیرو کہے جاسکتے ہیں، جس کی اعلیٰ ترین مثال حامدیؔ کاشمیری ہیں'' ۱۰

فریدؔ پربتی کے فن وفکر اور شخصیت میں دلچسپی رکھنے والے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ انھوں نے شاعری کے جملہ اصناف کے علاوہ تحقیق وتنقید میں اتنے گرانقدر کارنامے انجام دیئے ہیں، کہ مقامی اور قومی سطح پر محبانِ اردو ان کی پذیرائی میں پیش پیش تھے۔ مگر انھیں زندگی میں کسی سرکاری ونیم سرکاری ادارے، اکیڈمی اور انجمن کی جانب سے کوئی ایوارڑ یا انعام نہیں ملا۔ حالانکہ وہ اس کے مستحق تھے اور ہے۔ مگر ان کے دوست افتخار امام صدیقی نے اپنے شہرہ آفاق رسالہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی (۲۰۰۵ء) میں فریدؔ پربتی کے حوالے سے ایک گوشہ شائع کیا۔ جبکہ ان کے شاگردِ رشید اور میرے ساتھی سلیم سالکؔ نے بھی ایک کتاب بعنوان ''فریدؔ پربتی: شعر، شعور اور شعریات'' مرتب کر کے اس فنکار کی اہمیت وعظمت کا احساس دلایا۔ اور ان کے مرنے کے بعد ماہنامہ ''شیرازہ'' سری نگر، کشمیر (۲۰۱۲ء) نے فریدؔ پربتی نمبر اور ان کے ایک اور شاگردِ عزیز محمد اقبال لون نے ان پر ''فریدؔ پربتی۔ شخص اور ادبی جہات'' (۲۰۱۴ء) کے عنوان سے ایک اور کتاب مرتب کر کے منصۂ شہود پر لائی۔ مگر مسبوق الذکر کُتب اور رسائل سے فریدؔ پربتی کے فن اور شخصیت کے تمام گوشے وانہیں ہو سکتے۔ کیونکہ فریدؔ پربتی۔ ادبی دنیا میں گراں بہا سرمایہ چھوڑ کر پربت کی گھنی چھاؤں میں ہم سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس بیش بہا ادبی سرمایہ کو کھنگال کر ان کے فکر وفن اور حیات وشخصیت کے بیشتر پہلو منور ہوجائیں گے۔ مگر یہ ادبی سرمایہ توجہ کا طلب گار ہے، تجزیہ کاروں سے بھی اور تنقید نگاروں سے بھی۔

سمجھو کہ لگاؤ گے فقط رٹ میری
پاؤ گے چہارسمت آہٹ میری
جب تجھ پہ کمالات کھلیں گے میرے
سجدوں سے سجا دوگے چوکھٹ میری

حوالہ جات:

۱)۔ تاثر از پروفیسر شمیم حنفی، مشمولہ: فریدؔ پربتی: شعر، شعور اور شعریات، مرتب: سلیم سالکؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۶ء صفحہ ۱۳۴

۲)۔ کشمیر میں صنفِ رباعی، فریدؔ پربتی، مشمولہ سالانہ بازیافت، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سری نگر، ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۶ء صفحہ ۲۱۴

۳)۔ پسِ نوشت از حقانی القاسمیؔ، مشمولہ: فرید نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۳ء ص ۱۳۰

۴)۔ تاثر از پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، مشمولہ: فریدؔ پربتی: شعر، شعور اور شعریات، مرتب: سلیم سالکؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۱۳۴

۵)۔ نئی شعری روایت کا امین۔۔۔۔۔ فریدؔ پربتی، محمد یوسف ٹینگ، مشمولہ فریدؔ پربتی: شعر، شعور اور شعریات مرتب سلیم سالکؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۱۱

۶)۔ فریدؔ پربتی کی رباعیاں۔۔۔ ایک جائزہ، محمد ارشد، مشمولہ ہزار امکان (کلیات) کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۱ء ص ۴۰۷

۷)۔ دیباچہ از فریدؔ پربتی، فرید نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۳ء ص ۱۸

۸)۔ بحوالہ: کشمیر میں صنفِ رباعی، فریدؔ پربتی، مشمولہ سالانہ بازیافت، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سری نگر ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۶ء ص ۲۱۴

۹)۔ دیباچہ از وہاب اشرفی، مشمولہ ہزار امکان (کلیات)، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۱ء ص ۱۲

۱۰)۔ فریدؔ پربتی۔۔۔ غزل کے آئینے میں، قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، مشمولہ فریدؔ پربتی: شعر، شعور اور شعریات مرتب سلیم سالکؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۴۲، ۴۳

☆☆☆

رباعی کے گلابوں کے روشن چراغ: طہور منصوری نگاہ

رئیس الدین رئیس
(علی گڑھ، یوپی)

مخصوص بحر و وزن کی پابند چہار مصرعی نظم رباعی ہمارے یہاں غزل کی مانند ہی عہد بہ عہد طویل مسافت سے گزرنے کے بعد ہم تک پہنچی ہے۔ سب سے پہلے اوئل اٹھارہویں صدی کے شمالی ہندوستان میں غزل ہی کی طرح مظہر جان جاناں، حاتم اور قائم نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بعد میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ نے بھی رباعی کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے سے متاثر ہو کر جب اپنی بقا اور تلاش معاش کے لیے دلی کے شعرا کو لکھنؤ کا سفر اختیار کرنا پڑا تو دبستانِ لکھنؤ کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ وہاں جو شاعر غزلیات میں اپنے ہنر و کمال کا مظاہرہ کر رہے تھے انہوں نے رباعی میں بھی اپنے فکر و فن کے جوہر دکھانے شروع کر دیئے اور اس طرح انیس، دبیر، انشاء، جرأت، صفی، مصحفی، یگانہ اور فانی وغیرہ نے اس صنفِ لطیف کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اور یہ بات بھی تاریخی اعتبار سے درست ہی معلوم ہوتی ہے کہ رباعی کے عروج کا زمانہ ۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۵ء ہے جنہوں نے رباعی کو اپنے سر کا تاج بنایا او رخود پر فخر کیا۔ ان میں ان لوگوں کے نام پیش کر دینا ہی کافی ہوگا جو اس طرح ہیں:

پنڈت برج نرائن چکبست، اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، اختر مہدی، امجد حیدر آبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سیماب اکبر آبادی اور جمیل مظہری وغیرہ۔ اور آج بھی جب کہ ہمارے شعرا جاپانی اور اطالوی بیرونی اصناف کی زلف گرہ گیر کے اسیر بنے ہوئے ہیں اور ہندی نژاد دوہا اور پنجابی ماہیا کی مانگوں میں سندر و بھرنا ہی باعث فخر سمجھتے ہیں، ایسے نازک دور میں بھی جو رباعی کے وجود کو استحکام و تحفظ عطا کیے ہوئے ہیں، ان میں ناوک حمزہ پوری، مامون ایمن، فرید پربتی، فاروق جائسی، نادم بلخی، موہن لعل رواں، افسر آغا، اسلم حنیف، کوثر جائسی، جمنا پرشاد راہی، رفیق شاہین، کوثر صدیقی، شاہ حسین نہری، راجندر موج، اصغر ویلوری، رئیس الدین رئیس اور طہور منصوری نگا کے نام سرفہرست ہیں۔ آنجہانی گیان چند جین اور جگناتھ آزاد نے بھی رباعی کے احیا اور فروغ میں زبردست کردار نبھایا تھا، جو لائق صد تحسین ہے۔

ابھی تک ہم رباعی کے تاریخی ارتقاء اور اس کی عصری صورتحال پر ہی غور کر رہے تھے۔ اب ذرا یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ رباعی آخر ہے کیا؟ رباعی ایران کے خانہ بدوش قبیلوں کا لوک گیت تھا جسے شعرا نے مستعار لے لیا۔ ویسے یہ بحر ہزج سے مشتق ہے جسے رودکی نے چوبیس اوزان سے متصف کر دیا۔ اوزان کی یہ نئی نئی شکلیں زحافات سے مرتب پائی ہیں۔ یہ ایک غنائی صنف ہے جسے سنطور اور اک تارا کے ساز پر گایا جا سکتا ہے۔ یہ صنف صوفیوں کی پسندیدہ صنف ہے اور وہ اس میں حمد و نعتیہ اور صوفیانہ خیالات مرتب کر کے خانقاہوں میں گا کر سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ یہ صنف چونکہ ہمارے یہاں ایران سے وارد ہوئی تھی، اس لیے ہماری رباعیوں میں بھی ایرانی اثرات کے تحت مذہبی، دینی اور اخلاقی مضامین کو ہی رباعی میں جگہ دی جاتی تھی جس سے بعد میں لوگ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگے لیکن اب باعتبار مضمون اس کے دامن میں وسعت پیدا ہو چکی ہے اور اب کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو رباعی کی گرفت میں نہ آ سکے۔

آج بہت سے شعرا رباعی میں تازہ کاری کا احساس دلا رہے ہیں ان میں ایک نمایاں اور اہم نام طہور منصوری نگاہ (پ: ۵/مئی ۱۹۴۷) کا بھی ہے۔ موصوف کا بنیادی اور اہم اختصاص ہے یہ ہے کہ دیگر شعرا کی طرح وہ بہت سی محبوباؤں کا حرم قائم کیے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی پہلی اور آخری محبوبہ اور ان کا پہلا پیار اگر کوئی ہے تو وہ صرف رباعی ہے اور وہ کسی دوسری صنف کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت کبھی کبھی ہی کرتے ہیں۔ بہت سے شاعر ایک ہی وزن پر ساری رباعیاں تخلیق کرتے ہیں لیکن نگاہؔ نے چھ رباعیوں میں چوبیس اوزان برت کر اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوالیا ہے۔ ان کی درج ذیل رباعی میں پہلا دوسرا مصرعہ ہم وزن ہے جبکہ تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے اوزان مختلف ہیں:

گردش کے یہی شام سویرے لے کر
جذبات میں رنگین سے گھیرے لے کر
کرتی ہے مشقت کا نیا دور شروع
اگنی کے گرد سات پھیرے لے کر

طہور منصوری نگاہؔ دقاقت، ثقافت اور الہام واہمال کے قریب ہوکر بھی نہیں گزرے۔ ان کی زبان سادگی، شگفتگی اور شیرینی ونغمگی سے عبارت ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور طرز نگارش بھی بڑی دلنشین ہوتی ہے اور ان کی بہت سی رباعیاں تو سہل ممتنع کے زمرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے محض دینی اور اخلاق ہی نہیں بلکہ آفاقی سطح کے تاریخی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، روحانی، سائنسی، نفسیاتی، رومانی، فلسفیانہ، متصوفانہ اور عام محنت کشوں کے عامیانہ معمولات، ان کے معاشی مسائل، ان کے رہن سہن اور ان کے غم وخوشی کے پیکر بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے اپنی رباعیوں میں ڈھالے ہیں اور اس طرح انہوں نے رباعی کو وسعت دے کر اسے کہیں سے کہیں پہنچادیا ہے۔

ان کا رباعیوں پر مبنی مجموعۂ کلام ''گلابوں کے چراغ'' (مطبوعہ: ۲۰۰۵) رباعی کے سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے درج ذیل رباعیات کے مجموعے بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں:

۱۔ طلسموں کے چراغ (مطبوعہ: ۲۰۱۲)

۲۔ جگنوؤں کے چراغ (مطبوعہ: ۲۰۱۵)

۳۔ شبِ چراغ (ایک ہزار ایک سو گیارہ رباعیات پر مشتمل، مطبوعہ: ۲۰۱۹)

مجموعۂ رباعیات کے ناموں کی اس فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نگاہؔ کی زندگی میں "چراغ" کا لفظ گہری معنویت کا حامل ہے۔ وہ اسے بصیرت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی رباعیاں اسی بصیرت کی افزونی کا ذریعہ ہیں۔ نگاہؔ نے ہندی آمیز رباعیاں تخلیق کرکے ان سے دوہوں کا کام لینے کی بھی کوشش کی ہے جس میں وہ ظفریاب وکامیاب نظر آتے ہیں۔ محنت کشوں کی زندگی اور ہندی دوہے کے مترادف ان کی دو رباعیاں مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل ہیں:

سنگھار میسر ہے نہ کنگھی چوٹی
دس کام کرے تب تو ملیں دو روٹی
انگوں کی کساوٹ کہ لہو پھوٹ پڑے
وہ سن ہے پھڑکتی ہے بوٹی بوٹی

■

مندر کی فضاؤں میں اداسی کیوں ہے
ہر بات ہر انداز سیاسی کیوں ہے
ہے کچھ تو پروہت تیری سازش ورنہ
سہمی سہمی سی دیوداسی کیوں ہے

نگاہؔ کی فکر کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے چند رباعیاں اور ملاحظہ فرمائیں:

آؤ کہ پھر اک خواب سجایا جائے
پھر جذبہ تعمیر جگایا جائے
مسمار ہوئے شہر کی سرحد میں کہیں
بستی نہ سہی گھر ہی بسایا جائے

■

دشمن سے پشیمان بہت ہونا ہے
حیران پریشان بہت ہونا ہے
اس جنگ میں گو جیت یقینی ہی سہی
اس جنگ میں نقصان بہت ہونا ہے

■

ہونا ہے جو ایک بار ہو ہی جائے
اس جنگ میں جیت ہار ہو ہی جائے
نکلے تو کچھ انجام صف آرائی کا
حملہ کر آر پار ہو ہی جائے

■

پھر ڈسنے لگا تیز اجالا مجھ کو
نیزے پہ حوادث نے اچھالا مجھ کو
میں کھو تو گیا تھا غم جاناں میں نگاہؔ
دنیا نے مگر ڈھونڈ نکالا مجھ کو

ان کے فنکارانہ کمالات کی مظہر کتنی ہی رباعیاں نقل کی جاسکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے "گلابوں کے چراغ" ہمیشہ روشن رہیں گے۔

☆☆☆

نور محمد یاس: بہ حیثیت رباعی گو

سیفی سرونجی

(سرونج، مدھیہ پردیش۔موبائل:9425641777)

مدھیہ پردیش میں رباعی کہنے والے شعرا میں ایک نمایاں نام نور محمد یاس (پ: یکم جنوری ۱۹۵۵) کا ہے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ رباعی میں زیادہ تر انسانیت محبت اور اخلاق جیسے موضوعات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نور محمد یاس چونکہ ایک ولی صفت انسان ہیں اور شاعری ہمیشہ شاعر کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس لیے نور محمد یاس کی رباعیات قومی یکجہتی، انسانی قدروں اور اسلامی نظریات کی آئینہ دار ہیں۔ یوں تو مدھیہ پردیش میں رباعی گو کی حیثیت سے کوثر صدیقی نے نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ رباعی کے فن میں کئی تجربات بھی کیے ہیں مثلاً تین مصرعی رباعی کے تو وہ بانی کہلاتے ہیں۔ نور محمد یاس نے ایسا کوئی تجربہ تو نہیں کیا ہے لیکن ان کو رباعی کے فن اور عروض کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔ بہر حال مدھیہ پردیش کے نمائندہ رباعی گو شعرا میں نور محمد یاس ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں رباعی کے شہنشاہ "حافظ کرناٹکی" ہیں تو امریکہ میں "مامون ایمن" رباعی کے شہنشاہ کہے جاتے ہیں۔ مامون ایمن کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے مکہ، مدینہ میں درِ مصطفی میں بیٹھ کر ایک سو بیس رباعی کہنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لیکن میرا موضوع رباعی کی تاریخ لکھنا نہیں ہے بلکہ نور محمد یاس کی رباعیات پر اظہار خیال کرنا ہے۔ نور محمد یاس کی رباعیات پر مشتمل مجموعہ "خوشبو کے جزیرے" (مطبوعہ: ۲۰۰۳) شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے جس پر کئی تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ "خوشبو کے جزیرے" پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالمتین نیاز نے لکھا ہے:

> "نور محمد یاس کی رباعیات ان کی فنی طبع زادیت کا ایک روشن نمونہ ہے۔ انہوں نے رباعی کے روایتی موضوعات کے ساتھ اس عہد کے موضوعات سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات دل پذیر بھی ہیں اور فکر انگیزی کا مرقع بھی۔ یہ امر خود تعجب انگیز ہے کہ انہوں نے اس کم عمری میں رباعی جیسی مشکل صنف کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے مختلف اوزان پر استادانہ قدرت بھی حاصل کی ہے۔"

فکر انگیزی پر مشتمل نور محمد یاس کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

آسانی سے کہاں یہ فن آتا ہے
برسوں میں سلیقۂ سخن آتا ہے
ہر لفظ پہ چھلتی ہے زباں تب جاکر
لہجے میں یہ بے ساختہ فن آتا ہے

■

پتھر تھی زبان دیدۂ نم چپ نہ رہا
ساکت رہے لب روح غم چپ نہ رہا
ڈوبی رہی آواز تو ابھری تحریر
میں چپ تھا مگر میرا قلم چپ نہ رہا

■

ہر منظر و ماحول میں کھو جاتے ہو
جاگی ہوئی آنکھوں سے بھی سو جاتے ہو
نکلو بھی طلسم ذات سے تم تو یاس
جاتے ہو جہاں وہیں کے ہو جاتے ہو

ان رباعیات میں نور محمد یاس نے جن موضوعات کو برتا ہے وہ واقعی دامن دل کو کھینچتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ رباعی کا فن آسانی سے نہیں آتا، جب تک سلیقہ سخن حاصل نہیں ہوتا اور نور محمد یاس کو اس میں بلا کی مہارت حاصل ہے۔ان کی رباعیات انسانی طبعیات اور اخلاقی اقدار کا نمونہ ہیں۔خوشبو کے جزیرے میں، ایسی بے شمار رباعیات موجود ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔کیونکہ انھوں نے اپنی رباعیوں میں انسانی جذبات واحساسات کو ہنرمندی کے ساتھ پرویا ہے اور فرد کو شخصیت کے اعلی درجے تک پہنچنے کی ترغیب دی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ رباعی کا فن ایک مشکل فن ہے لیکن جس کے دل ودماغ میں رباعی کا خمیر اور اس کی تازگی وروانی سما جائے، اس کے اظہار کے لیے رباعی سے بہتر کوئی فن نہیں ہوتا جیسے کہ ہندوستان میں حافظ کرناٹکی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں ہندوستان میں کسی شاعر نے رباعیات نہیں کہیں۔اسی طرح مدھیہ پردیش کے نمائندہ رباعی گو میں نور محمد یاس کی رباعی ذہن ودل میں رقص کرتی نظر آتی ہے۔وہ رباعی کے فن میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ رباعی فارسی زبان سے اردو میں آئی۔عمر خیام نے رباعی کے فن کو مقبولیت سے ہمکنار کیا۔ ملا وجہی، غواصی، سودا، میر انیس، دبیر اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور اکبر الہ آبادی، حالی، فانی کے بعد ہمارے عہد تک بے شمار رباعی گو پیدا ہوئے۔انہیں شاعروں میں ایک نمایاں نام نور محمد یاس کا ہے۔نور محمد یاس کی رباعیات اس لیے بھی الگ سے دکھائی دیتی ہیں کہ وہ بلند کردار کے مالک ہیں اور بااخلاق گوشہ نشین، دنیا سے بے نیاز، عبادت میں مصروف رہنے والے ایسے شاعر ہیں کہ ایسے ماحول میں جب شاعروں کی گروپ بندیاں عروج پر ہوں، ان کی زبان سے آج تک کسی شاعر کی برائی نہیں سنی جبکہ بے شمار لوگ ان سے اصلاح لیتے ہیں۔لیکن استاد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔کردار کی انہیں خوبیوں نے انہیں قدرت نے یہ مقام بخشا۔دوسرے یہ کہ انہیں فن عروض اور زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔انہوں نے غربت کی صعوبتیں بھی جھیلیں لیکن اپنی انا اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ان کی رباعیات میں ان کی شخصیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی خودداری اور انانیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے زندگی کے مختلف تجربات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔حالانکہ رباعی کے علاوہ ان کی غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے لیکن رباعی کے فن میں وہ کمال کی مہارت رکھتے ہیں، سلام سندیلوی صاحب نے لکھا ہے:

''یاس صاحب کی رباعیات صرف موضوع کے اعتبار ہی سے اہم نہیں ہے بلکہ ان کا اسلوب بھی دلکش ہے۔''

اسی طرح مختار سلیم کہتے ہیں:

''مطالعے کی وسعت، فن شاعری اور عروض سے ان کی واقفیت نیز الفاظ کی پیکریت کے حوالے سے انہوں نے اپنا اسلوب تراشا ہے۔نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن بلندیوں پر ہیں لیکن ان کا ہنر تو یہ ہے کہ وہ اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔نور محمد یاس کی انفرادیت ان کے شعر کے معیار کی ضمانت ہے۔''

نور محمد یاس کی رباعیات پر اور بھی بہت سے قلم کاروں نے لکھا ہے لیکن میں یہاں ساری بحث کو چھوڑتے ہوئے چند رباعی پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں:

نفرت کی جو زنجیر کھنچی رہتی ہے
نسلوں میں رہتی شمشیر کھنچی رہتی ہے
کہتے ہیں کہ مردہ سانپ کی آنکھوں میں
قاتل کی تصویر کھنچی رہتی ہے

■

در کھولنے والے کو سزا ملتی ہے
پرتو لنے والے کو سزا ملتی ہے
بیدار ضمیری ہے بڑا جرم یہاں
سچ بولنے والے کو سزا ملتی ہے

■

آواز پہ میری جو ذرا بھی شک ہو
چپ رہنا تم کو نہ یقیں جب تک ہو
پھرتے ہیں یہاں بھیس بنائے قاتل
دروازہ نہ کھولنا اگر دستک نہ ہو

اس طرح کی بے شمار رباعیات نور محمد یاس کے یہاں موجود ہیں جن میں معنی کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

عاصم شہنواز شبلی اور باغ صنوبر

انجم عظیم آبادی
(کولکاتا، موبائل:9674430727)

۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعراء میں عاصم شہنواز شبلی (پ:۱۹۶۲) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ گرچہ وہ دور، ان کی طالب علمی کا تھا۔ جب کوئی نوجوان بحیثیت شاعر یا نثر نگار دنیائے ادب میں وارد ہوتا ہے تو اس کی چہار سمتوں میں پھیل جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ عزیزی عاصم شہنواز شبلی کی خواہش اور تمنا کو خدائے برتر نے پوری کردی۔ آج وہ نہ صرف کامیاب شاعر، ادیب اور تنقید نگار ہیں، بلکہ ایک اچھے خطیب، ناظم، مشفق استاد، مبصر اور ادبی صحافی کے طور پر بھی علمی و ادبی حلقوں میں مشہور و مقبول ہیں۔ عوامی سطح پر بھی اپنی خدمات کے سبب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ عاصم شہنواز شبلی کی ادبی بنیادوں کو ان کے والد گرامی، علقمہ شبلی اور معروف جدید شاعر و ادیب عم محترم، پروفیسر نصر غزالی کی ادبی تربیت نے استحکام بخشا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ادبی سفر میں تھک ہار کر بیٹھ جانے کی بجائے روز بروز قدم آگے بڑھاتے ہوئے نئی نئی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

عاصم شہنواز شبلی کی محبوب صنف سخن غزل رہی ہے اور ۲۵ برسوں تک اس کی مشاطگی کرتے رہے ہیں۔ مگر جانے انجانے میں وہ گیسوئے رباعی کے اسیر ہوگئے اور اپنے اس شعری شوق کی تکمیل کے لئے مشاہیر کے مجموعہ ہائے رباعیات کا گیرائی و گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس خصوصی مطالعے نے انھیں صیقل کردیا اور انھیں ذہنی طور پر اس قدر تیار کردیا کہ وہ رباعیات کا دیوان بعنوان ''باغ صنوبر'' لے آئے۔ صرف یہی نہیں رباعیات کے دو اور مجموعے ''متاع عشق'' اور ''عشق نامہ'' منتظر اشاعت ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی تک کہی جانے والی رباعیات استادانہ رنگ اور ڈھنگ سے عبارت رہی ہیں۔ نصف آخر میں اول تو رباعیاں بہت کم کہی گئیں، دوئم یہ کہ وہ طرز قدیم کا ساتھ نہیں دے سکیں۔ اس سے انکار مناسب نہیں ہوگا کہ عصر حاضر میں کوئی بھی صنف اصلی حالت میں نہیں ہے۔ صنف رباعی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آج بیشتر رباعیاں رواں بحر یعنی لاحول ولاقوۃ الا باللہ میں کہی جارہی ہیں۔ اس کی وجہ اہل نظر سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ہمیں آج کی رباعیوں کو عصری عینک سے ہی دیکھنا چاہئیے، لیکن اس کا خیال رہنا چاہئیے کہ رباعیاں زبان و فن اور فکر و خیال سے مزین ہوں۔ عاصم شہنواز شبلی نے صنف رباعی سے از حد متاثر ہونے کا سبب یوں بیان کیا ہے:

غزلوں کے طرف دار کبھی تھے ہم بھی
مر مٹنے پہ تیار کبھی تھے ہم بھی
ہے صنف رباعی کے مقابل سب ہیچ
نا واقف اسرار کبھی تھے ہم بھی

دیوان ''باغ صنوبر'' میں تین مشہور اور معتبر اہل قلم کی آرا شامل ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی فرماتے ہیں:

''مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ عزیزی عاصم شہنواز شبلی نے اپنے دیوان رباعیات ''باغ صنوبر'' میں رباعی کی صنف کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا ہے بلکہ اپنی غیر معمولی اختراعی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے رباعی کے ہم عصر نامے میں خوش گوار اضافے کئے ہیں۔''

''عاصم شہنواز شبلی رباعیات نگاری کو اصناف شاعری کا حاصل بناتے ہیں لیکن اس فن کی مشکلات کا احساس بھی انھیں ہے۔ ملاحظہ کریں:

کہتے ہی کہ مشکل ہے رباعی کا فن
اصناف کا حاصل ہے رباعی کا فن
مقتول ہیں سب عشوہ گری کے اس کے
سچ یہ ہے کہ قاتل ہے رباعی کا فن

پروفیسر حسین الحق اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

''عاصم شہنواز شبلی بہ حیثیت رباعی گو اپنی حیثیت و مرتبت تسلیم کرانے کے تمام تر امکانات رکھتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس دیوان کی ترتیب میں بھی کچھ ترک و انتخاب سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔''

ذیل میں ''باغ صنوبر'' کی چند رباعیاں نمونے کے طور پر نذرِ قارئین کر رہا ہوں تا کہ عاصم شہنواز شبلی کی رباعیوں کے حوالے سے رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔ پیش کی جانے والی رباعی بہ اعتبار مفہوم نیا تو نہیں ہے لیکن اس کی سچائی اور استادانہ رنگ میں ڈوبے ہونے سے انکار ممکن نہیں:

گزرے ہوئے لمحوں کی نشانی مت ڈھونڈ
اشکوں میں ڈبو دے جو کہانی مت ڈھونڈ
اس راہ سے گزرا نہ سلامت کوئی
آیا ہے بڑھاپا تو جوانی مت ڈھونڈ

جلد از جلد اپنے فن کی داد کے طلب گاروں کو عاصم یوں تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

یوں ہی نہیں ملتا ہے کسی کو اعزاز
لہجے میں نیا پن ہے تو ہوگے ممتاز
ہے دادِ سخن دور بہت دور بہت ابھی
پیدا کرو لہجے میں نرالا انداز

اگلے زمانے میں خطوط نویسی اور وہ بھی محبوب کے لئے کسی ہنر سے کم نہ تھی۔ نامہ و پیام کے بغیر عشق کے پروان چڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب نامہ بری کی جگہ برقی تکنالوجی نے لے لی ہے۔ ذیل کی رباعی سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ عاصم شہنواز نے اس صورت حال کی عکاسی اس طرح کی ہے:

ہے دور ہی ایسا نہیں آتا ہے خط
اب ڈاکیہ بھی کوئی نہیں لاتا ہے خط
کیا جانے موبائل کے دوانے لڑکے
محبوب کو کس طرح لکھا جاتا ہے خط

اردو شاعری میں ساقی سے مخاطب ہونا یا اسے نشانہ بنانا بھی روایت میں شامل ہے۔ ذیل کی رباعی میں عصری کرب بھی ہے ساقی سے اپیل بھی:

دنیا کو وہ پیغام سنا دے ساقی
رگ رگ میں جو اک جوش جگا دے ساقی
ظلمت میں گھری آج ہے بزم ہستی
اک شمع محبت کی جلا دے ساقی

فراق گورکھپوری کے ''روپ'' کی رباعیوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اس رباعہ سے حظ اٹھائیں:

رفتار کے ہر گام پہ باجے گھنگھرو
شرمائیں گھٹائیں کو بھی اس کے گیسو
لگتا ہے بہار آئی ہے نواح جاں میں
ہے روح فزا ایسی بدن کی خوشبو

مایوسی، کفر اور نا مساعد حالات کو بدلنے کی فکر اور جہد و عمل ہی ترقی پسندی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس رباعی کو:

دنیا کے رویے سے نہیں ہوں مایوس
کم علم کے دعوے سے نہیں ہوں مایوس
حالات ہوں جیسے بھی بدلنا ہے انھیں
طوفاں کے تھپیڑے سے نہیں ہوں مایوس

اوپر دی گئی رباعیوں اور ''باغ صنوبر'' کے گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ عاصم شہنواز شبلی نے رباعی نگاری میں نہ صرف طاق ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے بلکہ ہر موضوع کو خوبصورتی اور فن کاری کے ساتھ برتنے کے ہنر سے آشنا ہونے کا احساس بھی دلایا ہے۔ دیوان کی شاعری خواہ وہ غزل کی شاعری ہو یا رباعی کی، شاعر کی مشق و ریاضت اور پختہ کاری ہی اسے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ عاصم شہنواز شبلی ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں باندھنے کے فن سے بھی آگاہ ہیں، جس کی منہہ بولتی تصویریں ان کی رباعیاں ہیں۔ الفاظ کا ذخیرہ ہو تو زمینِ شعر جیسی بھی ہوگی شاعر بہ سلامت گزر جائے گا اور یہ خوبی عاصم شہنواز شبلی میں موجود ہے۔ موضوع کے معاملے میں انھوں نے وسعت نگاہی اور فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ تبھی تو ''باغ صنوبر'' کی رباعیاں ہر مکتبۂ فکر کے قاری کو متوجہ کرنے کی صلاحیتوں سے معمور ہیں۔ عاصم شہنواز شبلی غزل کی محبوبیت کے حصار سے نکل نہیں پائے ورنہ وہ دیوان میں غزل کی تعریف و توصیف میں رباعیاں شامل نہیں کرتے۔ صاحب دیوان نے جب خود اپنے پیش لفظ بعنوان ''اعتراف'' میں لکھا ہے کہ:

''تسامحات اگر ہوں گے تو میں اس لئے قبول کرتا ہوں کہ ایک شاعر کا حق اتنا تو بنتا ہے کہ لفظ و معنی کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرے۔''

ظاہر ہے تسامحات کی نشاندہی فضول ہے۔ ''باغ صنوبر'' کو میں عزیزی عاصم شہنواز شبلی کا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اس طرح انھوں نے علامہ شبلی کی شعری روایتوں کو نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ افقی سطح پر اسے منور بھی کیا ہے۔ میری دلی مبارکباد اور رہِ شعر و سخن پر گامزن رہنے کی دعائیں اور نیک خواہشات!

☆☆☆

عابدہ شیخ: گلشنِ رباعی کا نیا پھول

شاہینہ پروین
(ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، قاضی نذرل یونیورسٹی، آسنسول، مغربی بنگال)

عابدہ شیخ کا شمار اردو کی نامور رباعی گو شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ مانچسٹر (برطانیہ) میں ایک عرصے سے مقیم ہیں اور ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات اور سماجی کارکن کے طور پر بھی سرگرم عمل ہیں۔ سماجی اور ادبی خدمات میں رات دن پیش پیش رہنے والی عابدہ شیخ اردو رباعی گو کی حیثیت سے اردو ادب میں خاص شناخت رکھتی ہیں۔ یوں تو انھوں نے غزل گوئی میں بھی اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے جس کا ثبوت ان کی طویل غزلیں ہیں۔ "دل ہی تو ہے" کے عنوان سے ان کی غزلوں کا ضخیم مجموعہ ۲۰۲۲ میں منظر عام پر آ کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے، جس کی سب سے طویل غزل ایک سو ایک 101 اشعار پر مشتمل ہے۔ باوجود اس کے آپ بنیادی طور پر رباعی کی شاعرہ ہیں۔ "بال و پر" کے نام سے آپ کا دوسرا شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ جس میں دو سو رباعیات شامل ہیں اور چار سو سے زائد رباعیاں ہنوز منتظر اشاعت ہیں۔ ان اس کی شناخت کو ناقدین نے بھی سراہا ہے اور وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک رباعی میں کہتی ہیں:

میرے لئے ہے جان رباعی میری
پڑھیے کہ ہے آسان رباعی میری
میں حشر میں بھی پیش کروں گی اس کو
بخشش کا ہے سامان رباعی میری

ایک اور رباعی میں خود کو بحیثیت رباعی گو ثابت کرتے ہوئے عابدہ شیخ لکھتی ہیں:

مشہور ہوں، معروف ہوں، مقبول ہوں میں
ہر زاویہ فکر سے معقول ہوں میں
ہے نام مرا عابدہؔ یہ یاد رہے
گلشن کا رباعی کے نیا پھول ہوں میں

عابدہ شیخ کے دوسرے شعری مجموعے "بال و پر" میں رباعیات کے علاوہ قطعات اور دوہے بھی شامل ہیں۔ ان کا رنگِ سخن جداگانہ ہے۔ انہوں نے مختلف اور متعدد موضوعات پر رباعیاں لکھیں۔ ان میں عصری زندگی کی جھلکیاں بھی ہیں، سماجی حالات کا عکس بھی، والدین سے بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار بھی ہے۔ کہیں علامہ اقبالؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں تو کہیں قوم کو اقبالؔ کا درس یاد دلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی رباعیات سے صاف ظاہر ہے:

مشکل ہو بہت پھر بھی نہیں رونا ہے
اس بھیڑ میں دنیا کی نہیں کھونا ہے
منزل ہے پہاڑوں کی چٹانیں تیری
اقبال کا شاہین تجھے ہونا ہے

■

شاہین رہو صورتِ شہباز رہو
ہمدرد رہو حق کے ہم آواز رہو
آئے گا اسی رنگ میں جینے کا مزا
رفعت کے لئے مائلِ پرواز رہو

حکیم الامت علامہ اقبال نے امت کو جس طرح خواب غفلت سے بیدار کیا اور اپنی ساری توانائی صرف کر دیں، وہ یقینا آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ چنانچہ عابدہ شیخ علامہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں:

احساس خودی ہم کو کرایا اس نے
تہذیب و تمدن بھی سکھایا اس نے
اقبال کا احسان ہے اُمت پہ بہت
تحریک عمل دے کے جگایا اس نے

عابدہ شیخ اس نوع کی رباعیوں کے ذریعے قوم کو محوِ نالہ جرس رہنے کے بجائے یارانِ تیز گام سے قدم سے قدم ملا کر نئی منزلوں کی طرف گامزن ہونے کی تلقین کی ہے اور شاہین کی طرح اپنے خیالات کو اونچا رکھنے کا درس دیا ہے اور اپنی رباعیوں کے ذریعہ قوم کے افراد بالخصوص نوجوان نسل کو بیدار کرنے کی قابل تعریف کوشش کی ہے۔ ان کی غیرت کو للکارا ہے، انہیں آگے بڑھنے کا جوشو ولولہ عطا کیا ہے، علم کی اہمیت و افادیت سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ قوم کی ترقی کے لئے علم کی دولت سے مالا مال ہونا ازحد ضروری ہے، اس لیے انہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعے نہ صرف اخلاقیات کی تعلیم دی ہے اور حصول علم کے لیے ابھارا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی قدروں کو بھی پہچاننے کی تلقین کی ہے۔ وہ خود بھی زاہدہ اور نیک صفت خاتون ہیں ۔ اس لیے زہد و استغنا کی تعلیم اپنی رباعیوں کے ذریعے دیا ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وہ خود صوفی مزاج ہیں اس لئے ان کی رباعیوں میں بھی صوفیانہ رنگ صاف جھلکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ کہتی ہیں:

سرکار ﷺ کی الفت ہے مرے سینے میں
سردار ﷺ کی چاہت ہے مرے سینے میں
میں غم سے پریشان نہیں ہوتی ہوں
احمد ﷺ کی محبت ہے مرے سینے میں

■

انداز زمانے سے جدا رکھتے ہیں
افکار و خیلات نیا رکھتے ہیں
ہم سیکڑوں اصنام کے قائل ہی نہیں
ہم اپنا فقط ایک خدا رکھتے ہیں

■

قاصر ہے بہت میری زباں کیسے کروں
پوشیدہ جو دل میں ہے عیاں کیسے کروں
خالق ہے وہ مالک ہے وہ حاکم بھی وہی
اللہ کی مدحت میں بیاں کیسے کروں

توحید، مدحت رسول اور استغناء کے مضامین کے علاوہ بھی عابدہ شیخ نے اپنی رباعیات میں مختلف موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے انتخاب اور ترتیب کا بھی خاص خیال رکھا۔ آپ نے فطرت کی رنگینی، عشق و وصال، تخیلات اور مختلف موضوعات پر خوبصورت اور فنکارانہ رباعیاں لکھیں جس کی مثال دوسری رباعی گو شاعرات تو کیا بہت سے شعرا کا کلام بھی ان سے محروم ہے۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے اللہ رب العزت اور رسول ﷺ کے اسماء مبارکہ پر بھی رباعیاں لکھیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ان کو دیگر رباعی گو شعراء و شاعرات میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی ایک حمدیہ و نعتیہ رباعی ملاحظہ ہوں:

شاعر کے تخیل میں سخن میں تو ہے
ہر پھول کی خوشبو میں، چمن میں تو ہے
تجھ سے ہی منوّر ہے بساطِ ہستی
تو فرشِ زمیں پر ہے، گگن میں تو ہے

نعتیہ رباعی:

خوشحال ہے جنّت کے زینے ہی میں
آباد ہے رحمت کے سفینے ہی میں
یوکے میں مرا جسم ہی رہتا ہے فقط
دل تو ہے محمد ﷺ کے مدینے ہی میں

عابدہ شیخ کی ان رباعیات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کا دل اللہ رب العزت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سے سرشار ہے۔ اسلوبِ بیان کی سادگی و سلاست سے آراستہ ان کی رباعیاں ان کی سچّے دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اسی کے ساتھ شاید وہ واحد رباعی گو شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنے والدین کی عقیدت و محبت میں بھی کثیر تعداد میں رباعیاں لکھیں، جن میں وہ بطور خاص اپنے والد مرحوم کی شفقت و محبت کو یاد کرتی ہیں اور ان

کے حق میں بارگاہِ خداوندی میں دعا گو ہوتی ہیں کہ خدا ان کے والد مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنّت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین ثم آمین)۔ وہ کہتی ہیں:

ہر بات مثالی تھی مرے والد کی
اور ذات بھی عالی تھی مرے والد کی
چہرے پہ جو تھا رعب تو دل میں شفقت
کیا شان نرالی تھی مرے والد کی

تو ان کے گناہون کو مِٹا کر مولا
تو بخش دے ان کو تو رہا کر مولا
تو اپنی کریمی سے مرے والد کو
جنّت مین محل ایک عطا کر مولا

دولت ہے مری ماں کے قدم کے نیچے
ثروت ہے مری ماں کے قدم کے نیچے
جنّت کا اگر در ہیں مرے والد تو
جنّت ہے مری ماں کے قدم کے نیچے

عابدہ شیخ کی رباعیات کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ زندگی کے نازک سے نازک مسائل کو سادگی اور نصیحت آمیز لہجے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین بھی کرتی ہیں۔ وہ ایک وسیع القلب اور دردمند دل رکھنے والی شاعرہ ہیں۔ انسان کے دکھ درد کو سمجھتی ہیں جیسا کہ ذیل کی رباعیات سے عیاں ہوتا ہے:

روتے ہوئے پھولوں کو ہنسایا جائے
بگڑی ہوئی قسمت کو بنایا جائے
اے عابدہؔ میری تو خواہش ہے
اُجڑے ہوئے گلشن کو جگایا جائے

احساس شرافت کے سوا کچھ بھی نہیں ہاں!
پاس روایت کے سوا کچھ بھی نہیں
معصوم سے دل میں مرے دنیا والو!
جذبات محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

ان رباعیات میں داخل موضوعات کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عابدہ شیخ صاحبہ نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ قاری کو سیرت اور اخلاق کی تعلیم دے کر ان کی کردار سازی کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو رباعی کی تاریخ میں عابدہ شیخ نے ایک جداگانہ روش اختیار کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایسی شاعرہ خال خال ہی ملیں گی جنھوں نے اتنی بڑی تعداد میں اور اس قدر وسیع موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے رباعیاں لکھی ہوں۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار اپنی رباعیات کے ذریعے کیا ہے۔ ان کے موضوعات میں وسعت، گہرائی، سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ ان میں تاثیر بھی ہے۔ بلاشبہ عابدہ شیخ نے اپنی رباعیات کے ذریعے سماجی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر اصلاح کا کام بڑی عمدگی سے انجام دیا ہے۔ ان کے کلام کی یہ خوبیاں ان کے باکمال اور تعمیر پسند رباعی گو شاعرہ ہونے کی دلیل ہیں۔

حواشی:

1۔ عابدہ شیخ: بال و پر، دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد، مارچ 2022، ص۔ 27
2۔ ایضاً۔ 28، 48، 50، 51، 54، 56، 57، 83
3۔ روزنامہ سرزمین لاہور، مدیرانا فہد صفدر خان، 13 فروری 2023، ص۔ 4

☆☆☆

بندوں کو خدا سے ڈرنا ہے ضرور
جو کام ہے نیکی کا وہ کرنا ہے ضرور
ہر حال میں انجام رہے پیش نگاہ
سو سال بھی جی لے کوئی مرنا ہے ضرور

کب وقت قضا آئے کسے کیا معلوم
کب روح نکل جائے کسے کیا معلوم
جلد اپنے ہر اک ظلم سے توبہ کرلو
کس حال میں موت آئے کسے کیا معلوم

کے انیس اظہر
بڑی بیٹ، وانمباڑی ویلور، تمل ناڈو

رباعیات انیس: ایک مطالعہ

عذرا انجم

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

میر انیسؔ (۱۸۷۴-۱۸۰۳) کی شناخت ان کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے مستحکم ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے رباعی گوئی میں بھی ناموری حاصل کی ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیات میں انسان دوستی، اخلاقیات، اظہار ذات، مذہبیات اور فلسفہ زندگی جیسے موضوعات کو بڑی فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے مسائل اور خوشی وغم کے لمحات کی مرقع کشی بھی بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ مغربی مفکر کروچے کا کہنا ہے کہ "شاعر اگر اپنی بات کو خوبصورت انداز میں بیان کرے تو کامیاب ہے اور بدصورت انداز میں بیان کرے تو ناکام"۔ میر انیس کی رباعی گوئی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کی طرح ہی اپنی رباعیوں میں بھی بہت ہی خوبصورت اور دلکش زبان واسلوب کا استعمال کیا ہے۔ روزمرہ پر تو انیس کو دسترس حاصل تھا ہی۔ اس کی وجہ سے ان کی رباعیوں کا حسن مزید دوبالا ہو گیا ہے۔ رباعی کا عروج دراصل اُردو مرثیے کے ارتقاء سے وابستہ ہے۔ مرثیہ خوانی سے پہلے پیش خوانی کے طور پر رباعی وسلام پڑھے جاتے تھے۔ اس طرح اس صنف کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی جو انیس ودبیر اور دوسرے مرثیہ نگاروں کی مرہون منت ہے۔ انیس ودبیر سے پہلے بھی رباعی گوئی کا ثبوت ملتا ہے اور کلیات میر اور دیوان خواجہ میر درد میں بہترین رباعیات کے نمونے ہمیں ملتے ہیں لیکن انیس ودبیر کے دور میں جس طرح رباعی کا فروغ ہوا، وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ یہ اطمینان بخش ہے کہ آگے چل کر انیس کے عہد کا خاتمہ ہو گیا لیکن رباعی کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ حالی کی کامیاب رباعیوں کے بعد بیسویں صدی میں جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، امجد حیدر آبادی، فراق گورکھپوری اور جذب عالمپوری وغیرہ نے اردو رباعیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مضمون "مرزا دبیر اور دیار نجف" میں لکھتے ہیں:

> "یہ زمانے کی ستم ظریفی نہیں تو کیا کہیں کہ دبیر کی رباعیات سے عوام تو ایک طرف خواص بھی ناواقف ہیں۔ مرزا دبیر اُردو کے وہ تنہا ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ یعنی چودہ سو (۱۴۰۰) رباعیات کہی ہیں۔ دوسرا بڑا شاعر جس نے سب سے زیادہ رباعیات کہی ہیں وہ میر انیس ہیں جن کی رباعیات کی تعداد ۵۸۶ سے اوپر ہے۔ رباعی کی صنف گراں اُردو ادب میں خال خال ہے۔ اُردو کے مشاہیر نے بہت کم رباعیات کہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق محمد قلی قطب شاہ نے ۳۹، سراج اورنگ آبادی نے ۹، ولی دکنی نے ۶، میر تقی میر نے ۱۲۵، فغاں نے ۱۱، نظیر اکبر آبادی نے ۲۳، خواجہ درد نے ۳۲، سودا نے ۸۰ مصحفی نے ۱۶۴، مومن نے ۱۲۹، غالب نے ۱۶، ذوق نے ۱۷، ناسخ نے ۶۴، میر عشق نے ۱۹۰، امیر مینائی نے ۳۰، امیر لکھنوی نے ۱۲، منیر شکوہ آبادی نے ۸۰، داغ نے ۴۱، حالی نے ۱۲۵، شاد عظیم آبادی نے ۴۰۰، فراق گورکھپوری نے ۳۵۱، جوش نے ۳۱۵، اثر لکھنوی نے ۲۰۰، جگت موہن لال رواں نے ۱۷۵ اور تلوک چند محروم نے ۲۲۵ رباعیات لکھیں۔"

(روزنامہ سیاست مورخہ ۸ مارچ ۲۰۰۴، حیدر آباد)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انیس ودبیر کی ریاضت کام آئی اور ان کے دور کے بعد رباعی گوئی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ رباعی کی اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان اساتذۂ سخن نے رباعی میں ضرب الامثال کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے اور رباعی اگر استادانہ ہو تو ضرب المثل بننے کے امکانات کافی رکھتی ہے اور اس سے رباعی کا تاثر بھی دیرپا ہو جاتا ہے۔ میر انیس کا کمال یہ ہے کہ ان کی رباعیات میں اس نوع کے ضرب الامثال بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

زیست اور شباب یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو ہر ذی روح کو ملتی ہیں۔ میر انیس نے انسان کی جوانی کی بے ثباتی اور بڑھاپے کی یقینی کو اس قدر خوبصورت اور دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے کہ وہ کامیاب ضرب المثل بن گیا ہے۔ "جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی"۔ ایک اور رباعی ملاحظہ ہو جس میں میر انیس نے عزت وانکسار کے باہمی رشتے کو اس حسین پیرائے میں بیان کیا ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر آج تک جاری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

آخری مصرعے کی قوتِ ترسیل سے قاری بآسانی محظوظ ہوسکتا ہے۔ شاعر ہنرمندوں اور بارتبہ انسانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ جسے رتبہ دیتا ہے وہ جگہ جگہ اپنی جھوٹی تعریفیں کرتے نہیں پھرتا اور اپنے منھ میاں مٹھو نہیں بنتا بلکہ اس کے بجائے فروتنی کا شیوہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو زمانے میں اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے، وہی اپنے منھ میاں مٹھو بنے پھرتے ہیں۔ اس بات کو کتنی خوبصورتی سے شاعر نے ادا کیا" جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے"۔ ان کا یہ انداز اس قدر لوگوں کو بھایا کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انسان کی نبض شناسی کی یہی معرفت انیسؔ کے اندر تنقیدی شعور بیدار کر گئی۔ ان کا تنقیدی شعور کتنا بیدار اور بالیدہ تھا، یہ مصرع اس کی ایک مثال ہے۔ ان کا یہ تنقیدی شعور ان کی پوری رباعیات میں بھی رچ بس گیا ہے اور ان کے کلام کو آفاقیت بخشتا ہے۔ فارسی، ہندی اور اردو شاعری کے بہت سے موضوعات انیس کے یہاں رباعیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ اسی طرح فارسی مقولوں اور ضرب الامثال کو بھی انھوں نے اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے۔ مثلاً

ٹھوکر بھی نہ ماریں گے اگر خود سر ہے
زردار کو بھی فروتنی بہتر ہے
ہے میوۂ نخل قد انساں تسلیم
جھکتی ہے وہی شاخ جو بار آور ہے

کرشن نے ارجن سے کہا تھا کہ "سویم کو ہری ٹہنی کے سمان لوچدار بناؤ"، پھل دار درخت جھکا رہتا ہے، سوکھے درخت میں نہ تو پھل لگتے ہیں نہ لوچ ہوتی ہے، وہ تو اکڑ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس مضمون کو میر انیس نے درج بالا رباعی میں کس خوبی سے پیش کیا ہے۔ اسی مضمون کو درج ذیل رباعی میں بھی ایک الگ انداز میں باندھا ہے:

سر کھینچ نہ شمشیر کشیدہ کی طرح
ہر ایک سے جھک قوس خمیدہ کی طرح
منظور نظر ہے جو حفاظت اپنی
ہو گوشہ نشیں مردم دیدہ کی طرح

میر انیس کہہ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو کشیدہ شمشیر کی طرح سخت نہ بناؤ بلکہ ہر ایک سے جھک کر ملو اگر اپنی حفاظت منظور ہے تو اسی طرح رہو جس طرح مردم دیدہ یعنی آنکھوں میں پتلی رہتی ہے اسی طرح گوشہ نشین رہو۔ دونوں رباعیوں میں زبان کی چاشنی اور اس کے فنکارانہ استعمال سے قاری بخوبی محظوظ ہو رہا ہوگا۔ یہاں مردم دیدہ کی ترکیب نے بطور خاص توجہ حاصل کی ہے۔ سید محمد عباسی نے "مجموعہ رباعیات انیس" میں انیس کی رباعیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(الف) مذہبیات جن میں حمد، نعت، منقبت، معتقدات اور مراثی شامل ہیں
(ب) اخلاقیات
(ج) ذاتیات

میر انیسؔ نے تقریباً 600 رباعیاں کہی ہیں۔ قرآنی احکام اور اسلامی تعلیمات پر ان کی گہری نظر تھی اور زبان پر پکڑ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی رباعیات میں ان تعلیمات کو منظوم پیرائے میں بیان کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی:

"صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ موزوں چیز رباعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیام، سحابی، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ان مضامین کو اپنا موضوع شاعری قرار دیا تھا، اُنھوں نے رباعی کے سوا تمام عمر میں اور کچھ نہ لکھا۔ اُردو شاعری میں چونکہ یہ مضامین بہت کم ادا کیے گئے، اس لیے رباعیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ سودا نے البتہ نہایت کثرت سے رباعیاں لکھیں، لیکن اکثر عشقیہ یا خیال آفرینی کی غرض سے لکھی

ہیں۔ میر انیس کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے۔"

(موازنہ انیس و دبیر از علامہ شبلی نعمانی اشاعت 1969، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ 236)

شبلی کے اس قول سے واضح ہے کہ انیس کی ہر رباعی میں کسی نہ کسی اخلاقی پہلو کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ شبلی نے اس ضمن میں جن رباعیات کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ان میں سے ایک درج ذیل ہے:

اب خواب سے چونک ، وقت بیداری ہے
لے زاد سفر، کوچ کی تیاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی عجب بھاری ہے

اجل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دنیا کے کسی بھی انسان کو مفر نہیں۔ ہر ایک کو اس سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میر انیس نے کہا ہے کہ اے انسان! خواب سے چونک کہ بیداری کا وقت ہے اور دنیا سے آخرت کی طرف سفر کی تیاری کر۔ آخرت کی تیاری میں لگ جا کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل کو طے کرتے ہوئے آخر میں یہیں پہنچتا ہے اور پھر اس کے اعمال کا حساب ہوتا ہے۔ اس سے خبردار کرتے ہوئے کتنی خوبصورتی سے شاعر نے کہہ دیا کہ قبر کی منزل نہایت ہی بھاری ہے۔ آخرت کے تصور کی پیشکش نے بھی رباعی کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لحد، آخرت، دنیا کی بے ثباتی، انسان کی غفلت، عقبیٰ کی طلب گاری یہ مضامین انیس الگ الگ ڈھنگ سے باندھتے ہیں۔ اسی مضمون کو دیکھیے انھوں نے درج ذیل رباعیوں میں کس نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے:

غفلت میں نہ کھو عمر کہ پچھتائے گا
رونا ہی غم شاہ میں کام آئے گا
اسباب تعلق سے نہ بھر دل اپنا
چلتے ہوئے سب کچھ یہیں رہ جائے گا

■

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے
دنیا سے ہمیشہ اُسے بے زاری ہے
اک آنکھ میں کس طرح سمائیں دونوں
غافل یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے

ان رباعیات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ میر انیس کا پیغام کس قدر واضح ہے۔ وہ دنیا کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اے انسان! آنکھیں کھول، بیدار ہو جا۔ جب تو اس دنیا سے کوچ کرے گا تو تمام دنیاوی مال و اسباب یہیں رہ جائیں گے اور تو اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جا سکے گا۔ ہاں! تیری عبادات اور تیرے اعمال تیرے ساتھ رہیں گے تو ضروری ہے کہ بس انہیں پر دھیان دے اور باقی سب کچھ بھول جا۔ شاعر نے اس قدر دلنشین انداز میں ان مضامین کو برتا ہے کہ دامن دل کھنچتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ انسان کی تعمیر، اس کی ذہانت، اس کی اشرف المخلوقیت اور اس کے بلند درجات کے موضوعات کو بھی شاعر نے اپنی رباعیات کا حصہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

ایک مشت مٹی سے بنے انسان کی عظمت کو اتنی آسان زبان میں سمجھایا ہے کہ شعر سہل ممتنع کے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے انسان کو ایک الگ ہی مرتبہ بخشا ہے۔ اس نے مٹی کے انسان کو اعلیٰ مقام دیا۔ اس کو ہنر، تمیز، جان اور ایمان جیسی صفات سے نوازا اور تمام مشکلیں اس پر آسان فرما دیں۔ یہ اللہ کی قدرت ہے اور انسان کی فضیلت کہ ایک مشت خاکی کو اشرف المخلوقات کا درجہ ملا۔ اسی طرح انسانی صفات اور اس کی کمزوریوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہموار ہے گر، تو تجھ کو کچھ باک نہیں
سرکش ہے اگر، تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو ، کدورت کے سوا
دامن میں ہوا کے کچھ بہ جز خاک نہیں

عقل و ادراک کے لیے سرکشی سے اجتناب کو ضروری صفت قرار دے کر شاعر انسانوں کو یہ نصیحت کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اگر تمہارے مزاج میں ہمواری ہے اور تمہارے لب و لہجے میں موافقت موجود ہے تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر تمہارے مزاج میں سرکشی ہے تو بے شک تمہارے ادراک اور تمہاری عقل میں کمی ہے۔ تند مزاج انسان جو بات بات پر غصہ ہو جاتا ہے اور اپنے جذبات پر قابو نہیں کر پاتا وہ ہمیشہ برائی میں ہی مبتلا رہتا ہے۔ حکمت کی ان باتوں کو شاعر نے جتنی ہنرمندی سے

بیان کیا ہے، اتنی ہی انسانی یادداشت پر عدم بوجھ کا حامل بھی ہے۔ یہ آسانی سے حافظے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اخلاقی قدروں کی تخم ریزی کے ساتھ ساتھ میر انیس نے اللہ، رسول، آل رسول (اہل بیت) کی محبت اور محرم و نوروز پر بھی بے شمار رباعیات کہی ہیں۔ انیس کی رباعیاں اثنا عشریہ کے عالمی تصور کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر "نوروز" کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اب وقت سرور و فرحت اندوزی ہے
ہر دل مصروف جشن نو روزی ہے
ہے آج سے دور شاہی شاہ نجف
یہ رنگ بہار فتح و فیروزی ہے

اہلِ فارس "نوروز" کے نام سے ۲۰/۲۱ مارچ کو ہر سال ایک عید مناتے ہیں۔ نوروز کا عالمی تصور یہ ہے کہ اس دن ماہتاب کے آفتاب کے مقابل ٹھہراؤ میں تبدیلی آتی ہے۔ زمین برج حمل میں داخل ہوتی ہے اور نوروز وجود میں آتا ہے۔ ایران، افغانستان، البانیہ، آذربائیجان، بنگلہ دیش، بوسنیا، چین، جارجیا، ہندوستان، اسرائیل، عراق، قزاقستان، کرغستان، پاکستان، روس، شام، تاجکستان، ترکی، ترکمانستان، یوکرین، ازبکستان جیسے ممالک میں "نوروز" بڑی دھوم سے منایا جاتا ہے جس کی طرف اشارہ کر کے میر انیس نے شاہ نجف کو یاد کیا۔ صرف شاہ نجف کو یاد نہیں کیا بلکہ چوتھے خلیفہ مولیٰ علی کی شان میں دل کھول کر اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجئے:

الفت ہو جسے اسے ولی کہتے ہیں
ایسوں کو سعید ازلی کہتے ہیں
اس بزم میں دھوپ اٹھا کے آتے ہیں جو لوگ
ہنس کر طوبیٰ لکم علی کہتے ہیں

میر انیس نے مشکل کشا کی مدح میں اور بھی رباعیاں کہی ہیں۔ دیکھیے یہ رباعی کس قدر خوبصورت پیرائے میں کہی ہے:

بیزار علی کو مال و زر سے پایا
طاعت ہی میں شام سے سحر تک پایا
اللہ نے دی تیغ، نبی نے دختر
رتبہ یہ ادھر سے وہ ادھر سے پایا

حضرت علی مرتضیٰ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے میر انیس نے جس طرح کی مضمون آفرینی سے کام لیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک اخاذ ذہن کے مالک تھے اور چیزوں کو اور اس کی خصلتوں کو باہم جوڑنے پر قادر تھے۔ وجہ اشتراک تلاش کرنے کی اس سے عمدہ سے مثال نہیں مل سکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ مولیٰ علی کو مال و دولت کی کوئی ہوس نہیں تھی۔ ان کے شب و روز عبادت اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں گذرتے تھے۔ ان کی یہ ادا اتنی پسندیدہ قرار پائی اور ان کا رتبہ اتنا بلند ہوا کہ خدا نے ان کو تلوار دے دی تو نبی نے دختر۔ کیا ہی خوبصورت وجہ اشتراک تلاش کیا ہے شاعر نے۔ اس وجہ اشتراک کی تلاش پر ہی ان کو بطور خاص داد دی جانی چاہئے۔ بی بی فاطمہ زہرا اور حضرت علی مرتضیٰ کے صاحبزادے اور پیارے نبی کے نواسے امام حسین کی شان میں کہی گئی یہ رباعی بھی نہایت پُرمعنی و پُرلطف ہے:

کیا مرتبہ سلطان حجازی کا ہے
کیا عزو شرف امام غازی کا ہے
سجدے کا نشاں دیکھ کے سب کہتے ہیں
نیزے پر یہ سر کسی نمازی کا ہے

شہادت عظمیٰ کی فتح مبین کو انیس نے کس فصاحت و بلاغت سے اس رباعی میں نظم کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔ غم حسین پر میر انیس کی دل سوز رباعیاں اور بھی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان میں سے ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

شبیر کا غم یہ جس کے دل پر ہوگا
آنسو جو گرے گا شکل گوہر ہوگا
پوچھے گا خدا جب ایسے در کی قیمت
تب حشر میں جوہری پیمبر ہوگا

میر انیس کی رباعیات میں معرفت، عشق الٰہی اور صوفیانہ مضامین بھی کثرت سے شامل ہیں۔ ان کے مزاج میں صوفیانہ پن تھا تو انہوں نے اللہ کی محبت میں بے شمار ایسی رباعیاں کہی ہیں، جسے پڑھنے سے دل کو ایک طرح کا سکون میسر آتا ہے اور تزکیہ نفس کو جلا ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے دل پاکیزگی اور طہارت کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ خدا کی محبت سے بہتر دنیا میں کوئی محبت نہیں۔ جو سکون نماز میں ہے وہ کہیں نہیں۔ انیس نے بھی اللہ سے لو لگائی تھی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

راہی طرف عالم بالا ہوں میں
دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب ترا نام پاک جپنے کے لیے
گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

تِلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
قربت رگ جاں سے اور پھر اس پر یہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری
خلق وکرم وعطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے
دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

گوہر کو صدف میں آبرو دیتا ہے
بندے کو بغیر جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق گل کو بو سنگ کو لعل
جو کچھ دیتا ہے جس کو تو دیتا ہے

ان رباعیات میں شاعر نے اللہ کی وحدانیت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس سے اپنی عقیدت، اپنی محبت اور ان کی جلوہ کاریوں کو موضوع سخن بنا کر بڑی کامیابی کے ساتھ نوع انسانی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ایسی مثالوں کو زیر بحث لایا ہے جس سے خود انسان کا دماغ بھی کھلتا چلا جاتا ہے۔ "انسان کو رزق، گل کو بو، اور سنگ کو لعل" عطا کرنے کی بات کہہ کر انسان کو رزق کی تنگی کے احساس کا شکار ہونے سے بچنے کی تلقین کر دی ہے اور وہ بھی اتنے غیر محسوس طریقے سے کہ انسان بات کی تہہ کو سمجھ بھی جاتا ہے اور اسے ایسا بھی نہیں لگتا کہ کوئی نرا واعظ اس کے سامنے وعظ و نصیحت کے دفتر کھول کر بیٹھا ہوا ہے۔

میر انیس کی رباعیوں میں خود کلامی کی فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی اثر پذیری کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ خارجی حقائق کو کسی نہ کسی لحاظ سے داخلی بنا لیتے ہیں۔ موضوعات کی مناسبت سے لفظیات کا استعمال کرتے ہیں اور اپنی رباعیوں میں لہجے کی ہمواری اور خیال کی سبک روی سے قاری کو اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔ انیس کے اس انداز بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

"وہ ایک لمحے کے لیے بھی اخلاقی مقصد و اقدار کا دامن چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ اس کے لیے وہ دل سے دل تک منتقل کرنے والے لہجے کو ترجیح دیتے ہیں اور دعوت و موعظت کے عامیانہ رویّے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ تہذیب و توازن کا مسلسل عمل ان کی رباعیوں، سلاموں اور مرثیوں میں یکساں طور سے جاری و ساری نظر آتا ہے۔ توازن و تہذیب کی یہی مسلسل تلاش بکھری ہوئی کثرتِ مضامین میں وحدت تاثر کا رنگ بھی اختیار کرتی ہے اور ان کے الفاظ کو ایک کھنک اور نئی چمک دمک بھی عطا کرتی ہے۔"

(رباعیات انیس از علی جواد زیدی، اشاعت 1985 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 57)

علی جواد زیدی نے میر انیس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے، تقریباً ان ہی الفاظ میں ان کی رباعیوں کی خوبیوں اور ان کے مضامین کے تنوع پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عسکری صفدر اپنی کتاب "جائزہ انیس" میں لکھا ہے کہ:

"میر انیس کی رباعیات میں حزنیہ مضامین، فلسفیانہ اور فکری موضوعات کے علاوہ اخلاقی اور عام مضامین مثلاً موت و حیات، دنیا کی بے ثباتی فقر و قناعت اور انکساری وغیرہ بھی ملتے ہیں جنھیں انہوں نے اپنے شاعرانہ حسن بیان سے انتہائی پر اثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ ان کی اہمیت موضوع یا مضمون کی جدت سے بڑھ کر حسن بیان، ندرت اور تخیل کی تازگی کی وجہ سے ہے۔ رباعیات میں اخلاقی عنصر نہایت جاندار اور بلند آہنگ رہتا ہے۔ انیس کا عقیدہ جو اُن کے فلسفہ حیات کا سرچشمہ ہے۔ توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کو اصول دین اور نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد اور نفس کو فروغ دین ماننا ہے۔ رباعیات میں توحید کو جو اسلام کی اساس ہے، نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔"

(جائزہ انیس از ڈاکٹر عسکری صفدر، اشاعت 2009 تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص 119)

علی جواد زیدی اور ڈاکٹر عسکری صفدر کے ان اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ میر انیس نے اپنی رباعیات میں ایسے موضوعات کو پیش کیا ہے جو انسان کی ذات سے سروکار رکھتے ہیں اور موضوعات کو برتنے کے انداز نے ان کے بیان کو دلچسپ اور پُرمزہ بنا دیا ہے۔ نصیحت آمیز ہونے کے باوجود ان کی رباعیاں قاری پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں بجا طور پر دبستان لکھنؤ کے نمائندہ رباعی گو شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔

☆☆☆

کلیاتِ رباعیاتِ جوش: جوش شناسی کا نیا باب

حقانی القاسمی
نئی دہلی

شہرت وشناخت کا رشتہ زمان ومکان سے بھی ہے۔ عہد بدلتا ہے تو سیاسی، سماجی اور ثقافتی تغیرات کے ساتھ ذہنی ترجیحات بھی تبدیل ہوجاتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا اور جوش عوامی ذہن وشعور کا لاینفک حصہ تھے۔ مگر موت کے کچھ عرصے بعد ہی وہ روایت پارینہ بن گئے اور عوامی ذہن سے جوش کی یادیں بھی غائب ہوتی گئیں۔ جس جوش کو صدی کا حافظ وخیام کہا جاتا تھا اور جس کی گونج ہر طرف تھی رفتہ رفتہ اس جوش کا جادو ختم سا ہونے لگا۔ پاکستان میں بھی اتنی ناقدری ہوئی کہ جوش کے خلاف ایک محاذ سا کھڑا کر دیا گیا۔ انھیں مطعون ومعتوب کیا گیا۔ وہاں بھی وہ آزردہ اہل اذاں رہے تو ہندوستان میں بھی تقریباً کچھ ایسی ہی کیفیت رہی۔ میزانِ نقد میں بھی ان کے الحاد وایمان کو تولا جانے لگا اور ان کے شعری اوج واجلال، توقیر وجاہ کو بھلا دیا گیا۔ جب کہ جوش کا سرمایہ سخن بیش بہا بھی ہے اور ان کے یہاں فکری، موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع بھی ہے۔

جوش عصری جامعات کے تحقیقی وتنقیدی مطالعات کا حصہ بھی رہے اور ان کی شعری اور فنی جہتوں کے حوالے سے مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ سلسلہ نقد سے جڑے ہوئے افراد نے ایک خاص منہج نقد اختیار کیا جس کی وجہ سے ان کے کلام کی ساری معنویت قاری کے روبرو نہ آسکی۔ اس میں قصور کلام جوش کا نہیں بلکہ فہم وادراک کے زوال اور ذوق کی پستی کا ہے۔ دراصل معاملہ یہ ہوا کہ جوش ملیح آبادی کے شعری سرمائے کی تفہیم وتعبیر کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ ناقص تھا۔ جوش کا مطالعہ لسانیاتی اور نفسیاتی زاویہ نظر سے کیا جاتا تو شاید ان کی معنویت زیادہ روشن ہوتی۔ ان کے تعلق سے بھی وہی انداز نظر اختیار کیا گیا جو عمومی سطح کے شاعروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جوش کے تعلق سے مطالعاتی طریق کار میں تبدیلی کے بغیر ان کی مکمل تفہیم ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ بنیادی طور پر جوش نے لسانی سطح پر جو تجربے کیے ہیں اور ان کے یہاں جس نوع کے نادر الفاظ، تراکیب، تشبیہات اور استعارات ملتے ہیں ان کی تفہیم کا صحیح حق لسانیات کے ماہرین ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی کے یہاں جو فکری یا نفسیاتی تضادات ہیں ان کی صحیح طور پر تعبیر نفسیات کے ماہرین کے لیے ہی ممکن ہے۔ ان دونوں زاویوں سے ہی جوش ملیح آبادی کی مکمل معنویت سامنے آسکتی ہے۔ مگر ان پر جو بھی تنقیدی اور تحقیقی مطالعات لکھے گئے ہیں ان میں یہ دونوں زاویے تقریباً عنقا ہیں۔ ایک ٹریجڈی یہ بھی ہوئی کہ جوش کو مراثی میں محدود ومرکوز کر دیا گیا یا پھر ان کی نظمیہ شاعری کو ہی مرکز بنا کر تنقید لکھی گئی۔ جب کہ جوش ملیح آبادی اردو کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف اور شعری ہیئتوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے فنی اور جمالیاتی اعتبار سے اردو زبان وادب کو قابل فخر سرمایہ عطا کیا ہے۔ خاص طور پر جوش نے رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن میں اپنے جوہر دکھائے ہیں جس کے بارے میں خود ان کا کہنا تھا:

''رباعی ایک بہت بڑی بلا اور نہایت جان لیوا صنف کلام ہے۔ یہ کمبخت چالیس برس سے پیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاق اور بے نہایت دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا کام نہیں آتا اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔ قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے صرف چار مصرعوں میں اس ربع 'مسکوں' کے تمام تجربات، مشاہدات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا، ایک ننھے سے قطرے میں قلزم کو مقید کر لینا، ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔''

جوش ملیح آبادی نے اسی مشکل صنفِ رباعی کو وسعتوں سے ہمکنار اور اس کے دائرے کو لامحدود کیا ہے۔ ہر طرح کے موضوعات کو انھوں نے اپنی رباعی کا محور بنایا ہے۔ حیات وکائنات کے جملہ مسائل، فلسفہ جبر وقدر اور حسن وعشق ودیگر موضوعات ان کی رباعیوں میں ملتے ہیں۔ رباعی گو شعرا کی جو کہکشاں ہے اس میں جوش کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، ولی دکنی، انیس ودبیر، سودا، میر سوز، مظہر جانِ جاناں، غالب، مومن، جگت موہن لال رواں، امجد حیدر آبادی، یگانہ، فراق، جگر، فانی وغیرہ نے فارسی کے رودکی حافظ خیام اور سعدی کی اس صنف کو جو بلندی عطا کی ہے اس میں جوش کا بھی کردار بہت اہم ہے۔ جوش ملیح آبادی کے بیش تر شعری مجموعوں میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ رباعیات کی بھی کافی تعداد ہے۔ شاعر کی راتیں،

جنوں وحکمت، حرف وحکایت، حسین و انقلاب، آیات ونغمات، عرش وفرش، رامش ورنگ، سنبل وسلاسل، سیف وسبو، سرود وخروش، سموم وصبا، قطرہ وقلزم، نجوم و جواہر، محراب ومضراب کے علاوہ اور دیگر مرتب کردہ کتابوں میں ان کی رباعیات ملتی ہیں اور اس حوالے سے ڈاکٹر رباب انجم کا تحقیقی مقالہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے جوش کی رومانی رباعیاں کتاب مرتب کی ہے۔ ماہر جوشیات ڈاکٹر ہلال نقوی کی مرتب کردہ کتابوں میں بھی جوش کی رباعیات ملتی ہیں۔ مگر جوش کی رباعیات کے حوالے سے بہت کم تنقیدی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

رباعیات جوش کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر منتشر شکل میں ہے جس کی وجہ سے جوش ملیح آبادی کی تمام رباعیات سے قارئین روبہ رو نہیں ہو پاتے۔ نئی نسل کے نوجوان ناقد امیر حمزہ نے اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے کلیات رباعیات جوش کی ترتیب وتدوین کا بیڑا اٹھایا اور ان کے مختلف شعری مجموعوں سے رباعیات کو جمع کیا کیوں کہ رباعیات کے بغیر جوش ملیح آبادی کی مکمل شعری شخصیت سامنے نہیں آسکتی۔ جوش کو رباعی سے جو نسبت رہی ہے وہ ان کے لوح مزار پر کندہ اشعار سے بھی واضح ہے۔ جوش کی رباعیوں میں جو لطف زباں اور حسن بیاں ہے، فردوس لکھنو کی جو کھنکتی زبان ہے۔ جو بلند آہنگی، محاورہ بندی، لہجے کی تندی اور تلخی ہے۔ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ خاص طور پر خیام سے متاثر ان کی خمریہ رباعیات سے ایک الگ ہی جوش ملیح آبادی سامنے آتے ہیں۔ جن میں ان کے تجربات بھی ہیں، خیالات بھی ہیں اور حیات و کائنات کا مطالعہ بھی ہے، زندگی کا الگ تصور بھی ہے۔ چار مصرعوں میں خوبصورت منظر نگاری بھی ہے، محاکاتی کیفیت بھی ہے، لفظوں کی نادرہ کاری بھی ہے، تشبیہات، استعارات اور تراکیب کی تازہ کاری بھی۔ جوش کے فکری تضادات اور لسانی اجتہادات کی تصویر بھی ہے۔ تضادات کے تناظر میں دیکھا جائے تو جوش کے یہاں الحاد بھی ہے، ایمان بھی ہے، انکار بھی ہے، ایقان بھی ہے، تشکیک بھی ہے، تیقن بھی ہے، تمجید و تقدیس بھی ہے، تحقیر و تذلیل بھی اور شاید یہی تضاد ان کے شعری مجموعوں کے ناموں میں بھی نظر آتا ہے۔ جنون وحکمت، عرش وفرش، سیف وسبو، قطرہ وقلزم، سموم وصبا شاید جوش ملیح آبادی اضداد سے اشیا کی معرفت کے قائل تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں فکری او رنفسیاتی سطح پر تضادات ملتے ہیں۔ وہ ایک طرف ملحد و مذہب بیزار ہیں تو دوسری طرف مرثیہ لکھتے ہیں اور سورۃ رحمان کا منظوم ترجمہ بھی کرتے ہیں ۔جوش ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ:

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین
چرخِ نوع بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

تو دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں:

آنسو دے کر درِ عطا لیتے ہیں
اللہ سے انعام بُکا لیتے ہیں
تقلیدِ حسین سے ہمیں کیا سروکار
ہم تو فقط آہوں کا مزا لیتے ہیں

اس طرح کے اور بھی اشعار ہیں جن سے ان کے تضادات ظاہر ہیں۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

اللہ رے ایماں کا مرے استحکام
اک ہاتھ میں ہے حبل متیں ایک میں جام
دل برخِ بحرین ہے گویا اے جوش
اک سمت ہے کفر، اک جانب اسلام

دراصل جوش تیقن کی تلاش میں تشکیک کے شکار رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے موروثی اقدار اور مسلمہ افکار سے بغاوت کی۔ وہ کبھی خدا کے منکر اور رسالت کے انکاری بھی رہے اور اس طرح کے شعر بھی کہتے رہے:

کہتے ہیں یہ پیر، ہم پئے نفع عوام
ڈھولک کی گمک پر بیچتے ہیں اسلام
دیتے ہیں غریبوں کو کرائے پر رسول
کرتے ہیں امیروں میں خدا کا نیلام

تشکیک کے باوجود انسانیت پر جوش کا ایمان پختہ تھا اور ہر طرح کے مذہبی تعصّبات اور تحفظات سے اُن کا ذہن پاک تھا۔ اسی لئے انسانیت کی جستجو اُن کا شعری منشور بھی ہے اور نصب العین بھی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

خنجر ہے کوئی ، تو تیغِ عریاں کوئی
صرصر ہے کوئی، تو بادِ طوفاں کوئی
انسان کہاں ہے؟ کس کُرے میں گم ہے
یا تو کوئی 'ہندو' ہے 'مسلماں' کوئی

اسی طرح ان کی ایک اور رباعی ہے:

ہر بات میں تیغِ خونچکاں ہے یارب
ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب
'مذہب' کی برادری سے دل تنگ ہوں میں

'انساں' کی برادری کہاں ہے یارب!

جوش نے سماجی، سیاسی ناہمواریوں پر بھی ضرب کاری کی ہے اور حیات وکائنات کی حقیقتوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہ وہ تلخ حقیقتیں ہیں جنھیں شاید عقیدتوں میں محصور معاشرہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ انہی کی ایک رباعی ہے:

وہ جن کا تخیل ہے نجیب الطرفین
آتش کدہ و دیر بھی ان کے حرمین
ہیضہ حب وطن کا ہوتا ہے اُنہیں
ہوتی نہیں جن کو ہضم حب کونین

غزل گوشاعروں کے تعلق سے بھی جوش ملیح آبادی کے خیالات ایسے ہیں جو شاعروں کو شاید راس نہ آئیں۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

یہ صنف غزل کہ جس سے خوش ہیں اوباش
کیا چیز ہے کیا بتاؤں ارباب تلاش
سیلے ہوئے الفاظ کے تابوت میں ہے
یہ مردہ روایات کی بگڑی ہوئی لاش

ان کی رباعیات میں اس طرح کے تصورات کی کثرت ہے۔ شاید انہی تصورات کی وجہ سے جوش کے مخالفین کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور جوش شعری منظرنامے سے گم ہوتے گئے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جوش کی شاعری میں شور وتموج بھی ہے، جوش وتیج بھی اور طوفان وتشنج بھی۔ خاص طور پر ان کی تشبیہات کا تو جواب ہی نہیں:

شانوں پہ ہے چھٹکی ہوئی زلفوں کی لٹک
اعضاء میں ہے تازہ شاخِ گل کی سی لچک
اور اس پہ یہ انگڑائی کہ عالم نہ پوچھ
بکھری ہوئی بدلیوں میں جس طرح دھنک

لسانی اجتہادات کے تعلق سے دیکھا جائے تو جوش کے یہاں ایسے معرب ومفرس اور متروک الفاظ بھی ملتے ہیں جن کی تفہیم آج کے سہل پسند قاری کے لیے بہت مشکل ہے۔ جوش ملیح آبادی کے پاس لفظوں کا قلزم ذخار ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو جو الفاظ عطا کیے ہیں وہ اردو کی وسعت دامانی کا ثبوت ہیں۔ جب کہ رشید حسن خاں جوش کی شاعری کو لفظی اسراف کی بدترین مثال قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوش نے لفظوں کو نئی زندگی دی ہے اور مردہ لفظوں کو حیات بخش دہی ہے۔ جوش کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں:

افسوس ہے اے عربدہ چرخِ کبود
ہو، اور ایازیت کا دشمن، محمود
کہتے ہیں کہ یہ خلیل عصر حاضر
وا کرکے رہے گا باب نار نمرود

دراصل تخیل سے جوش کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ وہ خیالوں کے نئے جزیرے کی سیر کرتے تھے اور تب ان کے ہاتھ کچھ لعل وگہر آتے تھے۔ انھوں نے اس باب میں بڑی ریاضت کی ہے۔ تبھی انہیں ایسے الفاظ اور خیالات ملے ہیں۔ جوش ہی کی ایک رباعی ہے:

اس وقت کہ جب دل کو غذا دیتا ہوں
اور فکر کو لفظوں کی قبا دیتا ہوں
جتنی ہے زمین و آسماں کی قیمت
اتنے کا تو لوبان جلا دیتا ہوں

امیر حمزہ نے جوش ملیح آبادی کی فکریات اور لفظیات کے حوالے سے بہت مربوط اور مبسوط گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ لفظیات کے باب میں سودا، نظیر اور انیس نے جو جوہر دکھائے ہیں جوش نے بھی اسی جدت و جودت کا مظاہرہ کیا ہے۔ امیر حمزہ نے جوش کی شخصیت، شاعری اور ان کے دیگر متعلقات اور لوازمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آج کے زمانے میں جب مذاق سخن کی تبدیلی کی وجہ سے جوش ملیح آبادی فراموش کیے جارہے ہی تو ایسے میں یہ کتاب جوش کو زندہ کرنے میں معاون ثابت ہوگی خاص طور پر رباعیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ ایک حوالہ جاتی کتاب قرار پائے گی۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی شاعری میں بہت ادق الفاظ استعمال کیے ہیں ان کے یہاں دغدغہ، دغل، شنگرف، عربدہ، غباوت، افشردہ، افگندہ، رمیدہ، غلطیدہ، کیقباد، مردک زمہریری، خوبانِ صدف عذار، چرخِ کنج خو، ابلہانِ ذی جاہ، تکرار تزلزل، بنائے تمکین، اقلیم عقول، خشت خرابات جیسے الفاظ اور تراکیب ملتے ہیں جن میں سے بہت لفظوں کے معانی کی تلاش اردو، فارسی اور عربی لغات میں بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لیے تفہیمی زاویے سے امیر حمزہ نے فرہنگ بھی شامل کیا ہے۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت اور معنویت دوچند ہوگئی ہے۔ جوش شناسی کے باب میں یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے مجھے امید ہے کہ کلیات رباعیات جوش کی علمی اور ادبی حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور نئی نسل کے نوجوان محقق وناقد امیر حمزہ کی یہ محنت رائگاں نہیں جائے گی۔

☆☆☆

دبستانِ لکھنؤ میں صنفِ رباعی کا آغاز وارتقاء: ایک اجمالی تعارف

مجتبیٰ حسن صدیقی
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔ موبائل:8960799850)

دہلی میں نامساعد سیاسی حالات کے سبب مرکزِ شاعری لکھنؤ منتقل ہوئی۔ جن شعرائے دہلی نے دربارِ اودھ کو اپنے علم و ہنر سے آباد کیا ان میں سراج الدین خاں آرزوؔ، فغاںؔ، سوداؔ، میرؔ، میر حسنؔ، میر سوزؔ، جعفر علی خاں حسرتؔ، میر ضاحکؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ اور رنگینؔ جیسے شعراء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جمیل جالبیؔ نے لکھا ہے:

''اس دور کے لکھنؤ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ دلّی نے لکھنؤ میں آکر ایک نیا جنم لیا ہے۔''(۱)

یہ سچ ہے کہ دبستانِ لکھنؤ میں پنپنے والے ادب میں صنفِ غزل کو اولیت حاصل ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غزلوں کے علاوہ مرثیہ اور مثنوی کی مانند صنفِ رباعی نے بھی خوب ترقی پائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ دبستانِ لکھنؤ سے قبل اردو رباعی کی حیثیت محض ضمنی صنفِ سخن کی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے قبل شعرائے دکن اور شعرائے دہلی اپنی زبان کا ذائقہ بدلنے اور اپنی قادرالکلامی کے اظہار کے لئے رباعیاں کہتے تھے لیکن دبستانِ لکھنؤ سے منسوب شعراء نے رباعی کو ضمنی صنفِ سخن کے درجے سے نکال کر اسے ایک مستقل صنفِ سخن کا درجہ دیا۔ خصوصاً مرثیہ گو شعراء نے اس صنف کے تمام امکانات کو بروئے کار لا کر اس کے فکری وفنی دائرے کو وسعت بخشی۔ دبستانِ لکھنؤ اس اعتبار سے بھی فضیلت رکھتا ہے کہ اردو رباعیات پر مشتمل پہلا مجموعہ ہمیں دبستانِ لکھنؤ ہی میں نظر آتا ہے۔ اگلے سطور میں دبستانِ لکھنؤ میں صنفِ رباعی کے آغاز وارتقاء کا مختصراً جائزہ پیش خدمت ہے۔

جعفر علی خاں حسرتؔ لکھنوی (۱۷۳۴/۳۵۔۱۷۹۱/۹۲): دہلی سے لکھنؤ ہجرت کرنے والے شاعروں میں ایک اہم نام جعفر علی حسرتؔ کا بھی ہے۔ وہ میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور قائمؔ کے ہم عصر تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ابوالخیر عطار تھا۔ دہلی کی ناسازگار سیاسی حالات نے انہیں ترک وطن پر مجبور کیا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے۔ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اودھ کا پایہ تخت بنایا تو یہ بھی لکھنؤ منتقل ہو گئے اور لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ حسرتؔ فارسی اور اردو دونوں زبان میں شاعری کرتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکینؔ اور اردو میں رائے سرب سنگھ دیوانہؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ حسرتؔ نے مختلف اصناف سخن پر مشتمل کثیر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ 'کلیات حسرتؔ' جسے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مرتب کیا ہے اور جو سرفراز پریس لکھنؤ سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا، اس میں قصائد، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، مثنویات، غزلیات، مرثیہ اور ہجویات کے ساتھ ساتھ دیوان رباعیات بھی شامل ہے۔ نورالحسن ہاشمی کے مرتب کردہ کلیاتِ حسرتؔ میں کل ۴۳۶ رباعیاں موجود ہیں۔ جس میں 'دیوانِ رباعیات' کی ۴۰۳ رباعیاں اور ۳۳ رباعیاں دیوانِ دوم کی ہیں۔ حسرتؔ کی دیوان رباعیات میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے مختلف عناوین کے تحت ۲۱۹ رباعیاں درج ہیں۔ جس میں ایک مستزاد رباعی بھی ہے۔ دیوان رباعیات میں یوں تو تمام حروف تہجی پر ختم ہونے والی رباعیاں موجود ہیں سوائے 'پ' 'ڈ' اور 'ڑ' حروف کے۔ اس کے بعد 'فصل در ذکر سراپائے معشوق' کے تحت ۳۳ رباعیاں درج ہیں جس میں معشوق کے اعضائے جسمانی، پوشاک، زیورات وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ 'فصل در عیوب معشوق' میں معشوق کی جسمانی خامیوں کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ۱۹ رباعیاں درج ہیں۔ اس کے بعد 'فصل در صنائع و بدائع' کے تحت ۴۸ رباعیاں، 'فصل در شہرِ آشوب' کے تحت ۶۷ رباعیاں اور آخر میں 'فصل در ہجویات' کے تحت ۱۷ رباعیاں ملتی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں فکری عناصری خال خال ہی نظر آتے ہیں لیکن ایک بات تو صاف ہے کہ اردو میں رباعیوں کا پہلا مجموعہ بہ طرزِ دیوان سب سے پہلے ہمیں حسرتؔ کے یہاں ہی ملتا ہے۔

غلام ہمدانی مصحفیؔ (۱۷۴۷۔۱۸۲۴): غلام ہمدانی نام اور تخلص مصحفیؔ تھا۔ بلم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے خاندان کے ہمراہ امروہہ چلے آئے۔ یہیں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی اور شاعری کا ذوق بھی یہیں پروان چڑھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قدرت رکھتے تھے۔ عربی سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ طبیعت میں خود پسندی کا جذبہ کارفرما تھا۔ جو تنک مزاجی کا سبب تھا۔ لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ جرأتؔ، انشاؔ اور رنگینؔ کے ہم عصر تھے۔ مصحفیؔ بہت زود گو اور پر گو شاعر تھے۔ انہوں نے تمام اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے اور ان کے کثیر نمونے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ اردو میں ان کے کل آٹھ (۸) دواوین ہیں۔ جن میں غزلیات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ قصائد، مثنویات، مخمسات، قطعۂ تاریخ، مسدسات، مراثی وغیرہ بھی اچھی تعداد میں

ہیں۔لیکن ان کا اصل میدان غزل ہی ہے۔مذکورہ اصناف کے علاوہ انہوں نے رباعیات بھی کہی ہیں۔جن کی تعداد تقریباً ۱۷۰ ہے۔ان کی رباعیاں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔روایتی مضامین کے علاوہ کچھ رباعیاں ذاتی نوعیت کی ہیں اور کچھ سفارشی نوعیت کی۔اس قبیل کی رباعیوں میں مصحفی اور ان کے عہد کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

یحییٰ مان قلندر بخش جرأت (۱۷۴۹۔۱۸۰۹): خاندانی نام یحییٰ مان، عرفیت قلندر بخش اور تخلص جرأت تھا۔والد کا نام حافظ مان تھا۔دہلی میں پیدا ہوئے۔دہلی کی ناسازگار سیاسی حالات کے سبب جرأت کم سنی ہی میں اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد چلے آئے جو اس زمانے میں عیش وعشرت کا گہوارہ اور شعراء و ادباء کی پناہ گاہ تھا۔یہاں جعفر علی حسرت کی رنگِ شاعری کی بڑی دھوم تھی۔جرأت نے بھی ۱۵، ۱۶ کی عمر ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا اور جعفر علی حسرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔جوانی میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔لکھنؤ میں وفات پائی۔جرأت، لکھنوی تہذیب کے حقیقی ترجمان اور دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں۔انہوں نے تمام اصناف سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔جرأت کا پورا کلام پروفیسر اقتدا حسن نے تین جلدوں میں علی الترتیب ۱۹۷۰، ۱۹۷۱ اور ۱۹۷۵ میں نیپلز (اٹلی) سے شائع کیا۔جن میں غزلیات کثیر تعداد میں ہیں۔ اس کے علاوہ قصائد، مخمسات، ہجویات، مثنویات، مسدسات، واسوخت، ترکیب بند، ترجیع بند، سلام، نوحہ، مرثیہ وغیرہ بھی اچھی تعداد میں ہیں۔رباعیات، جلد میں شامل ہیں۔جن کی مجموعی تعداد ۲۷۶ ہے۔ان کی رباعیاں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں جن میں عشقیہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء (۱۷۵۷۔۱۸۱۷): انشاء مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔والد کا نام میر ماشاء اللہ مصدر تھا۔کم عمری ہی میں علومِ متداولہ سے فارغ ہو گئے۔شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔اردو، فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ترکی زبان میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔انشاء کی شخصیت، نابغۂ روزگار کی تھی۔وہ شاعر، زبان داں، عروض داں، داستان نگار، تاریخ گو، حاضر جواب، لطیفہ باز، بذلہ سنج اور نثر نگار تھے۔اردو میں کسی سے مشورۂ سخن نہیں کرتے تھے البتہ فارسی میں وہ مرزا فاخر مکین سے استفادہ کرتے تھے۔فی البدیہہ کہنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔دریائے لطافت، رانی کیتکی کی کہانی، لطائف السعادت تصانیف ہیں۔ان کے دیوان کی ورق گردانی کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے متعدد اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے جن میں رباعیات بھی شامل ہیں۔انشاء کی غزلوں میں جو رنگ پایا جاتا ہے وہی رنگ کم وبیش ان کی رباعیوں میں بھی ملتا ہے۔انشاء کے یہاں رباعیوں کی تعداد زیادہ نہیں اور ان کی رباعیوں کے موضوعات بھی متعین ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین (۱۷۵۷۔۱۸۳۵): سرہند میں پیدا ہوئے۔والد کا نام طہماس خاں تھا۔بچپن ہی میں دہلی آ گئے تھے۔فنِ سپہ گیری میں مہارت رکھتے تھے۔اوائلِ عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔شروع میں شاہ حاتم سے اصلاح لی پھر ان کے شاگرد محمد امان نثار کی شاگردی اختیار کی۔لکھنؤ میں مصحفی سے استفادہ کرتے تھے۔متقدمین اور متوسطین شعرائے فارسی کے کلام پر گہری نگاہ تھی۔کثیر اللسان تھے۔انہوں نے اپنے مجموعے 'مجموعۂ رنگین' میں سولہ زبان میں شعر کہے ہیں۔بہت ہی پرگو اور زود گو تھے۔انہوں نے ستائیس (۲۷) اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔تفہیم شعر اور نقدِ شعر کے حوالے سے بھی ان کی بہت اہمیت ہے۔فی البدیہہ کہنے میں مشاق تھے۔وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔اس کے علاوہ 'ریختی' کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔وہ خود کو 'علامہ' کے مرتبے پر فائز کرتے ہیں۔رنگین کے یہاں رباعیوں کے وافر نمونے موجود ہیں۔رباعی ان کے یہاں نئے تجربے سے گذرتی ہے۔رباعی، جو بلند اخلاقی اقدار کو فروغ دینے، تزکیۂ نفس کرنے اور عارفانہ و عالمانہ نکات کو موثر ترین انداز میں بیان کرنے کا ذریعہ تھی۔رنگین کے یہاں وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ جذبات اور ہجو گوئی کا ذریعۂ اظہار بنی۔رنگین نے عورتوں کے جذبات و معاملات کو عورتوں کی زبان، لہجے، مخصوص محاوروں اور روزمروں میں نظم کر کے 'ریختی' کا اختراع کیا تھا، وہی سب باتیں اپنی رباعیوں میں بھی پیش کی ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ (۱۷۷۲۔۱۸۳۸): فیض آباد میں پیدا ہوئے۔گھر کا نام عبداللہ تھا۔بچپن ہی میں اپنے والد شیخ خدا بخش کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ادبی، سماجی، سیاسی اور جسامت کے اعتبار سے ان کی شخصیت بہت وزنی تھی۔وہ اپنے عہد کے مقتدر ہستیوں میں سے تھے۔علومِ متداولہ کا حصول فرنگی محل سے کیا۔شادی نہیں کی تھی۔اردو اور فارسی دونوں زبان میں ان کا کلام موجود ہے۔ناسخ نے یوں تو کسی سے اصلاح نہیں لی مگر ان کے شاگردوں کی تعداد ۱۰۰ سے زائد تھی۔ان کی علمی استعداد اور استادانہ صلاحیت کے سب معترف و معتقد تھے۔'کلیاتِ ناسخ' مرتب یونس جاوید، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور سے ۲

جلدوں میں علی الترتیب ۱۹۸۷ اور ۱۹۸۹ میں شائع ہوا۔پہلی جلد میں ردیف وار غزلیں ہیں جبکہ دوسری جلد میں بقیہ غزلوں کے علاوہ رباعیات، قطعۂ تاریخ اور مثنویاں ہیں۔رباعیوں کی تعداد ۶۴ ہے۔جس میں وہی رنگِ سخن حاوی ہے جو غزلوں میں عمومی طور سے پایا جاتا ہے۔رباعیوں کے مضامین بھی روایتی نہ ہوکر 'تازہ گوئی' کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔اس میں بھی بلند آہنگی اور لہجے کی طمطراقیت کو صاف طور سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نواب سید محمد خاں رندؔ لکھنوی (۱۷۹۷۔۱۸۵۲): والد کا نام سراج الدولہ نواب غیاث الدین خاں تھا۔فیض آباد میں پیدا ہوئے۔شاعری ورثے میں ملی تھی کیونکہ ان کے والد بھی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔فیض آباد میں میر مستحسن خلیقؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور وفاؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔لیکن جب لکھنؤ آئے تو آتشؔ کی شاگردی اختیار کی۔آتشؔ نے ان کا تخلص وفاؔ سے رندؔ کر دیا۔رندؔ نے وفاؔ کا سارا کلام تلف کر دیا اور طرزِ آتشؔ میں شاعری کرنے لگے۔رندؔ فنِ عروض پر قدرت رکھتے تھے۔آخری وقت تک لکھنؤ ہی میں رہے۔عریضۂ جذام میں مبتلا ہوکر وفات پا گئے۔ان کا سارا کلام 'دیوان رندؔ' معروف بہ 'گلدستۂ عشق' میں شامل ہے۔یہ دیوان دو حصوں پر مشتمل ہے۔منشی نول کشور کے مطبع سے ۱۹۳۱ میں شائع ہونے والے اس دیوان کی ورق گردانی کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ رندؔ نے قصیدہ، مسدس، مثنوی، مخمس، قطعہ، قطعۂ تاریخ کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی کہی ہیں۔لیکن یہ رباعیاں تعداد میں صرف ۱۰ ہیں۔رندؔ کی رباعیوں کے موضوعات وہی ہیں جو ان کی غزلوں کے ہیں۔ان کی رباعیوں پر ان کی غزلوں کا عکس صاف طور سے نظر آتا ہے۔حصہ دوم کی رباعیاں تقدیسی نوعیت کی ہیں جبکہ حصہ اول میں شامل رباعیاں عشقیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔

سید مظفر علی اسیرؔ لکھنوی (۱۸۰۰۔۱۸۸۲): والد کا نام سید مدد علی تھا۔پیدائش امیٹھی میں ہوئی۔شادی کے بعد لکھنؤ آ گئے۔علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد، چچا، اور علمائے فرنگی محل سے کی۔مصحفیؔ کے خاص شاگردوں میں تھے۔فنِ شعر پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔علم عروض اور قافیہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔نصیر الدین حیدر شاہ کے دورِ سلطنت میں شاہی ملازمت سے وابستہ ہوئے اور واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں 'تدبیر الدولہ' اور 'مدیر الملک' کے خطابات سے نوازے گئے۔ واجد علی شاہ کے کلکتہ چلے جانے کے بعد اسیرؔ نے رام پور کے نواب محمد سعید خاں کے بچوں کی اتالیقی اختیار کی۔آخر عمر تک نوابینِ رامپور سے وابستہ رہے۔لکھنؤ میں انتقال ہوا۔اسیرؔ کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔امیرؔ مینائی، ریاضؔ خیرآبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ وغیرہ ان ہی کے شاگرد تھے۔غزلیہ شاعری کے برعکس ان کی رباعیاں زیادہ تر رثائی نوعیت کی ہیں۔جس میں واقعۂ کربلا کا بیان، شہدائے کربلا کا ماتم، اشکِ عزا اور فرشِ عزا کی عظمت کا بیان، حضرت امام حسین سے عقیدت و مودت کا اظہار جیسے مضامین نظم ہوئے ہیں۔حالانکہ ان کی رباعیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔'دیوانِ اسیرؔ' جو منشی نول کشور کے مطبع سے ۱۸۷۰ میں شائع ہوا تھا اس کے صفحہ نمبر ۴۷۶ سے ۴۷۷ تک جو رباعیاں درج ہیں ان کی تعداد محض ۱۱ ہے۔جس میں ایک رباعی مستزاد بھی شامل ہے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ لکھنوی (۱۸۰۳۔۱۸۷۵): محلہ بلی ماران، دہلی میں پیدا ہوئے۔والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔۷ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے اور ابتدائی تعلیم کی تحصیل یہیں سے کی۔منطق وحکمت کے ساتھ ہی مذہبی علوم میں ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔عربی و فارسی زبان میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔علمِ عروض سے بھی واقف تھے۔شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی مگر جلد ہی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے اور خود کو مرثیہ اور موضوعاتِ مرثیہ کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۲ برس کی عمر میں میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔دبیرؔ تخلص بھی میر ضمیرؔ ہی کا رکھا ہوا ہے۔غیر منقوط کلام میں مرزا دبیرؔ، عطارد تخلص استعمال کرتے تھے۔مرزا دبیرؔ نے جس ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس کی شعری فضا پر ناسخؔ کا جدید رنگِ سخن چھایا ہوا تھا، جس میں مضمون آفرینی کی مدد سے جدت وندرت پیدا کی جاتی تھی۔ دبیرؔ بھی ناسخؔ کے رنگِ سخن سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔انہوں نے ناسخؔ کی رنگِ شاعری کو مرثیوں میں برت کر مرثیے کو علمیت سے ہمکنار کیا۔وہ صنف جو محض رونے رلانے کا ذریعہ تھی دبیرؔ نے اسے علمیت اور قادر الکلامی کا اظہاریہ بنا دیا۔لکھنؤ کے علاوہ کانپور اور عظیم آباد وغیرہ میں مجلسیں پڑھنے جایا کرتے تھے۔مرزا انیسؔ کی وفات کے تین ماہ بعد ورمِ جگر کے سبب انتقال کیا اور نخاس واقع اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

دبیرؔ نے مرثیہ، سلام، قطعہ، مخمس، نوحہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی کثیر تعداد میں کہی ہیں۔ دفترِ ماتم کی ۲۰ ویں جلد میں جہاں نوحے، قطعات اور مناجات وغیرہ شامل ہیں وہیں ردیف وار رباعیاں بھی درج

ہیں۔ان رباعیوں کوموضوعات کے تحت ڈاکٹر سید تقی عابدی نے 'رباعیاتِ دبیر' کے عنوان سے یکجا کر دیا ہے۔ اس مجموعے میں دبیرؔ کی کل ۱۳۲۳ رباعیاں درج ہیں جن میں ۷۳ رباعیاں فارسی زبان میں ہیں۔اس طرح دبیرؔ کو حضرت غمگینؔ دہلوی کے بعد سب سے زیادہ رباعیاں کہنے کا شرف حاصل ہے۔ دبیرؔ کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر یہ بات بدیہی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کی رباعیاں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

میر ببر علی انیسؔ (۱۸۰۳۔ ۱۸۷۴): خدائے سخن میر انیسؔ کی پیدائش محلہ گلاب باڑی فیض آباد میں مشہور مرثیہ گو میر مستحسن خلیقؔ کے گھر ہوئی۔ وہ میر خلیقؔ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔مشہور مثنوی نگار میر حسنؔ ان کے دادا اور ہجو گو میر ضاحکؔ ان کے پر دادا تھے۔ وہ خاندانی شاعر تھے اور شاعری ان کا خاندانی فن تھا۔فیض آباد ہی میں علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ عربی و فارسی زبانوں کے ساتھ ہی علمِ دین، علمِ عروض، منطق و فلسفہ اور علمِ طب سے بھی واقفیت تھی۔خصوصاً فارسی زبان و ادب پر انہیں عبور حاصل تھا۔ انیسؔ نے کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔شاعری کی ابتدا تو غزل گوئی سے کی لیکن میر خلیقؔ کی نصیحت پر عمل کر کے سلام گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اپنے والد میر خلیقؔ سے اصلاح لیتے تھے۔شروع میں حزیںؔ تخلص اختیار کیا لیکن ناسخؔ کے مشورے پر اسے انیسؔ سے تبدیل کر دیا۔ ۱۸۴۶ کے آس پاس انیسؔ نے مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں انہیں کمال حاصل تھا۔مرثیہ لکھتے وقت اس بات کا مکمل دھیان رکھتے تھے کہ زبان بہت عام فہم ہو اور اسلوب پیچیدہ نہ ہو۔ وہ صحتِ الفاظ اور روز مرہ کے ساتھ ہی سامعین کی ذہنی سطح کا بھی خیال رکھتے تھے۔مرزا دبیرؔ کی بڑی قدر کرتے تھے۔لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا۔

انیسؔ کی شہرت و عظمت کا دارومدار ان کی مرثیہ گوئی پر ہے لیکن انیسؔ نے مرثیوں کے علاوہ سلام، نوحہ اور رباعی جیسی اصناف کو بھی اپنی گراں قدر تخلیقی ہنرمندی کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ انیسؔ نے بہ تقاضائے مجلس اور آدابِ مرثیہ خوانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کثیر تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔شروع میں یہ رباعیاں مرثیوں کے ساتھ ہی شائع ہوئیں لیکن بعد میں ان رباعیوں کو یکجا کر کے متعدد بار شائع کیا گیا۔ 'رباعیاتِ انیسؔ' سید تقی عابدی کا کارنامہ ہے۔ جس میں انیسؔ کی کل ۵۷۹ رباعیاں موجود ہیں۔اس مجموعے میں انیسؔ کی رباعیوں کو بہ لحاظِ موضوع، حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، اخلاقی، ذاتی، سماجی، اعتقادی اور رثائی موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ رباعیاں اخلاقی اور رثائی موضوعات کے تحت جمع کی گئی ہیں۔

شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی (۱۸۱۰۔ ۱۸۸۲): نام، امداد علی اور تخلص بحرؔ تھا۔والد کا نام شیخ امام بخش تھا۔فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ناسخؔ کے ارشدِ تلامذہ میں تھے۔نواب سید محمد یار خاں رندؔ کے دوست تھے۔ ماہرِ زبان اور عروض داں تھے۔صحتِ الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ان کی تصنیف 'بحر البیان' اردو زبان کی قواعد پر لکھی گئی اہم کتاب ہے۔طبیعت میں بے نیازی تھی اس لیے ساری زندگی تنگ حالی اور عسرت میں گذری۔آخر میں رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ پھر ان کی موت کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی فکر معاش سے دور رکھا۔آخری وقت میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

بحرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف کو بھی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ان کے دیوان 'ریاض البحر'، جو مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوا، میں ردیف وار غزلوں کے علاوہ آخر میں رباعیاں بھی درج ہیں۔صفحہ ۲۸۰ سے صفحہ ۲۸۲ پر موجود رباعیوں کی مجموعی تعداد ۳۰ ہے۔ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر یہ علم ہوا کہ یہ رباعیاں مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔زیادہ تر رباعیاں ذاتی اور تجرباتی نوعیت کی ہیں۔ جو ان کے مزاج اور فکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔غزلوں میں جہاں عام رنگِ سخن کی مانند بحرؔ نے معشوق اور معاملاتِ معشوق کو موضوعِ سخن بنایا ہے، رباعی چونکہ سنجیدہ مضامین کے اظہار کا اولین ذریعہ تھی، بحرؔ نے قدرے سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے مخصوص تشخص کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں قابل قدر اضافہ بھی کیا ہے۔انہوں نے فلسفہ اور اخلاقیات کے مختلف موضوعات کے ساتھ ہی تغیر زمانہ، رشتوں کے تلخ حقائق، علماء کی عظمت کا بیان اور مذہبی مضامین کو بھی اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے۔

میر نواب مونسؔ لکھنوی (۱۸۷۵۔ ۱۸۱۲): میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی اور میر مستحسن خلیقؔ کے بیٹے تھے۔ان کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی تھی۔اپنے والد اور بھائی کی طرح میر مونسؔ بھی ایک مرثیہ گو تھے۔حالانکہ انہوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن ان کی اصل شناخت ایک مرثیہ گو ہی کی ہے۔لکھنؤ کے علاوہ عظیم آباد اور راجہ محمود آباد کے یہاں مرثیہ پڑھنے جاتے تھے۔لکھنؤ میں انتقال ہوا اور میر انیسؔ کے پہلو میں دفن ہوئے۔میر مونسؔ، میر خلیقؔ سے اصلاح لیتے تھے لیکن ان کی وفات کے

بعد میر انیسؔ سے اصلاح لینے لگے۔ 'مجموعۂ مراثی میر مونسؔ' چھ جلدوں میں ہے۔ جس میں سلام اور رباعیاں بھی ہیں۔ چوتھے جلد کو چھوڑ کر بقیہ سبھی جلدوں میں رباعیاں موجود ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۴۵ ہے۔ یہ رباعیاں مذہبی، اخلاقی، ذاتی اور رثائی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

سید آغا حسن امانتؔ لکھنوی (۱۸۱۵۔۱۸۵۸): والد کا نام میر آقا علی عرف میر آغا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں سے علومِ متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ اوائلِ عمری سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ امانتؔ کی شاعری کی ابتدا سلام گوئی سے ہوئی لیکن جلد ہی وہ غزل کی طرف مائل ہو گئے۔ میاں دلگیر کے شاگرد تھے۔ ان کا تخلص دلگیر ہی نے تجویز کیا تھا۔ عارضۂ استسقاء کے سبب ۱۸۵۸ میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ امانتؔ کا سارا کلام 'خزائن الفصاحت' میں محفوظ ہے۔ امانتؔ نے جہاں غزل، واسوخت، مرثیہ، مخمس، ترجیع بند، مسدس اور سلام وغیرہ میں اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ وہیں انہوں نے رباعیات میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ 'خزائن الفصاحت' میں ان کی ۲۰ رباعیاں ملتی ہیں۔ یہ رباعیاں مختلف موضوعات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ زیادہ تر رباعیاں اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ کچھ رباعیاں ذاتی نوعیت کی بھی ہیں۔ اور کچھ صوفیانہ خیالات کی حامل ہیں۔

سید حسین مرزا عشقؔ لکھنوی (۱۸۱۷۔۱۸۸۵): والد کا نام سید محمد مرزا انسؔ تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عشقؔ تخلص اور آغا صاحب عرفیت تھی۔ میر ضمیرؔ کے داماد اور پیارے صاحب رشیدؔ کے چچا تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے ہم عصر تھے۔ مذہبی علوم کے ساتھ ہی فنِ سپہ گیری، تیراندازی، شہسواری اور خوش نویسی کے ہنر سے بہرہ مند تھے۔ عربی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔ علمِ عروض سے گہرا لگاؤ تھا۔ زبان کی باریکیوں نیز تذکیر و تانیث اور محاوروں کی صحت میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ چونکہ میر ضمیرؔ کے داماد تھے اور ان کی صحبتوں سے کسبِ فیض کرتے تھے وہیں سے مرثیہ گوئی کی تحریک ملی۔ اس طرح غزل کے ساتھ ہی مرثیہ بھی کہنے لگے لیکن کچھ وقت کے بعد غزل کو خیرآباد کہہ دیا اور پوری یکسوئی کے ساتھ مرثیہ گوئی میں منہمک ہو گئے۔ انہوں نے مرثیہ کو غزل کا لہجہ عطا کر اس میدان میں خوب نام کمایا۔ اپنے والد کی طرح استاد ناسخؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ مرزا عشقؔ نے دیگر مرثیہ نگاروں کی طرح رباعیات بھی کہی ہیں۔ 'مجموعہ مرثیہ میر عشق' جو مطبع منشی نول کشور سے ۱۸۸۱ میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں سلام، مرثیہ، تضمین اور مخمس کے ساتھ ہی رباعیات بھی شامل ہیں۔ رواجِ زمانہ کی ترتیب کے برخلاف مجموعے کا آغاز رباعیوں سے ہوتا ہے۔ صفحہ ۲ سے صفحہ ۲۲ تک کا صفحہ رباعیات پر محیط ہے۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۸۶ ہے۔ ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے لیکن واقعۂ کربلا ان کا مخصوص موضوع ہے۔ اخلاقی اور منقبتی رباعیاں بھی ملتی ہیں لیکن رثائی رباعیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

خواجہ ارشد علی خان قلقؔ لکھنوی (۱۸۷۹۔۱۸۲۰): نام خواجہ ارشد علی خان، تخلص قلقؔ، عرفیت خواجہ اسد علی اور خطاب آفتاب الدولہ تھا۔ قلقؔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ بہادر حسین فراقؔ تھا۔ خواجہ وزیرؔ، قلقؔ کے استاد اور حقیقی ماموں تھے۔ قلقؔ کا خاندان بہت ذی علم تصور کیا جاتا تھا اور اپنے عہد کے معززین میں شمار کیا جاتا تھا۔ قلقؔ اپنے شعری کمالات کے سبب واجد علی شاہ کے دربار سے منسلک ہو گئے اور بادشاہ کے مقربِ خاص بن گئے۔ بادشاہ نے انہیں آفتاب الدولہ، مہر الملک وغیرہ کے خطابات سے نوازہ تھا۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد قلقؔ بھی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے لیکن طبیعت کو وہ فضا راس نہ آئی اور لکھنؤ واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد نواب علی خاں کے دربار رامپور سے وابستہ ہو گئے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

قلقؔ نے مختلف اصناف کو اپنے احساسات کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا۔ لیکن ان کا اصل میدان غزل ہی رہا۔ 'مظہرِ عشق' ان کی غزلوں کا دیوان ہے۔ جو مطبع نول کشور کانپور سے ۱۹۱۱ میں شائع ہوا۔ انہوں نے مسدس، مخمس، تاریخی قطعات کے ساتھ ہی رباعی گوئی میں بھی اپنی جودتِ طبع کو آزمایا ہے۔ ان کے مذکورہ دیوان کے صفحہ ۱۹۶ سے صفحہ ۱۹۸ تک ۱۷ رباعیاں درج ہیں۔ جس میں ۴ رباعیاں فارسی زبان میں ہیں۔ قلقؔ کی رباعیاں مخلوق کا اپنے خالق کے تئیں بے پناہ عقیدت، محبت اور تعظیم کا اظہار یہ ہیں۔

سید مرزا تعشقؔ لکھنوی (۱۸۲۳۔۱۸۹۲): تعشقؔ، عشقؔ لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور ان کی طرح ہی اپنے عہد کے اہم مرثیہ گو شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم لکھنؤ

ہی میں حاصل کی۔شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن طبیعت میں مذہبی میلان ہونے کی وجہ سے جلد ہی سلام اور مراثی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں خوب نام پیدا کیا۔والد میر انسؔ بھائی میر عشقؔ اور استاد شیخ ناسخؔ سے اصلاحیں لیں۔لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔مرزا تعشقؔ نے مرثیہ کے علاوہ غزل، سلام، قصیدہ اور رباعی میں بھی اپنی تخلیقی قوت کا اظہار کیا ہے۔'تعشق لکھنوی (حیات، شخصیت، فن اور کلام)' از ڈاکٹر سید تقی عابدی جو شاہد پبلیکیشنز نئی دہلی سے ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی ہے۔اس میں ان کی رباعیاں شامل ہیں جو تعداد کے حساب سے ۲۷ ہیں۔ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا فکری دائرہ کافی وسعت رکھتا ہے۔ان کی رباعیوں میں شہیدانِ کربلا کا ذکر، اصغر کی مظلومیت کا بیان، خدا کی شفقت وسخاوت اور رحمت پر ایقان، حضرت امام علی اور حضرت امام حسین کی عظمت کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی اور قبر کی زندگی کا مختلف مثبت زاویوں سے بیان بھی موثر پیرائے میں ملتا ہے۔

واجد علی شاہ اخترؔ (۱۸۲۳۔۱۸۸۷): لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔اخترؔ تخلص تھا۔کبھی کبھی واجد تخلص بھی استعمال کر لیتے تھے۔والد کا نام سلطان امجد علی شاہ تھا۔۱۸۴۷ میں سلطنتِ اودھ کے تخت پر متمکن ہوئے۔سلطانِ عالم کے لقب سے مشہور تھے۔سلطنت جانے کے بعد واجد علی شاہ کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج کو اپنا مسکن بنایا۔لیکن ۱۸۵۷ کی بغاوت نے ان سے مٹیا برج کی سکونت بھی چھین لی۔۱۵ جون ۱۸۵۷ کو انگریزوں نے انہیں گرفتار کر فورٹ ولیم کالج میں نظر بند کر دیا۔جہاں سے ان کی رہائی ۹ جولائی ۱۸۵۹ کو ہوئی۔۲۰ ستمبر ۱۸۸۷ کو کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔واجد علی شاہ نے کثیر تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ 'ایمان' جو مطبع سلطانی سے ۱۸۸۴ میں شائع ہوا تھا، اس کا پہلا حصہ سلام کے دیوان پر مشتمل ہے۔جبکہ دوسرے حصہ میں مثلث، مخمس، تضمین وغیرہ کے ساتھ رباعیاں بھی درج ہیں۔اس میں صفحہ ۲۰۱ سے ۲۲۸ تک رباعیاں ہیں۔ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلا کہ ان میں چار مصرعوں پر مشتمل وہ رباعی نما نظم بھی درج ہے، جو رباعی کے مخصوص اوزان کی پابندی نہیں کرتی ہیں۔صفحہ ۲۲۱ پر ۱۴ اور ۱۵۰ نمبر کی رباعیاں، صفحہ ۲۲۴ پر ۱۷۵ نمبر کی رباعی، صفحہ ۲۲۶ پر ۱۸۷، ۱۹۰ اور ۱۹۱ نمبر کی رباعیاں اور صفحہ ۲۲۷ پر ۱۹۲، ۱۹۵ اور ۱۹۶ نمبر کی رباعیاں، بحر ہزج مثمن اخرب واخرم کے اوزانِ مخصوصہ میں نہ ہو کر کسی اور بحر میں ہیں۔لہٰذا چہار مصرعوں پر مشتمل یہ نظمیں رباعی نہ ہو کر قطعہ ہے۔اس طرح واجد علی شاہ کی رباعیوں کی صحیح تعداد ۱۹۳ ہے۔واجد علی شاہ کی رباعیوں کے زیادہ تر موضوعات کربلا اور شہدائے کربلا کے متعلق ہیں۔حضرت اکبر کے حسن و جمال کی تعریف، ان کی شہادت، حضرت امام حسین پر ٹوٹنے والے مظالم کا بیان، حضرت سکینہ کی مظلومیت کا بیان، حضرت عباس کی اطاعت و وفاداری، کربلا کی خاک کی عظمت، حضرات عون ومحمد کی شہادت کا بیان ان کی رباعیوں کے خاص موضوعات ہیں۔یہ رباعیاں درد واثر کی کیفیت سے مملو ہیں۔رثائی نوعیت کی یہ رباعیاں اپنے مذہبی مقاصد کی تحصیل تو بخوبی کرتی ہیں مگر فنی وفکری سطح پر کوئی اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتیں۔

مولوی محمد محسنؔ کاکوروی (۱۹۰۵۔۱۸۲۶): محسنؔ کاکوروی اردو شاعری میں نعت گوئی کے حوالے سے نہ صرف مقبول ومشہور ہیں بلکہ نعت گو شعراء میں منفرد وممتاز مقام رکھتے ہیں۔محسنؔ کاکوروی کی پیدائش کاکوری میں ہوئی۔وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ علم وعرفان کا گہوارہ تھا۔ان کے والد کا نام مولوی حسن بخش علوی تھا۔وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔محسنؔ کاکوروی کی تعلیم وتربیت ان کے دادا مولوی حسین بخش شہید، جو جید عالم اور بزرگ تھے، کے زیرِ سایہ ہوئی۔محسنؔ کاکوروی عربی، فارسی اور انگریزی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔قرآن وحدیث کا انہیں گہرا علم تھا۔انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اسے بطور پیشہ اختیار کیا۔وکالت کی پریکٹس آگرہ میں شروع کی لیکن غدر کے سبب وہاں سے واپس آنا پڑا۔اس کے بعد مین پوری کو اپنا میدانِ عمل بنایا۔آخری عمر تک وہیں رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔'کلیاتِ نعت مولوی محمد محسنؔ' جس کو ان کے بیٹے مولوی نور الحسن نیرؔ جو صاحبِ نور اللغات ہیں، نے مرتب کیا ہے۔یہ کلیات ۱۳۲۳ھ میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوا۔اس کلیات کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلا کہ محسنؔ کاکوری نہ صرف تمام اصناف شعر میں اظہار کی قوت وصلاحیت رکھتے تھے بلکہ ان کے صنفی مزاج سے بھی واقف تھے۔انہوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی کے ساتھ ہی تاریخ گوئی میں بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔اسی کلیات میں صفحہ ۱۹۰ سے صفحہ ۱۹۴ تک ۲۹ رباعیاں درج ہیں۔ان میں ۴ رباعیاں فارسی زبان میں ہیں۔اکثر رباعیاں عشق رسول کے جذبے سے سرشار ہیں۔

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی (۱۸۲۹۔۱۹۰۰): لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی کرم محمد تھا، جو صوفی، عالم اور خدا ترس بزرگ تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم والد صاحب سے ہی لی۔ فرنگی محل سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ سنسکرت اور ہندی زبان پر دسترس تھی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی نہایت شریف النفس، صوم وصلوٰۃ کے پابند، منکسر المزاج اور متقی و پرہیز گار شخص تھے۔ چونکہ امیرؔ مینائی کا خاندان شاہ مینا کی درگاہ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے امیرؔ مینائی نے بھی ان کی نسبت کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ اوائلِ عمری ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۵ برس کی عمر میں اسیرؔ لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور جلد ہی ان کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ اسیرؔ لکھنوی کی بدولت ہی واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے دربار سے وابستہ ہوئے پھر ان کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں سے منسلک رہے۔ جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو حیدرآباد کی طرف رخ کیا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ اسی بیماری کے عالم میں حیدرآباد میں انتقال ہوا۔

امیرؔ مینائی نے ادب کی اکثر اصناف میں اپنے خیالات و تجربات کو بیان کیا ہے۔ غزل، قصیدہ، واسوخت، نعت، مخمس، مسدس، مثنوی، ترجیع بند، تضمین، قطعہ، سلام، سہرا اور رباعی جیسی اصناف کو امیرؔ نے وسیلۂ اظہار کے لیے استعمال کیا اور اس میں بہترین نمونے پیش کئے۔ امیرؔ مینائی نے رباعیوں کا مجموعہ تو تخلیق نہیں کیا مگر ان کے نعتیہ اور غزلیہ دیوان میں رباعیاں بھی درج ہیں۔ غزلیہ دیوان 'دیوانِ امیرؔ' جس کا تاریخی نام 'مراۃ الغیب' ہے، اس میں صفحہ ۳۳۱ سے صفحہ ۳۳۵ تک ۳۰ رباعیاں درج ہیں۔ یہ رباعیاں زیادہ تر عشقیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح نعتیہ دیوان 'محامدِ خاتم النبیین' کے صفحہ ۱۴۶ سے ۱۴۹ تک ۱۹ رباعیاں درج ہیں۔ یہ رباعیاں تقدیسی مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس طرح امیرؔ مینائی کے رباعیوں کی کل تعداد ۴۹ ہوتی ہے۔

میر ضامن علی جلالؔ لکھنوی (۱۹۰۹۔۱۸۳۴): جلالؔ لکھنوی کئی حیثیتوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ماہر زبان، لغت نویس، عروض داں کے ساتھ ہی فن تحقیق میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں تو انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کے دواوین تاریخی قطعات سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعری میں ان کا سلسلہ شیخ ناسخؔ سے جا کر ملتا ہے۔ شروع میں میر علی خاں ہلالؔ پھر میر علی اوسط رشکؔ اور آخر میں مرزا محمد رضا برقؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ خاندانی پیشہ طبابت کا تھا اس لیے علم طب سے بھی گہری واقفیت تھی۔ جلالؔ کے یہاں رباعیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے کل ۱۷ رباعیاں کہیں ہیں۔ دیوان اول 'شاہد شوخ طبع' میں سب سے زیادہ گیارہ رباعیاں درج ہیں۔ ان رباعیوں کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ان کے چاروں مصرعوں کی شروعات ایک ہی حرف سے ہوتی ہے۔ ان رباعیوں میں ان کے استادانہ رنگ کا اظہار قوی انداز میں ہوا ہے۔ دیوان دوم 'کرشمہ گاہِ سخن' میں ۵ رباعیاں ملتی ہیں، جو خمریہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ دیوان سوم 'مضمون ہائے دل کش' میں ایک تہنیتی رباعی درج ہے۔ ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ رباعیاں مختلف روایتی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے یہاں دل کی عظمت کا بیان، محبوب کے حسن کی تعریف، اس کی شوخی اور ادا کا بیان، ہجر کی کلفتوں کا ذکر اور ناصح کا تمسخر اڑانے کے ساتھ ساتھ حمد و منقبت کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔

سید مصطفی میرزا پیارے صاحب رشیدؔ لکھنوی (۱۹۱۸۔۱۸۴۷): نام، سید مصطفی میرزا تخلص رشیدؔ اور عرفیت پیارے صاحب تھی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید احمد میرزا صابرؔ تھا۔ رشیدؔ کی والدہ میر انیسؔ کی سب سے چہیتی بیٹی تھیں۔ یعنی میر انیسؔ رشیدؔ کے حقیقی نانا تھے۔ رشیدؔ نے علومِ متداولہ کی تحصیل کی اور عربی و فارسی زبان میں مہارت حاصل کی۔ فنِ حرب وضرب مثلاً سپہ گیری، گھڑسواری اور تیغ بازی میں ثانی نہیں رکھتے تھے اور علمِ عروض، جفر، منطق و فلسفہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ باغبانی کا انہیں بہت شوق تھا۔ ان کی شخصیت بہت ہی متواضع تھی اور وہ بہت خوش اخلاق تھے۔ فالج میں مبتلا ہو کر دنیا سے کوچ کیا اور رکاب گنج لکھنؤ میں واقع 'باغِ میر عشق' میں دفن ہوئے۔

رشیدؔ کی شعری زندگی کا آغاز صغر سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ انہوں نے پہلا شعر دس برس کی عمر میں کہا اور اپنے چچا میرزا عشقؔ سے باقاعدہ اصلاح لینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی میر انیسؔ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ عشقؔ کی وفات کے بعد اپنے دوسرے چچا میرزا تعشقؔ سے بھی اصلاح لی۔ لکھنؤ کے علاوہ حیدرآباد، پٹنہ، رامپور اور کلکتہ میں خوب مجلسیں پڑھیں۔ بوستانِ رشیدؔ،

گلزارِ رشیدؔ اور مراثیِ رشیدؔ ان کے مراثی کے مجموعے ہیں۔گلستانِ رشیدؔ غزلوں کا دیوان ہے اور رباعیاتِ رشیدؔ میں ان کی رباعیاں درج ہیں۔رشیدؔ نے مرثیہ، سلام، قصیدہ، غزل اور رباعی جیسی اصناف کو وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا اور اس میں اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہے۔'رباعیاتِ رشیدؔ لکھنوی اور احوالِ پیری' رشیدؔ کی رباعیات اور سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں وہ رباعیاں بھی شامل ہیں جو 'رباعیاتِ رشیدؔ از خنجرؔ لکھنوی میں درج ہیں۔رشیدؔ نے ان رباعیوں میں مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ اور ذاتی موضوعات کو پیش کیا ہے۔ان کے موضوعات روایتی نوعیت کے ہیں جن میں جدت تو نہیں ہے لیکن اپنے زبان و بیان اور طرزِ ادا کے سبب کیف و تاثیر سے مملو ہیں۔اس لیے ان کو پڑھنے پر نیا پن اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔یوں تو رشیدؔ کی رباعیاں مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر رشیدؔ کا خاص موضوع پیری اور اس کے احوال ہیں۔جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

مرزا محمد جعفر علی اوجؔ لکھنوی (۱۸۵۳۔۱۹۱۷): مرزا سلامت علی دبیرؔ کے صاحب زادے تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔فارسی اور عربی میں مہارت رکھتے تھے۔علم عروض پر کامل قدرت حاصل تھی۔ان کی کتاب 'مقیاس الاشعار' عروض کی کتابوں میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔والد کے زیرِ تربیت اپنے شعری ذوق کو جلا بخشتے رہے۔اپنا کلام والد صاحب ہی کو دکھاتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔اس طرح رفتہ رفتہ فنِ شعر پر عبور حاصل کر لیا۔مرزا اوجؔ نے اپنی شاعری کا آغاز سلام گوئی سے کیا مگر ان کو شہرت مرثیہ گوئی سے ملی۔حیدر آباد، عظیم آباد اور کانپور میں ہر سال مرثیہ پڑھنے جاتے تھے۔لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا۔اپنے گھر میں مرزا دبیرؔ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مرزا اوجؔ کے کلام کا ایک حصہ ۱۹۲۴ میں ان کے شاگرد سید سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی نے 'معراج الکلام' کے نام سے شائع کیا۔اس کے بعد ان کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہ آسکا۔غالباً اس کی وجہ ان کے ورثاء کا عدم تعاون رہا۔جس کا اشارہ سید افضل حسین ثابتؔ لکھنوی نے مذکورہ کتاب میں شامل اپنے مضمون میں کیا ہے۔نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ سے شائع ہونے والے اس مجموعے میں مرثیوں، سلام، قطعہ وغیرہ کے ساتھ ہی رباعیات بھی موجود ہیں۔جن کی مجموعی تعداد ۲۵ ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر سید سکندر آغا نے اپنی کتاب 'مرزا محمد جعفر اوجؔ لکھنوی: حیات اور کارنامے' جس پر انہیں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی اور جو نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۸۵ میں شائع ہوئی تھی۔اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مرزا محمد صادق مرحوم کے حوالے سے ۵ رباعیاں اور پیش کی ہیں۔اس طرح مرزا اوجؔ کی رباعیوں کی کل تعداد ۳۰ ہوتی ہے۔یہ رباعیاں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔لیکن پیری و جوانی کا بیان ان کی رباعیوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ان کی اکثر رباعیوں میں جوانی کی کسک اور پیری کی حالتِ زار کا بیان ملتا ہے۔انہوں نے پیری و جوانی کے مضامین کو فلسفیانہ رنگ دے کر ندرتِ بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔کچھ رباعیاں منقبتی نوعیت کی ہیں۔جو حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے ذکرِ خیر سے عبارت ہیں۔کچھ رباعیوں میں حضرت محمدؐ کی حمد و ثنا کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے۔

سید ریاض احمد ریاضؔ خیر آبادی (۱۸۵۳۔۱۹۳۴): ریاضؔ، اودھ کے مردم خیز قصبہ خیر آباد ضلع سیتا پور میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سید طفیل احمد تھا۔ریاضؔ نے ابتداء میں اسیرؔ لکھنوی سے فیضِ سخن حاصل کیا اور ان کی وفات کے بعد منشی امیرؔ مینائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔وہ امیرؔ اور اسیرؔ دونوں استادانِ فن کے محبوب شاگردوں میں تھے۔ابتدا میں 'آشفتہ' تخلص اختیار کیا تھا۔خیر آباد میں انتقال کیا۔ریاضؔ کا دیوان 'ریاضِ رضواں' کے نام سے اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد سے ان کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ میں شائع ہو چکا ہے۔جسے ان کے شاگرد تلمذ حسین نے ترتیب دیا ہے۔اس دیوان کا تاریخی نام 'آتشِ گلِ تر' ہے۔اس میں دو حصے ہیں۔پہلا حصہ 'آتش تر' کے عنوان سے ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔جبکہ دوسرا حصہ 'آتشِ گل' کے عنوان سے ہے جو دیگر اصناف سخن کا مجموعہ ہے۔ریاضؔ نے غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔سہرا، مثنوی، خمسہ، مسدس، قطعہ اور رباعی کی مثالیں بھی ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں۔'ریاضِ رضواں' کے متعدد صفحات پر رباعیاں درج ہیں۔ان رباعیوں میں ریاضؔ نے مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔جن میں تہنیتی رباعیاں بھی ہیں اور رثائی بھی۔عجز و انکسار، ضعفِ پیری، بہار و خزاں کی نیرنگیاں، شباب کی کرشمہ سازیاں، اور قبر کے بیان سے متعلق رباعیاں بھی ملتی ہیں۔انہوں نے 'نو طرز' کے عنوان سے رباعی کے اوزانِ مخصوصہ میں سہرا بھی کہا ہے۔اس کے ساتھ ہی ریاضؔ نے روزہ کی حالت میں انسان کی کیفیت، پیاس کی شدت، افطار کی لذت، رمضان کی شام، ہلالِ عید، سحر

عیداور روزِ عید سے متعلق مضامین کو اپنی رباعیوں میں نظم کیا ہے۔

پنڈت دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی (۱۹۱۳۔۱۸۶۴): افقؔ لکھنوی شاندار شاعرانہ وراثت کے مالک تھے۔ان کے پردادا منشی ادے راج مطلعؔ اور دادا ایشوری پرشاد شعاعیؔ فارسی زبان کے شاعر تھے۔والد کا نام منشی پورن چند ذرہؔ تھا جو اردو میں شعر کہتے تھے۔بڑے بھائی منشی رام سہائے تمناؔ کا شمار بھی استاد شاعروں میں ہوتا تھا۔اس طرح شاعری افقؔ کا خاندانی فن تھا، جو انہیں ورثے میں ملا تھا۔افقؔ لکھنوی اپنے بڑے بھائی تمناؔ لکھنوی کی مانند ہی اپنے ماموں منشی شنکر دیال فرحتؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔۹ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔ہندی اور فارسی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے۔لیکن زیادہ تر کلام اردو زبان ہی میں ہے۔پہلے 'دل' تخلص اختیار کیا پھر اسے ترک کر کے 'افق' تخلص کو اپنایا۔افقؔ کا ۴۹ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

افقؔ کی شاعری مقصدی تھی اور وہ اس کے ذریعے قوم وسماج کی اخلاقی، قومی اور مذہبی اصلاح کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کی شعری زبان مشکل نہ ہو کر قدرے آسان ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں محاوروں اور کہاوتوں کا اس تخلیقی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے کہ وہ شعری خیال کا سب سے اہم جز بن گئے ہیں۔ان کی اس تخلیقی ہنرمندی کا اظہار رباعیوں میں قوی انداز میں ہوا ہے۔اکثر چوتھا مصرعہ محاوروں یا کہاوتوں ہی میں ہوتا ہے۔'لمعاتِ افقؔ' میں ان کی ۶۸ رباعیاں درج ہیں۔یہ رباعیاں زیادہ تر اخلاقی اور ناصحانہ نوعیت کی ہیں۔افقؔ کے یہاں مئے نوشی کے مضر اثرات کی نشاندہی، فضول خرچی پر ناپسندیدگی کا اظہار، خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی اپیل، علم وتعلیم کی عظمت کا اعتراف، اسلاف کی علمی عظمتوں پر مفاخرت کا اظہار اور منافرت وتعصب پر چوٹ کرتی ہوئی رباعیوں کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی ہمدردیٔ قوم، سچے انسان کی تعریف، صلاح ومشورہ کی اہمیت کا بیان، فرقہ وارانہ فسادات پر تکلیف کا اظہار اور ہندوستان کی عظمت کے مضامین پر مشتمل رباعیاں بھی ان کے مجموعے میں موجود ہیں۔

مرزا واجد حسین یاس یگانہؔ چنگیزی (۱۸۸۴۔۱۹۵۶): عظیم آباد کے مغل پورہ محلہ میں پیدا ہوئے۔والد کا نام مرزا پیارے صاحب تھا۔ابتدائی تعلیم عظیم آباد سے اور میٹرک کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔یگانہؔ شاعر و زبان دان ہونے کے ساتھ ہی علمِ عروض میں بھی مہارت رکھتے تھے۔چراغِ سخن علمِ عروض پر مبنی ان کی کتاب ہے۔طبیعت میں انا پرستی حد درجہ کی تھی۔جس سے ان کی شاعری اور شخصیت کو بہت نقصان ہوا۔یگانہؔ پہلے یاسؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ابتدا میں سید علی خاں صاحب بیتابؔ عظیم آبادی تلمیذ شادؔ عظیم آبادی سے کسب فن کیا۔بعد میں شادؔ عظیم آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔لکھنؤ میں پیارے صاحب رشیدؔ کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وکٹوریہ گنج میں دفن ہوئے۔یگانہؔ نے دو ادبی رسالے بھی جاری کئے۔کارِ امروز ۱۹۲۱ میں لکھنؤ سے اور صحیفہ ۱۹۲۵ میں اٹاوہ سے جاری کیا۔نشترِ یاسؔ، آیاتِ وجدانی، ترانہ، گنجینہ، چراغِ سخن، شہرتِ کاذبہ اور غالب شکن یگانہؔ کی تصانیف ہیں۔

یگانہؔ نے اپنے فن کا اظہار غزلوں کے ساتھ ہی رباعیوں میں بھی کیا ہے۔ان کی غزلیں ایک خاص قسم کے تیکھے پن، بانکپن اور مردانہ لب ولہجے سے عبارت ہوتی ہیں۔یہی تیکھا پن اور مردانہ رنگ وآہنگ ان کی رباعیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔غزلوں کی طرح ان کی رباعیوں کے موضوعات اکتسابی یا روایتی نہ ہو کر تجرباتی ہیں۔لہٰذا ان کے یہاں حسن وعشق، مئے و مینا اور صوفیانہ موضوعات کو موضوعِ شاعری بنانے کے بجائے زندگی، مسائلِ زندگی، انسانی رویے، خودداری وخود پرستی، عزم وحوصلہ اور حیات و کائنات کے متعلق مضامین ہی کو رباعیوں میں پیش کیا گیا ہے۔'ترانہ' ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔اس میں کل ۲۰۲ رباعیاں مندرج ہیں۔جن میں ۱۶ رباعیاں فارسی زبان میں ہیں۔کچھ رباعیاں مزاحیہ نوعیت کی ہیں اور کچھ میں غالبؔ کو حدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔'رباعیاتِ یگانہؔ' یگانہؔ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیوں کا مجموعہ ہے جسے عادل اسیر دہلوی نے مرتب کیا ہے۔اس میں ترانہ کے علاوہ وہ رباعیاں بھی شامل ہیں جو 'کلیاتِ یگانہ' مرتبہ مشفق خواجہ میں درج ہیں۔رباعیاتِ یگانہؔ میں رباعیوں کی کل تعداد ۴۴۱ ہے۔یہ رباعیاں یگانہؔ کی فکر اور ان کی پر پیچ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں۔انہوں نے اخلاقی، فلسفیانہ، عقیدہ وتشکیک، طنز واستہزا اور تصوف کے موضوعات پر کامیاب رباعیاں کہی ہیں۔

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی (۱۹۶۷۔۱۸۸۵): اثرؔ کی پیدائش لکھنؤ کے محلہ کٹرا ابوتراب میں ایک معزز خاندان میں ہوئی۔والد کا نام حکیم مرزا افضل خان تھا۔اثر بہت ذہین تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اثرؔ نے شعر گوئی کا آغاز ۱۱ برس کی عمر میں کیا تھا۔لسان الہند عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد

تھے۔ اثرؔ سے پہلے جعفر تخلص اختیار کرتے تھے۔ زبان و بیان پر انہیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ اردو ادب میں ان کی شناخت بطور غزل گو شاعر کی ہے مگر ان کی شخصیت کے کئی رخ ہیں۔ وہ سخن ساز کے ساتھ ساتھ سخن شناس بھی تھے۔ وہ شاعر تو تھے ہی نقاد، محقق، زبان داں، مترجم، فرہنگ ساز اور ماہرِ علمِ عروض بھی تھے۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے ۱۹۶۲ میں انہیں 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے نوازا۔ ۸۲ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ تال کٹورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

اثرؔ لکھنوی دبستانِ لکھنؤ کے شعرائے متاخرین میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے غزلوں، نظموں کے علاوہ صنفِ رباعی کو بھی اپنے خیالات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے قصائد اور قطعات بھی کہے ہیں۔ 'لالہ وگل' ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں ۱۸۸ رباعیاں ہیں۔ اس وہ ۷ رباعیاں بھی شامل ہیں جو عروسِ فطرت میں درج ہیں۔ یہ رباعیاں زیادہ تر عشق و رومان اور مناظرِ فطرت کی دلکش تصویر کشی پر مشتمل ہیں۔ جنت نشاں وادیِ کشمیر کے دلفریب مناظر کو بھی رباعیوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ و اخلاق کے گل بوٹے بھی اس کے دامن میں ٹنکے ہوئے ہیں۔

لالہ جگت موہن لال رواںؔ (۱۸۸۹۔ ۱۹۳۴): رواںؔ کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اناؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا۔ رواںؔ نے فارسی درسیات کے بعد میٹرک کیا۔ انگریزی سے ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور اناؤ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ساتھ ہی کتب بینی اور ذوقِ شعری کو بھی پروان چڑھاتے رہے۔ رواںؔ کا ہندی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ فارسی ادبیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ فلسفہ سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ وہ بہت ہی شریف النفس، منکسر المزاج اور نیک دل انسان تھے۔ انسان دوستی، بے لوث محبت اور آزادیِ فکر کے حامل تھے۔ رواںؔ کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ ۶ سال کی چھوٹی عمر میں پہلا شعر کہا۔ لسان الہند علامہ عزیزؔ لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ 'روحِ رواںؔ' شعری مجموعہ ہے۔ مختصر علالت کے بعد اناؤ ہی میں انتقال ہوا۔

رواںؔ نے مختلف اصنافِ سخن کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے استعمال کیا لیکن ان کا طبعی میلان رباعی گوئی کی طرف زیادہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب میں ان کی شہرت و عظمت کا دارومدار ان کی رباعی گوئی پر ہے۔ حالانکہ انہوں نے غزلیں، نظمیں، قطعات اور مثنوی بھی کہی ہے لیکن ان کی شناخت رباعی گو کی حیثیت ہی سے ہے۔ 'رباعیاتِ رواںؔ' عادل اسیر دہلوی کا کارنامہ ہے جس میں رواں کی تمام رباعیوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں 'رباعیاتِ رواں ۱۹۲۶'، 'روحِ رواںؔ ۱۹۸۳' اور 'باقیاتِ رواں ۱۹۸۴' میں شامل سبھی رباعیاں شامل ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۲۳۲ ہے۔ جس میں ایک رباعی فارسی زبان میں ہے۔ رواںؔ نے اپنی رباعیوں میں متنوع قسم کے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے رندی و سرمستی، ہستی کی ناپائیداری، دنیا کی بے ثباتی، فرد کی اہمیت، تہذیب کے نقصانات، دولت کی غرض و غایت، ریاکاری و مکاری کی مذمت، کائنات کی ماہیت، حرصِ دنیا، نفسِ امارہ کی مذمت، فلسفۂ جبر، فلسفۂ موت، فلسفۂ فنا و بقا، خوفِ خدا، کلفت و بے دلی، رحمتِ خداوندی، گناہ و توبہ کے مضامین کے ساتھ ہی حسن و عشق کی کیفیات اور عالمِ بہار کی کیف انگیزیوں کو اپنی رباعی میں پیش کیا ہے۔ جن میں زبان و بیان کی ندرت، تشبیہات و استعارات کا حسین استعمال، فکر کی بلندی، مشاہدے کی تیزی اور تجربات کی گرمی کو صاف طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالباری آسیؔ الدنی لکھنوی (۱۸۹۳۔ ۱۹۴۶): مولانا آسیؔ کی پیدائش قصبہ الدن میں ہوئی جو ضلع میرٹھ کے ہاپوڑ تحصیل میں واقع ہے۔ والد کا نام منشی خلیفہ حسام الدین احمد تھا جو اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور حسامؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ عربی و فارسی کی درسیات سے فارغ ہو کر فقہ و حدیث اور علمِ طب میں مہارت پیدا کی۔ ۱۹۱۲ میں مولانا محمد علی جوہرؔ کے مشہور اخبار 'ہمدرد' سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۱۴ میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں انتقال کیا۔ عیش باغ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ۱۹۰۴ میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ مولانا سید ابوالحسن ناطقؔ گلاوٹھی بلند شہری کے شاگرد تھے۔ مولانا ناطقؔ ہی نے عاصیؔ تخلص کو آسیؔ میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ابتدائے شعری میں آسیؔ نے دو۔ تین غزلوں پر استاد داغؔ سے بھی اصلاح لی تھی۔ اس طرح وہ داغؔ کے بھی حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ مولانا آسیؔ خود بھی درجنوں مشہور شاعروں کے استاد تھے۔ جن میں شوکت تھانوی، عمر انصاری، شہید بدایونی، زخمی لکھنوی اور اسد اللہ آبادی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی کے لکھنؤ کے مشہور استاد شاعر حضرت والی آسی ان کے حقیقی بیٹے تھے۔

آسیؔ کی رباعیوں کا کل سرمایہ 'رباعیاتِ آسی' پر، مشتمل ہیں، جس میں کل ۵۸۸ رباعیاں ہیں۔ اس میں وہ ۱۰۶ رباعیاں بھی شامل ہیں جو ان کی کتاب 'بصائر' میں درج ہیں۔ رباعیاتِ آسیؔ میں رباعیوں کو بہ لحاظِ موضوع یکجا نہیں کیا گیا ہے بلکہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے ردیف وار یکجا کیا گیا ہے۔ دیوانِ غزلیات کی طرز پر ترتیب دئے گئے اس مجموعے کو ہم پھر بھی دیوان کا درجہ نہیں دے سکتے کیونکہ اس میں تمام حروفِ تہجی پر ختم ہونے والی رباعیاں نہیں ہے لہٰذا یہ مجموعہ ہے دیوان نہیں۔ اس مجموعے کی ورق گردانی کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ آسیؔ کی رباعیوں کا کوئی مخصوص رنگ نہیں بلکہ ان کے رنگِ سخن میں کئی رنگوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان رباعیوں کے موضوعات بھی مستعار ہیں۔ یعنی وہ روایتی اور تقلیدی نوعیت کی ہیں۔ روایتی موضوعات پر مشتمل یہ رباعیاں آسیؔ کے کثرتِ مطالعہ اور شعرائے متقدمین سے عقیدت مندی کا مظہر ہیں۔

بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی (۱۸۹۷۔ ۱۹۷۰): منورؔ لکھنوی، ملک الشعرا افقؔ لکھنوی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے محلہ نو بستہ میں پیدا ہوئے۔ اردو، ہندی، سنسکرت، انگریزی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا۔ منورؔ لکھنوی خاندانی شاعر تھے۔ شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی۔ منورؔ تک یہ فن منشی ادے راج مطلعؔ، منشی ایشوری پرشاد شعاعیؔ، منشی پورن چند ذرہؔ اور منشی دوارکا پرشاد افقؔ سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس طرح منورؔ کا تعلق پانچویں پشت سے تھا۔ منورؔ نے شعر گوئی کا آغاز ۱۳ برس کی عمر میں کیا۔ ابتدائی کلام اپنے والد افقؔ لکھنوی کو دکھایا۔ والد کی وفات کے بعد منورؔ منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ کچھ عرصہ تک اپنے خسر منشی پچھمن پرشاد صدرؔ لکھنوی سے بھی اصلاح لی۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔

منورؔ بنیادی طور پر غزل اور نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں زبان و بیان کی کاریگری، مضمون آفرینی، شعری تراکیب، بندش کی چستی اور قادرالکلامی کی صفت سے مملو ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ منورؔ نے قطعہ اور رباعی جیسی اصناف میں بھی اپنے خیالات و تجربات کو پیش کیا ہے۔ ان کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ۱۹۲۹ میں 'نذرِ ادب' کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ قطعہ سے قطع نظر اس مجموعے میں شامل ان کی اکثر رباعیاں خمریہ رنگ و آہنگ میں ہیں۔ کہیں کہیں اخلاقی مضامین پر مشتمل رباعیاں بھی موجود ہیں لیکن بیشتر حصہ مئے و مینا کے تلازموں اور رندی و سرمستی کے مضامین پر محیط ہے۔ منورؔ کے رباعیات و قطعات پر مشتمل ایک غیر مطبوعہ مسودہ موسوم بہ 'زیرۂ گل' بھی ہے۔ جس کو پڑھ کر منورؔ کی قادرالکلامی اور بیان کی پختگی کا ادراک ہوتا ہے۔ دونوں مجموعہ ہائے رباعیات میں منورؔ نے جن موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں ان میں عشق و رومان، حیات و کائنات، اخلاق و عقیدہ جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ خمریہ موضوع پر بھی کامیاب رباعیاں ہیں۔

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۸۔ ۱۹۸۲): جوشؔ کی پیدائش ملیح آباد کے ایک جاگیردار خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام بشیر احمد خاں بشیرؔ تھا۔ جوشؔ فارسی، اردو، انگریزی اور عربی زبانوں سے واقف تھے۔ عربی تو انہوں نے مرزا محمد ہادی رسواؔ سے پڑھی تھی۔ جوشؔ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد گئے اور دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ناظرِ ادب کے عہدے پر فائز (۱۹۲۴۔ ۱۹۳۴) رہے۔ حیدرآباد سے دہلی آئے اور ۱۹۳۵ میں رسالہ 'کلیم' جاری کیا جو ۱۹۳۹ تک نکلتا رہا پھر یہ 'نیا ادب' میں ضم ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ سے ۱۹۴۸ تک فلموں میں گانے بھی لکھے۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۵ تک رسالہ 'آج کل' کی ادارت بھی کی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ میں پاکستان چلے گئے اور لغت نویسی میں مشغول ہوگئے۔ وہ بہت کثیر المطالعہ شخص تھے۔ تاریخ، فلسفہ، علمِ دین، ادب وغیرہ کے متعلق ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ جوشؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد بشیر احمد خاں شاعر تھے اور بشیرؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ دادا احمد خاں احمدؔ بھی شاعر تھے اور پردادا فقیر محمد خاں گویاؔ تو اردو کے معروف شاعر تھے۔ اس طرح جوشؔ خاندانی شاعر تھے۔ ان کو شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب اور شاعر فطرت کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جوشؔ نے شعر گوئی کا آغاز بہت کم عمر ہی میں کر دیا تھا۔ ابتدا میں وہ غزلیں کہتے تھے اور علامہ عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ وہ بہت پرگو اور زود گو شاعر تھے۔ غزل کے علاوہ نظم، مرثیہ، رباعی، مسدس وغیرہ بھی کثیر تعداد میں کہی ہیں۔ روحِ ادب (۱۹۲۰)، شاعر کی راتیں (۱۹۳۰)، نقش و نگار (۱۹۳۶)، شعلہ و شبنم (۱۹۳۶)، فکر و نشاط (۱۹۳۷)، جنون و حکمت (۱۹۳۷)، حرف و حکایت (۱۹۳۸)، آیات و نغمات (۱۹۴۱)، عرش و فرش (۱۹۴۴)، رامش و رنگ (۱۹۴۵)، سنبل و سلاسل (۱۹۴۷)، سیف و سبو (۱۹۴۷)، سرود و خروش (۱۹۵۳)، سموم و صبا (۱۹۵۴)، طلوعِ فکر (۱۹۵۷)، قطرہ و قلزم (۱۹۶۳)، نجوم و جواہر (۱۹۷۰)، الہام و افکار (۱۹۶۶) اور مضراب و

محراب (۱۹۹۳) شعری مجموعے ہیں۔ نثری تصنیف میں مقالاتِ زریں (۱۹۲۱)، اوراقِ سحر (۱۹۲۱)، ارشادات (۱۹۴۳) اور یادوں کی برات (۱۹۷۲) شامل ہیں۔

ان مجموعہ ہائے کلام میں زیادہ تر مجموعے نظمیات پر مشتمل ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ جوشؔ کی ناموری اور شعری امتیاز کا سبب ان کی نظمیں ہی ہیں۔ نظموں کے بعد انہوں نے جس صنف میں سب سے زیادہ اپنے فکر و خیال کو پیش کیا ہے وہ صنفِ رباعی ہے۔ جوشؔ کی پہلی رباعی ان کے پہلے مرثیے 'آوازۂ حق' (۱۹۲۱) میں مرثیہ سے قبل درج ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مجموعۂ کلام میں جوشؔ کی سیکڑوں رباعیاں موجود ہیں۔ جن میں 'شاعر کی راتیں' میں ۲۲ رباعیات، 'حسین اور انقلاب' (۱۹۴۱) میں ۵ رباعیات، 'آیات و نغمات' میں ۸۶ رباعیات، 'عرش و فرش' میں ۱۰۷ رباعیات، 'رامش و رنگ' میں ۱۲۶ رباعیات، 'سنبل و سلاسل' میں ۳۷۸ رباعیات، 'سیف و سبو' میں ۱۳۶ رباعیات، 'سرود و خروش' میں ۵ رباعیات، 'سموم و صبا' میں ۲۳۸ رباعیات اور 'محراب و مضراب' میں ۲۸۳ رباعیات درج ہیں۔ ان رباعیات کے علاوہ جوشؔ کی رباعیات پر مشتمل ۳ مجموعے بھی ہیں۔ ان کی رباعیات کا پہلا مجموعہ 'جنون و حکمت' کے نام سے محبوب المطابع برقی پریس دہلی سے ۱۹۳۷ میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۴۰۲ رباعیاں ہیں۔ یہ رباعیاں مختلف عناوین کے تحت جمع کی گئی ہیں۔ 'حقائق' کے عنوان سے ۱۴۸ رباعی، 'حسن و عشق' کے عنوان سے ۶۰ رباعی، 'پیرانِ سالوس' کے عنوان سے ۲۰ رباعی، 'خمریات' کے عنوان سے ۱۰۸ رباعی اور 'متفرقات' کے تحت ۶۶ رباعیاں درج ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعۂ رباعیات 'قطرہ و قلزم' ہے، جس میں ۳۰۳ رباعیاں درج ہیں اور آخری مجموعۂ رباعیات 'نجوم و جواہر' ہے، جو ۶۲۰ رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں 'قطرہ و قلزم' کی بیشتر رباعیاں بھی شامل ہیں۔ جوشؔ کی یہ رباعیاں تعداد میں تو زیادہ ہیں ہی، فکر و فن کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان رباعیوں میں رباعی گوئی کی ایک نئی روایت جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جوشؔ کی رباعیاں روایت سے انحراف بھی نہیں کرتی ہیں اور جدیدیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔ صنفِ رباعی جس تیزی، کاٹ اور نشتریت کی متقاضی ہے وہ جوشؔ کے اسلوب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حیات و کائنات کے مسائل ہوں یا جسم و روح کی کشاکش، حقائق کی تلاش و اظہار ہو یا عظمتِ انسان کا تصور، شیشہ و ساغر کی پر کیف صحبتیں ہوں یا اخلاق و اقدار کی یاد دہانی، آزادیِ انسان کی تبلیغ ہو فلسفہ کے ادق مسائل، غرض جوشؔ نے ہر موضوع پر کامیاب رباعیاں کہی ہیں۔ خمریہ مضامین کو نظم کرنے میں جوشؔ کو کمال حاصل ہے۔ اس میدان میں وہ عمر خیام سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر خمریہ رباعی میں عمر خیام کے انداز و اسلوب کی پیروی کی گئی ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملاؔ (۱۹۰۱۔۱۹۹۷): مجاہد اردو پنڈت آنند نرائن ملاؔ کشمیر الاصل برہمن تھے۔ ملاؔ کی شعر گوئی کی ابتدا انگریزی نظموں سے ہوتی ہے۔ ان کا کوئی استاد تو نہیں تھا لیکن وہ غالبؔ و اقبالؔ کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے نظموں، غزلوں، قطعہ اور رباعی جیسی اصناف میں اپنے احساس و نظریات کا اظہار کیا ہے۔ خلیق انجم کی مرتب کردہ 'کلیاتِ آنند نرائن ملا' میں ان کے تمام مجموعے شامل ہیں۔ اس کلیات میں جہاں روایتی اور جدید نظمیں، غزلیں اور دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل سرمایہ موجود ہے وہیں صفحہ ۳۵۷ سے ۳۶۳ تک ۳۸ رباعیاں بھی درج ہیں۔ یہ رباعیاں ان کے پہلے مجموعۂ کلام جوئے شیر (۱۹۴۹) میں شامل ہیں۔ یہ رباعیاں ان کے گہرے سماجی، سیاسی اور قومی شعور کی غماز ہیں۔ جہاں انہوں نے کچھ رباعیوں میں روایتی موضوعات کو پیش کیا ہے۔ تو وہیں متعدد رباعیوں میں تہذیب و زبان، سیاسی نظریات، امن و جنگ اور قوم پرستی کے متعلق بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ روایتی موضوعات کے تحت ملاؔ نے شراب کی اہمیت، یکسانیت کے نقصانات، وقت کی ستم ظریفی کا بیان،، نفرت و منافرت سے باز رہنے کی تلقین، حقیقتِ احباب، مسئلۂ تقدیر، حرکت و عمل کا پیغام، زندگی کی قلیل المدتی کا بیان، قحطِ وفا پر اظہارِ افسوس اور رومانی مضامین پر مشتمل رباعیاں کہی ہیں۔

ان بڑے ناموں کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی نام ہیں جنھوں نے دبستان لکھنؤ میں رباعی کے صنف کو فروغ بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے کسی بھی شاعر کا کوئی نمونۂ رباعی درج نہیں کیا گیا ہے۔ ان تفصیلات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دبستانِ لکھنؤ میں صنفِ رباعی کی ایک مستحکم روایت تھی اس روایت کو آگے بڑھانے میں کلاسیکل شعرا سے لے کر جدید شعرا تک سب نے اپنی سطح پر ریاضت کا فریضہ انجام دیا۔

☆☆☆

اردو کے غیر مسلم رباعی گو شعراء

خوشبو پروین
(ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

اردو کے ابتدائی عہد میں غیر مسلم رباعی گو شعرا میں سب سے پہلا نام جودتؔ کا سامنے آتا ہے جن کا وطن مرشدابادتھا۔ان کا انتقال شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ان کے بعد رائے سرب سکھ دیوانہؔ کا نام سامنے آتا ہے جن کا انتقال ۱۰۲۱ھ میں ہوا۔

اگر ہم شہر کلکتہ کی بات کریں تو وہاں بہادر دیپ کنورؔ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ان کی پیدائش ۱۸۱۵ء میں شہر کلکتہ کے ایک علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ والد مہاراجہ راج کشن دیب بہادر اردو زبان وادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ان کے دو اردو کے دیوان، دو مثنویاں اور چار جلدوں میں شاہنامہ ہند بزبان فارسی انگریزی ترجمہ کے ساتھ ہیں۔ڈاکٹر سلمہ کبریٰ نے تحقیق کر کے ان کی رباعیوں کی تعداد ۵۵ بتائی ہے ان کے یہاں مختلف موضوعات پر رباعیاں موجود ہیں۔وہ ایک رئیس زادے تھے اس لیے ان کی زیادہ تر رباعیوں میں رئیسانہ شان وشوکت نظر آتی ہیں۔

دل کو ہے دوری میں اس کی اضطراب
ہو گیا سو زدروں سے جی کباب
مانگتا ہوں میں خدا سے روز و شب
کاش کہ دلدار مل جاوے شتاب

ان کے بعد غیر مسلموں میں ایک مشہور شاعر رام سہائے تمناؔ (۱۸۵۴ء ۱۹۳۴ء) کا نام سامنے آتا ہے۔حضرت تمنا نے قریب دو سو کتابیں تصنیف کیں۔ان کے وفات کے بعد ان کے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر گوری سہائے نے ''انتخاب کلام تمنا مع مختصر تذکرہ'' شائع کیا جس میں دیگر اصناف کے ساتھ چند رباعیوں کو بھی شامل کیا ہے۔اسی سے ایک رباعی بطور مثال ملاحظہ ہو:

زبان نرم سے بیہودہ گفتگو کیسی
یہ خود کڑی نہیں سختی کی اس میں خو کیسی
زبان میں نام کو بھی استخواں کا نام نہیں
پھر ایسے گل کو ہی کانٹوں کی جستجو کیسی

جوش ملسیانی اردو ادب کا ایک نمایندہ شاعر ہے ان سے کون واقف نہیں ہوگا۔ان کا نام پنڈت لبھو رام اور جوش تخلص تھا۔ان کی پیدائش ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے گاؤں ملسیان میں ہوئی۔ شروع میں داغ دہلوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے لیکن یہ تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا کیونکہ داغ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔اس کے بعد انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ان کے مجموعہ ہائے کلام بادہ سرجوش، جنون وہوش اور فردوس گوش کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے جو رباعیاں کہی ہیں ان میں بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کا استعمال اور محاورات نظر آتے ہیں۔ان کی رباعیاں ان کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں۔بطور مثال ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

قبضے میں کلید گنج قاروں نہ سہی
تاج سر کاؤس و فریدوں نہ سہی
اے بحر کرم کچھ تو عطا کر مجھکو
قطرہ ہی سہی فرات و جیحوں نہ سہی

منشی تلوک چند محروم:

منشی تلوک چند محروم ۱۸۸۷ دریائے سندھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔تلوک چند محروم کا شمار رباعی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'رباعیات محروم' کے نام سے ان کی زندگی میں ہی 1946 میں طبع ہو چکا تھا۔اس مجموعہ پر علامہ اقبال، دتاتریہ کیفی کے لکھے گئے دیباچے بھی ہیں۔ڈاکٹر محمد اقبال رباعیات محروم کے متعلق لکھتے ہیں:

''رباعیات محروم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے۔ فلسفہ، اخلاق، روحانیت کے وہ نکتے جنھوں نے فارسی رباعیوں کو اس قدر پرمعنٰی بنادیا ان میں جابجا ملتے ہیں۔''42

محروم کی رباعیاں دنیائے ادب میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی رباعیوں میں دلکشی، رعنائی اور سادگی بدرجۂ اتم موجود ہے جس میں فنی پختگی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ان کی تمام رباعیاں معیاری ہیں۔ برج موہن دتاتریہ کیفی نے بھی محروم کی رباعیوں کی تعریف کی ہے:

''آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جن کی غائر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔آپ کے کلام کی پختگی اور اسلوب کی دلآویزی ملک کے نقادوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہے۔ان اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لئے ضرورت ہے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجو دہیں۔''43

محروم نے اپنی رباعیوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے چاروں مصرعے بہم مربوط ہوں۔اکبر الہ آبادی نے ان کے بارے میں کہا ہے:

ہے داد کا مستحق کلام محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

محروم نے اپنی رباعیات کو مختلف عنوانات کے ماتحت یکجا کیا۔ان کے یہاں ہر طرح کی رباعیات موجود ہیں۔ان کی ایک حمدیہ رباعی دیکھئے:

ہے طبع سخنوران نامی عاجز
حامی و نظامی و گرامی عاجز
میدان ثنائے قادر مطلق ہیں
عاجز ہے قادر الکلامی عاجز

محروم کی رباعیوں میں سرمد و خیام کی رباعیوں کا عکس نظر آتا ہے لیکن کبھی بھی انہوں نے اپنی تخلیق میں کسی اور کا رنگ شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ جو ان کے دل میں تھا اور اس وقت تک جیسے موضوعات چلے آرہے تھے اسے ہی سادگی کے ساتھ کہا۔

جگت موہن لال رواں:

جگت موہن لال رواں کی پیدائش ۱۸۸۹ میں اناؤ میں ہوئی۔رباعی کی دنیا میں فطری طور پر داخل ہونے والے شاعر ہیں۔وہ رباعی کی دنیا میں ایک ایسے وقت میں داخل ہوئے جب رباعی کے میدان اکبر وحالی کی اصلاحی رباعیوں سے گونج رہے تھے وہیں رواں نے فلسفہ کا درس رباعی کے ذریعہ شروع کیا۔رواں نے اپنی رباعیوں میں وطن، قوم اور سیاست کے تصورات کو توازن کے ساتھ پیش کیا۔رواں نے عشق کی وادیوں میں سفر کئے تو علاقے کے عکس کو بھی پیش کیا۔رواں رباعی کی دنیا میں اپنی فلسفیانہ رباعیوں کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔

رواں کی رباعیوں کے متعلق ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''رواں کی رباعیاں میں خیالات کی بلندی، بندش کی چستی، طرز ادا کی جدت، نازک تشبیہات اور حسین استعارات موجود ہیں۔ان رباعیات میں ایک روانی اور ترنم بھی موجود ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی رباعیات کا خاص موضوع فلسفہ ہے لیکن فلسفہ کی آمیزش نے ان کی رباعیات کو دقیق، خشک اور بے آب ورنگ نہیں بنایا بلکہ حسن وخوبی میں اور اضافہ کر دیا۔''39

رواں کی رباعیات کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہم کو اس وقت درس فلسفہ دیا جب ہم اس کو بھول چکے تھے۔ان کی چند رباعیاں دیکھئے:

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
ایک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

دل صرف حصول جام و مینا کردے
جاں وقف سرور کیف و صہبا کردے
تو راز نشاط پوچھتا کیا ہے
غرق مئے ناب ذہن وینا کردے

جذبؔ عالم پوری:

جذبؔ عالم پوری ۱۸۹۴ میں پیدا ہوے۔ رباعی کی تاریخ میں جنوب کے اول اہم غیر مسلم شاعر ہیں۔ راگھوندان کا نام اور رجذبؔ تخلص تھا ان کی پیدائش رایچور کرناٹک میں ہوئی۔ ان کے والد پنڈت رام راؤ تھے جن کا لگاؤ شعروشاعری سے تھا۔ گھریلو ماحول کی وجہ سے جذب اردو شاعری کی جانب مائل ہوئے۔ ارمغان جذب، آہنگ جذب، تحفہ جذب، رباعیات جذب، ساز غزل اور صد پارہ جذب ان کے اہم شعری مجموعے ہیں۔ رباعیات جذب کے علاوہ آہنگ جذب اور صد پارہ جذب میں بھی کافی تعداد میں رباعیاں ہیں۔ ان کی رباعیوں کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ سخن فہمی اور مشاقی ان کا شیوہ ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی، مذہبی اور فلسفیانہ موضوعات پر رباعیاں ملتی ہیں۔ اس وقت کے موضوعات کے حساب سے ان کی زیادہ تر رباعیوں میں اخلاقی تعلیم کا پیغام دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور رباعیوں کی خصوصیات میں جذبے اور فکر کا حسین امتزاج، انداز بیان کا رچاؤ اور اسلوب ادا کی شائستگی ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

صدہا ہوئے نذر تیغ دارا کی طرح
لاکھوں گئے زیر خاک کسریٰ کی طرح
کیا اب بھی نہ سمجھوگے اجل ہے کیا چیز
ویراں کیے جس نے شہر صحرا کی طرح

فراق گورکھپوری:

فراق گورکھپوری کی پیدائش ۱۸۶۹ میں ہوئی۔ فراق اردو ادب کی وہ شاخ ہیں جنھوں نے اردو کے مایہ ناز شاعر اقبال اور جوش کی طرح اردو زبان کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ فراق کا انداز بیان اور لب ولہجہ بالکل نیا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی حیات بخشی ہے۔ انھوں نے رباعی گوئی کو ایک نئی راہ بخشی ہے۔ رباعی کو ایسے گل بوٹے سے سجایا کہ وہ 'روپ' میں ڈھل گیا۔ جس میں رنگ کے ساتھ ساتھ رس بھی ہے۔ فراق کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' کے نام سے شائع ہوا۔ فراق کی رباعیوں میں محبوب کا سراپا، اس کی چنچل آنکھوں میں گنگناتی ہوئی شام کا منظر، اس کی زلفوں کی تعریف اور اس خوبصورتی کا ذکر ملتا ہے۔ فراق کی رباعیوں میں ہندوستانی عورتوں کا عکس پوری طرح دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں پنگھٹ پر گگریوں کا چھلکنا، معصوم کنواریوں کا کھیتوں میں دوڑنا، گیلی ساڑی پھیلانا، ساجن کی یاد میں اداس ہونا اتنا حقیقی معلوم ہوتا جس سے ہم سب آشنا ہیں اور یہی چیزیں ہیں جو ہمارے سماج کی زینت ہیں۔

فراق نے کل پانچ سوانہتر (569) رباعیاں کہی ہیں جن میں 'روپ' میں تین سو اکیاون (351) روح کائنات میں اڑسٹھ (68) گلبانگ میں مادر ہند کے تحت اٹھانوے (98) فکریات کے عنوان سے اکیاون (51) اور متفرق میں ایک رباعی موجود ہے۔ فراق نے ان رباعیوں میں ہندوستانی تمدن، گنگا جمنی تہذیب اور ہندوستانی عورت کے جمالیات کا مظاہر کیا ہے جس سے ان کے تخیل اور ان کے طرز ترسیل کا انوکھا رنگ نظر آتا ہے۔

فراق اپنے مجموعۂ کلام 'روپ' میں ہندوستانی کلچر وثقافت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''جہاں تک ایسی شاعری کا تعلق ہے جسے ہم صحیح معنیٰ میں ہندوستانی کہہ سکتے ہیں جس میں یہاں کی فضا کی گرمی ہو، ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہو، یہاں کی ہواؤں کی لچک ہو، یہاں کے آکاش سورج اور چاند ستاروں کا آئینہ بنیں اور ان کو آئینہ دکھائیں۔ یہ صفات اردو شاعر میں ابھی کم آئی ہیں۔ شاعری میں کوشش خواہ غزل ہو یا نظم کا رباعی محض اضطراری چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی کوششوں میں بھی ہندوستان اور ہندوستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندہ رگوں کو چھو لینا چاہتا ہوں۔''49

فراق جس طرح رباعی میں کھل کر سامنے آئے ہیں اس طرح اپنی غزلوں اور نظموں میں بھی نہیں آئے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں استعارات وکنایات اور تشبیہات کا خوبصورت ذخیرہ جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی چند رباعیاں دیکھئے جو زلف کی تعریف میں کہی گئی ہیں:

نکھری ہوئی زلف جگمگاتی ہوئی زلف
تقدیر کے پیچ و خم دکھاتی ہوئی زلف

مدھم لے میں چھڑا ہے ساز ہستی
جیون سنگیت گنگناتی ہوئی زلف

■

راتیں برکھا کی تھرتھراتی ہیں کہ زلف
تقدیریں پیچ و تاب کھاتی ہیں کہ زلف
پرچھائیاں کانپ کانپ جائیں جیسے
متوالی گھٹائیں گنگناتی ہیں کہ زلف

فراق کی رباعیوں کے متعلق اقبال ماہر رقم طراز ہیں:

''روپ کی رباعیوں میں فراق نے ہزارہا سال پرانی لیکن سدا سہاگن ہندو وجدان اور ہندو ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کا ثبوت دیا ہے۔ اگر ہم تمام اردو شاعری میں ہندو تصور حسن کو تلاش کرنا چاہیں تو اس تصور کے حقیقی کارنامے اور نمونے ہمیں رباعیوں میں ملیں گے۔''50

فراق کی چند رباعیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ہودی پہ کھڑی کھلا رہی ہے چارا
جوبن رس انکھڑیوں سے چھلکا چھلکا
کومل ہاتھوں سے ہے تھپکتی گردن
کس پیار سے گائے دیکھتی ہے مکھڑا

■

اٹھنے میں ہمالہ کی گھٹاؤں کا ابھار
انداز تشت چڑھتی ندی کا اتار
رفتار میں مدھ بھری ہواؤں کی سنک
گفتار میں شبنم کی رسیلی جھنکار

عرش ملسیانی:

عرش ملسیانی ۱۹۰۸ میں پیدا ہوئے جن کا پورا نام بالمکند عرش ملسیانی تھا۔ جوش ملسیانی کا ذکر اپر آ چکا ہے۔ دونوں میں صرف آبائی وطن کی مماثلت نہیں ہے بلکہ عرش جوش کے لڑکے تھے جنہوں نے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اپنے والد جوش ملسیانی کے پاکستان چلے جانے کے بعد عرش ماہنامہ آج کل کے مدیر کے عہدے پر بھی رونق افروز ہوئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۲۶ رہیں۔ شاعری میں ہفت رنگ، چنگ و آہنگ، شرار آہنگ، آہنگ حجاز، بیوہ سہاگن، گاندھی گان، عرش، نغمہ سرمد ہیں۔ تحقیق و تنقید میں دیدار غالب، فیضانِ غالب، اردو کی مزاحیہ شاعری، مولانا آزاد، راجہ رام موہن رائے، امیر خسرو، ہست و بود، ہم ایک ہیں، پوسٹ مارٹم۔ تراجم میں قاضی نذرالاسلام، بنگرواڑی، ایک ہمارا جیونا، ادھ چنی رات، ہند قدیم کی تمدنی تاریخ کے علاوہ کچھ ہندی تراجم بھی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے میں رباعیاں موجود ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

بادہ ہے کہ ہے نسخہ تسخیر قلوب
بوتل ہے بغل میں کہ ہے وصل محبوب
یوں ملتے ہیں لب جام مئے احمر سے
خورشید و شفق جیسے بہ ہنگام غروب

بخشی اختر امرتسری:

بخشی اختر امرتسری کی پیدائش ۱۹۰۹ء کو ہوئی۔ اختر ان کا تخلص تھا۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا اس وقت کی جب وہ آٹھویں کلاس میں تھے۔ اپنی شاعری کی اصلاح کے لیے انہوں نے دہلی کے مشہور استاد جناب منشی پیارے لال رونق کی شاگردی اختیار کی۔ ''رباعیات اختر'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۳۲۴ رباعیاں شامل ہیں۔ ان کی رباعیوں میں تصوف کے مماثل موضوعات کے ساتھ پند و نصائح، فلسفہ، اخلاقی زوال، شراب اور عشق وغیرہ ہیں۔

اے حسن سراپا مجھے جلوہ تو دکھا
ہاں رخ پر نور مجلی تو دکھا
سن لی ہے بہت یہ لن ترانی تیری
پردہ تو اٹھا روئے مصفا تو دکھا

کرشن گوپال مغموم:

کرشن گوپال مغموم ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کی پیدائش موضع دومیل ضلع اٹک میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی پوری تعلیم لاہور اور راولپنڈی میں حاصل کی۔ رباعیات مغموم میں ان کی ۲۹۵ رباعیاں ہیں اور جہاں نما میں ایک ہزار رباعیاں۔ موصوف کے شعری مجموعوں پر نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تمام اصناف سخن پر قلم اٹھایا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے رباعیوں میں خصوصی توجہ دے کر اردو رباعی کی دنیا کو مالا مال کیا۔ انہوں نے رباعیوں کو فلسفہ سے دور رواں دواں زندگی کو پیش کیا ہے اور سادہ و سلیس اسلوب بیان اپنایا ہے۔ ان کے کافی تعداد میں رباعیاں موجود ہیں۔

میخانہ لٹاتی ہوئی آنکھیں توبہ !
مدہوش بناتی ہوئی آنکھیں توبہ !
یہ کیف وسرور اور تبسم پاشی
جادو سا جگاتی ہوئی آنکھیں توبہ!

جگن ناتھ آزادؔ:

جگن ناتھ آزادؔ کا شمار اردو دنیا میں ایک شاعر اور ماہر اقبالیات کے طور پر ہوتا ہے۔ان کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں پنجاب کے ایک شہر عیسیٰ خیل میں ہوئی اور وفات ۲۴ر جولائی ۲۰۰۴ء کو نئی دہلی میں۔ تقسیم ہند سے قبل ان کی زندگی کا بیشتر حصہ راولپنڈی میں گزرا۔آزادی کے بعد دہلی آئے جہاں ان کی ادبی زندگی پروان چڑھی۔انہوں نے قلمی زندگی کی شروعات شاعری سے کی اور تین شعری مجموعے ''بے کراں''، ''ستاروں سے ذروں تک''، ''وطن میں اجنبی'' اور ''نوائے پریشان'' منظر عام پر آئے۔ان تمام مجموعہ ہائے کلام میں کل ۵۶ رباعیاں موجود ہیں جس میں حسن وعشق کی کیفیات، وطن سے دوری کا دکھ درد، تقسیم کے عکس کے ساتھ شباب کی رنگینیاں اور تصوف کے مزاج کی حامل رباعیاں بھی ہیں۔ایک رباعی بطور مثال ملاحظہ ہو:

طوفاں سا روح میں اٹھاتی ہوئی آئیں
احساس میں نشتر سے چلاتی ہوئی آئیں
بچھڑے ہوئے احباب کی پیاری یادیں
پھر آج مرا درد بڑھاتی ہوئی آئیں

راجندر بہادر موجؔ:

راجندر بہادر موجؔ ضلع فرخ آباد اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۳ جولائی ۱۹۲۲ء کو ہوئی، والد کا نام منشی کنور سکسینہ تھا۔ان کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آئے، جن میں ''موج ساحل''، ''موج در موج''، ''ساگر''، ''موجیں''، ''لہریں'' اور ''طوفان'' ہیں۔ ان شعری مجموعوں کے نام سے ہی محسوس ہوجاتا ہے کہ انہوں نے فطرت نگاری میں خاص توجہ دی ہے۔۔''ساگر'' ان کی رباعیوں اور قطعات کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۰ر رباعیاں ہیں۔لہریں میں ۱۱ر رباعیاں اور موجیں میں ۱۰۵ر رباعیاں ہیں۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں واردات قلبی اور رموز ہستی کو خصوصی طور پر پیش کیا ہے جن میں رومان اور اخلاق بھی پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں آخری مصرع سے متاثر کن کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔مثال:

خاکی تو ہوں لیکن آتش فشاں ہوں میں
قطرہ ہی سہی مرکز طوفاں ہوں میں
ہے دیدنی ہے موجؔ مرا ظرف بلند
قوت ہے فرشتوں کی اور انساں ہوں میں

گیان چند جینؔ:

گیان چند جینؔ کا شمار اردو کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش ۱۹ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو سیوہارہ میں ہوئی اور وفات ۹۱ر اگست ۲۰۰۷ کو کیلیفورنیا، امریکہ میں ۸۳ سال کی عمر میں ہوئی۔وہ اردو کے ناقد و محقق شاعر اور استاد بھی تھے۔وہ اقبال کی شاعری سے متاثر تھے اور بانگ درا کی تقلید کرتے تھے لیکن ابتدا میں انہوں نے عشق و رومان کے مضامین کو برتا۔ ''کچے بول'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعہ میں ان کی ۸۷ر رباعیاں درج ہیں۔انہوں نے جوش اور اقبال کی تقلید ایک حد تک کی ہے، اس کا اثر ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتا ہے، اخلاقی و اصلاحی رباعیاں بھی کہی ہیں۔

اب بھی ترے نام کی کشش باقی ہے
کچھ کچھ وہی پہلی سی روش باقی ہے
گو عشق سے ہاتھ دھو چکا ہے کب کا
پھر بھی دل مردہ میں خلش باقی ہے

کالی داس گپتا رضا:

کالی داس گپتا رضا کی پیدائش ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء کو ضلع جالندھر میں ہوئی اور وفات ۲۰۰۱ء میں۔ان کی شناخت اردو دنیا میں بیک وقت قابل ادیب انشا پرداز، عظیم محقق اور قابل قدر ناقد کے طور پر ہوتی ہے۔انہوں نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ خاصی تعداد میں رباعیاں بھی کہی ہیں ۔''شعاع جاوید'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۶۳ر رباعیاں ہیں ۔اس کے علاوہ ''شاخ گل'' میں ۲۶ر اور ''شعلہ خاموش'' میں ۳۹ رباعیاں ہیں ۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں حیات انسانی کے گوناگوں مسائل، اخلاقیات، مناظر فطرت اور حسن وعشق جیسے معاملات کو پیش کیا ہے۔اردو دنیا میں انہوں نے خود کو بطور ماہر غالبیات متعارف کروایا ہے۔الغرض انہوں نے اردو دنیا کو ہر طرح سے نوازا ہے۔ایک رباعی بطور مثال پیش ہے۔

احساس شرر رنگ ، نظر شعلہ بجاں
باندھا ہے عجب ضبط محبت نے سماں
اے راز دروں !اور دروں ،اور دروں
اے درد نہاں ! اور نہاں ، اور نہاں

امیر چند بہارؔ:

امیر چند بہارؔ کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں گاؤں روکھڑی ضلع میانوالی مغربی پنجاب میں ہوئی ۔ امیر چند بہار کے بارہ شعری مجموعے شائع

ہوئے ہیں جن میں سب سے پہلا شعری مجموعہ ''نسیم مغرب'' ہے۔ اس کے بعد رباعی کی جانب رجوع کرتے ہیں ''نسیم بہار''، ''دین و دنیا''، ''انسان بنو'' کے نام سے مجموعہ شائع ہوا۔ پھر بہارؔ کے رباعیات کا چوتھا مجموعہ ''اردو ہے جس کا نام'' ہے جو تقریباً ایک سو پچاس رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ساری رباعیاں اردو کے موضوع پر ہیں۔ جس کو وہ دس ذیلی عناوین ابتدائیہ، قومی ورثہ، اردو اور جنگ آزادی، اردو کا سیکولر مزاج، ماضی حال مستقبل، اردو زبان کی چاشنی، اردو زبان کی اہمیت و آفاقیت، عناد و مخاصمت بیجا، زبان و مذہب، صائب مشورہ اور اردو ادب ہیں:

یہ بغض ، یہ بیر ، یہ خصومت کیسی
اک شیریں زبان سے عدوات کیسی
غالب سے اگر پیار ہے اتنا تو بتائیں
اردو سے پھر اس درجہ کدورت کیسی

کندن لال کندنؔ:

کندن لال کندنؔ کا نام جدید اردو رباعی گو شعرا میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے کہ رباعی گوئی کے ساتھ ہی انہوں نے سحر عشق آبادی کے رباعی کے بارہ نئے اوزان ڈاکٹر اوم پرکاش زار علامی کے اٹھارہ نئے اوزان کو اپنی رباعیوں میں برتا ہے۔ یہ اوزان رباعی کے بحر ہزج کے اخرب اور اخرم کے چوبیس اوزان کے سوا ہیں۔ اس طریقے سے انہوں نے رباعی کے فن میں ایک خوبصورت اضافہ کیا اگرچہ ان اوزان پر کندن لال کندن کے سوا کسی اور نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔ ان کی اس کتاب کا نام ''ارمغانِ رباعیاتِ کندن'' ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱۹۳۶ء میں تونسہ شریف کے قریب کوٹ قیصرانی میں ہوئی۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے ساتھ شاعری کی اور عروض کے فن پر ''ارمغانِ عروض''، ''عروض و پنگل و خلیل'' اور ''معراج فن'' جیسی کتابیں بھی تحریر کیں۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں مروجہ مضامین سے الگ ہٹ کر سیاسی موضوعات، مذہب، اخلاق اور سماج پر طنز کیا ہے ساتھ ہی اصلاحی رباعیاں بھی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

تو چندے آفتاب چندے ماہتاب
ہے دنیا کے حسن میں تیرا نہ جواب
چشم باطن ہے گر کوئی دیکھے
تو دیکھے گا تیرا جلوہ بھی شتاب

ان کے علاوہ کرشن کمار طورؔ، سوامی شیا مانند سرسوتی وغیرہ شعراء ہیں جنہوں نے رباعی کی جانب خاص توجہ دی اور اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

☆☆☆

رباعیات

ڈاکٹر ہارون رشید، لکھنؤ

جز تیرے نہیں اور کوئی بھی معبود
بس تو ہی دو عالم میں ہے تنہا مسجود
منکر کے لیے صرف سموم اور حمیم
مومن کے لیے سایۂ سدرِ مخضود

■

ہارون وہی لوگ بہت خوب ہوئے
احکام الٰہی جنھیں مرغوب ہوئے
کھٹکے وہ ابوجہلوں کی آنکھوں میں مگر
اللہ کے محبوب کے محبوب ہوئے

■

سرت ہے کہ پھر خواب سہانا دیکھوں
گلشن میں بدلتا ہوا صحرا دیکھوں
تاریک پڑا ہے جو بہت عرصے سے
اب دل کے اس آنگن میں اجالا دیکھوں

■

مانگا نہیں اوروں سے اجالا ہم نے
پہلوئے سخن خود ہی نکالا ہم نے
جب شعر کہا کوئی تو پہلے ہارون
دریائے معانی کو کھنگالا ہم نے

■

مسجد بھی تری اور شوالا تیرا
موجود ہے دونوں میں حوالہ تیرا
بھٹکا نہیں سکتے ہیں اندھیرے اسکو
جس دل میں فروزاں ہے اجالا تیرا

میرٹھ کے اہم رباعی گو شعراء: ایک جائزہ

ڈاکٹر ارشاد سیانوی

(استاد، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، اتر پردیش۔ موبائل: 9759238472)

فرانسیسی زبان میں ادب کے لیے جس لفظ کا استعمال ہوتا ہے اس کے معنی ہیں ''حسین تحریریں''۔ ہم یقین کے ساتھ یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ ادب حسین اور خوبصورت تحریروں کا ایک عمدہ مرقع ہے جس میں اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور معاشی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بہت سے شعرا و ادبا نے اپنی تخلیقات میں حسن کی ایسی ہی جھلکیوں کو پیش کیا ہے ؎

چشمہ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں 'صحرا' میں ویرانے میں آبادی میں حسن

[بچہ اور شمع، اقبال]

شاعر کے نزدیک حسن فطرت ان کے لیے بصیرت افروز ہوتا ہے۔ فطرت کا حسن انسان کے سامنے قدرت کے راز سے بھی پردہ فاش کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کو زندگی کے قریب لانے میں ایک ادیب یا فن کار کو ذہنی شعور کے ساتھ ساتھ احساسات کی فراوانی کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور جن مشاہیر ادب میں یہ صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنی فن کارانہ صلاحیت سے بعض ایسے منفرد اور نئے موضوعات اور پہلوؤں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جہاں ان سے قبل کسی اور کی نظر میں ایسے پہلو پوشیدہ رہتے ہیں۔ ایسے فن کار ادب میں اپنی خاص جگہ ہی نہیں بناتے بلکہ ان کی فن کارانہ صلاحیت کے ذریعے رفتار ادب میں اضافی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی فن کاروں میں میرٹھ کے کچھ شعرا کا شمار ہوتا ہے۔ ان شعرا میں حقی حزیں، مولانا اسماعیل میرٹھی اور قلق میرٹھی، مولوی اختر شاہ خان، ارشاد نبی، معشوق حسن، عبدالباری، بیاں میرٹھی، محمد یحییٰ تنہاؔ، مولانا شیث جودت، حشمت فضلی، حمید اللہ خان، ابراہیم حسن، روشن شاہ، شاغر نظامی، شارق میرٹھی، پیارے لال شاکرؔ، صوفی وارثی وغیرہ نے اپنی نعت، نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی طبع آزمائی کر کے ادب کے قاری کو چونکانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ان شعرا میں حقی حزیں انفرادیت کے حامل ہیں۔ آپ کا پورا نام توفیق الحق حقی حزیں ہے جو 1920ء میں دہلی میں پیدا ہوئے لیکن روزگار کے سلسلے میں حقی حزیں کے والد میرٹھ آ گئے تھے تو حقی حزیں بھی میرٹھ ہی آ گئے۔ یہیں پر آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ محلہ مفتی واڑہ میرٹھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ بڑے ہوئے تو شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ رباعی میں بھی دل لگایا۔

حقی حزیں کو ایک عمدہ غزل گو کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ نے غزل کے مزاج کو تبدیل کیا۔ غزل کے موضوعات و مشاہدات کی شدت کو نئے سلیقے سے پیش کیا۔ غزل کے ذریعے ایک خوشگوار ماحول پیدا کیا۔ آپ کی اردو غزلوں نے عوام کے ذہنوں میں نئے شوق اور ولولے کو جگہ دی۔ اسی لیے حقی حزیں اپنے معاصرین میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ آپ نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ ہیئت کی حصار بندی کو توڑنے کے لیے نظموں کو مثنوی کے انداز میں تحریر کیا۔ کچھ نظمیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔ کچھ نظموں میں حسن و عشق کے جذبات و خیالات کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل بھی شامل ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حقی حزیں کسی صنف سخن کے پابند نہیں تھے۔ ان کے کلام میں قطعات، رباعیات بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ رباعی میں پورا مضمون صرف دو اشعار میں خوبصورتی سے سما جاتا ہے۔ رباعی کا فن بھی بہت نازک فن ہے۔ ولی دکنی، میر درد، غالبؔ، انیس، دبیر وغیرہ نے رباعیاں لکھی ہیں۔ شمالی ہند میں محمد رفیع سوداؔ، میر حسنؔ، حسرتؔ، انشاءؔ، مومنؔ وغیرہ نے بھی رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ میر انیس نے مذہبی موضوعات پر رباعیاں لکھی ہیں۔ دبیر نے بھی تمام موضوعات پر رباعیاں تحریر کیں۔ امجد حیدری، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی تو حقی حزیں کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ حقی حزیں نے اسے اعتنائے تخلیق عطا کیا۔ نظم، غزل، قطعات وغیرہ کی مانند حقی حزیں نے رباعی کے فن کو بھی وقار عطا کیا۔ رباعی کی زبان اور اس کی لطافت کو حسن عطا کیا۔ مثال دیکھئے ؎

تاچند یہ فرسودہ نظام اے ساقی
تا چند یہ دور نئے جام اے ساقی
مستی ہے اگر حاصل سامان نشاط
رندوں کو سنا میرا کلام اے ساقی

حقی حزیں نے اپنی رباعیات میں ایک جانب زندگی کی باریکیوں، نزاکتوں، حقیقتوں کو ظاہر کیا تو دوسری جانب اسی صنف کے ذریعے انسانی جذبات، احساسات، غم، خوشی کو فن کاری کے ساتھ قاری کے روبرو اس طور پیش کیا کہ قاری چونکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سماج و معاشرے کے یہ تمام رجحانات ان کی رباعیات میں نظر آتی ہیں۔ مثال دیکھئے ؎

دل کی دنیا جو سیہ پوش ہوئی جاتی ہے
اپنی ہستی بھی فرا موش ہوئی جاتی ہے
اب انہیں کون سنائے گا فسانہ میرا
آج تو شمع بھی خا موش ہوئی جاتی ہے

مولانا اسماعیل میرٹھی کو مشاہیر ادب نے الگ الگ لقب سے نوازا ہے۔ اور اسماعیل میرٹھی کی شخصیت میں ادبی رنگا رنگی بھی اتنی زیادہ ہے کہ آپ نے بے پناہ قوت تخلیق کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشاہیر ادب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے بچوں کے لیے عظیم الشان کارناموں کو انجام دیا ہے۔ اسی آپ کو بچوں کا شاعر بھی کہتے ہیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی 12/ نومبر 1844ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ صرف 16 سال کی عمر میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے لگے اور ترقی کرتے ہوئے فارسی ادب کے صدر شعبہ ہو گئے۔ ترقی کی اور منازل طے کیں تو 1888ء میں سینٹرل اسکول میں چلے گئے اور 1899ء میں اپنی تدریسی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ سرکار نے بھی آپ کی تدریسی خدمات پر انعامات سے نوازا اور خاں صاحب کے خطاب سے نوازے گئے۔ آپ کو شاعری سے دلچسپی اور لگاؤ اتنا تھا کہ میرٹھ میں کہیں بھی مشاعرہ ہوتا تو اسماعیل میرٹھی وہاں ضرور شریک ہوتے۔ مولانا نے اپنی شاعری میں بھی قدیم وجدید طرز کو اپنایا۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ شاعری میں مولانا نے نظم نگاری میں خاصی دلچسپی لی اور نظم کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ جیسے نظم، غزل، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ۔ اسماعیل میرٹھی کو یہ احساس تھا کہ اردو شاعری میں غزل کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے اور نظموں میں عوام کی دلچسپی کم ہے۔ اس طرح سے انجمن پنجاب کی بنیاد پڑی اور اس انجمن کے ذریعے شعرا نے نظم میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مولانا حالی اور اسماعیل میرٹھی نے عوام کے لیے خاص طور پر نظم کے میدان کو چنا اور اسماعیل میرٹھی کا یہ خیال تھا کہ عوام میں نظم کی دلچسپی کو عام کرنے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے بچوں میں نظم کو عام کیا جائے اور اسی لیے لوگ مولانا اسماعیل میرٹھی کو بچوں کا شاعر کہنے لگے۔ نظم کی صنف میں رباعی عام طور سے غائب ہوتی جا رہی تھی جس کا احساس مولانا کو ستا رہا تھا۔ اسی لیے رباعی کے میدان کو وسیع کرنے اور عام لوگوں کو رباعی کی جانب راغب کرنے کی غرض سے مولانا نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

نظم اور غزل کی مانند مولانا اسماعیل میرٹھی نے رباعی کے میدان میں بھی اپنے جوہر پیش کیے ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی رباعیات میں جو منفرد انداز بیان اور پہلو سے عوام کی زندگی کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے ہیں وہ بے مثال اور انمول ہونے کے ساتھ ساتھ عام انسان کی بھرپور نمائندگی اور سماجی زندگی کی اصل حقیقت کو پیش کرتی ہے ؎

بندہ ہوں تو اک خدا بنا وُں اپنا
خالق ہوں تو ایک جہاں دکھاؤ اپنا
ہے بندگی وہم اور خدائی پندار
میں وہ ہوں کہ خود پتا نہ پاؤں اپنا

مولانا اسماعیل میرٹھی کی رباعیات میں معاشرتی اقدار، جمالیاتی حسن، تہذیب وتمدن، عوام کے جذبات وخیالات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ حالانکہ مولانا اسماعیل میرٹھی کو بچوں کا شاعر یا نظم کا شاعر ہی تسلیم کیا جاتا ہے مگر ان کی رباعیات کا مطالعہ جب گہرائی و گیرائی سے ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان رباعیات میں زندگی کی سچی اور حقیقی کہانیاں ملتی ہیں۔ نظموں کی مانند ان کی رباعیات میں جمالیاتی حسن کے ساتھ ساتھ متصوفانہ خیالات وجذبات کا احساس جاگتا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجئے ؎

ڈھونڈا کرے کوئی لاکھ کیا ملتا ہے؟
دن کا کہیں رات کا پتا ملتا ہے ؟
جب تک کہ ہے بندگی خدائی کا حجاب
بندہ کو بھلا کہیں خدا ملتا ہے؟

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرٹھ میں مولانا اسماعیل میرٹھی، حقی حزیں ایسے شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے میرٹھ کی ادبی فضا میں چاند ستارے بچھانے کا خوبصورت کارنامہ انجام دیا ہے۔

قلق میرٹھی، رنج میرٹھی، اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی اور حفیظ میرٹھی وغیرہ نے میرٹھ کو عالمی ادبی سطح کا مقام عطا کیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے کلام میں اصلاحی شاعری، سماجی میل جول اور جدید رجحانات کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اپنی اصلاحی نظموں اور رباعیات کے ذریعے معاشرتی کمزوریوں کی جانب بھی اشارے کنائے سے کام لیتے ہیں۔ رباعیات، قصیدوں اور غزلوں میں اصلاحی کاموں، تصوف کے مسائل اور مقصد کو سامنے رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اسماعیل کی قومی نظموں کا رجحان زیادہ تر اصلاحی ہے۔ اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ کام کرنے اور پاک باز رہنے کی تلقین زیادہ ہے۔ اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی کبھی وہ عہد ماضی کا عروج اور عہد حاضر کی پستی کا موازنہ کر کے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اکبر کی طرح انگریزی فیشن سے گریز پر بھی زور دیتے ہیں اور سماجی کمزوریوں کی طرف پر اثر انداز میں اشارے کرتے ہیں۔ وہ اپنا اصلاحی مقصد قصائد وغیرہ میں بھی نہیں بھولتے، کبھی کبھی کار آمد نصیحت اس میدان میں بھی کر جاتے ہیں۔ غزلوں میں وہ زیادہ تر تصوف کے مسائل نظم کرتے ہیں۔ عشقیہ مضامین بھی پر زور انداز میں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے کلیات میں مختلف اصناف شاعری نظر آتی ہیں۔ غزل، رباعی، قصیدے کے علاوہ سلام و مرثیے پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مولوی اسماعیل ہر حال میں بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔''

[مختصر تاریخ ادب اردو، سید اعجاز حسین، ص114، اردو کتاب گھر، دہلی]

اس اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سماج میں پائے جانے والے تمام مسائل و موضوعات کو رباعی گو شعرا نے اپنی رباعیات میں جگہ دی ہے اور یہ حق بھی ہے کہ رباعیات میں حسن و عشق، شراب، شباب،، مذہب و ملت اور عوامی موضوعات کو بخوبی فن کاری کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ فارسی شاعری میں اس صنف کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایران کی اس پیداوار صنف نے کئی موڑ طے کیے۔ کبھی اس کو ترانہ کہا گیا اور کبھی عربی۔ مگر رفتہ رفتہ اس صنف نے عوام کو اپنی جانب راغب کیا اور غزل، قصیدہ، مثنوی کی مانند یہ بھی شاعری کی ایک اہم صنف بن کر ابھری جس میں عوام اور سماج کے تقریباً تمام مسائل و موضوعات حسن اسلوبی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''فارسی شاعری میں رباعی بہت پرانی چیز ہے۔ عروضیوں نے تو اس کی بحر کو عربی اوزان سے نکالا لیکن جدید تخلیقات نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے۔۔۔۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ رباعی خالص ایرانی چیز ہے۔ وہ ایران ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ اس کا نام اگرچہ عربی ہے لیکن یہ نام اسے بہت بعد کے زمانے میں دیا گیا۔ تیسری چوتھی صدی ہجری کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی کو اس زمانے میں ترانہ کہتے تھے اور بالعموم اسے گانے کے لیے تصنیف کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں ایسی وسعت و ہمہ گیری پیدا ہوئی کہ قصیدہ اور مثنوی تو درکنار غزل بھی اس کے سامنے ناچیز ہو کر رہ گئی۔''

[رباعیات محروم، دیباچہ، ص12-11]

اس طرح رباعیات نے سماجی حقیقت کو سامنے لانے کا بھی منفرد کارنامہ انجام دیا۔ سماج کے چاہے مذہبی مسائل ہوں یا معاشرتی پیچیدگی۔ عشقیہ واردات ہوں یا فلسفیانہ مسائل تمام موضوعات کو رباعی نے تسلیم کیا اور اس صنف کے ذریعے ان تمام مسائل کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسماعیل میرٹھی کی رباعیات ہوں یا حقی حزیں کی۔ تمام رباعی گو شعرا نے قارئین کی توجہ رباعی کی جانب کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ انہیں شعرا کی مانند قلق میرٹھی کی رباعیات میں تمام مسائل و موضوعات ملتے ہیں۔

مولا بخش قلق میرٹھی اردو زبان و ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جدید نظم نگاروں میں آپ کو امتیاز حاصل ہے۔ جدید نظم کے ذریعے غزل کی نئی راہوں کو تلاش کیا اور فنی رچاؤ، گہرائی و گیرائی میں وسعت پیدا کی۔ نظم کے ساتھ ساتھ قلق میرٹھی نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی اردو زبان و ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں رباعی کو اردو کے اہل قلم حضرات نے مشکل صنف تسلیم کیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رباعی کے موضوعات و مضامین میں تبدیلی کرنا مشکل مرحلہ ہے مگر قلق میرٹھی نے مختلف موضوعات پر عمدہ رباعیات کہی ہیں۔ ان کی رباعیات کی کل تعداد 142 ہے۔ آپ نے عشقیہ، مذہبی، فلسفیانہ، سماجی وغیرہ موضوعات پر رباعیاں لکھی ہیں۔

رباعیات میں نئے موضوعات پیش کر کے قلق میرٹھی نے اس صنف کو استحکام عطا کیا ہے۔قلق میرٹھی نے گھریلو زندگی کے ساتھ ساتھ حسن وعشق اور جمالیاتی پہلوؤں کو اپنی رباعیات میں اس طور پیش کیا کہ انسانی زندگی کی سچی تصاویر سامنے آجاتی ہیں۔مثال دیکھئے ؎

مجھ کو شب غم اے دل غم خوار نہ چھیڑ
رہنے دے اب قصہ اغیار نہ چھیڑ
داغوں سے سینہ رشک بال طاؤس
اے اشک نہ لے چٹکیاں ہر بار نہ چھیڑ

رباعی آسان صنف نہیں ہے۔اس صنف کی جانب کئی ناقدین نے مشکل پسندی کا اعتراف کیا ہے۔ جوش اور اقبال نے بھی اس کی مشکل پسندی کو تسلیم کیا ہے۔ جہاں تک قلقؔ میرٹھی کی رباعیات کا تعلق ہے ان کی رباعیات میں ایک جانب احساسات زندگی کی ترجمانی تو دوسری جانب سماجی، سیاسی شعور اور عقل فہمی کی پختگی کا پتہ چلتا ہے،قلق میرٹھی نے عام انسانوں کی زندگی، ان کے واقعات ومسائل، معاشرتی اور سماجی مسائل کو اپنی رباعیات میں سمیٹ لینے کے عمل دخل کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ ان کی رباعیات میں انسانی واردات کی شدت اور سماجی حقیقت نگاری کی جدت نظر آتی ہے۔قلقؔ میرٹھی لکھتے ہیں ؎

یہ شہر بلند عالم بالا سے تھا
ہم شکل غرض جنت ماویٰ سے تھا
اب کیا ہے ایک آبادیٔ ریگستاں ہے
دہلی کو شرف قلعہ معلیٰ سے تھا

کوئی بھی شاعر کسی بھی تاریخی شہر سے تعلق رکھتا ہے تو اس شہر کے تاریخی مقامات کو بھی اپنی شاعری میں فن کاری سے پیش کرتا ہے۔ علامہ اقبال سیالکوٹ کے رہنے والے تھے تو وہاں کی فضا اور ماحول کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ترنم ریاض نے کشمیر کی خوبصورتی کو اپنی غزلوں میں ہنرمندی سے شامل کیا۔اسی طرح قلق میرٹھی کی تعلیم وتربیت میرٹھ میں ہوئی تو آپ نے میرٹھ کے نوچندی میلے کو اپنی رباعیات میں خوبصورتی سے پیش کیا ؎

نو چندی میلے کا نہ پوچھو کچھ حال
ہوں دیکھ کے حیراں کہ دوں کس کی مثال
یا روضۂ رضوان ہے سادہ سا مکاں
یا سیر سے میرا ہی منقش ہے خیال

محترم مولوی اختر شاہ خان مدرسہ امدادالاسلام میرٹھ کے صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ مولانا شاہ اختر کو شاعری میں ملکہ حاصل تھا۔ اردو فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر شاعر نعت،نظم،غزل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ بہت کم شعرا ایسے ہوتے ہیں جو اس اصناف شاعری میں رباعی کو بھی اپنی دلچسپی میں شامل رکھتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رباعی میں طبع آزمائی کرنا آسان کام نہیں ہے۔مولانا اختر شاہ نے بھی اردو، فارسی ادب میں غزل کے ساتھ ساتھ رباعی میں بھی دلچسپی لی۔ انہوں نے اپنی رباعیات میں سماجی حالات ومسائل کو تو پیش کیا ہی ہے ساتھ ہی نعتیہ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ اپنی رباعی میں سماج کی ہر شے کی حقیقت کو فن کارانہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور معاشرتی حقیقت کو اس انداز میں بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں کہ اس کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔مثال دیکھئے ؎

ہے دارِ فنا کی آنی جانی ہر شے
اور دار بقا کی جا ودانی ہر شے
باقی کے لیے ہوک جو ٹھانی اخترؔ
باقی ہے وہی باقی ہے فانی ہر شے

شیخ ارشاد نبی بھی اپنے عہد کے باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک زندہ دل انسان کے ساتھ ساتھ موسیقی کے بھی دلدادہ تھے۔ حب الوطنی کے جذبات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور قومی تصورات ان کی رباعیات کی خصوصیات ہیں۔ ہر قسم کی محبت،حسن وجمال ان کی رباعی میں پنہاں ہے ؎

آتی ہے ہر ایک پھول سے نکہت تیری
سو من کی زباں پر ہے مدحت تیری
بتلاتا پتا تیرا ہے پتا پتا
غنچے کے بھی دل میں ہے محبت تیری

مولانا سید معشوق حسین، ہاپوڑی کا شمار بھی بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ عربی وفارسی زبان کے ماہر تھے۔ وکالت بھی کی۔ بحیثیت شاعر آپ کو عوام میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ زبان وبیان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ نثر ونظم میں ماہر تھے۔ تصنیف وتالیفی کاموں میں اکثر مشغول رہتے تھے۔ غزلیات وقصائد فارسی مجموعہ قطعات ورباعیات، مجموعہ قصائد اردو اور قطعات کے علاوہ آپ کا کلام مضامین اور رسالوں میں

خوب ملتا ہے۔نعت،غزل، رباعیات،قطعات کے لیے آپ ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں اور مشاعروں میں کثرت سے شرکت فرماتے تھے۔

اخلاقی مضامین کے علاوہ عمدہ رباعیات میں اخلاقی درس ملتا ہے جس میں فکر کی گہرائی،شوکت بیانی اور عہد آفرینی دکھائی دیتی ہے۔مثال ملاحظہ کیجئے ؎

افسوس عالمِ جوانی نہ رہا
اب لطفِ نشاطِ کامرانی نہ رہا
ہستی و فنا کی مل گئی ہے سر حد
کچھ فصل و گل و زندگانی نہ رہا

مولانا عبدالباری آسیؔ کے والد فارسی کے اہم شاعر اور غالبؔ کے شاگرد تھے۔مولانا آسیؔ کو شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔شاعری کی سوغات وراثت میں ملی تھی۔آپ نے ناسخؔ، غالبؔ، داغؔ اور مولانا حالیؔ کے رنگ میں بہت سی غزلیں کہی ہیں مگر کسی کے پابند نہ رہے۔نثر اور نظم میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ ناقد اور محقق بھی تھے،تذکرہ نگار بھی اور ترجمہ نگار بھی۔اردو شاعری کی ہر صنف مثلاً غزل،نظم،قصیدہ،مثنوی، رباعی وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔آپ کے شعری مجموعوں میں قطعات، رناعیات کا مجموعہ ''بصائر'' میں اخلاقی مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ فانی کے یہاں حسرت اور المناکی کا کثرت سے ملتا ہے مگر مولانا آسی،غم کو سنوارتے اور پالتے ہیں اور اسی فضا میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ان کے یہاں جمالیات شناسی کی بھی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔رباعی کو آپ نے ہر طرح کے حسن سے لبریز رکھا ہے۔

دل میں تپ عشق سے تعب پیدا کر
آئین وفا میں رہ ادب پیدا کر
جب کچھ بھی نہ ہو سکے تو کر خوب گناہ
رحمت کا غرض کوئی سبب پیدا کر

■

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے
ہر دم یہ رلا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے اب وہ ہم کو رو ئے

بیاں میرٹھی کا اصل نام سید محمد مرتضیٰ، بیاںؔ و یزدانی ہے۔سید محمد مرتضیٰ اردو میں بیاںؔ میرٹھی کے نام سے مشہور ہوئے۔آپ کا شمار اپنے عہد کے ممتاز علماء کرام میں ہوتا تھا۔صحافت سے بھی آپ کو گہرا شغف تھا۔ناسخ، داغؔ دہلوی مولانا حالیؔ اور آزادؔ کے عہد میں بیاںؔ میرٹھی نے بھی اپنے کلام کے ذریعے عوام الناس کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔آپ کے کلام میں قدیم وجدید خیالات کا سنگم تھا۔کبھی مولانا اسماعیل میرٹھی کے رنگ میں غزل کہتے تو کہیں مولانا حالیؔ کا رنگ ان کی شاعری میں نظر آتا۔بیاںؔ میرٹھی نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی رباعیاں مختلف عنوانات کے تحت ہیں۔انسان، دنیا، جذبات، واقعات، فکر ونظر، وغیرہ کے عمدہ نمونے ان کی رباعیات میں جلوہ گر ہیں ؎

بازار میں کس وقت جگہ پائی ہے
ہونے کو سبق جنس گراں آئی ہے
اب کوئی انیس ہے نہ مونس ہے بیاںؔ
یکتا ہوں عجب عالم تنہائی ہے

مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔آپ کے گھر کا ماحول تعلیمی تھا۔آپ کا پہلا مضمون 1940ء میں'' احسان فراموشی'' عصر جدید، میرٹھ میں شائع ہوا۔آپ نثر ونظم دونوں اصناف ادب میں دلچسپی رکھتے تھے''سیر المصنفین ''اور''مراۃ الشعرا'' دو دو جلدوں میں منظر عام پر آکر قارئین سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔آپ نے شاعری اور شاعری کی تنقید پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔شعری اصناف میں غزل،قطعات، رباعی میں قاری کو چونکانے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ غزل ہو یا رباعی۔مولانا محمد محمد یحییٰ رباعی لکھتے وقت یہ خیال رکھتے ہیں کہ واقعات کا تانا بانا رباعی میں ایسے بنا جائے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لے۔دنیا میں بسنے والے تمام لوگوں کی حرکات و سکنات، عادت واطوار کو ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔شاعر کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ دل کا حال شعری انداز میں اس طور پیش کرتا ہے کہ قاری اسے اپنے دل کا حال محسوس کرنے لگتا ہے۔مثال دیکھئے ؎

اس سے میں کہوں کچھ، کہ کہوں کچھ اس سے
نکلے گا نہ مطلب میں کہوں گا جس سے
ہے تیرے سوا کوئی بھی سننے والا
تجھ سے نہ کہوں میں، تو کہوں پھر کس سے

مولانا محمد شیث جودت نے بھی انسانی نفسیات، سماجی معاشیات اور عوام الناس کی حرکات وسکنات کو محسوس کیا اور اسے رباعی کے پیکر میں ڈھالا۔ انسانی نفسیات کو مولانا اس فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ آپ غیر ضروری پے چیدگی کو رباعی سے دور رکھتے ہیں اور مفہوم کو قرینے کے ساتھ، حسن بیان کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

ویران ہو جو قصرِ زیست آباد ہے تو
گر کا وشِ حق دل میں ہو، فرہاد ہے تو
رکھتی ہے سوئے حرص پر قینچ تجھے
گر نفس ہو ترا قید آزاد ہے تو

حشمت فضلی 1936ء میں ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جرمن زبان میں پی۔ ایچ ڈی کیا تھا۔ آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اردو شعر وادب کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ لیکن رباعی کو آپ اپنی پسندیدہ صنف قرار دیتے ہیں ''سنگ وآہنگ'' کے نام سے آپ کا رباعی کا مجموعہ بھی منظر عام پر آیا جو کافی مقبول ہوا۔ یہ سچ ہے کہ ادب کسی محدود رجحان کے اظہار کا نام نہیں ہے۔ ادب میں انسانی جذبات واحساسات اور خیالات کو خاص پیکر میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ جس طرح ادب انسانی زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی کرتا ہے اسی طرح رباعی میں انسانی زندگی کی تمام حرکات کو پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی ماحول، اس کے زندگی گزارنے کا طریقہ اور سلیقہ عوام الناس کی خوشی اور غم کو دلچسپ انداز بیان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اچھا شاعر اپنے تجربات کے ردعمل کی تشریح ایسے پیرائے میں کرتا ہے جو قارئین کے سامنے حقیقی تصور کے ساتھ آتا ہے۔ ایسے شعراء میں حشمت فضلی کو ملکہ حاصل ہے جو معاشرتی ماحول، خوشی، غم، شائستگی اور سنجیدگی کو ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثال دیکھئے ؎

ماحول سنور جائے گا افسردہ نہ ہو
ہر ذرّہ نکھر جائے گا افسردہ نہ ہو
اے تلخیٔ ایام سے ڈر نے وا لے
یہ وقت گزر جائے گا افسردہ نہ ہو

جب سے اس دنیا میں انسان نے قدم رکھا ہے تب ہی سے تحقیق، تنقید، تلاش وجستجو کا سلسلہ قائم ہے، بہتر سے بہتر کارنامہ انجام دینے کا کام انسان نے ہی کیا ہے۔ انسان کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ ایک خواہش پوری ہونے کے بعد دیگر نئی خواہشات پیدا ہوجاتی ہیں۔ غالبؔ نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

محمد حمید اللہ خان نے ان ہی خیالات وجذبات کو اپنے شاعرانہ کلام میں فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ نے رسائل و جرائد میں اپنی رباعیات کے ایسے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ واعظ یہ چاہتا ہے کہ عقبیٰ اس کے ہاتھ میں آجائے اور دنیاوی خواہشات کو حاصل کرنے والے لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے قدم چومے۔ انسان دولت، شہرت اور عظمت کی خواہش رکھتا ہے مگر کسی بھی انسان کی یہ خواہشات کبھی بھی مکمل نہیں ہوتیں مگر شاعر کی سوچ انفرادی ہے۔ محمد حمید اللہ اپنی رباعی کے ذریعے قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ان تمام خواہشات کی بجائے اگر مولیٰ مل جائے تو دنیا کی ہر شے اس کے قدم کا بوسہ دے گی۔ مثال دیکھئے ؎

واعظ کا مقولہ ہے کہ عقبیٰ مل جائے
منعم کی تمنا ہے کہ دنیا مل جائے
دنیا عقبیٰ یہ دونوں چھوڑے ہم نے
ہم تو یہی کہتے ہیں کہ مولیٰ مل جائے

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جب معاشی بدحالی، مسائل اور مستقبل کی غیر یقینی صورت حال ہمارے اور آپ کے سامنے ہو ایسے نازک حالات میں روحانیت کا عمل سامنے آتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں ہر انسان عزت اور شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کبھی کبھی اپنی خودی کا بھی سودا کر بیٹھتا ہے۔ چہرے پر چہرہ لگا کر دھوکہ دیتا ہے۔ شکل وصورت سے نیک دکھائی دیتا ہے مگر قلب سیاہ ہونے پر عبادت میں بناوٹی تسبیح کے دانوں کو گننے لگتا ہے۔ وہ، طاقت، دولت کو ہی اصل عزت قرار دیتا ہے۔ منشی نصیر الدین خلشؔ نے اپنی رباعیات کے ذریعے یہ پیغام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو بناوٹی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ صرف اپنے دست بازو اور خود پر یقین کامل رکھنا چاہئے۔ جھوٹ، لوٹ کھسوٹ اور مصنوعی عبادات نے انسانی زندگی کو کھوکھلا کردیا ہے۔ نصیر الدین خلش یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر صدق دل سے خدا سے مانگا جائے اور اس کی عبادت کی جائے جیسا کہ عبادت کرنے کا حکم اور طریقہ ہے تو انسان کی بے تابیاں، آرزوئیں ضرور پوری ہوں گی۔ اللہ کی سچی عبادت ہی

انسان کوعظمت عطا کرتی ہے۔ ریا کاری، مکاری اور بناوٹی عبادات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مثال دیکھئے ؎

اے شیخ یہ ہو، حق نہیں مکاری ہے
باتوں میں بھی تسبیح تری جاری ہے
دانا ہے تو رکھ نفس کی آمد پہ شمار
گنتی تری دانوں کی ریا کاری ہے

سید ابراہیم حسین نقوی رضوانؔ 1933ء کو میرٹھ کے محلہ پُروا فیاض علی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے فیض عام انٹر کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا اور میرٹھ کالج سے 1955ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ایس ڈی کالج، مظفر نگر سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ کے والد بھی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ اسی ماحول کا اثر تھا کہ آپ کو بھی بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نعت، غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ، سلام، منقبت۔ قطعہ، رباعی میں قارئین سے داد و تحسین حاصل کی۔ قصیدہ اور غزل کی مانند رباعی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ نے اپنی رباعیات میں بیداریٔ کائنات کے روشن پہلوؤں کو عمدگی سے پیش کیا ہے اور انسان کی بے ربط زندگی کو حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سید ابراہیم حسین نقوی انسان کو بار بار اس کی منزل کا احساس دلاتے ہیں، اس کے ذوق وجد و جہد کو ابھارتے ہیں۔ اپنی رباعیات میں شاعر نے مایوس مسلم قوم کو پیغام دیا ہے جو منزل کو حاصل کرتے کرتے راستے میں رک جاتی ہے اسے بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ؎

چلتے ہوئے رستے میں یہ رکنا کیسا
پھر حالت قیام میں پھدکنا کیسا
اس قوم کے رہبروں سے پوچھو تو سہی
منزل پہ پہنچ کر یہ بھٹکنا کیسا

روشن شاہ روشنؔ بریلی سے میرٹھ آ گئے تھے۔ آپ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ آپ ایک روشن خیال شاعر اور اہم شخصیت کے مالک تھے، خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات تغیرات کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ موت کو بھی موت ہے۔ ہر کمال کو زوال اور زوال کو کمال اس دنیا کے دستور میں شامل ہے۔ روشن شاہ ایک ایہام گو شاعر کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو ایک اچھوتا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ اپنی رباعیات میں روشن شاہ قوم کو ان کا ماضی یاد دلاتے ہیں۔ بلند مقام و مرتبے والی حیثیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور ماضی کو بھلا کر مستقبل کو روشن کرنے کی جد و جہد اور کوشش کرنے کا پیغام اپنی رباعیات میں فن کاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

روشن یہ خراب ہم نے ہستی دیکھی
جو کچھ تھا بلند اس کی پستی دیکھی
جب جیتے جی نہیں نظر آتی تھی
اب نیست ہوئے تو ہم نے ہستی دیکھی

معروف شاعر ساغر نظامی عربی، فارسی اور اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ سنسکرت سے بھی خوب واقف تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ اس لیے نظامی لکھتے تھے۔ کئی زبانوں پر عبور رکھنے کے علاوہ اہم شخصیت کے مالک بھی تھے۔ آپ کی مشہور کتاب ''بادۂ مشرق'' نے قارئین کو چونکانے کا منفرد کارنامہ انجام دیا۔ فلمی دنیا میں آپ کی نظمیہ اور نثری خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ آزادی کی منظوم تاریخ بھی آپ نے رقم کی۔ کئی رسائل و جرائد بھی نکالے۔ آپ نے نظم اور نثر دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ ہندوستانی حکومت نے ان کی تعلیمی خدمات پر 1969ء میں ''پدم بھوشن'' کے اعزاز سے نوازا۔ آپ نے اپنی رباعیات کے ذریعے ادبی فضا اور انسان کے دل و دماغ کے تاثرات اور جذبات کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ ہمیشہ عوام کے لیے فلاح و بہبودی کا کام انجام دیتے رہے،۔ ساغرؔ نظامی کا کلام ان کے جذبات و احساسات کو قارئین کے روبرو لاتا ہے۔ نیک انسانوں کے جذبات و احساسات سے دور دور تک نیکی ہی پھیلی ہے اور اس نیکی کی بدولت وہ عوام کے لیے راحت و سکون تلاش کرتے ہیں ؎

تو ہیں مزاج مدعا کرتے ہیں
تکذیبِ مشیت خدا کرتے ہیں
جو نیک ہیں وہ کرتے ہیں نیکی پہ عمل
جو کچھ نہیں کرتے وہ دعا کرتے ہیں

میرٹھ میں شارقؔ میرٹھی کو علمی و ادبی اور معتبر شخصیت کا درجہ حاصل ہے۔ نثری و شعری خدمات ہی آپ کا معمول تھا۔ ہمیشہ ادب کی خدمات کے لیے کوشاں رہے۔ غزل کی آبیاری آپ کا ذوق و شوق رہا ہے۔ زبان

میں سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ آپ نے شاعری کی اصناف غزل، قصیدہ، رباعی اور نظم وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ آپ کی شاعری میں گہرائی، سلاست اور جدت طرازی ملتی ہے۔ شارقؔ میرٹھی دنیا کے مسائل سے منہ نہیں موڑتے بلکہ ان مسائل کو دور کرنے کی پرزور کوشش کرتے ہیں۔ آپ نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی لکھی ہیں جو زیادہ تر سماجی و مذہبی ہیں۔ ان رباعیات میں جمالیاتی احساسات پوری شدت، مقصد اور خلوص کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی رباعیات میں انسان کے وجود، زمانے کے پیچیدہ مسائل اور گرداب کا خوبصورتی سے نقشہ کھینچا ہے۔ شارقؔ میرٹھی نے ہمیشہ اپنی شاعرانہ تعلیم کے ذریعے عوام کو گردش زمانہ سے خبردار کرنے کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ مثال دیکھئے ؎

یہ بحرِ زمانہ ہے سنبھل اے ناداں!
گرداب سے اس کے نہیں بچنا آساں
طوفاں سے پہلے کی خموشی پہ نہ جا
دامن میں لیے ہے یہ ہزاروں طوفاں

پیارے لال شاکر 13/مارچ 1880ء کو کنکرکھیڑہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی شعروادب کی خدمت کرتے رہے۔ میدان چاہے شاعری کا ہو یا صحافت کا وہ اپنے عہد کے عمدہ ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ نظم اور غزل میں خوب طبع آزمائی کی مگر رباعی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس صنف میں آپ نے تمام سماجی، سیاسی اور مذہبی موضوعات کو پیش کیا۔ اس لیے وہ اپنے عہد کے اچھے رباعی گو شاعر تھے۔ اپنے زمانے کے اہم رسائل وجرائد میں ان کی رباعیاں قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کے نقوش ان کی رباعیات کی خصوصیات ہیں۔ پیارے لال شاکر نے یوں تو تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، مرثیے، قصیدے وغیرہ لکھے لیکن رباعی میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کی رباعیات کی زبان نہایت سادہ اور تصنع سے بے نیاز ہے۔ ان کی رباعیات زمانہ کی معاشرتی زندگی کا آئینہ ہے۔ آپ نے اپنی رباعیات کے لیے ہندوستانی زندگی اور جذبات کو منتخب کیا ہے۔ ان کی نگاہ سماج ومعاشرہ کی ہر شے میں حقیقت کا سراغ تلاش کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی رباعیات کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہموار نہیں، ظاہر و باطن جن کے
چنوائے گی ان کو یہ دو رنگی تنکے
گر دل میں نہیں چور تمہارے شاکرؔ
کیوں رکھتے ہو ڈر ڈر کے قدم گن گن کے

■

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے
میعاد اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے والی ہے قطع زنجیر حیات
جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

میرٹھ کے تمام شعراء نے شاعری کی زلفوں کو سنوارا ہے۔ شاعری میں نظم، نعت، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی وغیرہ میں تمام شعرائے میرٹھ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری میں غزل کو مقبول صنف قرار دیا جاتا ہے۔ غزل کے مقابلے میں رباعی کو وہ درجہ حاصل نہ ہوسکا جس کی وہ حقدار تھی مگر ابتدا سے ہی غزل کے ساتھ رباعی نے بھی قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر عصر حاضر تک رباعی کا سفر جاری رہا اور آج بھی صنف رباعی اپنے مخصوص انداز میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

میرٹھ اور میرٹھ کے اطراف میں لکھی جانے والی رباعیات اور رباعی گو شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کر کے ثابت کر دیا ہے کہ میرٹھ بھی رباعیات کے میدان کو وسیع کر رہا ہے۔ میرٹھ کے بے شمار شعراء نے اس صنف کو استحکامیت عطا کی ہے۔ شاہد حسین نقوی، فہیم الحسن، شمیم جے پوری، جارج پیش شور، مولانا احمد حسن انصاری، نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ وغیرہ نے رباعی کی زلفوں کو سنوارا اور رباعی کے تعلق سے میرٹھ کو بھی عالمی شہرت دلائی۔ نواب مصطفی خاں شیفتہ فارسی اور اردو کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ آپ اپنے عہد کے معتبر ناقدین، ادبا، اور مشاہیر ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شیفتہ کا کلام تصوف کا حامل ہے۔ بلند پایہ مضامین بامحاورہ زبان نے ان کی شاعری کو بلندی عطا کی ہے اور فارسی شاعری خاص کر رباعی کو اس کا مقام عطا کرانے میں خاصی دلچسپی لی۔

صوفی وارثی ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ایک ادبی شخصیت کے ساتھ ساتھ صحافی کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بھی کافی ہے۔ میرٹھ سے شائع ہونے والی کتب میں انجام محبت، رباعیات صوفی، جنگ آزادی، جنون خام، ہندو ذہنیت وغیرہ بہت اہم ہے۔ شاعری میں حمد، نعت، سلام، غزل، منقبت،

قطعات اور رباعیات آپ کی پسندیدہ اصناف رہی ہیں اور رباعیات میں آپ کی اچھی گرفت ہے

جب پھول کبھی خار نہیں ہو سکتا
جب نور کبھی نار نہیں ہو سکتا
یہ امر مسلم ہے تو اے صوفی
اللہ کا انکار نہیں ہو سکتا

■

انسان کے ساتھ اس کے عمل جاتے ہیں
اس راہ میں بل سارے نکل جاتے ہیں
یہ راہ وہ ہے اہل نظر بھی جس میں
طوطے کی طرح آنکھ بدل جاتے ہیں

کرشن مراری لال ضیاؔ منشی عابد حسین، سید مقصود زاہدی، حشمت حسین نجمی، جولئیس نحیفؔ، مرزا انور بیگ وفاؔ وغیرہ نے میرٹھ کا نام روشن کیا ہے اور رباعی کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ میرٹھ کے ان شعرا نے اخلاقی، مذہبی اور سماجی موضوعات پر رباعیاں لکھی ہیں۔ میرٹھ کے شعراء نے رباعیات کو غزل کی مانند لوگوں کی تسکین کے لیے ضروری سمجھا اور اس کے فن میں کمال عطا کیا۔ حالانکہ یہ ایک مشکل صنف ہے مگر میرٹھ میں یہ مردہ قرار نہیں دی گئی بلکہ اس کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے موضوعات پیش کرنے کی کاوش کی۔ سرزمین میرٹھ میں غزل کی مانند رباعی میں بھی شعرا نے کمال حاصل کیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رباعیات جیسی مشکل صنف میں سماج و معاشرے کے تمام موضوعات کو تو شامل کیا گیا مگر جدید دور کے فیشن نے اس صنف کو آگے بڑھنے سے روکنے کا بھی کام کیا ہے۔ حالانکہ ان شعرا نے اپنی رباعیات میں انسان کی اعلیٰ قدروں کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ملک سے محبت کی تعلیم، انسانی ہمدردی، حیات و کائنات کا شعور۔ ان رباعیات میں نظر آتا ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رباعیات کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے شعرائے میرٹھ نے دبستان شاعری میں اپنی انفرادیت ہی قائم نہیں کی بلکہ اپنی غزلوں، نظموں اور رباعیوں کے ذریعے میرٹھ کو عالمی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ رباعیات کے حوالے سے دبستان میرٹھ ان شعرا کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

رباعیات

معید رہبر۔ لکھنؤ

اشعار میں لہجے کی نوا ہے کچھ اور
لفظوں کو برتنے کی ادا ہے کچھ اور
وہ دورِ یگانہ تھا گرفتارِ بلا
اب شہر نگاراں کی ہوا ہے کچھ اور

■

اردو کے لئے شوق یہ پالا ہم نے
افکار کو الفاظ میں ڈھالا ہم نے
تہذیب کے پھولوں کو حسیں رنگ دیا
گلزار سخن جب بھی سنبھالا ہم نے

■

خیام کے سعدی کے جہاں سے لاؤں
یا فکرِ سخن، کاہکشاں سے لاؤں
کہنے کو تو کہہ لوں میں رباعی لیکن
اسلاف کے انداز کہاں سے لاؤں

■

کب دونوں جہانوں کے چمن میں پایا
جو حسنؓ شہنشاہؑ زمن میں پایا
تقسیم ہوا ہے جو سراپائے نبیؐ
ہم نے وہ حسینؓ اور حسنؓ میں پایا

■

ایمان رکھے گرچہ خدا پر انساں
بن جائے مقدر کا سکندر انساں
تھامے رہے گر دامنِ سرکارؐ امم
ہو جائے بہتر سے بہتر انسان

صنفِ رباعی میں فلسفۂ لاادریت (AGNOSTICISM) کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر عبدالحق امام

(محلہ مرزا پور پوسٹ گیتا پریس گورکھپور، یوپی۔ موبائل: 9450878330)

لاادریت کا فلسفہ واضح کرتا ہے کہ خدا یا دوسری غیر مادی اشیاء کا علم ہمیں نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا یہ فلسفہ لاعلمی کے مختلف پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں درج ہے کہ:

''انسان کو ماورائی دنیا کی اصلیت اور حقیقت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ مادی دنیا کے حدود سے آگے کیا چیز موجود ہے۔'' ۱؎

اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں لاادریت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ہمارے تجربات کے باہر جو اشیاء ہیں ہم کو ان کا علم کچھ بھی نہیں ہے۔'' ۲؎

لیکن جب ہم ریڈرڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں زیادہ واضح تعریف۔AGNOSTIC کی نظر آتی ہے۔

"one who Holds That Nothing is Nown or Likly To Be Knoon of Eixis Tence of God or Any Thing Be Yond Materil Phenomena" 3

لیکن حقیقت ہے کہ فلسفۂ لاادریت کو سب سے پہلے باقاعدہ طور پر پائر ہونے پیش کیا اور اس پر مفصل روشنی ڈالی کہ اشیائے کائنات کی حقیقت کو معلوم کرنا بہت دشوار ہے اس نے اپنے نظریات کی وضاحت کے لئے کوئی کتاب نہیں لکھی مگر اس کے شاگرد ٹائمن (Timon) نے اپنے استاد کے خیالات کو منضبط کیا جو بہت جامع اور وقیع ہیں۔

اس طرح لاادریت کے فلسفیوں کا قول ہے کہ:

''بہت سی اشیاء ہم کو نظر آتی ہیں مگر ان اشیاء کی حقیقت کیا ہے ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں ان اشیاء کے وجود کے ہم قائل ہو سکتے ہیں مگر ان اشیاء کی روح کیا ہے! اس کا سمجھنا دشوار ہے۔'' ۴؎

لاادریت کے فلسفی یہ بھی نظریہ رکھتے ہیں کہ ہم کو اپنی ہستی کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں ہے ہم کیا ہیں! ہماری حقیقت کیا ہے! ان باتوں کا علم ہم کو نہیں ہے۔

اس طرح جب ہم فلسفۂ لاادریت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم کو خدا کے بارے میں کچھ علم نہیں، ماورائی دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے مثلاً جنت، دوزخ اور عقبیٰ کے بارے میں بھی بتانے سے قاصر ہیں ہم کو مادی دنیا کے بارے میں کچھ بھی مکمل معلومات نہیں، ہم کو خود اپنی ہستی کے بارے میں اصل معلومات نہیں حاصل ہیں ہم روح کے بارے میں بتانے سے قاصر ہیں اس کے علاوہ موت، مستقبل، تقدیر وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں۔

جب ہم شعراء کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ماورائی دنیا کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ اس دنیا کا قائل بھی ہے اس طرح شاعر کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ خدا اور ماورائی دنیا کا منکر نہیں ہے بلکہ اپنی شاعری میں مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے یا جب مسائل سمجھ میں نہیں آتے ہیں تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے اس وقت منیر شکوہ آبادی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ: ؎

جلوۂ نورِ اجل چشمِ بشر کیا جانے
سات پردوں کے ادھر کیا ہے نظر کیا جانے

اور اس سلسلے میں امجد حیدر آبادی کی ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو:

کیوں گرم ہے آفتاب ؟ معلوم نہیں
کیوں ہے یہ انقلاب ؟ معلوم نہیں
جی بھر کے سوال کرلو ؟ جتنے چاہو
سب کا ہے یہی جواب ؟ معلوم نہیں

اس طرح فارسی شعراء میں عمرؔ خیام کے ہاں بہت زیادہ لاادریت کی رباعیاں موجود ہیں اس کے علاوہ عرفی، حافظ کے ہاں بھی لاادریت کی رباعیاں ملتی ہیں لیکن ہمیں صرف اُردو شاعروں کی رباعیوں میں فلسفۂ لاادریت پر گفتگو کرنی ہے۔

دور قدیم کی اُردو شاعری میں لاادریت کے اشعار ملتے ہیں لیکن رباعیات میں نہیں اسی طرح دورِ متوسط میں بھی شعراء کے ہاں بہت سے اشعار فلسفۂ لاادریت کے ہیں اور کچھ شعراء نے رباعیات میں بھی فلسفۂ لاادریت کو اجاگر کیا ہے جیسے راسخؔ عظیم آبادی کے ہاں: ؎

دیکھی ہے فقط آرائش دنیا تم نے
پیدا نہ کیا دیدۂ بینا تم نے
مصروفِ تماشائے چمن ہی رہے تم
راسخؔ چمن آرا کو نہ دیکھا تم نے

راسخؔ کہتے ہیں کہ ہم تماشائے چمن میں مصروف رہے مگر چمن آرا کو نہ سمجھ سکے اسی طرح مصحفیؔ نے ایک رباعی میں یہ ظاہر کیا ہے کہ افلاک کی حقیقت کو سمجھنا مشکل ہے۔

باہم جو فلک کا ہے بندھا زنجیرا
معلوم نہیں اس میں حکمت ہے کیا
ہر چند کئے ہم نے بہت عقدا وا
لیکن نہ کھلا ہم سے یہ گورکھ دھندہ

اور دورِ متاخر کے شعراء کے ہاں ان کی غزلوں میں بہت سے اشعار لاادریت کے ملتے ہیں لیکن رباعیات میں نہیں اسی طرح دورِ جدید کی اُردو شاعری میں فلسفۂ لاادریت کے اشعار ملتے ہیں اور کچھ شعراء کے ہاں رباعیات میں بھی فلسفۂ لاادریت کے اشعار ملتے ہیں مثال کے طور پر آسیؔ غازی پوری کی کچھ رباعیات میں لاادریت موجود ہے جیسے ایک رباعی میں آسیؔ نے کہا ہے کہ خدا انسان کو نظر نہیں آتا۔ ؎

کیا حسرتِ دید ہے خدایا ہم کو
مانند نظر جس نے پھرایا ہم کو
کہتا ہے کہ میں نورِ نظر تیرا ہوں
یوں بھی سہی پر نظر نہ آیا ہم کو

ایک رباعی میں آسیؔ غازی پوری نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ گل کی حقیقت کا سمجھنا مشکل ہے معلوم نہیں کہ اس گل میں کس کا رنگ ہے: ؎

پردہ نہ کھلا قبائے گل کا کچھ بھی
کیا غنچے کے دل میں ہے نہ سمجھا کچھ بھی
گلشن میں یہ کس کے رنگ ہیں اے نرگس
کس کام کی آنکھ جب نہ سوچا کچھ بھی

اسی طرح چکبستؔ نے بھی ایک رباعی میں دنیا کو ایک ناتمام افسانہ قرار دیا ہے کہتے ہیں کہ:

آباد ہے اصل میں نہ ویرانہ ہے
شادی کا یہ گھر ہے نہ عزا خانہ ہے
واللہ نہ مبتدا ہے اس کی نہ خبر
دنیا اک ناتمام افسانہ ہے

امجدؔ حیدر آبادی کی رباعیات میں فلسفۂ لاادریت کے بہت سے اشعار ملتے ہیں لیکن چند مثال ہم ان کی رباعی سے پیش کرتے ہیں: ؎

یا رب رہے مستقیم معلوم نہیں
حارث کو درِ قدیم معلوم نہیں
سبحانک لا علم لنا پڑھتا ہوں
کچھ بھی مجھے اے علیم معلوم نہیں

ان کا کہنا ہے کہ مجھے نہ تو خدا کے بارے میں کچھ معلوم ہے اور نہ اپنے بارے میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ: ؎

یہ کیا مرے روبرو ہے معلوم نہیں
میں کون ہوں کون تو ہے معلوم نہیں
ہوتی رہتی ہیں دل ہی دل میں باتیں
کس سے یہ گفتگو ہے معلوم نہیں

اور ایک جگہ اپنی ہستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ۔ ؎

کس طرح بنا ہوں مجھ کو معلوم نہیں
میں کون ہوں کیا ہوں مجھ کو معلوم نہیں
کچھ دیکھ رہا ہوں یہ تو کہہ سکتا ہوں
کیا دیکھ رہا ہوں مجھ کو معلوم نہیں

ایک جگہ روح کی حقیقت سے بھی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ؎

کیفیتِ روحِ پاک معلوم نہیں
حالِ دلِ درد ناک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی
خاکی انسان کو خاک معلوم نہیں

اس طرح امجدؔ کی رباعیوں میں بہت سی مثال ملتی ہے لیکن صفحات اجازت نہیں دے رہے ہیں۔

اسی طرح جوشؔ ملیح آبادی کی رباعیات میں بھی فلسفۂ لاادریت کی رباعیاں موجود ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ خدا کی ذات سے انکار کرنا بھی جہل ہے اور اقرار کرنا بھی جہل ہے: ؎

نو میدیٔ نظارۂ انوار بھی جہل
امیدِ شہود و شوق دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال
انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل

ایک جگہ عقبیٰ کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ؎

عقبیٰ کی خبر نا عمرِ دنیا معلوم
تا چند رہیں گے بحر و بر کیا معلوم
ہم خاک ہیں اور خاک ہو جائیں گے کل
اب تک تو ہوا صرف اتنا معلوم

اسی طرح کی ایک رباعی اور دیکھئے: ؎

کیا جانئے چہرہ زرد کیوں ہوتا ہے
دل رنج و الم سے سرد کیوں ہوتا ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد کیوں ہوتا ہے

ایک رباعی میں اسرارِ حیات پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ ؎

کُھلتا ہی نہیں بھید زندگانی کیا ہے
یہ پیری و طفلی و جوانی کیا ہے
اک حادثہ ، اتفاق یا ایک صفت
معلوم نہیں حیاتِ فانی کیا ہے

اسی طرح آج کل کے شعراء نے بھی لاادریت کا ذکر اپنی رباعیوں میں کیا ہے۔ جیسے طہور منصوری نگاہ کی رباعی ملاحظہ ہو: ؎

صحرا نہ سمندر نہ زمیں ہے معلوم
مسجود نہ سجدہ نہ جبیں ہے معلوم
کچھ ڈھونڈ رہے ہیں یہ خبر ہے لیکن
کیا ڈھونڈ رہے ہیں یہ نہیں ہے معلوم

اسی طرح خاکسار نے بھی فلسفۂ لاادریت پر بہت سی رباعیاں کہی ہیں جو میرے دیوان نیرنگ رباعی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں دو رباعیاں پیش کر رہا ہوں ملاحظہ ہو: ؎

کیا شے ہے بقا اور فنا کیا معلوم
اِس پار سے اُس پار ہے کیا کیا معلوم
رہنا ہے یہاں صرف اندھیرے میں مجھے
خود اپنی ہی ہستی کا پتہ کیا معلوم

قسمت ہوں خود اپنی کہ کسی کا مقسوم
آیاتِ مقدّس ہوں کہ ان کا مفہوم
انساں ہوں ، فرشتہ ہوں کہ مٹی ، پتھر
کیا چیز ہوں یہ مجھ کو نہیں ہے معلوم

حواشی

۱۔ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا جلد نمبر صفحہ 157
۲۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد اول صفحہ 351

4-:Readersdigest-Great Encyclopadic Dictionrry-v0l I P.33

Types of philosophy Bywilliam 4 Ernest hocking P.126

☆☆☆

تصویر کی مانند سراپا سیدھا
کیا عکس نظر آتا ہے سیدھا سیدھا
برعکس سمجھتے ہیں مجھے آئینے
آئینے میں ہو جاتا ہے اُلٹا سیدھا

آنسو مرے تاریخ رہے ہیں گویا
ہم پلہء مرّیخ رہے ہیں گویا
ادنیٰ سا تعارف ہے مری غزلوں کا
صحرا میں ہرن چیخ رہے ہیں گویا

مظہر حسین تاج
لکھنؤ

رباعیات

زیب النساء زیبی
(کراچی، پاکستان)

آنکھیں میری ہیں کہ سمندر ہیں یہ
عہدِ ناپرساں کی، قلندر ہیں یہ
اپنی مرضی سے ہیں ، چمکتے جاتے
دیکھو! دیکھو اشکوں کو اختر ہیں یہ

ملتا ہے زمانے کو بھی محنت سے کمال
آتا ہے ہراک شے پہ زمانے میں زوال
اک بار ملا کرتی ہے، دنا میں حیات
رہتا ہی نہیں حُسن ، سراپا، یہ جمال

گلشن سے خزاں جائے تو آتی ہے بہار
دنیا کو کرامت بھی دکھاتی ہے بہار
عشّاق کے بے تاب دلوں کا ہے سکون
گل ہائے حسیں رنگ کھلاتی ہے بہار

شاخوں پہ عجب رنگ دکھاتے ہیں گلاب
شبنم سے بھی ہر روز نہاتے ہیں گلاب
جب دیکھتی ہوں ان کو تو اے جانِ بہار
مسکان تری دل میں سجاتے گلاب

رباعیات

مصباح انصاری
گورکھپور

گدڑی سبھی زندگی کی سیتے ہیں یہاں
جس حال میں گزرے سبھی جیتے ہیں یہاں
کچھ لوگ بسر کرتے ہیں ہنس کر لیکن
کچھ اشک شب و روز ہی پیتے ہیں یہاں

دنیا تو بنایا تھا پہ راحت نہ ملی
عقبیٰ کو بنانے کی فرصت نہ ملی
بیدار ہوا چاہا کہ پڑھ لوں کلمہ
افسوس کہ اک پل کی مہلت نہ ملی

یاد اس کو صبح شام کرتا ہوں میں
ناراضگی سے اس کی ڈرتا ہوں میں
مصباح میں مومن ہوں یقیں ہے مجھ کو
اذکار کی برکت سے سنورتا ہوں میں

سمجھا نہ پرندہ کبھی صیاد کی چال
زنجیر بنی پیروں میں ہر بار ہی جال
دنیا کی حقیقت ہے اسے تو بھی مان
سب کو راس آتا نہیں حسن و جمال

حصہ سوم:
تبصرے

تبصرہ

نام کتاب:	رباعیاتِ قمر
مصنف:	قمر سیوانی
اشاعت:	۲۰۱۱
صفحات:	۲۰۰
قیمت:	۲۵۰ روپے
ملنے کا پتہ:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی (موبائل:9899706640)
مبصر:	صفدر امام قادری (شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ 9430466321)

ادھر مجموعۂ رباعیات کا زور بہت ہے۔ ناول بھی بڑی تعداد میں چھپ کر سامنے آرہے ہیں۔ ادب کے یہ مشکل علاقے ہیں لیکن اس طرف لکھنے والوں کی خاص توجّہ کے معنی یہ بھی ہوئے کہ تخلیق کاروں نے آسانیوں کے مقابلے مشکل جزیروں کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسے پورے ادبی سماج کی عمومی بلوغیت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نگاہِ نقد کہتی ہے کہ یہ قابلِ غور موڑ ہے اور اس بات کے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں افراط وتفریط کا معاملہ تو نہیں۔ دوسری بات نامناسب اس لیے نہیں لگتی کیوں کہ ہم جب دیکھتے ہیں کہ مجموعۂ رباعیات اور ناولوں میں یا تو بہتر اور پسندیدہ چیزیں ہیں، یا بالکل فضول کی کتابیں۔ یعنی ان میں درمیانی سطح کا ادب بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

صوبۂ بہار میں ایک مردم خیز ادبی بستی سیوان ہے جہاں اِدھر ہر برس رباعیات کا کوئی مجموعہ ضرور شایع ہو رہا ہے۔ التفات امجدی کے دو مجموعے ،ظفر کمالی کی 'رباعیاں' اور اب قمر سیوانی کی کتاب''۔ یہ سلسلہ بھی خوب ہے کہ پہلے کم عمر والے کی کتاب آئی، پھر اس سے بزرگ کی اور اب ستّر برس کے استاد شاعر قمر سیوانی (پ: ۱۹۴۲) کا مجموعہ شایع ہوا۔ یہ کلام بالکل تازہ ہے اور پچھلے دو برس میں نازل ہوا۔ اس سے یہ حقیقت بھی برآمد ہوتی ہے کہ شاعر نے یہ کلام تقریباً نصف صدی کی ریاضت کے بعد پیش کیا ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں تجربے کی رنگارنگی، بیان کی قدرت، مطالعۂ کاینات کی وسعت و گہرائی اور فنّی امور میں پختگی کے شامل صنفِ رباعی کے آداب اور مخصوص تقاضوں کے پہلو بہ پہلو نئے مدارِ علمی کی تلاش کے ثبوت بھی ایک ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

قمر سیوانی کی داستانِ حیات اس مجموعے میں ظفر کمالی نے ضروری تفصیل کے ساتھ بغیر کسی نمک مرچ کے پیش کر دی ہے۔ یہ زندگی نشیب وفراز سے تو بھری ہی ہے لیکن اس میں ایک پہلو ایسا ضرور ہے جس میں قصّۂ آدم کی رنگینی اور ظفر مندوں کے آگے خامہ سوزی کا نتیجہ بکھیر نے میں مصنّف کی مہارت اور جوش پر دھیان چلا جاتا ہے۔ کلام بیچنے یا بانٹنے کی ہر زبان میں ایک پختہ روایت رہی ہے۔ بھلے اس میں اکثر وبیش تر ہمارے شعرا کا بہترین کلام متشاعروں یا شاگردوں کے کھاتے میں درج ہو جاتا ہو لیکن ایک فائدہ شاعر کو بھی ملتا ہے اور وہ قادرالکلامی اور مشقِ سخن کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔'' سے شاعر کی قادرالکلامی اور طبیعت کی جولانی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

غزل کی طرح رباعی بھی بہت ظالم صنف ہے۔ کہنے کو غزل کے اشعار معنوی ربط سے آزاد ہوتے ہیں اور ایک رباعی سے دوسری رباعی کا کوئی موضوعاتی رشتہ نہیں ہوتا لیکن غور کیجیے تو اکثر اچّھے غزل گو یا رباعی گو کی بہ ظاہر بکھری ہوئی چیزوں میں داخلی سطح پر ایک بھرپور معنوی ربط اور کوئی نظامِ فکر ہوتا ہی ہے۔ 'رباعیاتِ قمر' تو اس معاملے میں اور بھی گہری کتاب ہے۔ شاعر جب زندگی کا کچّا پکّا سب دیکھ لے، اپنی ہوس کاریوں کے سارے مراحل گزران کر لے یعنی سب بلائیں تمام ہو چکی ہوں، تب قوتِ گفتار میں ایک عجیب صلابت اور پختگی آجاتی ہے۔ زندگی کے لین دین سے جیسے ہی اسے فرصت ملنے لگتی ہے، وہ زیادہ باحوصلہ، باکردار، اور روشن ضمیر بھی ہو جاتا ہے۔ قمر سیوانی کی رباعیوں کی یہ کتاب انھی جہات سے مجھے متوجّہ کرتی ہے۔

عام طور سے رباعیات کی زمین ٹھوس حقائق پہ قائم ہوتی ہے جس کے سبب اس میدان میں تخیل کے پر کبھی کبھی اڑان ہی نہیں بھر پاتے۔ قمر سیوانی استاد شاعر ہیں اور انھیں اس سوال کا ادبی جواب دینا تھا۔ اسے جاننے کے لیے پہلے ان کی چند رباعیات ملاحظہ کریں:

دے آج نہ رہ رہ کے صدا بادل کو — اس حال میں گھر میں نہ بُلا بادل کو
مے خواروں کے مانند ہے مدہوشی میں — سورج نے پلایا ہے نشا بادل کو

تو حال زمیں کا نہ بتا بادل کو　　پانی کے لیے دے نہ صدا بادل کو
گر جائے گی تحریر کی کچّی دیوار　　کاغذ کے مکاں میں نہ بُلا بادل کو

■

جنگل کو، بیابانوں کو، صحراؤں کو　　تپتے ہوئے ہر کھیت کی آشاؤں کو
اس سال ملاقات نہیں ہے ممکن　　برسات نے خط لکھا ہے دریاؤں کو

ان تین رباعیات پر غور کیجیے تو قمر سیوانی کی ایک عجیب وغریب دنیا دکھائی دیتی ہے۔ یہاں آسماں، بادل اور موسم سے جس طرح باتیں ہو رہی ہیں، مجھے کالی داس کے میگھ دوت کی یاد آرہی ہے جہاں برہن بادلوں سے اپنے عاشق تک پیغام پہنچانا چاہتی ہے۔ فطرت کو دیکھنے اور پرکھنے کے لیے نگاہ چاہیے۔ اکثر چوں کہ ہم سرسری گزرتے ہیں، اس لیے جہانِ دیگر نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کہتے ہیں، حکیم لقمان سے پیڑ پودے چلتے پھرتے محوِ گفتگو ہوتے تھے۔ جڑی بوٹیاں خود سے وضاحت کرتی تھیں کہ میں کس مرض کی دوا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح سے تجربے کی بھٹّی میں تپ کر کندن بن گئے قمر سیوانی سے بھی فطرت کے مظاہر براہِ راست گفتگو کرتے ہیں بلکہ وہ فطرت کے نازک اشاروں کی پرت در پرت سرگوشیوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ ورنہ وہ دریا سے برسات کی خط وکتابت آخر کیسے جان پاتے اور کب سورج نے بادل کو نشا پلایا، انھیں کیسے معلوم ہو پاتا؟ قدرت شناسی کا یہ سلسلہ میں لگاتار جاری رہتا ہے۔ ایک اور رباعی ملاحظہ ہو ؎

سر دھوپ کا قدموں سے کُچل ڈالا ہے　　کرنوں کے سرا پے کو بدل ڈالا ہے
آکاش پہ یہ شور ہے کہ اک پا گل نے سورج کے کلیجے کو مسل ڈالا ہے

زندگی کو سمجھنے کی یہ سب سے گہری سطح ہے۔ اکثر رباعیات میں مبلّغانہ اور ناصحانہ گفتگو کے درمیان زندگی کی سمجھ ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بھی مجموعۂ رباعیات کا وہ حصّہ سب سے باسی اور اُباؤ ہوتا ہے۔ آخر ناصحانہ باتوں کے لیے اساتذہ کی طرف کیوں نہ رُخ کیا جائے۔ اردو کے کلاسیکی رباعی گو شعرا کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ قمر سیوانی کے مجموعے میں بھی ایسے روایتی حصّے کم نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ ان کے یہاں مظاہرِ فطرت کی بوقلمونی اور اس کی پرت در پرت کو کھولنے کی جستجو اصل چیز بن کر اُبھر رہی ہے۔

کائنات کو اُس کے ظواہر کے پسِ پردہ کون دیکھتا ہے؟ بے در و دیوار سے گھر کی تمنّا شاید شاعر اس لیے بھی کرتا ہے کیوں کہ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب در و دیوار کی زندگی اسے وحشت ناک معلوم ہوتی ہے۔ غالی حقیقت پسند شاید اِسے راہِ فرار قرار دیں لیکن لاکھوں کے لیے قدرت یا مظاہرِ فطرت عرصۂ سکون ہے۔ تصوّف اور مذہب میں اِس امر کی تعبیریں الگ ہیں لیکن اتنا کہنا کہیں سے بھی نامناسب نہیں کہ قمر سیوانی کھردری زندگی سے تھوڑی دیر کے لیے الگ ہو کر فطرت کی دل فریبیوں میں محو ہوتے ہیں تو واقعتاً نئی شعری کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مظاہرِ فطرت سے ہنسنا، کھیلنا اور سوال وجواب کر پانا ان کی شخصیت کی اصل توانائی ہے۔ زندگی میں تھکا ہارا سن رسیدہ شاعر فطرت کی آغوش میں بیٹھ کر کیسے کیسے خیالات نظم کرتا ہے، ملاحظہ کیجیے ؎

ساحل کے اشارے پہ ہوا ناچتی ہے　　موجوں کی فصیلوں پہ قضا ناچتی ہے
لہراتی ہے کشتی کی جبیں پر جب برق　　دریا کے اشارے پہ گھٹا ناچتی ہے

■

تتلی سے کہو پھولوں پہ منڈلائے نہ وہ　　زلفوں کی طرح جھوم کے لہرائے نہ وہ
اس کھیل میں جاسکتی ہے جاں بھی اس کی　　دیوار سے خوشبو کی ٹکرائے نہ وہ

■

ہاتھ اپنا دریا کے آگے مت جوڑ　　منّت کرنے کی اس عادت کو چھوڑ
پیاسا ہے تو بنیاد کی جانب رُخ کر　　بادل کی رگ رگ سے تو پانی کو نچوڑ

قمر سیوانی کی رباعیات ہم عصر رباعی گو شعرا کی تخلیقات سے واقعتا مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ تفصیل سے گفتگو کا موقع نہیں لیکن یہاں اُن کی مشّاقی اور نئے موضوعات کی طرف لپکنے کی کوشش مجھے پسندیدہ معلوم ہوئیں۔ وہ دکھاوے کی استادی کے مقابلے نئے نئے رنگوں کی طرف راغب ہونا پسند کرتے ہیں۔ ایک رباعی گو کی حیثیت سے یہی ان کا وصفِ خاص ہے۔ اردو رباعی کی تاریخ میں اساتذۂ فن کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک صاحبِ کمال اور مشّاق ہر دور میں دکھائی دیتے ہیں۔ بعضوں نے تو اسی صنف میں خود کو فنا کر لیا لیکن سودا، درد، انیس، حالی سے لے کر فراق تک ایک ایسا سلسلہ ہے جب شعرا نے دوسری اصناف کے ساتھ رباعیات کو بھی آزمایا اور فضلِ خدا سے اس میں بھی کم نام نہیں کمایا۔ ان کی رباعیات قدر سے دیکھی گئیں اور زبان زدِ خاص وعام ہوئیں۔ قمر سیوانی کی رباعیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ایک اہم رباعی گو کی حیثیت سے ضرور شناخت ملے گی۔ خاص طور سے مضمون آفرینی اور شاعر کی پختہ عمری میں 'نوخیزی' کی یہ کیفیت ان کی پہچان کی ضمانت بنے گی۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب:	آئینِ رباعیات
مصنف:	پروفیسر عراق رضا زیدی
اشاعت:	۲۰۲۳
صفحات:	۱۸۴
قیمت:	۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ:	شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (9818818215)
مبصر:	علیم اشرف خان (سینئر پروفیسر، شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔9315174986)

شمس قیس رازی نے ''المعجم فی معاییر اشعار العجم'' میں نہایت وضاحت سے بحور، اوزان اور قوافی شعر پر دقیق اور عالمانہ مباحث رقم کئے ہیں مگر عہد حاضر میں ہمیں بحور، اوزان وقوافی کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا صرف پروفیسر عراق رضا زیدی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ مجھے بارہا یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ جب کبھی بھی کسی نے عراق صاحب کے روبرو کوئی شعر پڑھا اور اس میں بحر، وزن یا قافیہ میں کوئی بھی کمی واقع ہوئی تو عراق صاحب نے فوراً اس کی تصحیح فرمائی اور اس تصحیح سے زیادہ ان کا تجربہ اس کی تحلیل اور بحر و اوزان وقوافی کی اصلاح ضرور کرتا ہے۔ زیر نظر کتاب ''آئین رباعیات'' اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس میں ۱۶ شاعروں کی رباعیات کو مدنظر رکھ کر رباعی کی حقیقت، اصلیت اور اقسام رباعیات اور اس کی اہمیت پر بھی ایک منطقی، استدلالی اور اقسام رباعیات اور اس کی اہمیت پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب میں زیر بحث رباعی گو شعرا میں مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، حسن سجزی، حافظ شیرازی، ہمایوں، سید جلال الدین رضا، دارا شکوہ قادری، حضرت امام خمینی، جمیل مظہری، محبوب حیدر سیتھلی، شاہین سیتھلی، کندن لال کندن اور روشن جیسے افراد کو شامل کیا گیا ہے۔ مزید برآں اس کتاب میں ایک جامع، نہایت واضح اور عالمانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کیا گیا ہے جس میں پروفیسر عراق رضا زیدی کی تحقیقی کاوش اور دقیق فن رباعی پر ان کی گرفت کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے وہ خود بھی رباعی گو شاعر ہیں ان کی دو رباعیاں ان کے شعری ہنر کو ثابت کرنے کے لیے بطور مثال یہاں درج ہیں ؎

ای صاحب قرآن تو ایمان مخور
آن شی که حرامست به قرآن مخور
خواهی که وصال شه لولاک شود
ای یار مخور خون یتیمان مخور

ظاہر ہے مذکورہ بالا رباعی میں جو پیغام پنہاں ہے وہ تعلیمات اسلامی سے عبارت ہے کہ اگر تمہارا پڑوسی بھوکا ہے تو تمہاری ساری عبادات کی کوئی حیثیت نہیں گویا سب سے بڑی عبادت بھوکے کو کھانا کھلانا ہے جس کی تمام صوفیا نے وکالت کی ہے اور اگر کوئی یتیموں کا مال ہڑپ لے تو یہ بھی بڑا گناہ ہے اور سماج و معاشرے کی اصلاح کے لیے عراق صاحب کا یہ پیغام نہایت اعلیٰ و عملی ہے جس پر کسی بھی مسلمان کو عمل کر کے خدا کے نزدیک قربت کا احساس کرنا چاہئے۔ بہرحال ان دونوں رباعیوں میں عراق صاحب نے جن چیزوں کو رباعی کا عنوان بنایا ہے وہ بہت عظیم ہیں اور ان کی رباعی گوئی پر دال ہیں۔ عراق صاحب نے رباعیوں کی اقسام کے سلسلے میں جو بات مستند اور معتبر مثالوں سے واضح کی ہے وہ یہ ہے کہ رباعی بالعموم سالم یا غیر سالم (خصی) ہوتی ہیں۔ مگر رباعی کی ایک تیسری قسم مستزاد بھی ہے جو عہد قدیم سے مروج تھی مگر اس میں رباعی کم لکھی گئی ہیں گویا رباعی سالم یا غیر سالم (خصی) اور مستزاد تینوں ہیئتوں میں لکھی جاتی ہے۔ (یہ بحث جدا ہے کہ ان کے اوزان کیا اور کیسے ہیں؟) آئین رباعیات میں رباعی پر جو مباحث ہوئے ہیں ان میں بڑے مستند اور معتبر شعرا جیسے امیر خسرو، حسن سجزی، مسعود سعد سلمان، حافظ شیرازی، دارا شکوہ، حضرت امام خمینی، جلال الدین رضا، جمیل مظہری اور کندن لال اور روشن جیسے شعرا کو مورد نقد و تبصرہ قرار دیا گیا ہے جو کم از کم رباعی جیسی اہم صنف سخن پر نہایت عالمانہ، وقیع، معتبر، مستند اور محققانہ کتاب ہے اور اس سے بڑھ کر رباعی پر تحقیق کرنے والے بہ آسانی رباعی کے نشیب و فراز سے آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔

میں اپنی بات کو حضرت امیر خسرو کی ایک رباعی جو انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے لیے تحریر کی تھی اس کے ذکر پر تمام کرتا ہوں ؎

از شیخ نظام چون سلام است مرا
با حسن عمل عیش مدام است مرا
امید پس مراد و کام است مرا
زیرا همه کار با نظام است مرا

میں پروفیسر عراق رضا زیدی صاحب کو ''آئین رباعیات'' کی تالیف پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خداوند کریم سے دعا گو ہوں:

اللہ کرے زور قلم اور ہو زیادہ

خدائے تعالیٰ پروفیسر عراق زیدی کو صحت و سلامتی اور تندرستی سے نوازے جس سے لوح و قلم کی خدمت کو اسی محنت، تندہی اور محققانہ روش سے انجام دیتے رہیں۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: انسان (ایک موضوع پر مبنی، مستزاد رباعیات میں نظم)
مصنف: مامون ایمن
اشاعت: ۲۰۲۰
صفحات: ۱۳۰
قیمت: ۵۰۰ روپے
ناشر: رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان
مبصر: سومی پروین (ریسرچ اسکالر، قاضی نذرل یونیورسٹی، آسنسول، مغربی بنگال)

مامون ایمنؔ جنہیں ان کی گوناگوں ادبی خدمات کی وجہ سے شمالی امریکہ میں ''بابائے اردو'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام محمد مامون الرشید، تخلص ایمنؔ اور قلمی نام مامون ایمنؔ ہے۔ موصوف نے 14 مئی 1941ء میں الہٰ آباد شہر یوپی کے حاجیوں اور حافظوں کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد محترم علامہ ہارون ارشد اپنے زمانے کے علم دین، زبان دان، عروض دان اور خوش الحان شاعر و ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت سے پنجاب یونیورسیٹی سے منشی فاضل، مولوی فاضل اور ادیب فاضل کی اسناد بھی حاصل کیں۔ والد محترم کی سرپرستی میں ہی مامون ایمنؔ صاحب کے کردار و افکار میں نکھار پیدا ہوا اور ان کی مخفی صلاحتیں اجاگر ہوئیں۔ انہوں نے روایتی طور پر ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ امریکہ چلے گئے جہاں کولمبیا یونیورسیٹی نیویارک میں اپنی تعلیم مکمل کی بعدازاں 1966ء میں لندن گئے اور وہاں دو سال قیام کے بعد پھر امریکہ واپس آ گئے اور فی الوقت وہیں مقیم ہیں۔ آپ نے وہاں کل وقتی طور پر انگریزی زبان و ادب میں بحیثیت استاد تدریسی فرائض انجام دیا اور جز وقتی طور پر آپ نے ریڈیو اور ٹی۔ وی کے شعبوں میں ایک کارگر صحافی کی حیثیت سے نشریاتی ذمہ داری بھی بخوبی نبھائی۔ یورپ جیسے کارپوریٹ معاشرے میں مقیم ہوتے ہوئے بھی آپ کا رشتہ اردو ادب سے بڑا گہرا ہے۔ اپنے وطن سے دور ایک انجان اور انگریزی معاشرت والے ملک میں سانس لیتے ہوئے، اردو ادب کی پہچان اور اس کی شناخت کو برقرار رکھا۔ یوں تو آپ نے مختلف النوع اصناف سخن میں طبع آمائی کی مثلاً غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی، پابند نظم، غیر مقفی نظم، نعت، تنقید و تحقیق اور رباعی وغیرہ لیکن آپ کو سب سے زیادہ مقبولیت صنف رباعی میں ہی حاصل ہوئی۔ موصوف نے فارسی و عربی کے صرف و نحو کے ساتھ ساتھ فن عروض کی جانب بڑی سنجیدگی سے توجہ دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صنف رباعی کے متعلق اب تک ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں ''عرض'' (۱۰۶ رباعیات) ''احتساب'' (۱۰۱ رباعیات)، ''زنداں'' (۱۴۵۰ موضوعاتی رباعیات) ''ابجد'' (۳۲۰ رباعیات)۔ ''ادراک'' (۲۰۲ مستزاد رباعیات)۔ ''آئینہ'' (۱۸۰ مستزاد رباعیات)۔ ''پرتو'' (۱۰۲ مستزاد رباعیات) اور ''انسان'' (۱۳۲ مستزاد رباعیات) وغیرہ اہم ہیں۔ کتابوں کی فہرست مامون ایمنؔ کی رباعی سے محبت کو بیان کرتی ہے، اس کا اعتراف اردو ادب کے نامور اشخاص بھی کرتے ہیں۔ مثلاً شاعر و دانشور جناب بشیر احمد صاحب مامون ایمنؔ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

غالبؔ و میرؔ کی صحبت میں رہے ہو برسوں
مدتوں بیٹھے ہو تم حافظ و خیّام کے ساتھ
صائبؔ و بیدلؔ و عرفی سے شناسائی ہے
ہے تعلق نہیں ہر صاحب الہام کے ساتھ

(مامون ایمنؔ فن اور شخصیت از پروفیسر محمد جناب عبدالقادر فاروقی، ناشر محمد عابد ۲۰۱۶ء۔ ص ۲۸۹)

پروفیسر عاصم علقمہ یوں فرماتے ہیں:

غزلوں کی قصاحت میں نمایاں ایمنؔ
نظموں کی سلامت میں صنوفشاں ایمنؔ
تنقید بھی، تحقیق بھی شعبہ ان کا
ہیں صنف رباعی میں فروزاں ایمنؔ

(''انسان'' — اردو شاعری، مامون ایمنؔ، رائٹرز فاؤنڈیشن، پاکستان لاہور، مارچ ۲۰۲۰ء ص ۵۵)

مذکورہ بالا رباعیات سے مامون ایمنؔ کی شخصیت اور فن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کا اعتراف خود بھی بآواز بلند کیا۔ وہ اپنی شناخت کے حوالے سے یوں فرماتے ہیں:

میں شہر لاہور کا تھا باسی مگر ہوں اب تک
امریکی شہری ملی ہے مجھ کو یوں جان دو جی، میں
دو جیانوں کا آشنا ہوں غزل نے کب دی ہے مجھ کو

شہرت، بجا کہ ہے نعت میری عزت مگر، رباعی سے رکھ کر
رغبت ادب میں، ایمن! ادب رسا ہوں

مامون ایمنؔ کی مستزاد رباعیات کے فارم میں لکھی گئی نظم ''انسان'' بلاشبہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں، اپنی نوعیت کی پہلی منفرد نظم ہے۔ جس میں انسان کے موضوع پر ۱۳۲ رباعیات شامل ہیں۔ جو کہ شاعر کے دعوے کے مطابق یہ سبھی رباعیاں ''مرکب اضافی، مرکب عطفی، جزو قوافی اور تقابل ردیفین سے مبراء ہیں'' (ص: ۲۳)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اہتمام کا التزام نظر آتا ہے۔ اب تک اردو ادب کی تاریخ میں، یہ اہتمام کسی اور رباعی گو کے تحریری اسلوب میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ موصوف نے نظم کو مکمل ۱۶ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ نظم کے حصہ اول میں ۲۵ رباعیات ہیں اور ہر رباعی کی ردیف ''انسان'' ہے۔ حصہ دوم میں ۲۴ رباعیات درج ہیں، ہر رباعی کے چوتھے مصرعے کا ایک لفظ اگلی رباعی کے پہلے مصرع میں شامل ہے، جو زنجیر کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ حصہ سوم میں مکمل ۶۵ رباعیات پیش کی گئی ہیں جس میں حرف تہجی کا اہتمام بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ حصہ چہارم میں ۱۷ رباعیات انسان کی حیثیت سے شاعر کی خود کلامی پر مشتمل ہیں جو مستزاد رباعیات کے فارم میں درج ذیل ہیں۔ حصہ پنجم میں شاعر کا تعارف بہ حیثیت انسان، مستزاد رباعیات کے مصرعوں میں درج ہے۔ اور آخری حصہ ششم میں شکریہ، کوائف شاعر، حوالہ جات اور کتب وغیرہ کا ذکر شامل ہے۔ اس نظم کو کتابی شکل دے کر ''انسان'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ جس میں اردو ادب کے نامور نقادوں نے نظم کے متعلق اپنے تاثرات بھی پیش کئے ہیں، انہوں نے مامون ایمنؔ کے فکر وفن اور رباعی، بالخصوص مستزاد رباعی پر ان کی قدرت کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے اسے سراہا ہے۔ خورشید اکبر، پروفیسر نذیر تبسم، پروفیسر عبداللہ جاوید، سید احمد قادری، مفتی عبد الرحمان قمرؔ اور پروفیسر عاصم علقمہ شبلی وغیرہ نے مامون ایمنؔ کی رباعی گوئی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں تخلیقی مجاہد، جدید اسلوب کے بانی، بابائے رباعیات جیسے خطابات سے نوازا ہے۔ ''انسان'' کے حوالے سے خورشید اکبر رقمطراز ہیں:

''مامون ایمنؔ کی زیر نظم کتاب ایک طویل نظمیہ کی صورت نمو پذیر ہوئی ہے۔ ہر چند کہ یہ رباعی مستزاد رباعی کے فارم میں تخلیق ہوئی ہے۔ جو انسان کی بنیادی جبلت (فطرت)، جذبہ واحساس، فکر وتخیل اور کردار و کمالات کے ساتھ اس کے ہمہ جہت ترقیاتی فراز اور اخلاقی نشیب کی معانی خیز ہی نہیں تجسس انگیز داستان بھی بن گئی ہے۔'' (ص:۱۶)

خورشید اکبر کا یہ بیان مبنی بر انصاف ہے۔ مامون ایمنؔ کی فکری اپج اور مشکل پسندی کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے انسان کے موضوع کا انتخاب کیا۔ انسان جسے اشرف المخلوقات کہا گیا، وہی انسان مامون ایمنؔ کی اس نظم میں مرکزی کردار ہے۔ مامون ایمن نے نظم ''انسان'' کے ذریعہ انسانی فطرت کی متضاد کیفیات یعنی حیاتیاتی کشمکش، خودنمائی وخودستائی، عیش پرستی، بے انصافی، لاچاری، اخلاقی پسماندگی، مروّت اور خدمت وغیرہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ انسانی اوصاف حمیدہ وقبیحہ کا ذکر اتنی بے باکی سے اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کا گہرا شعور ہے۔ اس رباعی میں ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے کس فنکاری سے انسان کی کج روی کا بیان کیا ہے:

ہر دھوکا دکھاتا ہے بشر کا چہرہ
چہرہ کو بناتا ہے ضرر کا چہرہ
در آتا ہے ہر آنکھ میں خرمن کوئی
جب دل میں جھلکتا ہے شرر کا چہرہ

■

خوابوں میں گھرے لمحے
تعبیر میں بھی ابھرے
سجتے ہیں نئے منظر
پتھر یوں بنے، شیشے

مامون ایمنؔ کی یہ نظم انسانی جذبات کی مکمل عکاسی ہے۔ انسان کے قلب کی گہرائیوں میں موجود حزن وطرب کی کیفیات جس طرح جنم لیتی ہیں، ٹھیک اسی طرح کائنات کے تمام مناظر کے جلال و جمال کے احساسات سے بھی اسے لگاؤ ہے۔ کبھی یہ دنیا مسرتوں سے بھری ہوئی ہے تو کبھی اس میں اذیت اور خوف کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ دراصل انسان متضاد کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ وقت اور حالات کی مناسبت سے اپنے جذبات اور احساسات کو تبدیل کرنے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔ جو چیز اسے بے حد عزیز ہو بعض اوقات وہی چیز اس کے دل ودماغ کو ناپسندیدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالات کے اثر سے اس کی ذہنی فکر کے ساتھ ساتھ اس کی پسند اور ناپسند میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان تمام نفسیاتی کیفیتوں کا ذکر نظم میں بڑی ہی خوبصورتی سے ہوا ہے۔ یہ رباعی ملاحظہ ہو:

گلزار سے احساس مہک اٹھتا ہے
بلبل ہو کر انسان ، چہک اٹھتا ہے
جب بات بدل جاتی ہے ، چنگاری میں
پتھر کا سراپا بھی ، دہک اٹھتا ہے

ہوتا یہی دیکھا ہے
دنیا میں یہ چرچا ہے
بدلے جو کوئی منزل
رستہ بھی بدلتا ہے

مامون ایمنؔ نے نظم میں انسان کے داخلی وخارجی حالات اور انسانی کیفیات ونفسیات کی تحلیل وتجزیے سے ایک نئی شخصیت کو جنم دینے کی کوشش کی ہے جو انسان ، اور اس کی گہری فکر کو سمجھ سکے ، وہ اسی بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان اشرف بھی ہے اور انسان اجلف بھی ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے ۔ خود اپنی ستائش میں ہمہ وقت مصروف رہنا، زر اور دولت کے نشے میں چور رہنا، جھوٹ اور فریب ، دھوکہ دہی سب کچھ انسانی جبلت میں شامل ہے ۔ انسان کی بے وقوفی کی حد یہ ہے کہ وہ اس دنیا کے حصول پر نازاں بھی ہے۔ فریب میں حقیقت اور حقیقت میں فریب کو تلاش کرنے والا ہے۔ لیکن ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود رباعی گو نے انسان کے حوالے سے یہ بھی فرمایا کہ اگر انسان صرف انسان ہے تو وہ اتنی طاقت ضرور رکھتا ہے کہ دنیا بھر کو اپنے وصف سے اپنا سکے ، دنیا کی برائیوں کو صاف کر سکے۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب تک ان برائیوں کو وہ کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ لے تب تک اچھائیوں کی قیمت اور ان کی اہمیت اس پر آشکار نہیں ہوتی ہے۔ درج ذیل رباعی میں شاعر نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

اشرف ہے، خلافت کا امین ہے انسان — بے مانگے، ملی دنیا
اسی دہر کی تقدیر، رہیں ہے انسان — رسوائی میں ہے چرچا
اک پل میں، وہ چھپ جاتا ہے مٹی بن کر — آغاز میں گم تھا، اب
کہنے کو ضیا بار جبیں ہے انسان — انجام کا ہے کھٹکا

ہر شام کی تاخیر، سحر ہے انساں — کہنا ہے، تو کہہ لیجے
بینائی سے آگے کی، نظر ہے انساں — گم راہی میں رہ لیجئے
کھوٹا ہی کہا کرتا ہے دنیا بھر کو — دستور ہے شاید، یہ
جانے وہ کھرا خود کو اگر ہے انساں — اِک زخم ہے، سہہ لیجے

مامون ایمنؔ کے مطابق جہاں انسان بہت ساری خامیوں ، کمیوں، کوتاہیوں کا مجسمہ ہے وہیں دوسری طرف انسان اشرف المخلوقات ہونے کی عظمت کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تبدیلی وتغیر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اور یہی تبدیلی انسان کو دنیا کی تسخیر کا موجب بھی بناتی ہے۔ دنیا اور اپنی کامیابی وکامرانی کے حصول کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتا لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ حالات کے شکار ہونے کا رونا رونے لگتا ہے۔ مامون ایمنؔ نے انسان کے اسی فطری جذبے کا تجزیہ بعض جگہوں پر تاریخی حوالوں سے پیش کیا ہے ۔ انسانی فطرت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کتب مقدسہ اور قدیم تہذیب ومعاشرت کا سہارا لے کر انسانی وجود کا تجزیہ کیا ہے اور انسان کی قدر ومنزلت کے ساتھ ساتھ کائنات میں اس کے مقام ومرتبہ کا یقین بھی اپنی رباعیات میں کیا ہے۔ مثلاً:

ویران ہے، آباد ہے، انسان بے شک — یہ بات ازل کی ہے
تعداد کے سودے میں ہے ارزاں بے شک — یہ بات خلل کی ہے
دیا کے اندھیرا سے نکل کر انساں — آئندہ ہو نقشہ کیا
ہو جائے گا عقبیٰ میں فروزاں، بے شک — یہ بات اجل کی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مامون ایمنؔ کی نظمیہ رباعیات ''انسان'' میں انھوں نے فکر وفن کے لحاظ سے انسان کی نفسیات، اس کے جذبات و احساسات اور اس کے کمالات اور افکار کو فنکاری سے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ انسان جو اپنی شناخت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ وہ انسان اپنی شناخت کا علم تو رکھتا ہے لیکن اس کا ذکر کرنا اس کے بس کی بات نہیں ۔ اچھائیوں کا ذکر، اپنی تعریف اپنی زبانی تو ہر انسان کر لیتا ہے لیکن انسانی کمیوں اور برائیوں کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسانی کا تذکرہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن مامون ایمنؔ نے اپنی اس نظم کے ذریعہ انسان کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مامون ایمنؔ عہد حاضر کے ایک پختہ گو شاعر اور منفرد رباعی گو ہیں۔ جنہوں نے اس صنف میں نئے نئے تجربات کر کے جدید لفظیات و موضوعات میں اضافہ کیا ہے اور اکیسویں صدی میں صنف رباعی کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے۔ ان کی رباعیات ذخیرۂ اردو میں ایک خوبصورت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: سوغات (رباعیاں صفدر امام قادری کے لیے)
مصنف: ظفر کمالی
اشاعت: ۲۰۲۳
صفحات: ۷۲
قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ صدف، ۲۰۲ ابو پلازہ، این آئی ٹی موڑ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶، بہار
9430466321
مبصر: شاہد حبیب (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔ 8530548888)

ظفر کمالی (پ: ۱۹۵۹) بہار کے ایک چھوٹے سے قصبے (سیوان) میں رہ کر ایک لمبے عرصے سے مشقِ سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی اس طویل ریاضت کی بدولت اردو شعر و ادب کی کئی اصناف مستفید ہوئی ہیں۔ ادب اطفال پر ان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ساہتیہ اکادمی نے ان کو ایوارڈ کا سزاوار سمجھا تو وہیں ان کی رباعیاں ایک عالم میں قبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ خاک جستجو اور رباعیات ظفر ان کی رباعیات کے مجموعے ہیں تو "چہکاریں" بچوں کے لیے لکھی گئی رباعیاں کا مجموعہ۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے خاص دوست اور کرم فرما صفدر امام قادری کی خدمت میں وقفے وقفے سے رباعیوں اور دیگر شعری و نثری اصناف کے توسط سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں مگر اس میں رباعیوں کا حصہ غالب تھا۔ کسی خیر خواہ کی یاددہانی پر انھوں نے ان تمام رباعیوں کو جو ۱۲۵ کی تعداد تک پہنچ گئی تھی، ایک جگہ جمع کر کے دونوں فنکاروں کے چاہنے والوں کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے پیش کر دیا۔ یہ ایک خوش آئند فیصلہ تھا۔ حالانکہ پوری کتاب کو کسی ایک شخصیت کے اردگرد مرکوز کر دینا، یہ کوئی جدت طبع کا مظہر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں اس طرح کی مثالیں قدیم دور سے ہی موجود ہیں اور جدید دور میں بھی گاہے بگاہے اس کے نمونے نظر آتے رہتے ہیں۔ قدیم دور میں ملا وجہی کی "قطب مشتری" اور جدید دور میں غضنفر کی "مثنوی قمر نامہ" کی روشن مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن شاید صنف رباعیات کو ایسی کسی کوشش کے طور پر بروئے کار لانے کے حوالے سے "سوغات" کو پہلا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے سوغات کا مقدمہ "ظفر کمالی کی صفدری رباعیاں" کے عنوان سے تحریر کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی جناب امتیاز وحید نے لکھا ہے کہ "۔۔۔۔۔۔ اس عام روش کے علی الرغم صفدر صاحب کے سلسلے سے ظفر کمالی نے ایک سو پچیس رباعیاں کہی ہیں۔ اس طرح ایک طرف جہاں شخصی رباعیوں کے باب میں رباعی گو کے کمالات ہمارے سامنے آتے ہیں وہیں اس شخصیت کا طلسم بھی وجہہ کشش بنتا ہے جنھیں سامنے رکھ کر اتنی بڑی تعداد میں رباعی کہنے کی گنجائش نکل آئی ہے۔" (ص:16)

ظفر کمالی نے یہ تمام رباعیاں 2013 سے 2023 تک کے دس سالہ عرصے میں کہی ہیں جو صفدر امام قادری کے تئیں ان کی فکر و نظر کو پیش کرتی ہیں۔ کتاب کی شروعات صفدر امام قادری کی محبوبیت اور شرافت کے ذکر سے ہوتی ہے۔ ظفر کمالی کہتے ہیں:

سب جس کو محبت سے پکاریں صفدر
ہیں اس میں شرافت کے ہزاروں جوہر
چھوڑے گا بھلا کیسے اشراف کی خو
اشرف کا پسر ہے وہ اشرف کا پسر

پہلے اور دوسرے مصرعے میں صفدر امام قادری کی شخصیت کی دو خوبی (محبوبیت اور شرافت) کا ذکر کر کے تیسرے اور چوتھے مصرعے کو دلیل کے طور پر لے کر آتے ہیں اور صفدر امام قادری کے والد گرامی جناب اشرف قادری کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ وہ اشرف انسان کا لخت جگر ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ شرافت کا دامن ہاتھ سے جانے دیں۔ آگے وہ صفدر امام قادری کے میدانِ کار "پٹنہ" کو ان کی ذات سے پہنچ رہے فیض کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب آن ہوا شان ہوا پٹنے کی
سب خوش ہیں کہ وہ جان ہوا پٹنے کی
یہ اس کی ریاضت کا صلہ ہے کہ وہی
اس عہد میں پہچان ہوا پٹنے کی

'پٹنہ کی شناخت بننے تک کے اس سفر میں ایسا نہیں کہ صفدر کو کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ وہ ہر طرح کی آزمائش کا شکار ہوئے اور قدم قدم پر انھیں جان جوکھم میں بھی ڈالنا پڑا پھر بھی انھوں نے اپنی شرافت کی خو کو بالائے طاق نہیں رکھا۔ ان کی اس خوبی کو بیان کرنے کے لیے ظفر کمالی نے بڑی ہی خوبصورتی سے "کوفہ" کے استعارے کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آغوش گردن میں جینا سیکھا
تیروں کی بارش میں جینا سیکھا
فن جینے کا اس سے سیکھو، اس نے
کوفے کی سازش میں جینا سیکھا

اسی کوفے کی سازشوں کو ایک اور رباعی میں انھوں نے مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

دشنام کے پتھر بھی چلے ہیں اس پر
بہتان کے خنجر بھی چلے ہیں اس پر
ایسے ہی نہیں اسے سرفرازی ملی
احساس کے نشتر بھی چلے ہیں اس پر

ان سب سازشوں سے صفدر بخوبی نکل کر پٹنہ کی پہچان بننے میں کیونکر کامیاب ہوئے، اسے ظفر کمالی نے ایک رباعی میں یوں بیان کیا ہے:

بہتان کی بارشوں سے واقف صفدر
اغیار کی سازشوں سے واقف صفدر
آنکھیں ہیں کھلی ہوئی تو کیسے نہ رہیں
اپنوں کی "نوازشوں" سے واقف صفدر

الغرض 125 رباعیوں میں ظفر کمالی نے صفدر امام قادری کی شخصیت کے 125 رنگ کو بخوبی عیاں اور واضح کیا ہے۔ 72 صفحات پر مشتمل یہ مختصر کتابچہ دراصل صفدر امام قادری کی زندگی کا سوانح ہے اور وہ بھی شعری پیکر میں۔ جو ایک دستاویزی اہمیت کا حامل ہے اور دونوں ہی فنکاروں کے چاہنے والوں کے لیے بیش قیمت تحفہ بھی۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب:	رباعی تحقیق
مصنف:	ڈاکٹر امیر حمزہ
اشاعت:	۲۰۲۲
صفحات:	۲۲۴
قیمت:	۳۵۰
ناشر:	عذرا بک ٹریڈرس، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر:	شاہد حبیب (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔ 853054888)

ڈاکٹر امیر حمزہ (پ: یکم فروری ۱۹۸۹) نوجوان محقق ہیں اور سنجیدہ قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے دوران ہی رسائل و جرائد میں شائع ان کے مضامین ادبی حلقوں میں اعتبار کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ پی ایچ ڈی مکمل ہونے کے بعد "کلیاتِ رباعیاتِ جوش مع فرہنگ" کے ساتھ ساتھ "رباعی تحقیق" نامی ان کی کتابیں اشاعت کے زیور سے آراستہ ہوئیں۔ یہ مسرت افزا بات ہے کہ آج ہمارے اسکالروں کی بڑی تعداد یونیورسٹیوں سے نکل کر آرہی ہے لیکن افسوس کہ ان میں سے بیشتر کا تحقیقی مقالہ منظر عام پر نہیں آپاتا۔ مگر ان میں سے ڈاکٹر امیر حمزہ جیسے تازہ دم محققین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جن کے تحقیقی مقالے نہ صرف شائع ہو رہے ہیں بلکہ تحقیقی مقالے کے ابواب بھی بذات خود مکمل کتاب کی حیثیت سے منظر عام پر آرہے ہیں۔

ڈاکٹر امیر حمزہ کی زیر نظر کتاب "رباعی تحقیق" دراصل رباعیات کے حوالے سے ہمارے اب تک کہ ڈسکورس کے جائزے پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ہمارے اس ورثے کا نہ صرف تجزیہ کیا ہے بلکہ اس پر اپنی رائے بھی رقم کی ہے۔ یہ کام دقت طلب تھا اور گہرے مطالعے کا متقاضی بھی۔ خوشی ہے کہ وہ ان سارے تقاضوں کو پورا کرتے نظر آرہے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو نو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ساڑھے پانچ صفحات پر مشتمل جامع دیباچے کے بعد پہلے باب "فارسی کتب سے" میں سرود، چکامہ، ترانہ، بیت، قول، بیت عربی یا فارسی، دو بیتی، دوازدہ، ہجائی، فہلویات کا وزن، ترانہ، چہارگانی وغیرہ کے حوالے سے رباعی کے فن اور تاریخ کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدیم متون سے استفادے کے سبب یہ حصہ بطور خاص توجہ طلب ہے۔

دوسرا باب علامہ شبلی کی "شعرالعجم" کے حوالے سے قائم کیا گیا ہے۔ شعرالعجم میں علامہ نے یعقوب صفار کا نام لے کر اردو رباعی کے حوالے سے جو باتیں کہی تھیں، اس کو ڈاکٹر امیر حمزہ نے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور اس سلسلے کے اختلافات کی نشاندہی کر دی ہے۔

تیسرے باب میں علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خیام" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خیام میں سید صاحب نے رباعی کی وجہ تسمیہ، اس کی ایجاد اور اس کی تاریخ پر گفتگو کی تھی۔ ڈاکٹر امیر حمزہ نے تفصیل سے ان کے دلائل کا جائزہ لیا ہے۔ رباعی کے سلسلے میں سید صاحب کا خیال تھا کہ یہ فن عربوں کا تھا اور عرب سے ہی عجم میں آیا ہے۔ اس کے اس خیال پر حافظ محمود شیرانی نے پرزور نکیر کی تھی۔ اپنی کتاب کے چوتھے باب میں ڈاکٹر امیر حمزہ نے حافظ محمود شیرانی کے دلائل کا جائزہ لے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا اختلاف برائے اختلاف تھا محض۔ ان کے پاس دلائل کا فقدان ہے۔ باوجود اس کے حافظ محمود شیرانی کی رائے ہی اردو دنیا میں مروج ہے۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کے جلد پنجم میں ایک مقالہ شامل ہے جو اکتوبر ۱۹۲۲ میں رسالہ "اردو" اورنگ آباد میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں حافظ صاحب نے علامہ شبلی اور سید صاحب کے دلائل کو باطل قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر امیر حمزہ نے ان سب کے دلائل کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ "شیرانی کے اس اقتباس میں تو بالکل واضح ہے کہ فارسی شاعری کی شروعات ہی مستعربہ کر رہے ہیں۔ ایسے میں رباعی کے حوالے سے موصوف کا پورا نظریہ کمزور ہو جاتا ہے" (ص:۹۹)۔ ڈاکٹر امیر حمزہ کی اس بحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس قدر عرق ریزی سے اس بحث کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

پانچویں باب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب "اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقا"، چھٹے باب میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی "اردو رباعیات" اور ساتویں و آٹھویں باب میں بالترتیب "رباعی تحقیق" از محمد ارشاد (پاکستان) اور "سیر رباعی" از سیروس شمیسا (شیراز یونیورسٹی، ایران) کے حوالے سے مفصل گفتگو کی ہے اور دادِ تحقیق دی ہے۔

آخری باب "اردو رباعی کا فن" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں رباعی کی تعریف، خیال، رباعی کی مقبولیت، مشکل ترین صنف سخن، آخری مصرعے، شاعر کی خصوصیات، رباعی کی مقبولیت، رباعی سے وجد، مقتل میں رباعی، رباعی سے جاں بخشی، قید سے رہائی، اردو رباعی کی اقسام، رباعی کے موضوعات، اوزان و بحور، اخرب، اخرم، خنیق، بنیادی اوزان، ۱۲ مزید اوزان، علامہ سحر عشق آبادی کے بارہ اوزان، ڈاکٹر زار علامی کے اٹھارہ اوزان، عبید اعظم اعظمی (ممبئی) کے ۲۸ اوزان جیسے ذیلی ابواب کے تحت معلومات افزا بحث کی گئی ہے۔ رباعی کے اوزان کے سلسلے میں تحقیق کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اس طریقے سے اردو رباعی کے اوزان میں نئے تجربے ہوتے رہے اور کل بیاسی اوزان سامنے آئے۔ ان اوزان کے قبول و عدم قبول پر کوئی ماہر عروض ہی بحث کر سکتا ہے۔ اس کتاب میں محض اوزان کو پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کے علم میں یہ بات آجائے کہ رباعی اردو کے کسی منجمد صنف سخن کا نام نہیں ہے۔" (ص:۱۱)۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر امیر حمزہ نے رباعی اور دیگر شعری اصناف سخن کے عنوان سے ایک ذیلی باب باندھا ہے اور اس میں "رباعی، قصیدہ اور غزل"، "رباعی اور مثنوی"، "رباعی اور مرثیہ"، رباعی اور قطعہ"، "رباعی اور سانیٹ" کے عناوین سے رباعی اور ان اصناف کے درمیان وجہ اتفاق و اختلاف کو بڑے قرینے سے سجایا ہے جو طلبہ کے لیے خاصے کی چیز ہے۔ اپنے مقدمے میں ڈاکٹر امیر حمزہ نے ایک سوال قائم کیا ہے کہ اس کتاب کا قاری کون؟

ان کا جواب ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں اور اگر آپ اس ذیل میں خود کو پاتے ہیں تو یقیناً یہ کتاب آپ کے لیے مفید ثابت ہوگی:

> "اول یہ کہ جو شخص اس موضوع سے واقف ہو، دوم یہ کہ اسے عربی و فارسی کا بھی علم ہو۔ موضوع کی واقفیت یہ ہے کہ کم از کم ڈاکٹر سلام سندیلوی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے توسط سے سید سلیمان ندوی اور حافظ محمود شیرانی کو پڑھا ہو، نیز صاحبِ ذوق ہو۔ اگر نہیں تو پھر اس پر یہ کتاب گراں گزرے گی۔ عربی و فارسی کا علم اس لیے ضروری ہے کہ اکثر شواہد و دلائل عربی و فارسی سے لیے گئے ہیں؛ اس لیے کتاب کی راست تفہیم کے لیے مذکورہ دونوں زبانوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ طویل اقتباسات کے مفاہیم تو درج کر دیے گئے ہیں؛ لیکن مختصر جملوں کی کوئی تشریح نہیں ہے، ایسے میں مشکل پیدا ہوگی اور قاری پر ایک صفحے کا مطالعہ بھی گراں گزرے گا۔ قاری اگر دونوں شرائط سے مزین ہو تو بھی اسے اختصار کا احساس ہوگا"۔

بہرحال ایک عمدہ تحقیقی کتاب کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر امیر حمزہ اردو دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

اشاریہ مجموعۂ رباعیات (اردو)

تحقیق وترتیب: تنویر اختر رومانی (جمشید پور)

اردو رباعیات کے مجموعے/ دیوان کی عالمی پیمانے پر فہرست تیار کرنا بڑے جوکھم کا کام ثابت ہوا۔ یہ فہرست کئی وسیلوں سے تیار کی گئی ہے۔ میں نے سینکڑوں قلمکاروں کے پاس نامکمل فہرست بھیج کر ان سے مدد کی درخواست کی، لیکن افسوس کہ چار پانچ اصحاب کے علاوہ کسی نے توجہ تک نہ دی۔ البتہ جناب احمد بدر (جمشید پور)، جناب ارشد قمر (ڈالٹن گنج) اور محترمہ خوشبو پروین (دہلی یونیورسٹی) نے بھرپور مدد فرمائی ہے۔ خاکسار تینوں محبانِ اردو کا بے حد ممنون ہے۔ اس فہرست میں کئی مجموعوں کے نام ان تینوں حضرات ہی کے رہین منت ہیں۔

اس فہرست میں صرف اردو رباعیات کے مجموعے/ دیوان ہیں۔ اردو شاعروں کے فارسی رباعیات کے مجموعوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

شمار	مجموعے کا نام	شاعر کا نام	سن اشاعت/ ناشر
۱۔	مکاشفات الاسرار (دیوان رباعیات)	میر سید علی غمگین دہلوی	۱۲۵۵ھ (۴۱/۱۸۴۰)
۲۔	ترانۂ خامہ (دیوان رباعیات)	عبدالغفور نساخ	۱۳۰۲ھ (۸۶/۱۸۸۵) کلکتہ
۳۔	نصرۃ المسلمین	عبدالغفور نساخ	۱۳۰۳ھ (۸۷/۱۸۸۶) کلکتہ
۴۔	رباعیاتِ شہباز	عبدالشکور شہباز	۱۸۹۱ء اردو گائیڈ، کلکتہ
۵۔	رباعیاتِ عجائبات امّو جان ولی	امّو جان ولی دہلوی	۱۹۰۲ء (طبع اول) انجمن ترقی اردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی
۶۔	رباعیاتِ اکبر	اکبر الٰہ آبادی	۱۹۰۸ء مخزن پریس، دہلی
۷۔	رباعیاتِ شاد مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ	۱۹۱۵ء	نامی پریس، کانپور
۸۔	آئینۂ عقیدت	مہاراجا سرکشن پرشاد شادؔ	۱۹۱۶ء نامی پریس، کانپور
۹۔	رباعیاتِ مولانا اکبر الٰہ آبادی	مرتب: شیخ الٰہ بخش گنائی	۱۹۲۴ء شیخ جان محمد الٰہ بخش، تاجرانِ کتب، لاہور
۱۰۔	رباعیاتِ امجد اول	مولوی سید احمد حسین امجد	۱۹۲۵ء
۱۱۔	رباعیاتِ اخگر	امداد حسین اخگر مرادآبادی	۱۹۳۴ء جامعہ پریس، دہلی
۱۲۔	رباعیاتِ امجد دوم	مولوی سید احمد حسین امجد	۱۹۳۵ء
۱۳۔	رباعیات	شاد عظیم آبادی	۱۹۴۶ء حمید عظیم آبادی، لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی
۱۴۔	روپ	فراق گورکھپوری	۱۹۴۷ء سنگم پریس، الٰہ آباد
۱۵۔	مجموعۂ رباعیات انیس	میر انیس	۱۹۴۸ء منشی نول کشور پریس، لکھنؤ
۱۶۔	موجِ سخن	عبدالباری آسی	۱۹۴۸ء لکھنؤ
۱۷۔	رعنائیاں	برج لال رعنا	۱۹۵۰ء مکتبہ شانِ ہند، دہلی
۱۸۔	رباعیاتِ امجد سوم	مولوی سید احمد حسین امجد	۱۹۵۵ء
۱۹۔	جذباتِ ناوک	ناوک حمزہ پوری	۱۹۵۶ء
۲۰۔	زمزمہ	صفدر آہ	۱۹۶۳ء پنچ بھون پبلی کیشنز، بھوپال

۲۱۔رباعیاتِ دبیر	مرتب: سید سرفراز حسین خبیرؔ	جون ۱۹۶۸ء نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ
۲۲۔قوسِ قزح	علامہ قوس حمزہ پوری	۱۹۶۸ء تاج پریس، باری روڈ، گیا
۲۳۔تجلیاتِ حبیب	مرزا حبیب علی حبیبؔ	۱۹۶۹ء اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد (پاکستان)
۲۴۔جذباتِ حبیب	مرزا حبیب علی حبیب	۱۹۷۰ء اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد (پاکستان)
۲۵۔رباعیات صادقین نقاش	صادقین	۱۹۷۰ء صادقین فاؤنڈیشن، امریکہ
۲۶۔گھر آنگن	خدیجہ اختر	۱۹۷۱ء مکتبہ شاہراہ، دہلی
۲۷۔تصوراتِ حبیب	مرزا حبیب علی حبیب	۱۹۷۳ء اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد (پاکستان)
۲۸۔صہبا و سمن	محشر عنایتی	۱۹۷۹ء (طبع اول) ۲۰۰۸ء (طبع دوم) اسماعیل گرافکس، چمن گنج، کانپور
۲۹۔نقطوں کا حصار	نادم بلخی	۱۹۸۸ء حیدر بلخی، محلہ کنڈ، ڈالٹن گنج
۳۰۔چارسو	راہی قریشی	۱۹۹۰ء حنا پبلی کیشنز، گلبرگہ۔۴
۳۱۔زادِ سفر (حمدیہ و نعتیہ رباعیاں)	علقمہ شبلی	۱۹۹۰ء اثبات و نفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۳۲۔اندازِ بیاں اور	ناوک حمزہ پوری	۱۹۹۲ء قوس اردو لائبریری، حمزہ پور، شیر گھاٹی
۳۳۔آبِ گوہر	برتر مدراسی	۱۹۹۲ء تاج پرنٹرس، وانمباڑی
۳۴۔نوائے امروز	ناوک حمزہ پوری	۱۹۹۶ء تکلّم پبلی کیشنز، پونہ
۳۵۔گل برگ	ریاض اختر ادیبی	۱۹۹۶ء جے اے آفسٹ پریس، نئی دہلی۔۲
۳۶۔رباعیاتِ قوس	علامہ قوس حمزہ پوری	۱۹۹۸ء اج پریس، باری روڈ، گیا
۳۷۔موجِ سبو	کوثر صدیقی	۲۰۰۲ء دبستانِ بھوپال
۳۸۔ارمغانِ سخن	فتح اللہ قادری	۲۰۰۲ء ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ۔۴
۳۹۔رباعیاتِ اصغر	اصغر ویلوری	۲۰۰۴ء سرمدی پبلی کیشنز، چینئی
۴۰۔انسان بنو	امیر چند بہارؔ ۲۰۰۴ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۴۱۔رباعیاتِ پرویز شاہدی	مرتب: شاہد ساز	۲۰۰۴ء اثبات و نفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۴۲۔چکنے پات	التفات امجدی	۲۰۰۵ء دارالاشاعت خانقاہِ امجدیہ، سیوان
۴۳۔روشن آیات	کوثر صدیقی	۲۰۰۵ء دبستانِ بھوپال، مدھیہ پردیش
۴۴۔طلسموں کے چراغ	طہور منصور نگاہ	۲۰۰۵ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶
۴۵۔موجِ تسنیم	حافظ کرناٹکی	۲۰۰۶ء فرید بک ڈپو، دہلی
۴۶۔چہار آئینہ	علقمہ شبلی	۲۰۰۶ء اثبات و نفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۴۷۔آبِ تسنیم	برتر مدراسی	۲۰۰۷ء تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینئی
۴۸۔خبرِ تحیّر	فرید پربتی	۲۰۰۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۴۹۔شہر نامہ (شہر پر رباعیات)	علقمہ شبلی	۲۰۰۸ء اثبات و نفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۵۰۔رباعیاتِ عادل	عادل اسیر دہلوی	۲۰۰۸ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی

۵۱۔ ترانہ	کوثر صدیقی	۲۰۰۸ء دبستانِ بھوپال
۵۲۔ ربیعہ دیوان	شاہ حسین نہری	۲۰۰۸ء نوائے دکن پبلی کیشنز، اورنگ آباد
۵۳۔ شاہ بانی (دیوان رباعیات)	شاہ حسین نہری	۲۰۰۹ء نوائے دکن پبلی کیشنز، اورنگ آباد
۵۴۔ موجِ شفق	کوثر صدیقی	۲۰۰۹ء دبستانِ بھوپال
۵۵۔ چکنے پات	التفات امجدی	۲۰۱۰ء دارالاشاعت خانقاہِ امجدیہ، سیوان
۵۶۔ بربط بردوش	حماد انجم	۲۰۱۰ء
۵۷۔ سنگریزے (کلیاتِ رباعیات)	اصغر ویلوری	۲۰۱۰ء ایم آر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔ ۲
۵۸۔ چار محراب	التفات امجدی	۲۰۱۰ء دارالاشاعت خانقاہِ امجدیہ
۵۹۔ رباعیاں	ظفر کمالی	۲۰۱۰ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
۶۰۔ رباعیاتِ قمر	قمر سیوانی	۲۰۱۱ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
۶۱۔ رباعیاتِ حافظ (حصہ اول)	حافظ کرناٹکی	۲۰۱۱ء فرید بک ڈپو، دہلی
۶۲۔ زینت القرآن	کوثر صدیقی	۲۰۱۱ء دبستانِ بھوپال
۶۳۔ گلابوں کے چراغ	طہور منصور نگاہ	۲۰۱۲ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی۔ ۶
۶۴۔ رباعیاتِ اسمٰعیل میرٹھی	مرتب: محمد اسلم پرویز اسلم	۲۰۱۲ء الکوثر پبلی کیشن، سبزی باغ، پٹنہ
۶۵۔ رباعیاتِ یگانہ	مرتب: عادل اسیر دہلوی	۲۰۱۲ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی
۶۶۔ رباعیاتِ عادل	عادل اسیر دہلوی	۲۰۱۲ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی
۶۷۔ رباعیاتِ رواں	جگت موہن لال رواں	۲۰۱۳ء ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی
۶۸۔ ہزار رنگ	ناوک حمزہ پوری	۲۰۱۳ء ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ
۶۹۔ جنوں خواب	فراغ روہوی	۲۰۱۳ء گلستاں پبلی کیشنز، کولکاتا
۷۰۔ فریدنامہ	فرید پربتی	۲۰۱۳ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۶
۷۱۔ ٹافیاں (بچوں کی رباعیات)	التفات امجدی	۲۰۱۳ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۹۵
۷۲۔ رباعیاتِ ظفر	ظفر کمالی	۲۰۱۳ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۹۵
۷۳۔ چہکاریں (بچوں کے لئے رباعیاں)	ظفر کمالی	۲۰۱۴ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۹۵
۷۴۔ احتساب (اشاعتِ دوم)	مامون ایمن	جنوری ۲۰۱۴ء خزینۂ علم وادب، لاہور
۷۵۔ عرض (اشاعتِ دوم)	مامون ایمن	فروری ۲۰۱۴ء گل بخشالوی، گجرات (پاکستان)
۷۶۔ رباعیاتِ رشید لکھنوی	مرتب: سید تقی عابدی	۲۰۱۴ء شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی
۷۷۔ چہرہ نامہ (شخصی رباعیات)	علقمہ شبلی	۲۰۱۴ء اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۷۸۔ بساطِ سخن	عبدالمتین جامی	۲۰۱۴ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۶
۷۹۔ ورق ورق شمیم (دیوانِ رباعیات)	شمیم انجم وارثی	۲۰۱۵ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۶
۸۰۔ نکاتِ اربع	نادم بلخی	۲۰۱۵ء ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ۔ ۴
۸۱۔ رباعیاتِ حافظ (حصہ دوم)	حافظ کرناٹکی	۲۰۱۵ء فرید بک ڈپو، دہلی
۸۲۔ فانوس	کوثر صدیقی	۲۰۱۵ء دبستانِ بھوپال

۸۳۔قندیل	کوثر صدیقی	۲۰۱۶ء دبستانِ بھوپال
۸۴۔رباعیاتِ حافظ (حصہ سوم)	حافظ کرناٹکی	۲۰۱۶ء فرید بک ڈپو، دہلی
۸۵۔رباعیاتِ حافظ (حصہ چہارم)	حافظ کرناٹکی	۲۰۱۶ء فرید بک ڈپو، دہلی
۸۶۔شہرِ رباعی	عادل حیات	۲۰۱۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۸۷۔ترانۂ جاوید	عبدالمتین جامی	۲۰۱۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۸۸۔مونسِ سخن	عبدالمتین جامی	۲۰۱۶ء بُک کارپوریشن، لال کنواں، دہلی۔۶
۸۹۔دیوان رباعیاتِ عارف	عارف حسن خان	۲۰۱۶ء جے کے آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی
۹۰۔خاکِ جستجو (رباعیوں کا دیوان)	ظفر کمالی	۲۰۱۷ء عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
۹۱۔چار اضداد (دیوانِ رباعیات)	مسرت حسین عازم	۲۰۱۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۹۲۔رباعیاتِ خلیل	خلیل الرحمان قاسمی	۲۰۱۸ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۹۳۔رنگِ رباعیات	زاہد کونچوی	۲۰۱۸ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۹۴۔زنداں مامون ایمن	جون ۲۰۱۸ء	مثال پبلشرز، فیصل آباد
۹۵۔باغِ صنوبر (دیوانِ رباعیات)	عاصم شہنواز شبلی	۲۰۱۹ء اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتا
۹۶۔رباعیات	رباب رشیدی	۲۰۲۰ء نائیس پرنٹنگ پریس، غازی آباد (یوپی)
۹۷۔انسان	مامون ایمن	اپریل ۲۰۲۰ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۹۸۔دیدہ ور	مامون ایمن	اپریل ۲۰۲۰ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۹۹۔تقطیر	مامون ایمن	جون ۲۰۲۰ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۰۰۔رُموز	مامون ایمن	اپریل ۲۰۲۱ء مدر لینڈ بک ایجنسی، لاہور
۱۰۱۔آئینہ	مامون ایمن	مئی ۲۰۲۱ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۰۲۔اِدراک	مامون ایمن	مئی ۲۰۲۱ء الحمد پبلشرز، لاہور
۱۰۳۔ابجد	مامون ایمن	جون ۲۰۲۱ء الحمد پبلشرز، لاہور
۱۰۴۔پرتو	مامون ایمن	جون ۲۰۲۱ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۰۵۔قطرہ قطرہ مشک (حمدیہ، نعتیہ رباعیات)	شمیم انجم وارثی	۲۰۲۱ء کریئیٹو اسٹار پبلی کیشنز، دہلی
۱۰۶۔چہار عالم	معراج احمد معراج	۲۰۲۱ء مرکزی پبلی کیشنز، دہلی۔۲۵
۱۰۷۔قرطاس وقلم	کوثر صدیقی	۲۰۲۱ء دبستانِ بھوپال، مدھیہ پردیش
۱۰۸۔سنگریزے	اصغر ویلوری	۲۰۲۱ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۱۰۹۔شخصیات	محمد اسلم پرویز اسلم	۲۰۲۱ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
۱۱۰۔شعر وحکمت حصہ اول	مولانا محمد زکریا مائل	مارچ ۲۰۲۲ء مرحوم کے صاحبزادے محمد انور، کراچی
۱۱۱۔اِفہام	مامون ایمن	اپریل ۲۰۲۲ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۱۲۔اقدام	مامون ایمن	جون ۲۰۲۲ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۱۳۔آہنگ محمد اسلم پرویز اسلم	ستمبر ۲۰۲۲ء	دی پرنٹ لائن، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
۱۱۴۔شعر وحکمت حصہ دوم	مولانا محمد زکریا مائل	اکتوبر ۲۰۲۲ء مرحوم کے صاحبزادے محمد انور، کراچی

(دونوں حصے احادیثِ نبوی ﷺ پر مشتمل رباعیات کے مجموعے ہیں)

۱۱۵۔انتخاب رباعیاتِ عابدہ شیخ	مرتب: محمد اسلم پرویز اسلم	مئی ۲۰۲۳ء دی پرنٹ لائن، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
۱۱۶۔ توضیح	مامون ایمن	اگست ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۱۷۔گفتار	مامون ایمن	اگست ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۱۸۔گفتنی	مامون ایمن	اگست ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۱۹۔ سفر	مامون ایمن	اگست ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۲۰۔تضاد	مامون ایمن	اگست ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۲۱۔تصریح	مامون ایمن	ستمبر ۲۰۲۳ء رائٹرز فاؤنڈیشن، لاہور
۱۲۲۔سیراب	مامون ایمن	ستمبر ۲۰۲۳ء زربفت پبلی کیشنز، لاہور
۱۲۳۔سوغات	ظفر کمالی	۲۰۲۳ء مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
۱۲۴۔رباعیاتِ حالی	الطاف حسین حالیؔ	عزیزی پریس، آگرہ
۱۲۵۔رباعیات	تلوک چند محروم	مکتبۂ دانش، مزنگ، لاہور
۱۲۶۔گوہرِ شہوار	علامہ قوس حمزہ پوری	کتابستان، چندوارہ، مظفر پور
۱۲۷۔رباعیاتِ جعفر	جعفر علی حسرت لکھنوی	
۱۲۸۔مغز ادب و فرتاب	میر کاظم علی برق موسوی	
۱۲۹۔گل صد برگ	حافظ جلیل حسن جلیل	
۱۳۰۔رباعیاتِ تسلیم	تسلیم گلشن آبادی	
۱۳۱۔رباعیاتِ الہام	رگھونندن سکسینہ الہام	
۱۳۲۔بہارستان	ناوک حمزہ پوری	
۱۳۳۔شرارِ سخن	ناوک حمزہ پوری	
۱۳۴۔کلیات رباعیاتِ جوش	جوشؔ ملیح آبادی	
۱۳۵۔گلستانِ رباعیات	دلکش بدایونی	
۱۳۶۔رباعیاتِ شایاں	شایاں قدوائی	
۱۳۷ انجیلِ خیال	سراج العارفین سراج	
۱۳۸۔رباعیاتِ شوق	سنجے مشرا شوق لکھنوی	
۱۳۹۔رباعیاتِ قلم	قلم سنبھلی	
۱۴۰۔شہابِ سخن	سید شاہ طلحہ رضوی برق	
۱۴۱۔خزینۂ رباعیات	شفقؔ عماد پوری	
۱۴۲۔گل برگ	ریاض اختر ادیبی	
۱۴۳۔ نکتے کی صدا	معصوم رضا عادل	
۱۴۴۔میری رباعیات	مرزا ناصر حسین	
۱۴۵۔رنگ و آہنگ	طرب ضیائی	
۱۴۶۔صفر	ساغر جنیدی	

☆☆☆



مراسلات:

محترمی ومکرمی

تسلیمات

سہ ماہی ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (مارچ تا مئی 2023) موصول ہوا۔ مضامین کے حسن انتخاب کو دیکھ کر یہ امنگ پیدا ہوئی کہ اسے ضرور پڑھا جائے۔ یوں تو ادبی نشیمن کا ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک مثال ہوتا ہے اور یہ شمارہ بھی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس شمارے کا آغاز بھی حمد ونعت سے ہوا اور اختتام قارئین کے احساسات پر۔ ڈاکٹر سلیم صاحب کے پر مغز اداریہ کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی صاحب کا مضمون "برہان پور کے پانچ شاعر : امکانات اور مسائل"، ڈاکٹر نارائن پاٹیدار صاحب کا مضمون "جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار"، ڈاکٹر درخشاں تاجور صاحبہ کا مضمون "گورکھ پور میں پہلی جنگ آزادی کے نقوش"، ڈاکٹر نزہت زہرا صاحبہ کا مضمون "مزاحیہ شاعری کا باوقار شاعر: ساغر خیامی"، شبیر احمد ملک صاحب کا مضمون "خاکہ نگاری شخصیت کے آئینے میں" وغیرہ کافی اہم ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی صاحب نے اپنے مضمون "برہان پور کے پانچ شاعر: امکانات اور مسائل" میں برہان پور کی علمی وادبی فضا اور وہاں کے لوگوں کی علم دوستی کا نقشہ کھینچنے کے بعد شاعروں کے احوال اور ان کے کلام کے کچھ نمایاں شعر پیش کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "سرزمین برہان پور کے ان پانچ شاعروں پر تاثراتی اور تنقیدی انداز میں جو گفتگو کی گئی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی خاک سے نمو پذیری کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ ہر زمانے کی طرح موجودہ عہد میں بھی برہان پور میں خاطر خواہ رہنمائی کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو معاصر ادبی رجحانات اور ترجیحات کے بابت نئے کہنے والے کو متعارف کرا سکے، وگرنہ ایسے ذہن ہر دور میں برہان پور کی مٹی سے پیدا ہوتے رہے ہیں جو صحیح رہنمائی اور قدر ومنزلت سے محروم ہوجانے کی صورت میں قصہ پارینہ بن گئے۔ جب تک آپ اپنے خول سے باہر آکر اور سستی شہرت اور مقبولیت سے احتراز کرنے کے ساتھ ہی پورے ادبی منظر نامے سے واقف نہیں ہوتے تب تک کسی بڑے فکری اور لائق تقلید کارنامے کی توقع بے سود رہے گی۔" (ص 8)

ڈاکٹر نارائن پاٹیدار صاحب اپنے مضمون "جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار" میں جیلانی بانو کے احوال وکوائف، ان کے ناولوں کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد، کچھ مشہور افسانوں کا تعارف اور چند اقتباسات پیش کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں "غرض یہ کہ اردو کے افسانوی ادب میں جیلانی بانو کو منفرد وممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ ایک تجربہ کار افسانہ نگار ہیں ان کا ادبی سفر سات دہائیوں کو محیط ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے یہاں بڑی وسعت ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں ہونے والے جبر اور طبقاتی کشمکش کے ساتھ سیاسی وسماجی حالات کو بڑی باریکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے نہ صرف ہمارے معاشرے کی بدلتی ہوئی تصاویر کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں بلکہ ان میں ہندوستان کی سماجی وسیاسی زندگی سے وابستہ ایسے مسائل موجود ہیں جن کا حل سماجی فلاح وبہبود کے لئے از حد ضروری ہے۔" (ص 14)

ڈاکٹر درخشاں تاجور صاحبہ نے اپنے مضمون "گورکھ پور میں پہلی جنگ آزادی کے نقوش" میں آزادی کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں کو سراہا ہے۔ ساتھ ہی محمد حسن، سرفراز علی، آغا ابراہیم بیگ، عنایت علی، بندھو سنگھ اور سردار علی کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

"وطن کی آبرو کے تحفظ کے لئے اپنی جان ومال قربان کرنے والوں کی یادگاروں کے تحفظ کے لئے ہم نے کیا قدم اٹھائے ہیں اس پر گفتگو تو ہوتی ہے اور دعوے بھی کئے جاتے ہیں لیکن نتیجہ ہمیشہ صفر ہی ہوتا ہے۔ کم از کم ہم اپنی نسلوں کو شہیدان وطن کے ناموں سے آگاہ تو کر سکتے ہیں اور ہمیں ایسا کرنا بھی چاہیے کیوں کہ یہ ہماری تاریخ کے وہ زریں اوراق ہیں جنہیں آب زر سے لکھا جانا چاہیے تھا لیکن افسوس ہے ایسا نہیں ہوا اور ہم نے اپنے مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یکسر بھلا دیا۔" (ص 17)

ڈاکٹر نزہت زہرا صاحبہ نے اپنے مضمون "مزاحیہ شاعری کا باوقار شاعر

:ساغر خیامی" میں ساغر خیامی کی مزاحیہ شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ ان کی مشہور نظم کرکٹ میچ کے بارے میں لکھتی ہیں" کرکٹ میچ" میں شاعر کا انداز بیان رومانی ہے اور منظر کشی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دوشیزہ کے ہاتھ میں جب لال گیند آتا ہے تو وہ گیند بلے باز کو گلاب کا پھول نظر آتا ہے اور اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ گویا وہ حسینہ گیند بازی نہیں بلکہ اسے شراب پلا رہی ہے۔ اس تصور کو انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں مترنم الفاظ کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ لال گیند پھول ہو جیسے گلاب کا
جس طرح دست ناز میں ساغر شراب کا
سایہ ہوا میں ناچتا تھا آفتاب کا
بمپر میں سارا زور تھا حسن وشباب کا
ایسے بھی اپنے عشق کا میداں بناتے تھے
امپائر ہر اپیل پر انگلی اٹھاتے تھے

ڈاکٹر صاحبہ ان کی مزاحیہ نظموں اور غزلوں کا تعارف کرانے کے بعد لکھتی ہیں" ساغر خیامی کی ظریفانہ شاعری کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر ناقدین ادب نے انہیں بڑے طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیا ہے اور انہیں دلاور فگار کے بعد ظریفانہ شاعری کا ایک نمایاں اور ممتاز شاعر قرار دیا۔" (ص 21)

رسالے میں مضامین کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جن میں" عامر قدوائی، مرغوب اثر فاطمی، شعیب ندیم گورکھ پوری، ظفر صدیقی وغیرہ کی غزلیں قابل ذکر ہیں۔ نظموں میں یاسین حسین زیدی نکہت کی نظم" عورت "اور مشتاق صدف کی نظم" ماں" قابل ذکر ہیں۔ رسالے میں کچھ خاص افسانے بھی شامل ہیں جن میں نصیر رمضان کا افسانہ" شہر تمنا کی آرزو" اور شاہد حبیب کا افسانہ" یورآنز" قابل ذکر ہیں۔ یورآنز میں شاہد حبیب صاحب نے سماج میں پھیلتی انارکی اور عدالت سے اٹھا انصاف کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نئی کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں جس سے رسالے کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سلمان عبدالصمد کی کتاب "متن کے آس پاس" پر پروفیسر غضنفر کا تبصرہ اور تنویر اختر رومانی کے افسانوی مجموعے" کھول دو" پر مدیر رسالہ ڈاکٹر سلیم احمد کا تبصرہ خوب ہے۔

مجموعی طور سے رسالہ دلچسپ ہے اور علم و آگہی میں اضافے کا باعث ہے۔ ہر اردو داں صاحب علم کو اس رسالے سے مستفید ہونے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔

ابوالفیض اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رباعیات

محسن عظیم انصاری، لکھنؤ

9451300431

انسان بنایا ہے خدا نے کامل
کیوں عمر گنواتا ہے تو بن کر کاہل
ہر آن کا دینا ہے حساب دنیا
تو اٹھ بھی ذرا ، ہو جا مکمل عامل

عزّت سے جو جینا ہے، تو مت بن سائل
اب روگ ہٹیلا یہ تو کردے زائل
کشکول یہ تو پھینک ، ذرا زحمت کر
محنت کی نہ رہ میں ہے کبھی کچھ حائل

ہو صبح کہ شب ، چلنے سے مت ہو غافل
منزل کی تو شہ رہ میں ابھی ہو داخل
بس سود و زیاں پر نہ نگہ تیری ہو
تو مشق کا ، محنت کا سدا ہو قائل

دنیا کی تگ و دو میں ، ہدف میں شامل
ہو گا جو ، کرے گا وہ سبھی کچھ حاصل
دولت کے سمندر میں جو ڈالے کشتی
ہچکولے بھی آئیں گے ، ملے گا ساحل

حق لیتے ہیں ، رہ چھوڑتے ہیں اب باطل
اللہ ہمیں دے گا ، بہت ہے عادل
رامش جو عظیم آپ سناتے ہیں اک
ہم ہوتے ہیں اس لئے کی نوا میں شامل

آزادی کے ۷۵ سال

آزادی کا امرت مہوتسو

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں / دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہانہ ''خبرنامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ قلیتی طلباء کو سول سروسیز کی کوچنگ کے لئے اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر واقع 'پارہ' موہان روڈ، لکھنؤ ☆ بچوں کا رسالہ ''باغیچہ'' کی اشاعت، اردو ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ☆☆☆☆

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت		نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱-	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=		۲۱-	تنقیدی نظریات (دوم)	سید احتشام حسین	183/=
۲-	مظہر امام	امام اعظم	208/=		۲۲-	توبۃ النصوح	ڈپٹی نذیر احمد	92/=
۳-	انتظار شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	270/=		۲۳-	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	107/=
۴-	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=		۲۴-	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	126/=
۵-	سالک لکھنوی	پروفیسر منظر حنفی	216/=		۲۵-	بادشاہ نصیر الدین	مرزا وجاہت حسین	42/=
۶-	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر زکی طارق	216/=		۲۶-	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	100/=
۷-	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=		۲۷-	ناٹک ساگر	نور الٰہی و محمد عمر	163/=
۸-	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=		۲۸-	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	183/=
۹-	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=		۲۹-	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	150/=
۱۰-	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=		۳۰-	انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی	مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن	30/=
۱۱-	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=		۳۱-	انتخاب کلام فراق گورکھپوری	مرتبہ ڈاکٹر افغان اللہ خاں	86/=
۱۲-	تعلیم نسواں	نسرین احمد	170/=		۳۲-	عصمت شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	248/=
۱۳-	معیاری نثر و نظم (اول)	حامد ندیم	73/=		۳۳-	ادب پارے نثر	سید احتشام حسین	45/=
۱۴-	معیاری نثر و نظم (دوم)	حامد ندیم	85/=		۳۴-	ادب پارے نظم	سید احتشام حسین	45/=
۱۵-	مثنوی سحر البیان	میر حسن	108/=		۳۵-	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	65/=
۱۶-	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	70/=		۳۶-	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
۱۷-	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	105/=		۳۷-	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	263/=
۱۸-	الیسیات	سید مسعود حسن رضوی	91/=		۳۸-	کلیم عاجز	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	173/=
۱۹-	پریم چند رنگے تناظر میں	پروفیسر علی احمد فاطمی	80/=		۳۹-	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=
۲۰-	تنقیدی نظریات (اول)	سید احتشام حسین	196/=		۴۰-	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	140/=

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010

فون نمبر: 0522-4022924 سیلس ڈپو موبائل: 7081007078

E-mail:upurduakademi3@gmail.com

Vol: 6, Issue: 03,04
June. to November.2023

Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy :200/-
Biannaul Subscription :300/-

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
A Central University under Ministry of Education
Government of India

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

داخلہ اعلامیہ۔ تعلیمی سال 2023-24

جولائی۔اگست 2023 سے شروع ہونے والے تعلیمی سال 2023-24 میں مندرجہ ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگراموں میں داخلے کے لیے آن لائن درخواستیں مطلوب ہیں:

1۔ ایم اے (اردو)	10۔ بیچلر آف سائنس (بی۔ایس۔سی) (فیزیکل سائنسز)
2۔ ایم اے (ہندی)	11۔ بیچلر آف ایجوکیشن (بی۔ایڈ)
3۔ ایم اے (انگریزی)	12۔ ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن
4۔ ایم اے (عربی)	13۔ ڈپلوما ان ٹیچنگ انگلش
5۔ ایم اے (تاریخ)	14۔ ڈپلوما ان ارلی چائلڈ ہوڈ کیئر اینڈ ایجوکیشن
6۔ ایم اے (اسلامیات یا اسلامک اسٹڈیز)	15۔ ڈپلوما ان اسکول لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ
7۔ بیچلر آف آرٹس (بی۔اے)	16۔ سرٹیفکیٹ کورس اہلیت اردو بذریعہ انگریزی
8۔ بیچلر آف کامرس (بی۔کام)	17۔ سرٹیفکیٹ کورس فنکشنل انگلش
9۔ بیچلر آف سائنس (بی ایس سی) (لائف سائنسز)	

ای پراسپکٹس اور آن لائن درخواست فارم ویب سائٹ manuu.edu.in/dde داخلہ پورٹل manuuadmission.samarth.edu.in پر دستیاب رہیں گے۔مندرجہ بالا پروگرامس میں داخلے کے لیے درخواست فارم پراسپکٹس 2023-24 کے مطابق دی گئی رجسٹریشن فیس کے ساتھ جمع کرنا ہوگا اور اسناد کی تصدیق کے بعد پروگرام فیس کی ادائیگی کرنی ہوگی۔

امیدوار مزید تفصیلات کے لیے طلبہ رہبری یونٹ ہلپ لائن **040-23008463** اور **040-23120600 (2208&2207)** پر صبح 9 بجے سے شام 7 بجے تک رابطہ کر سکتے ہیں۔ان کے علاوہ مزید تفصیلات کے لیے طلبہ نئی دہلی، کولکتہ، بنگلور، ممبئی، پٹنہ، دربھنگہ، سری نگر، رانچی، امراوتی، حیدرآباد، جموں، نوح، ورانسی اور لکھنؤ میں واقع یونیورسٹی کے ریجنل/سب ریجنل سنٹرس سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں یا ویب سائٹ **manuu.edu.in/dde** ملاحظہ کریں۔

آن لائن درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ بی۔ایڈ کے لیے **25 جولائی 2023** اور دیگر تمام پروگراموں کے لئے **25 اگست 2023** ہے۔سبھی پروگراموں کے لیے فیس ادائیگی کی آخری تاریخ **31 اگست 2023** رات 11:59 بجے سے قبل مقرر ہے۔

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم　　**manuu.edu.in/dde**　　رجسٹرار

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow　　**Editor: Dr. Saleem Ahmad**